قافلۂ علم وادب

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ناشر

مکتبۂ ندویہ
پوسٹ بکس ۹۳۔ندوۃ العلماء،لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

باراول

۲۰۱۶ء مطابق ۱۴۳۷ھ

نام کتاب.................. قافلۂ علم وادب (جلد اول)

نام مصنف.................. مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

تعداد صفحات.................. ۶۷۲

کمپوزنگ.................. محمد اشرف علی ندوی

قیمت.................. ۳۷۰ روپئے

ناشر:.................. مکتبہ ندویہ۔ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

باہتمام:.................. نجیب الحسن صدیقی ندوی

ملنے کا پتہ

مکتبہ ندویہ

NADWI BOOK DEPOT

P. BOX. 93 NADWATUL ULAMA LUCKNOW.7

E-mail:maktaba.nadwia@gmail.com Ph.0522-2741225, 8960997707

فہرست کتاب

عناوین	صفحات
عرض ناشر	۷
دیباچۂ کتاب	۱۰
مقدمہ	۱۴
باب اول چند مایہ ناز شخصیات	۱۹
امام شافعیؒ اور ان کی فقہی خدمات	۲۱
شیخ المحدثین شاہ محمد اسحاق دہلویؒ	۲۹
اورنگ زیب عالمگیرؒ اور ان کا اہم کارنامہ	۳۹
شیخ الہند علامہ محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کی علمی و دینی قیادت	۵۳
حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ	۶۱
دارالمصنفین، اور اس کے اولین معمار	۷۴
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	۸۶
حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ	۹۲
علامہ عبدالباری ندویؒ: مایہ ناز شخصیت اور عظیم فلسفی	۹۸
حکیم الاسلامؒ اور دارالعلوم دیوبند	۱۰۶
مولانا ابوالکلام آزادؒ: ایک مثالی قائد ورہنما	۱۱۲
حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ اور عشق الٰہی	۱۱۸

باب دوم **مفکر اسلام ایک جامع الکمالات شخصیت**	۱۲۹
معاصر مسائل وقضایا میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا معتدل موقف	۱۳۱
مفکر اسلامؒ اور نوجوان	۱۵۵
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ: اپنے دعوتی خطبات کے آئینے میں	۱۶۵
مفکر اسلامؒ عربی کے صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے	۱۸۱
بچوں کے ادب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اسلوب	۱۹۷
اردو زبان کے سوانحی ادب کی تشکیل میں ''پرانے چراغ'' کا حصہ	۲۲۵
باب سوم **چند اسلامی ادباء وشعراء**	۲۳۷
اردو زبان کے چند زعماء : ایک مختصر جائزہ	۲۳۹
شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ: شاعر اصلاح وانقلاب	۲۵۳
جگر مرادآبادیؒ کا کلام اور ان کا مقام ومرتبہ	۲۶۷
گجرات کی چند شخصیات: ماضی اور حال کے آئینہ میں	۲۷۹
مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ کا سوانحی ادب: چند جھلکیاں	۳۰۱
مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی شاعری اور قرآن کریم سے استفادہ	۳۱۹
بچوں کے ادب میں حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ کا حصہ	۳۴۷
باب چہارم **عالم اسلام کی جلیل القدر شخصیات**	۳۶۷
سید قطب شہید: زندگی کے چند نقوش	۳۶۹
شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ	۳۷۲
علامہ عبدالعزیز بن بازؒ پیکر علم وعمل اور داعی کتاب وسنت	۳۷۷

باب پنجم چند محترم اور بزرگ شخصیات	۳۸۵
مولانا دریابادیؒ کردار سازی کے آئینے میں	۳۸۷
امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور ملی خدمات	۴۰۵
حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ: کچھ یادیں، کچھ باتیں	۴۱۵
محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحقؒ : ایک تذکرہ	۴۲۴
مولانا مختار احمد ندویؒ: چند یادیں اور کارنامے	۴۴۵
مولانا قاضی معین اللہ ندویؒ : بافیض شخصیت کی چند جھلکیاں	۴۶۱
حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ : نقوش وتأثرات	۴۶۵
مولانا ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلیؒ: تاریخ ساز شخصیت	۴۸۰
حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی:» □ علم وتحقیق اور فقہ اسلامی کا عظیم سرمایہ	۴۸۶
الحاج منت اللہ کانپوری: نقوش وتأثرات	۴۹۱
پروفیسر وصی احمد صدیقیؒ : ایک باغ وبہار شخصیت	۴۹۷
عالم باعمل مولانا محبوب الرحمن صاحب ازہری رحمۃ اللہ علیہ	۵۰۵
باب ششم والد محترم اور مشفق اساتذۂ کرام	۵۱۱
محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمیؒ: شخصیت اور علمی مآثر	۵۱۳
والد محترم حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ کی وفات حسرت آیات	۵۲۵
مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ: چند نقوش وتأثرات	۵۳۶
مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ: کامیاب مربی، مشہور فقیہ اور مصنف	۵۴۳
پیکر مہر ووفا حضرت مولانا عبد الجبار اعظمیؒ	۵۵۲
شیخ التفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامیؒ	۵۵۶

مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ	۵۶۱
مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ	۵۶۲
مولانا مفتی محمد سعید صاحب ندویؒ	۵۶۲
مولانا ابوالعرفان صاحب ندویؒ	۵۶۳
ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندویؒ	۵۶۳
باب ہفتم چند باکمال رفقاء	۵۶۵
محمد الحسنیؒ : چند یادیں	۵۶۷
مولانا ڈاکٹر سید محمد اجتباء حسینی ندویؒ : چند یادیں	۵۷۸
امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین قاسمیؒ	۵۸۹
حافظ محمد اقبالؒ اللہ کے جوار میں	۵۹۶
مولانا حبیب الرحمن ندویؒ: کچھ باتیں، کچھ یادیں	۵۹۹
مولانا ڈاکٹر مقتدی حسن ازہریؒ	۶۱۱
مولانا شفیق الرحمن ندویؒ: کامیاب استاذ، دیانتدار منتظم اور باوقار مثالی عالم دین	۶۱۶
الحاج عبدالرزاق رصاصیؒ	۶۲۶
پروفیسر محمد یونس نگرامیؒ: چند نقوش وتأثرات	۶۳۴
مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی جوار رحمت میں	۶۴۰
پیکر اخلاص ومحبت مولانا ابومسعود محمد اظہر غوری ندویؒ	۶۴۲
مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ اللہ کے حضور میں	۶۵۵
آہ! مولانا محمد ابراہیم ندویؒ	۶۶۲
الحاج عبدالرزاق نصیر آبادی	۶۶۵

عرض ناشر

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين أما بعد :

دین کی نشر واشاعت کے دو ذریعے ہیں: ایک کتاب اللہ، دوسرے رجال اللہ، کتاب اللہ قرآن کریم کی شکل میں مکمل دستور کی حیثیت سے موجود ہے، اور رجال اللہ کا سلسلہ بھی برابر قائم ہے، نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے بعد سے آج تک مجددین اور مصلحین آتے رہے، اور اصلاح وتجدید کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیتے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تاریخ دعوت وعزیمت اس پر شاہد عدل ہے، حضرت مفکر اسلامؒ عام طور پر طلبائے مدارس کو خطاب کرتے ہوئے کہتے تھے:

> ''چراغ سے چراغ جلتا ہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی مخلص بندہ آپ کو مل جائے تو اس کو آپ اپنا رہنما مان کر اپنی زندگی کی نئی تعمیر شروع کریں، زندوں میں آپ کو کوئی نظر نہ آئے تو ماضی کی شخصیتوں میں اس کو تلاش کیجئے''۔ (پا جا سراغ زندگی: ۳۲)

بلاشبہ تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری پر عصر حاضر میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہے، لیکن وہ '' ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است '' کی مصداق ہیں، اگر مولانا حالی نے حیات جاوید لکھ کر اس صنف کو تابندگی بخشی تو علامہ شبلی نعمانیؒ وعلامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس موضوع کو آفاقی بنایا، اور نیا زاویہ فکر عطا کیا، سید صاحب کی حیات شبلی و یادِ رفتگاں، مولانا شاہ معین

الدین ندویؒ کی متاع رفتگاں، مولانا ماہر القادریؒ کی کاروان رفتگاں اور مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی معاصرین اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی پرانے چراغ، وغیرہ اسی موضوع کا در شہوار ہیں، مخدوم گرامی قدر کی یہ کتاب ''قافلۂ علم وادب'' اسی کاوش کا امتداد اور عکس جمیل ہے۔ (کم ترك الأول للآخر)

پیش نظر کتاب مخدوم گرامی قدر حضرۃ الأستاذ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی گرانقدر تصنیف ہے، مولانا محترم نے اپنی زندگی کا آغاز سوانح نگاری سے کیا، عربی اور اردو میں ''ساعة مع العارفين'' اور ''تذکرہ اہل دل'' سوانح نگاری کا اعلی نمونہ ہیں، بزرگوں کی خدمت میں نیازمندانہ حاضری اور ان سے استفادہ آپ کا شروع سے وطیرہ رہا ہے، اسی جذبہ نے آپ کو سرزمین عراق کا مسافر بنایا اور ۱۱ر مہینے قیام کر کے استفادہ کی راہ ہموار کی، مولانا نے اس سفر کی بھی پراز معلومات روداد اور داستان لذیذ تر اپنے شاداب قلم سے تحریر کی ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شفقتوں کے سائے میں ۴۸ر سال گذارنے والے اس رجل عظیم کی حیات کیونکر قابل رشک نہیں ہوگی، بلاشبہ حضرت مفکر اسلامؒ کی ذات افراد ساز بھی تھی اور تاریخ ساز بھی، ان کی کیمیا اثر نگاہ نے سیکڑوں ہیرے وجواہرات امت مسلمہ کے لئے پیش کئے، مولانا مدظلہ کی ذات اسی سلسلہ طلائے ناب کی اہم کڑی ہے۔

کتاب میں کیا ہے؟ اس کا جواب تو قارئین خود دیں گے، لیکن کتاب کا ہر قاری میرے اس نظریہ کی ضرور تائید کرے گا کہ اس میں علماء بھی ہیں اور شعراء بھی، فقہاء بھی ہیں اور ادباء بھی، سیاست داں بھی ہیں اور بزرگ ترین شخصیات بھی، مایہ ناز صحافی بھی ہیں اور منبر ومحراب کو زینت بخشنے والے حضرات بھی، مشفق اساتذہ بھی ہیں اور محبت کرنے والے رفقاء بھی، ملک کی شخصیات بھی ہیں اور ملک سے باہر شہیدان راہ وفا بھی، اور پھر ان تمام حضرات کا تذکرہ ایسے خوبصورت انداز میں کہ ''ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا''، مولانا مدظلہ نے حضرت مفکر اسلامؒ کی شخصیت پر جو مضامین ان کی وفات حسرت آیات کے بعد لکھے وہ اس

میں موجود ہیں، جن سے مولانا کے اپنے مربی ومحسن کی قدر شناسی کا جذبہ نہ صرف یہ کہ سامنے آتا ہے، بلکہ وہ ہر صاحب بصیرت کے لئے چشم کشا ہیں۔

مکتبۂ ندویہ کے لئے یہ سعادت وخوش بختی کی بات ہے کہ مخدوم گرامی نے میری حقیر درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور یہ قیمتی کتاب اشاعت کے لئے عنایت فرمائی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھے اور یہ بیش قیمت تصنیف ہر صاحب ذوق کے ہاتھ میں ہو۔

۱۴۳۷/۲/۲۱ھ — نجیب الحسن صدیقی ندوی

۲۰۱۵/۱۲/۴ء — مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

دیباچۂ کتاب

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آلی وأصحابہ أجمعین أما بعد :

میرے رب کریم کا مجھ ناچیز پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے مجھے اپنے دین کی تعلیم حاصل کرنے اوراس کی تعلیمات کو سمجھنے اوران پر عمل کرنے کی کسی حدتک توفیق عطا فرمائی، اور اہل علم کی زندگی سے سبق لینے اور ان کے کارناموں کو پڑھنے اور ان کی قابل رشک خدمات سے واقف ہونے کا شوق اور زندگی کی تعمیر میں ان کی سیرت سے مستفید ہونے کا موقع مرحمت فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے دوران تعلیم ومطالعہ مجھے اپنے تأثرات لکھنے اوران کو مرتب کر کے کتابی شکل میں پیش کرنے کی سعادت بخشی، وہ دراصل ان اساتذۂ کرام اوراہل تربیت حضرات کی شفقتوں کا نتیجہ ہے، جن کی خدمت میں مجھ کو کچھ وقت گذارنے اوران کی مجلسوں میں بیٹھنے اوران کے علم سے مستفید ہونے کا موقع ملا، سب سے اعلیٰ اور کامل ترین اور ہمیشہ تروتازہ باقی رہنے والی سیرت تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور ہر انسان کے لئے وہ ایک مینارۂ نور ہے، اسی سیرت مطہرہ کا فیض ہے کہ ان کے متبعین کی زندگی کے حالات میں بھی اس دائمی روشنی کا کوئی نہ کوئی عکس کسی درجہ میں موجود ہوتا ہے اوراس سے عالم بشری کے لئے راہ ہدایت کھلتی ہے اورصراط مستقیم کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

میں نے اپنے اساتذہ سے اوراہل تربیت وارشاد علماء وشیوخ سے بھی مستفید ہونے

کی پوری کوشش کی ہے، لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ سمندر کی گہرائیوں اور اس کی صدفہائے گرانمایہ سے میں نے کچھ حاصل بھی کیا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر کی موجوں اور اس کی وسعت کو دور سے دیکھ لینا بھی کافی ہوتا ہے، اور کسی حد تک اس کی وسعت بے پایاں کی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ کم ہمت انسان کے لئے سرمایۂ سعادت بن جاتی ہیں، میرے اساتذۂ کرام اور میرے والدین کا فیض ہی تھا کہ مجھے حصول علم کا شوق پیدا ہوا اور اہل علم وعمل کے سامنے سے گذر جانے کی عزت حاصل ہوئی۔

میں نے سب سے زیادہ وقت اپنے مرشد ومربی اور استاذ گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی خدمت بابرکت میں گذارا، یہ محض اللہ تعالیٰ کا اپنے اس بندے کے ساتھ فضل خاص ہے کہ تقریباً نصف صدی (۴۸ سال) تک مجھے ان کی شفقتوں کے سایے میں رہنے کا موقع ملا، اس کی تفصیل میں نے کسی قدر اپنے اُس تذکرے میں تحریر کرنے کی سعادت حاصل کی ہے، جس کو میں نے (۴۸ سال شفقتوں کے سایے میں) کے نام سے شائع کیا ہے، اور اس میں میں نے اپنے اساتذۂ کرام اور محسنین اور اہل علم وفضل کا بھی مختلف مواقع سے ذکر کر کے کسی حد تک احسان شناسی کا ثبوت دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب میرے ان مضامین ومقالات پر مشتمل ان مختلف شخصیات کے بارے میں ہے، جو علم وعمل کی تاریخ میں بلند مقام رکھتی تھیں، اور ان کی زندگی کو میں نے قریب سے دیکھا ہے، یا ان کی زندگی کے حالات کو میں نے کتابوں مں پڑھا ہے اور وہ اصحاب علم ودین کی صفوں میں امتیازی شان کے مالک تھے، البتہ امام شافعیؒ کے مختصر حالات کو فاتحۃ الکتاب بنا کر میں نے اس کو اپنے لئے سعادت دارین کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے، اور باوجود اس کے کہ میں نے اپنے استاذ اور مرشد ومربی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی حیات مبارکہ پر اپنے مشاہدات اور حالات کو مذکورہ بالا کتاب میں حسب استطاعت تفصیل سے ذکر کیا ہے، لیکن اس مجموعہ میں حضرت مولاناؒ کے بعض اہم پہلوؤں اور

خصوصیات کا بیان الگ سے ایک مفصل باب (مفکر اسلام ایک جامع الکمالات شخصیت) میں موجود ہے، جو میرے لئے مزید اطمینان وسعادت اور حق شناسی کے باب میں اہمیت رکھتا ہے اور کتاب کی افادیت اور اس کی معنویت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔

بطور وضاحت یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے میں جو ابھی جلد اول کے طور پر شائع ہو رہا ہے، صرف انھیں شخصیات وحضرات کا تذکرہ ہے جو سفر آخرت اختیار کر چکے ہیں، اور عام طور سے جن حضرات (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے استفادہ کا موقع مل چکا ہے۔ یا ان کو قریب سے دیکھا ہے۔ یا ان کے بارے میں پڑھا ہے، اس فہرست میں میرے بعض قریبی بزرگ اور عزیز دوست اور رفقاء بھی ہیں، جن کا تذکرہ میرے لئے باعث اطمینان ومسرت ہے

کتاب کا نام (قافلۂ علم وادب) تجویز کیا گیا ہے، یہ سات ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول:	چند مایۂ ناز شخصیات
باب دوم:	مفکر اسلام ایک جامع الکمالات شخصیت
باب سوم:	چند ادباء وشعراء
باب چہارم:	عالم اسلام کی جلیل القدر شخصیات
باب پنجم:	چند محترم اور بزرگ شخصیات
باب ششم:	والد محترم اور مشفق اساتذہ کرام
باب ہفتم:	چند باکمال رفقاء

اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چند اساتذۂ کرام کا تذکرہ بہت مختصر ہے، لیکن جامع ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: استاذ محترم حضرت مولانا مفتی سعید صاحب ندویؒ (سابق مفتی عام دار العلوم ندوۃ العلماء)، استاذ محترم حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب بلیاویؒ، اور استاذ محترم حضرت مولانا ابو العرفان صاحب ندوی (رحمہم اللہ جمیعاً)۔

گھریلو تربیت اور عمومی تعلیم میں اپنے والدین اور خاص طور سے والد محترمؒ اور برادر معظم ومشفق جناب مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمیؒ (سابق استاذ طبیہ کالج دارالعلوم دیوبند) کے تربیتی کردار واحسان کو کبھی نہیں بھول سکتا کہ یہ حضرات زندگی کی عمارت کا بنیادی پتھر ہیں، اوران کے احسانات کی فہرست بہت طویل ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کا انتظام عزیز مکرم مولانا نجیب الحسن صاحب ندوی حفظہ اللہ تعالیٰ نے مکتبۂ ندویہ کی جانب سے کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اس بیش قیمت تعاون کو قبول فرمائیں اور جزائے خیر سے نوازیں (آمین)۔ میں ان کا بہت شکرگزار ہوں۔

میں نے اس کتاب پر مقدمہ تحریر کرنے کی درخواست محبّ مکرم مولانا محمد علاء الدین ندوی (حفظہ اللہ تعالیٰ) (استاذ ادب عربی ومساعد العمید لکلیۃ اللغۃ العربیۃ دارالعلوم ندوۃ العلماء) سے کی، جسے انہوں نے قبول کرلیا اور ایک وقیع مقدمہ لکھ کر کتاب کی قیمت میں اضافہ کیا، میں اس کے لئے ان کا دل کی گہرائیوں سے شکرگذار ہوں۔

یہ مضامین مختلف رسالوں اور بعض کتابوں میں بھی اپنے وقت پر شائع ہوئے تھے، ان سب مضامین کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کا کام عزیز گرامی مولانا محمد فرمان ندوی (استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے اپنے ذوق خاص کے مطابق انجام دیا ہے، میں ان کی اس فکر واعتناء، اوراس حسن ظن کے لئے دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں اورامید رکھتا ہوں کہ مجھے ان کا اور دیگر عزیزوں، اور عزیزی مولوی محمد عبد اللہ مخدومی کا تعاون ہمیشہ حاصل رہے گا۔ واللہ ولی التوفیق۔

راقم الحروف
سعید الرحمٰن اعظمی
(مدیر البعث الاسلامی ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

۱۷ر محرم الحرام ۱۴۳۷ھ
۳۱ر اکتوبر ۲۰۱۵ء

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين ، أما بعد :

''قافلۂ علم وادب'' (جلد اول) کا مسودہ راقم کے سامنے ہے، یہ پوری ۶۵۰ر صفحات پر پھیلی ہوئی، کتاب کیا ہے، بس گنجینۂ علم ودانش اور شخصیات کی پیکر تراشی، جس کی حنا بندی ادب کے گل ولالہ سے کی گئی ہے، یہ مؤلف کی فکری کاوش کا نتیجہ ہے، جو خود بھی برسوں سے قافلۂ علم وادب کا سچا نمائندہ اور امت کی رہنمائی کا علمبردار ہے۔

زبانی اعتبار سے اس وقیع تصنیف میں دوسری صدی ہجری سے لے کر موجودہ صدی ہجری تک کی شخصیات کا تذکرہ شامل ہے، مکانی لحاظ سے اس کے جلو میں عالم عربی سے لے کر ہندوستان کے مختلف علاقوں کی ممتاز شخصیتیں قطار اندر قطار کھڑی ہیں، معروف معنوں میں یہ کتاب محض تذکرہ نگاری اور سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ چند مایہ ناز شخصیات کے دینی، علمی، فکری، اصلاحی، تعلیمی اور بعض شخصیات کے تناظر میں تجدیدی کارناموں اور ان کی متنوع خصوصیات وامتیازات کا ایک وثیقہ ہے۔

خدمات وتأثرات کے پیرایۂ بیان میں اظہار ذات بھی ہے، جس میں جمالیاتی کیف کی آمیزش ہے، اس میں اساتذۂ کرام اور مربیوں کی شفقتوں سے معمور مقدس جذبات کی عکاسی بھی ہے، مناقب وفضائل کا بیان بھی ہے، اور مدح وستائش کا اعتراف بھی، مگر ہر اعتراف واظہار جادۂ اعتدال کے دائرے میں اور ہر بات دلیل کے پیرایۂ میں یا عقل ومنطق کی کسوٹی پر پوری اتری ہوئی۔

کتاب کے پہلے باب کی نمایاں شخصیات میں امام شافعیؒ کا تذکرہ ہے، شیخ المحدثین شاہ محمد اسحاقؒ اور اورنگ زیب کے کارناموں کا تعارف ہے، شیخ الہندؒ کی علمی و دینی قیادت کی مختصر، مگر جامع تاریخ ہے، حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت شاہ وصی اللہؒ اور حضرت قاری طیبؒ کی حکمتوں، دانائیوں اور کارناموں کا بیانیہ بھی ہے۔

اس کتاب کا باب دوم خاص جامع فضائل وکمالات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ذات والا صفات سے تعلق رکھتا ہے، قاری اس جامع کمالات شخصیت کے بیکراں علم، فکر ونظر کی وسعتوں اور محبت وشفقت کے برتاؤ کو پڑھتے ہوئے مصنف کے جذبے کی صداقت، شعور کی بالیدگی، ایمان ویقین کی باطنی طاقت اور انداز بیان کے نورانی کیف کو محسوس کرتا ہے اور محظوظ بھی ہوتا ہے۔

باب سوم میں مؤلف گرامی نے ''چند اسلامی ادباء وشعراء'' کا تعارف جس فکری بلندی، جذبہ دُروں اور مؤثر ادیبانہ قلم کے ذریعہ کرایا ہے، اس سے تحریر کی سطر سطر فکر وفن ،ذوق جمالیات کا نمونہ بن گئی ہے، اس حصہ میں علامہ محمد اقبال کی انقلابی واصلاحی شاعری کا عالمانہ تعارف ہے، جگر مرادآبادی کے مقام ومرتبے کا تعین ہے، مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ کی تصنیفات میں سوانحی ادب کی درخشانی کی جھلکیاں ہیں، بچوں کے ادب میں حکیم شرافت حسین کی کاوشوں کا اظہار ہے، اور ذریعہ اظہار کے لئے جو انداز نگارش اپنایا گیا ہے، اس میں گرمیٔ گفتار ہے، فکر وبصیرت ہے اور اسلوبِ بیان کی حلاوت ہے۔

باب چہارم ''عالم اسلام کی جلیل القدر شخصیات'' میں علم وعمل اور فکر ونظر کی متعدد اور قدآور شخصیات کے درخشاں نقوش دکھائے گئے ہیں، ان میں سید قطب شہیدؒ، شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمودؒ اور پیکر علم وعمل علامہ عبدالعزیز بن بازؒ پر عمیق معلومات پیش کی گئی ہیں۔

باب پنجم ''چند محترم اور بزرگ شخصیات'' کی ایک طلائی زنجیر ہے، جس کی مختلف کڑیاں حسب ذیل ہیں:

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا

ابرار الحقؒ، مولانا مختار ندویؒ، مولانا معین اللہ ندویؒ، مولانا ابوالطیب فرنگی محلیؒ، مولانا محمد انظر شاہ کشمیریؒ، مولانا مجیب اللہ ندویؒ، پروفیسر وصی احمد صدیقیؒ، اور مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ۔

''والد محترم اور مشفق اساتذۂ کرام'' یہ ''قافلۂ علم وادب'' کا چھٹا باب ہے، جس میں آسمانِ علم وفضل وکمال کے گیارہ درخشاں ستارے شامل ہیں، یہ وہ اہل ایمان اور اہل دل ہیں، جو اس جہاں فانی میں صورت خورشید جیتے رہے ہیں، مصنف دام ظلہ نے علم کی دولت انہی سے حاصل کی ہے ان میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مصنف کے والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ ہیں نیز مولانا عبداللطیف نعمانیؒ، مولانا ظفیر الدین مفتاحیؒ، مولانا عبدالجبار اعظمیؒ، مولانا محمد اویس ندویؒ، مولانا شاہ حلیم عطاؒ، مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ، مفتی محمد سعید ندویؒ، مولانا ابوالعرفان ندویؒ، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ کا جامع تعارف شامل ہے۔

آخری باب میں ''چند باکمال رفقاء'' کے بارے میں قلم نے تصویر کشی کی ہیں، ان باکمال انسانوں میں سرفہرست محمد الحسنیؒ چند یادیں نیز ڈاکٹر محمد اجتباء ندوی کی یادیں، حافظ محمد اقبال اللہ کے جوار میں، مولانا حبیب الرحمٰن ندوی کچھ یادیں، کچھ باتیں، ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری، مولانا شفیق الرحمٰن ندوی، الحاج عبدالرزاق رصاصی، پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی، مولانا محمد عارف سنبھلی، مولانا محمد اظہر غوری ندوی، مولانا عبداللہ حسنی ندوی، مولانا ابراہیم وغیرہ مرحومین کا تذکرہ زیر بحث آیا ہے۔

یہ مصنف زادمجدہ کی بے مثال تواضع ہے کہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کو ''رفقاء'' اور عمدہ القاب عطا فرما کر اپنی رفاقت اور کریم النفسی کا ثبوت دیتے ہیں۔

کسی تصنیف کی اصل خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں مصنف بھی نظر آتا ہو اور جب آدمی کوئی تصنیف پڑھے تو صرف کتاب ہی کے بارے میں رائے قائم نہ کرے، بلکہ مصنف کے بارے میں بھی اظہار خیال کرے، خود راقم نے ایک جگہ لکھا ہے ''کسی بھی ادیب کا اسلوب اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، شاندار اسلوب شاندار کردار کا عکس ہوتا ہے، روشن ذہن، زندہ فکر اور جمالیاتی حس سے ایک زندہ اسلوب جلوہ گر ہوتا ہے، مولانا کی شخصیت علمی، فنی،

داخلی، خارجی ہر حیثیت سے ایک ایسے چمن سے عبارت ہے، جس کی آغوش میں ہزاروں گل ولالہ کی مہک ہے، اس سے مولانا کا اسلوب ''عطر مجموعہ'' بن گیا ہے''۔(خون جگر کے نقوش:۱۱۷)

''قافلہ علم وادب'' پر ان صفات وشرائط کا کلی انطباق ہوتا ہے اور مصنف کی شخصیت اپنے گوناگوں عناصر واوصاف سے ترکیب پائی ہوئی استاذ الاساتذہ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اڈیٹر البعث الاسلامی کی ہے، جو راسخ العلم، باعمل عالم دین، اور اردو عربی زبان وادب کے خطیب وادیب، انشاء پرداز ونثر نگار، مصنف اور داعی ومبلغ ہیں، قائد ورہنما ہیں، مدیر ومنتظم اور جوہر شناس ہیں۔

حضرت مؤلف اس سرزمین اور اس خانوادۂ علم سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں کا ہر ذرہ نیر تاباں بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک شخص قلم پکڑنا نہیں جانتا، پکڑتا ہے تو اس کا بوجھ اٹھا نہیں پاتا، وہی قلم لپک کر مولانا کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ اور ایسا چمٹتا ہے کہ جدا ہونا نہیں چاہتا۔

کسی جرمنی فلسفی کا مقولہ ہے: ''بڑا آدمی وہ ہے جس کا کوئی وقت ضائع نہ ہوتا ہو''، مولانا کا ہر لمحہ سونے سے زیادہ قیمتی ہے، حاشا وکلا جو کوئی وقت مفید اور نفع بخش عمل سے خالی گزرتا ہو، مولانا کی کامیابیوں کے عناصر میں اوقات کی تنظیم کو بڑا دخل ہے۔

مولانائے محترم نے بہت کچھ لکھا اور قلم کا صحیح استعمال کیا ہے، ان کے سب تحریری سرمائے مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آجائیں تو لوگوں کی حیرت ومسرت کا باعث بنیں، ''قافلہ علم وادب'' اس کتاب زیست کا ایک باب ہے، اور تابدار زندگی کا محض ایک درِ آبدار ہے۔

مولانا کی فکر میں بڑی ہمہ جہتی وجامعیت ہے، موضوع جو بھی اپنائیں، اسلام کی صداقت، اس کے دوام وخلود پہ یقین محکم اور اسے پیکر عمل میں ڈھالنے کا جذبہ درد بن کر ٹپکتا رہتا ہے۔

مولانا کے اسلوب میں بڑی سادگی اور پرکاری ہوتی ہے، قوت تفہیم ایسی کہ کوئی بات فہم سے بالا نہیں ہوتی، مولانا لفظوں کو چباتے نہیں، نہ ہی بتکلف جملوں کو سنوارتے ہیں،

آپ کی تحریر بے ساختگی میں، خوش مذاقی اور رفتگی و شگفتگی میں فطری جمالیاتی حس کا آمیختہ ہوتی ہے۔ آپ کے طرز انشاء میں سلاست کے ساتھ حلاوت، استواری و پائیداری کے ساتھ حرکیت و عملیت کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔

قدرت نے دانائی اور بصیرت، دین وملت کی دردمندی کی دولت سے خوب نوازا ہے، چونکہ ۴۸/سال اپنے شیخ ومربی، مشفق ومعلم، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شفقتوں اور معرفت آگاہی کے خنک بار سایہ میں رہے، اس لئے آپ ایک کہنہ مشق ادیب، نباض صحافی اور ایک جہاں دیدہ عالم دین ہیں، اس کے لئے البعث الاسلامی کے اداریئے کی شہادت کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ الکتاب نازل فرمائی، دوم برگزیدہ انسانوں کی شکل میں اسوہ ونمونہ دے دیا، قافلہ علم وادب کے مصنف نے جن مایہ ناز ہستیوں پر قلم کے جوہر دکھلائے ہیں، وہ یقیناً بعد والوں کے لئے نمونہ بنیں گے اور اس کی روشنی میں راہ عمل کے تعین میں مدد ملے گی۔

حضرت مؤلف نے اس کم علم کو اس کے چھوٹے منہ سے بڑی بات کہلوانے کا موقع دے کر اپنی بڑائی اور خورد نوازی کا ثبوت دیا ہے...... اللہ تعالیٰ ''قافلۂ علم وادب'' کو سرچشمۂ فیض رحمت واستفادہ بنائے اور حضرت ممدوح وموصوف کا سایہ عاطفت ہمارے اور امت اسلامیہ کے سروں پر تادیر قائم رکھے، یہ وقیع تصنیف یقیناً قبول عام حاصل کرے گی، اور مشعل راہ کا کام دے گی۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

مخلص

محمد علاء الدین ندوی

(استاذ ادب، ووکیل کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابھا، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

۱۷/۲/۱۴۳۷ھ

۳۰/۱۱/2015ء

باب اول

چند مایہ ناز شخصیات

امام شافعیؒ اور ان کی فقہی خدمات

امام شافعیؒ محمد بن ادریس ۱۵۰ھ اسلامی تاریخ کی دوسری صدی میں غزہ فلسطین یا عسقلان میں پیدا ہوئے، ان کی ولادت سے متصل حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کی وفات ہوئی، اور کبار تابعین میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کا فقہی منہج بڑی حد تک شہرۂ آفاق ہو چکا تھا، اور لوگ اس کی اتباع کرتے تھے، وہ دور نبوت سے قریب تر تھے، اور تعامل اہل حرمین اور علمائے حدیث اور کتاب وسنت کی روشنی میں فقہ اسلامی کے مسائل مدون کرنے کی خداداد صلاحیت سے بہرہ ور تھے، انہوں نے حضرت مالک بن انسؒ کی فقہ سے بھی پوری طرح استفادہ کیا، اور مسائل کو پیش کرنے میں وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابۂ کرام کے قول وفعل کو پیش نظر رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے فقہی مسلک کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور دنیا کے ایک بڑے حصے میں اسی پر عمل کیا گیا، اور اس کو ترجیح دینے کی کوشش جاری رہی۔

امام شافعیؒ کے والد ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع تھے، ان کا نسب ہاشمی ہے، اور وہ ہاشم بن عبدالمطلب بن عبد مناف کی طرف نسبت رکھتے تھے، ان کے اجداد میں شافع بن صائب تھے، اور غالباً انہیں کی نسبت سے شافعی کہلاتے ہیں، ان کا اصل نام محمد اور کنیت ابو عبداللہ ہے، ان کے والد ادریس بن عباس اصلاً حجاز کے باشندے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، وہاں سے ہجرت کر کے شام آئے اور عسقلان میں سکونت اختیار کی، لیکن امام شافعیؒ کی ولادت سے قبل وہ انتقال کر گئے، ان کی والدہ قبیلہ ازد کی رہنے والی ایک شریف خاتون تھیں، اور ان کے والد کے انتقال کے بعد اپنے بیٹے محمد بن ادریس کو لے کر مکہ مکرمہ ہجرت کر گئیں، اور حرم مکی کے قریب ایک محلہ میں جس کا نام ”شعب الخیف“ تھا، قیام پذیر ہو گئیں، اور

اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت میں پوری طرح مشغول ہوگئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام شافعیؒ ۷ یا ۸ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوگئے، اور اس کے بعد مسجد حرام کے ایک مدرسہ میں داخل ہوکر علوم لغت پر توجہ مرکوز کی، اور اس میں مہارت حاصل کی، چونکہ وہاں کے اساتذہ بادیہ کے رہنے والے تھے، اس لئے خالص عربی لہجہ میں عربی زبان کو حاصل کرنے کا ان کو بہترین موقع ملا، اسی کے ساتھ انہوں نے فقہ اور علوم قرآن وحدیث کو بھی حاصل کیا۔

پھر انہوں نے حرم شریف کے علماء کی مجلسوں میں بیٹھ کر علوم حدیث وقرآن میں استفادہ کرنا شروع کیا، حدیث میں ان کے شیخ سفیان بن عیینہ، مسلم بن خالد زنجی، سعید بن سالم قداح، داؤد بن عبدالرحمٰن عطار، عبدالمجید بن عبدالعزیز بن أبی رواد تھے، مسجد حرام میں ایک حد تک اپنی تعلیم پوری کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اور وہاں جاکر امام مالک بن انسؒ سے سارے علوم اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، ان کے شیوخ میں وہاں ابراہیم بن سعد الأنصاری، عبدالعزیز بن عمر الدراوردی اور محمد بن سعید بن أبی فدیک اور عبداللہ بن نافع الصائغ قابل ذکر ہیں، اس کے بعد انہوں نے یمن کا رخ کیا، وہاں انہوں نے حدیث اور فقہ کی تعلیم مطرف بن مازن، اور ہشام بن یوسف سے، جو صنعاء یمن کے قاضی تھے، حاصل کی اور انکے علاوہ دیگر شیوخ وقت سے استفادہ کیا، پھر عراق تشریف لے گئے، اور بغداد میں علم حدیث وفقہ اور علوم قرآن کو مزید تفقہ اور گہرائی کے ساتھ ازسرنو وہاں کے مشہور علماء سے حاصل کیا، وہاں کے شیوخ وکیع بن جراح، اور ابوأسامہ حماد بن اسامہ جو کوفہ کے رہنے والے تھے، اور بصرہ کے مشہور عالم کبیر اسماعیل بن علیہ اور عبدالوہاب بن عبدالمجید تھے، ان سے بھی استفادہ کیا، اس تعلیم وتربیت کے بعد محمد بن ادریس شافعی اب امام شافعی کے لقب سے پہچانے جانے لگے۔

امام شافعیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ''کتاب الأم'' ہے اس کا ایک جائزہ درج ذیل ہے:

امام شافعیؒ نے علمائے حدیث وفقہ کی ایک تعداد سے تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے فقہی مذہب کو پورے اطمینان قلب کے ساتھ پیش کرنے کے لائق اپنے آپ

کو تصور کیا، اور انہوں نے اپنی مشہور عالم تصنیف ''کتاب الأم'' تصنیف کی، اس کتاب میں فقہی مسائل کو بیان کرنے میں کتاب وسنت کا سہارا لیا، کتاب الطھارۃ سے اس کو شروع کیا، جس میں پانی کی طہارت، پھر وضو کے سلسلہ کے تمام مسائل، پھر مسافر و مقیم کے لئے تیمّم کی شکلیں، جس مٹی سے تیمّم کیا جائے، اس کی شرط، جسم اور کپڑوں کی طہارت کے سلسلے میں ساری تفصیلات بیان کی ہیں، طہارت کے سلسلے میں کچھ ایسے مسائل ہیں، جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں ان کو بھی بالتفصیل ذکر کیا ہے۔

پھر نماز کی فرضیت، پانچوں نمازوں کی تعداد، نماز کے اوقات، مختلف قسم کی نوعیتوں میں نماز کا حکم، سفر میں نماز کے وقت کی تعیین اور اس کے تمام مسائل، مریض و مسافر کی نماز اور جمع بین الصلاتین کے جملہ مسائل۔

اسی طرح اذان کی فضیلت، اس کے اوقات، جمع بین الصلاتین کی صورت میں اذان واقامت، پھر نماز میں لباس کی نوعیت، اور نماز کن جگہوں میں پڑھنے کی اجازت ہے، اس کا بالتفصیل ذکر، یہاں تک کہ کعبہ مشرفہ میں نماز پڑھنے کی کیفیت، نماز کا افتتاح تعوذ وتسمیہ سے کرنا، آمین کہنا، اور سورۂ فاتحہ کے بعد کی قراءت، رکوع میں کس طرح جانا چاہئے، رکوع سے کس طرح اٹھنا چاہئے، کس طرح سجدہ کرنا چاہئے، ان تمام چیزوں کی تفصیلات، دو رکعتوں کے بعد قعدہ پھر قیام، نماز میں سلام، نماز میں گفتگو کی مخالفت، سلام کے بعد امام کا بیٹھنا، اور کسی موضوع پر گفتگو کرنا، امام اور مقتدی کا مسجد سے واپس جانا، سجدۂ سہو، سجدۂ تلاوت وشکر، نفلی نماز، ایک رکعت سے وتر بنانا، جن اوقات میں نماز مکروہ ہے، اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، جماعت سے نماز کی فضیلت، کس کو امامت کرنی چاہئے، مرد عورتوں کی امامت کرسکتا ہے یا نہیں، عورت کی امامت، نابینا کی امامت، ناجائز اولاد کی امامت، بچہ کی امامت، ایسے شخص کی امامت جس کی قراءت صحیح نہ ہو، اسی طرح امامت کے تمام مسائل پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

جمعہ کی فرضیت، گاؤں میں جمعہ کی نماز کا مسئلہ، گھر میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا مسئلہ، کسی مصلی کے دو مسجدوں میں نماز پڑھنے کی صورت، اور اس کا حکم، جمعہ کے لئے جامع مسجد میں پہلے پہونچنے کی فضیلت، جامع مسجد تک چل کر جانے کی صورت، جمعہ کے دن حالت خطبہ میں سنت پڑھنے سے متعلق حکم، کہاں کھڑے ہوکر خطبہ دینا چاہئے، خطبہ کے آداب، خطبہ کی مستحب کیفیت، حالت خطبہ میں گفتگو کی کراہت، خطبہ کو غور سے سننا، جمعہ کے دن مسجد میں مصلیوں کا گوٹا مار کے بیٹھنا، قراءتِ جمعہ میں دعائے قنوت کا مسئلہ، غرض یہ کہ جمعہ کے تمام جزئی اور تفصیلی مسائل کا پورا ذکر، اسی طرح صلاۃ الخوف کی رکعتوں کی تعداد، صلاۃ الخوف میں نماز کا قصر، عیدین کی نماز کے جملہ مسائل، کسوف کی نماز کا وقت اور اس کا خطبہ، استسقاء کی نماز اور اس کا طریقہ، صلاۃ الاستقساء کے خطبہ میں امام کو کس طرح اپنی چادر پلٹنی چاہئے، بارش کے آثار دیکھ کر خاموش رہنے کی کیفیت، صلاۃ الاستقاء چھوڑنے والے کا حکم، جنازہ کی نماز اور اس کا طریقہ، میت کو غسل دینا اور اس کی تجہیز وتکفین، شہید کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے، مسلمانوں کے شہداء کا کفار کے مردوں سے اختلاط کا مسئلہ، جنازہ اٹھانے کا طریقہ، جنازہ کی نماز اور اس میں کتنی تکبیریں ہوں، میت کو کس طرح قبر میں رکھنا چاہئے، دفن کرنے کے وقت کیا پڑھنا چاہئے، میت کے جملہ مسائل کا تذکرہ۔

کتاب الأم کی پہلی جلد کتاب الجنائز پر مکمل ہوتی ہے اور دوسری جلد کتاب الزکاۃ سے شروع ہوتی ہے، فرضیت زکوۃ کے ساتھ جانوروں کی زکاۃ کا ذکر بالتفصیل موجود ہے، زکاۃ کے نکالنے میں نیت ضروری ہے، یتیموں کے مال میں زکوۃ دینے کا مسئلہ، اسی طرح سے کھجور، انگور اور زراعت اور دیگر پیداوار کی زکوۃ دینے کا ذکر، مال تجارت میں زکوۃ کا طریقہ، زکوۃ فطر کب ادا کی جائے گی، صدقات کی تقسیم کا بیان، اس کی تمام جزئیات کے بارے میں مفصل بیان، روزہ کا بیان اور اس کی تمام قسموں کا ذکر، اعتکاف کا مسئلہ، حج کی فرضیت، اور جن لوگوں پر حج فرض ہوتا ہے، ان کی قسمیں، کسی مرحوم کی طرف سے حج کرنے کا مسئلہ، حج

کے لئے قرض لینے کا مسئلہ، غلام اور عورت کا حج، اس بارے میں ائمہ کا اختلاف، وہ کون سی حالت ہے، جس میں حج بدل کرنا صحیح ہے، اور وہ کون شخص ہے جو حج بدل نہیں کر سکتا، احرام اور مناسک حج وعمرہ کی تفصیلات، سرزمین حرم کی اہمیت، تلبیہ کے الفاظ، اور اس کا استحباب، حجر اسود کا بوسہ لینا، اور اس کے لئے دعا پڑھنا، زحام کی حالت میں حجر اسود کے استلام کا طریقہ، طواف کی فضیلت اور اس کے مسائل، احرام کی حالت میں کون سا شکار ممنوع ہے۔

ارکان اسلام کی جزئیات اور ان کی تفصیلات، ان کے مسائل وفتاویٰ کے ساتھ ساتھ، اس کے علاوہ اور بھی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو بھی امام شافعیؒ نے اپنی کتاب جس کی نسبت ماں کی طرف ہے، میں پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ شامل کیا ہے۔

امام شافعیؒ اور فقہ مقارن:

اب نمونے کے طور پر چند ایسے مسائل جس میں امام شافعی اور دیگر ائمہ کے درمیان کچھ اختلاف ہے، مثلاً تارک الصلاۃ کے بارے میں امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ وہ کافر یا مرتد نہیں ہوتا، لیکن اس پر حدِ قتل جاری ہوگی، امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسے تارک الصلاۃ کو تین دن قید میں رکھ کر مہلت دی جائے گی، اگر وہ اس درمیان توجہ کر کے نماز شروع کر دے تو بہتر ہے، ورنہ اس کو اتنے کوڑے لگائے جائیں، جس کی وجہ سے اس کے جسم سے خون جاری ہو جائے۔ نفل عبادت کے بارے میں امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس کو شروع کرنے کے بعد پایۂ تکمیل پہونچانا ضروری ہے، اگر دوران عبادت کسی عذر کی بنا پر وہ فاسد ہو جائے، تو اس کی قضا کرنا واجب نہیں ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک اس کی قضا واجب ہے، اس کی دلیل دونوں اماموں کے پاس موجود ہے۔ زکوۃ کے بارے میں امام شافعیؒ، امام مالک کا قول یہ ہے کہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا جائز نہیں، لیکن امام ابوحنیفہؒ اور دیگر ائمہ، زکوۃ کو ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنا جائز قرار دیتے ہیں، دونوں اماموں کے پاس دلیل موجود ہے۔ ماء مستعمل کے بارے میں امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ وہ طاہر ہے،

لیکن مطہر نہیں ہے، حنفیہ کا بھی اس پر فتویٰ ہے۔ سمندر کے پانی سے وضو کرنے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، لیکن سمندر کے جانور کے بارے میں امام مالکؒ کا قول ہے کہ سوائے خنزیر کے سمندر کے تمام جانور حلال ہیں، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سوائے مینڈک کے تمام بحری جانور حلال ہیں، امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کہ سمندر کے جانوروں میں صرف زندہ مچھلی حلال ہے، اگر وہ سمندر کے اندر مرگئی ہو اور سطح آب پر آجائے تو حرام ہے۔ باقی سارے بحری جانور حرام ہیں، برتن کی پاکیزگی کا مسئلہ بایں طور کہ اگر کتے نے منہ ڈال دیا تو کتنی بار دھونا ضروری ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سات بار دھونا ضروری ہے اور ایک مرتبہ اس میں مٹی لگا کر دھونا ضروری ہے، امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ کتے کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو تین مرتبہ دھونا واجب ہے، اور سات مرتبہ دھونا مستحب ہے۔

استنجاء بالید الیمنیٰ: داہنے ہاتھ سے استنجاء پاک کرنا مکروہ تنزیہی ہے، تقریباً یہی خیال امام ابوحنیفہؒ کا بھی ہے، وہ مکروہ تحریمی قرار دیتے ہیں، بلا عذر کھڑے ہو کر (استنجاء) پیشاب کرنے میں امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ مکروہ تنزیہی کے قائل ہیں، اسی طرح حلال جانور کا پیشاب جس کا گوشت استعمال کیا جاتا ہو امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نجس ہے۔

عورتوں کے مسائل طہارت میں حیض ونفاس کے مسائل بھی اہمیت رکھتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی اقل مدت تین دن تین رات اور اکثر مدت دس دن ہے، لیکن امام شافعیؒ کا قول ہے کہ حیض کی اقل مدت ایک دن ایک رات ہے، اور اکثر مدت پندرہ یوم ہے، استمتاع بالحائض فوق الازار یا تحت الازار عورت کی شرم گاہ سے دور رہ کر ائمہ ثلاثہ، امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ کے ہاں جائز ہے، دیگر ائمہ کا بھی یہی خیال ہے۔

زکوۃ میں امام شافعیؒ کے نزدیک سونے چاندی کے زیورات میں زکوۃ نہیں ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زیورات کی زکاۃ بھی واجب ہے، مال یتیم میں امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ کے نزدیک زکوۃ واجب ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مال یتیم میں زکوۃ نہیں ہے۔

فقہ شافعی کی تدریس: چند تجاویز

فقہ شافعی کے اس مختصر جائزہ کے بعد شاید یہ عرض کرنا مناسب ہو کہ ہندوستان کے تمام مدارس اسلامیہ میں فقہ اسلامی کی تدریس کے نصاب میں امام شافعیؒ کا فقہی مسلک ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے پڑھانا فقہ میں مہارت اور جامعیت پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے، لہذا مفتی کو ایک ماہر فن کی حیثیت سے ایسی تربیت دی جائے کہ وہ فقہ اسلامی اور ائمہ اربعہ کے مذاہب فقہیہ سے پوری طرح واقف ہو، اور ائمہ فقہ کے اختلاف اور ان کے استدلالات پر وہ پوری طرح حاوی ہو، بلا شبہ ہدایہ فقہ اسلامی کی ایک جامع کتاب ہے، لیکن اس میں ایک فقہی مسلک کو بیان کرنے اور اس کو راجح وغالب بنانے کی بھرپور کوشش مصنف کی طرف سے ہے، موجودہ دور میں زندگی کے حالات اور تقاضے اور ان کے فقہی حل اور جواز کی ضرورت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، ایسے میں مسائل کا حل اگر ایک ہی مسلک میں تلاش کیا جائے، تو دشواری اور بعض حالات میں مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، بہت سے تمدنی اور اجتماعی مسائل ایسے بھی ہیں، جو کسی ایک مسلک میں پوری وضاحت کے ساتھ نہیں پائے جاتے، لیکن دوسرے مسلک میں ان مسائل کا اطمینان بخش جواب موجود ہوتا ہے۔

چونکہ فقہ حنفی زندگی کے وسیع رقبہ پر حاوی ہے، اور امام شافعیؒ کے فقہی مسلک سے مقدم ہے، اس لئے اس کے ماننے والے روئے زمین کے ایک بڑے حصہ میں پائے جاتے ہیں، اس کے باوجود تغیر پذیر دنیا میں بہت سے ایسے حالات کا سامنا ہے، جہاں دوسرے ائمہ فقہ کی آراء وافکار سے قیمتی مدد ملتی ہے، خاص طور سے حضرت امام شافعیؒ کے مسلک میں ایک قسم کا لوچ اور کشش پائی جاتی ہے، شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے وہ علماء جو تقلید کے قائل نہیں ہیں، فقہ شافعی کی روشنی میں اپنی ترجیحات کو متعین کرتے ہیں، خاص طور سے فاتحہ خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر، اور قعدۂ صلاۃ اور وتر بیک رکعت ادا کرنے کے مسائل کو پیش نظر رکھتے ہیں، اسی طرح زکاۃ کی تفصیلات میں اور حج کے بعض مسائل میں امام شافعیؒ کے بتائے ہوئے فقہی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

فقہ اسلامی میں تقابلی مطالعہ کا اہتمام بھی ضروری ہے، ائمہ اربعہ کے علاوہ اور دوسرے اماموں کے فقہی مسالک کو پیش نظر رکھنے اور جدید پیدا شدہ زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈھنے میں آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اور وقت کی بچت بھی آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے، اس بنا پر میری ناقص رائے ہے کہ برصغیر کے مدارس اسلامیہ کے اندر فقہ اسلامی کے تقابلی درس و مطالعہ کا اہتمام کرنا ہر لحاظ سے مفید ہے، اس طریقہ کو اختیار کرنے میں بظاہر کوئی قباحت یا کسی فقہی مسلک یا کسی فقیہ و امام کی تنقیص کا ہرگز کوئی امکان نہیں ہے، اس لئے کہ فقہ کا تعلق کتاب وسنت کی باریکیوں اور اس کی گہرائیوں سے ہے، اور ہر امام کتاب وسنت ہی سے اپنے فقہی مسلک پر استدلال کرتا ہے۔

فقہ واصول فقہ کی تدوین اور امام شافعیؒ کی اولیت :

سب سے پہلے امام شافعیؒ نے فقہ اسلامی کی تدوین کا بیڑا اٹھایا، ان کے دل میں من جانب اللہ یہ بات آئی کہ وہ اصول فقہ کے قواعد کی تدوین کریں، یہی قواعد دراصل علم فقہ کی بنیاد ثابت ہوئے اور علمائے فقہ نے اس سے زبردست استفادہ کیا، ابن خلدون نے تمام علمائے امت کا اجماع نقل کیا ہے کہ اصول فقہ کے قواعد کی تدوین کے بارے میں امام شافعیؒ سب سے پہلے امام ہیں، جن کے ذریعہ یہ عظیم خدمت انجام پذیر ہوئی، اسی کے ساتھ یہ بات بھی صحیح ہے کہ اصول فقہ کے قواعد صرف امام شافعیؒ کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ ان سے قبل کے علماء، صحابہ کرامؓ، اور تابعین رضی اللہ عنہم کی زبانوں پر اصول فقہ کے قواعد جاری تھے، لیکن ان کو مدون کرنے کی عظیم خدمت سب سے پہلے امام شافعیؒ نے انجام دی۔

یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ کی فقہ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ انہوں نے اصول فقہ کے قواعد کے ذریعہ احکام کے استنباط کا کام انجام دیا ہے، اور جو بھی ان کی فقہی کتابوں کا مطالعہ کرے گا، بالخصوص کتاب الأم اور الرسالہ کا تو وہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شیخ المحدثین شاہ محمد اسحاق دہلویؒ

سب سے پہلے شجرۂ ولی اللّٰہی پر ایک نظر

اکثر مؤرخین اور اصحاب تراجم نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نسبت امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کی طرف کی ہے اور ان کو انھیں کی پشت کا امتداد قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ بن عبد الرحیمؒ کو ان کی ۳۴ویں پشت میں شمار کرایا ہے، لیکن یہاں ایک بہت بڑا مغالطہ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ سیدنا عمر بن الخطابؓ کی اولاد میں کسی کا نام محمد نہیں ہے ،جبکہ دیگر تمام مؤرخین نے بالاتفاق ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: ولی اللہ بن عبد الرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین بن قاسم بن قاضی بدھ (غالباً یوم الاربعاء مراد ہے) بن عبد الملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین بن شیر ملک بن محمد عطا بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم بن عادل بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ماھان بن ھمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب۔ اس میں امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کی اولاد میں محمد بن عبد اللہ کا ذکر آیا ہے، جب کہ عبد اللہ بن عمرؓ کے کسی بیٹے کا نام محمد نہیں ہے، اور تاریخ کے شواھد سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر بن الخطابؓ کے بارہ (۱۲) صاحبزادگان میں سے کسی کا نام عفان یا محمد نہیں (۱)، اور ان بارہ صاحبزادوں کی آنے والی پشت میں محمد کا کوئی فرد صاحب اولاد نہیں، کئی پشتوں کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمر کے ایک پڑپوتے کا نام محمد ہے

---

(۱) عبد اللہ بن عمرؓ کے بارہ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں: ابوبکر، ابوعبیدہ، واقد، عبد اللہ، عمر، عبد الرحمن، سالم، عبید اللہ، حمزہ، بلال، ابوسلمہ، حفظہ، سودہ، عائشہ، قلابہ (الطبقات الکبریٰ مؤلفہ ابن سعد ج۴/۱۴۲، بیروت، ۱۴۰۵ھ)

اوران کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا گیا ہے: محمد بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر بن الخطابؓ، یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار کرنا ناممکن ہے، یہیں سے شجرۂ ولی اللہی کی نزاہت محل نظر ہے اوراسی طرح ان کی کسی پشت میں ان کے وطن اصلی کا ذکر نہیں ہے، اس لئے آج تک یہ مسئلہ حل نہ ہوسکا کہ شاہ ولی اللہؒ کے کون سے جدامجد کس خطۂ ارض سے ہندوستان تشریف لائے تھے، صرف قیاس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تاتاریوں کے حملے کے بعد جب بہت سے اہل علم ومعرفت عراق، ایران اور ترکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے، اسی موقع پر شاہ ولی اللہؒ کے کوئی جدامجد ہندوستان ہجرت کر کے آئے ہوں گے، لیکن کسی مؤرخ کو یہ نہیں معلوم کہ ان کے کون سے جدامجد کب اور کس جگہ سے ہندوستان آئے، یہ ایک ایسا معمہ ہے جس کا حل کرنا کسی طرح ممکن نہ ہوسکا، اس لئے قطعی طور پر ان کی نسبت فاروق اعظم عمر بن الخطابؓ کی طرف اور پورے یقین کے ساتھ کرنا، علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے میل نہیں کھاتی، کسی تاریخی ذریعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تاتاریوں کے سیلاب میں اس خاندان کا کوئی فرد ہجرت کر کے ہندوستان آیا تھا اور نہ کسی مؤرخ نے اُس ملک یا شہر کی تعیین کی ہے، جہاں سے ہجرت کا کوئی عمل شروع ہوا تھا۔

شاہ ولی اللہؒ کی باکمال اولاد واحفاد

اللہ تبارک وتعالی نے شاہ صاحب کو پانچ عالم باعمل بیٹے عطا فرمائے تھے، پہلی شادی جو کم عمری یعنی ۱۴ سال کی عمر میں آپ کے ماموں شیخ عبید اللہ صدیقی پھلتی کی صاحبزادی سے ہوئی، ان کے بطن سے سب سے پہلے صاحبزادہ شیخ محمد پیدا ہوئے، وہ شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر اور تعلیم وتربیت سے آراستہ ہونے کے بعد قصبہ بڑھانہ میں منتقل ہوگئے اور وہیں ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی، پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد دوسری شادی سونی پت کے سید ثناء اللہ صاحبؒ کی صاحبزادی۔ جو ''ارادت'' کے نام سے مشہور تھیں ۔سے ہوئی اوران کے بطن سے آپ کے چار مشہور زمانہ فرزند پیدا ہوئے، شاہ عبدالعزیزؒ،

شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر، شاہ عبد الغنی، جو اس ملک میں علوم اسلامیہ اور قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح اور علم حدیث کے علمبردار شمار کئے گئے۔

شاہ عبد العزیز دہلوی کی اولاد

تاریخی شہادت کے مطابق شاہ صاحب کی شادی مولوی نور اللہ بڑہانوی کی صاحبزادی سے ہوئی اور ان کے بطن سے ۳ لڑکیاں تولد ہوئیں اور وہ تینوں کم عمری کے باوجود شاہ صاحب کی زندگی ہی میں وفات پا گئیں، بڑی صاحبزادی کا عقد شاہ رفیع الدین کے صاحبزادہ مولوی محمد عیسی سے ہوا، دوسری بیٹی کا عقد مولوی محمد افضل لاہوری سے ہوا، انہیں سے ۲ فرزند شاہ محمد اسحاقؒ اور شاہ محمد یعقوبؒ تولد ہوئے، شاہ صاحب کی تیسری صاحبزادی کا نکاح مولوی عبد الحی بڑہانوی سے ہوا جو شاہ صاحب کی اہلیہ کے بھتیجے تھے، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور ان کا انتقال بھی شاہ صاحب کی زندگی میں ہو گیا۔

شاہ محمد اسحاق دہلویؒ

شاہ محمد اسحاق دہلویؒ شاہ عبد العزیز کے بڑے نواسے اور ان کے خلیفہ وجانشیں تھے، ان کی تاریخ ولادت ۶ ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ ہے، وہ خاندان ولی اللہی کے آخری اور عظیم رکن شمار کئے جاتے ہیں، ان کو درس حدیث کا خاص ذوق عطا ہوا تھا، اور ایک عظیم محدث کی حیثیت سے متعارف ہوئے، مسند تحدیث پر بیٹھنے کے بعد طالبان علوم نبوت آپ سے حدیث پڑھنے اور اس کی اجازت حاصل کرنے کے لئے ہر طرف سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور علم حدیث میں ان کا دائرہ فیض بہت وسیع ہوا، حجاز مقدس میں حدیث کی درس وتدریس کی خدمت کے ساتھ وہاں کے محدث وقت شیخ عمر بن عبد الکریم سے اجازت حدیث حاصل کی، ۲ سال تک حجاز مقدس میں قیام کے دوران خود بھی بہت سے علماء کو حدیث کی اجازت دی اور افادہ واستفادہ کا سلسلہ جاری رکھا، حجاز سے واپسی کے بعد تقریبا ۱۶ سال تک درس حدیث کے ساتھ ارشاد وافتاء کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام

دیئے، ۱۲۵۸ھ میں مکہ معظمہ کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں عبادت واطاعت کے ساتھ ساتھ درس حدیث اور اصلاح باطن کا مشغلہ جاری رکھا اور جوار حرم میں ۴ سال اور چند ماہ قیام کرنے کے بعد ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں مکہ مکرمہ میں انتقال فرمایا اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے قبر مبارک کے جوار میں مدفون ہوئے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران بھی تدریس حدیث میں مشغول رہے اور وہاں علماء کی ایک بڑی تعداد اس سرچشمۂ حدیث سے سیراب ہوئی۔

شاہ صاحب کی علمی یادگار میں حدیث کی مشہور کتاب ''مشکوۃ المصابیح'' کا اردو ترجمہ اور فارسی رسالہ شعب الإیمان (قلمی) ہے۔

ہندوستان میں شاہ صاحبؒ کے جلیل الشان مشہور تلامذہ

محدث جلیل شیخ عبدالغنی بن ابوسعید عمری دہلوی مہاجر مدنیؒ، محدث شہیر سید نذیر حسین میاں بن جواد علی حسینی دہلویؒ، عالم جلیل شیخ عبدالرحمان بن محمد انصاری پانی پتیؒ، شیخ عالم علی مراد آبادیؒ، شیخ عبدالقیوم بن عبدالحی بڑہانویؒ، شیخ قطب الدین بن محی الدین دہلویؒ، مولانا شاہ محمد یعقوب (آپ کے برادر حقیقی)، شاہ محمد عمر بن سیدنا محمد اسماعیل شہیدؒ، مولوی کرامت علی اسرائیلیؒ، سید عبدالخالق دہلویؒ، مولوی صبغت اللہؒ (والد ماجد قاضی محفوظ پانی پتی)، مولوی یار علیؒ، مولوی محمد ابراہیم نگر نہسویؒ، شیخ محمد تھانویؒ، مولوی علی احمد ٹونکیؒ، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ مفتی عنایت احمد کاکورویؒ، مولوی محمد حازمی عربیؒ، مولوی محمد سبحان بخش شکار پوریؒ، مولوی عبداللہ سندھیؒ، مولوی گل کابلی، مولوی نور علی سہسراویؒ، مولوی محمد فاضل سورتیؒ، مولوی بہاء الدین دکھنیؒ، قاری حافظ کرم اللہ دہلویؒ، مولوی نور الحسن کاندھلویؒ، مولوی نصیر الدینؒ، مولوی عبدالقیوم بھوپالیؒ، مولوی نوازش علی دہلویؒ، مولوی رستم علی خانؒ، مولوی احمد علی سہارنپوریؒ (محشی الجامع الصحیح للبخاری)، نواب صدر الدین خان دہلویؒ، مولوی عبدالرشید مجددیؒ، حافظ مظہر علی کاکورویؒ، مولوی امداد العلیؒ (امروہہ)، مولوی احمد اللہ انامیؒ (استاد مولانا

سخاوت علی جونپوریؒ)، سید شاہ محی الدین عبداللطیف معروفؒ بقطب ویلور، منشی جمال الدین ؒ (مدارالمہام ریاست بھوپال)، سرسید احمد خانؒ مولانا محمد عرف جھاؤ۔

شاہ صاحبؒ کے بارے میں علمائے عظام کی شہادت

شیخ شمس الحق ڈیانوی نے اپنی کتاب ''تذکرۃ النبلاء'' میں تحریر کیا ہے کہ: ''شاہ محمد اسحاقؒ کا جب انتقال ہوا تو ان کا غسل شیخ عبداللہ سراج مکیؒ نے دیا، اور فرمایا کہ شیخ ابھی زندہ رہتے اور میں ان سے حدیث کی کتابیں پوری عمر پڑھتا رہتا، تب بھی میں ان کے درجہ تک نہ پہونچ پاتا''۔ شاہ اسحاقؒ کے شیخ اور استاد شیخ عمر بن عبدالکریم مکی، علم حدیث اور رجال حدیث میں ان کے درجۂ کمال اور علو مرتبت کی گواہی دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالی نے ان کے نانا شیخ عبدالعزیز کی برکت اتار دی ہے، شیخ عبدالعزیزؒ تحدیث نعمت کے طور پر اکثر یہ آیت پڑھا کرتے تھے: الحمد لله الذي وهب لي على الكبر إسماعيل وإسحاق، اور محدث جلیل شیخ نذیر حسین میاں فرماتے تھے کہ میں نے ان سے بہتر کسی عالم کی صحبت نہیں اختیار کی اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

برائے رہبریٔ قوم فساق
دوبارہ آمد اسماعیل و اسحاق

شاہ صاحبؒ کے مواعظ اور ان کے اثرات

شاہ محمد اسحاقؒ کے مواعظ نہایت مؤثر اور رگ و ریشے میں اتر جانے والے ہوا کرتے تھے، ان کی مجلس وعظ میں بیشمار لوگ شریک ہوا کرتے تھے، باہر مردوں کا انتظام ہوتا اور اندر عورتیں جمع ہوتی تھیں، ان میں ہر طبقے کے مرد وعورت حاضر ہو کر فیض حاصل کرنے کی سعادت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، اس سلسلہ میں سرسید احمد خاں مرحوم کا بیان ہے:

''میں شاہ (اسحاق) صاحب کے وعظ میں حاضر ہوتا، باہر مردوں کا

ہجوم ہے، زنانہ میں عورتیں جمع ہیں، ڈولیوں کا شمار، نہ پالکیوں کی گنتی، محلات شاہی کی بیگمیں تک حاضر ہوتیں، امراء کے یہاں سے مکلف کھانوں کی ڈیگیں کہاروں کے کندھوں پر لدی چلی آرہی ہیں، صاحبزادی حاضر ہوکر عرض کرتی ہیں: حضرت جی! کھانے آگئے، فرماتے تقسیم کردو، زنانہ حلقہ وعظ میں سے عورتیں اپنے اپنے برتن پیش کرتی ہیں، سب سے پہلے طلباء کے لئے کھانا بھیجا جاتا، پھر عورتوں کو بٹتا، اس پر بھی بچ رہتا تو صاحبزادی عرض کرتیں، حضرت جی کچھ کھانا بچ گیا ہے، فرماتے بیٹی! ہمارے لئے نہیں بچا، اسے رہنے دو۔"

شاہ صاحبؒ خود معمولی چپاتی، یخنی کا سا شوربہ، گاڑھے کے دسترخوان پر رکھ کر تناول کرتے، میں نے ان کا سا کھانا کسی کو کھاتے نہ دیکھا، گردونواح کی محتاج عورتیں آجاتیں اور اس بے فکری سے دولت کدہ پر ہفتوں رہی آتیں، گویا باوا کے گھر میں آگئی ہیں، جب خود ہی جی چاہتا رخصت ہوتیں محتاج عورتوں کی اسی طرح کی مہمان داری مکہ مکرمہ میں بھی جاری رہی"(۱)

شاہ محمد اسحاقؒ اور مدرسہ رحیمیہ

تقریباً ۱۱۱۲ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد امجد شاہ عبد الرحیم نے "مہدیوں" میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، بعد میں اس کا نام "مدرسہ رحیمیہ" رکھا گیا اور اسی مدرسہ میں شاہ صاحب اور ان کے فرزندان اعلیٰ مرتبت نے تعلیم حاصل کی، اور پھر وہیں مسند حدیث بچھائی، اس مدرسہ میں شاہ عبد العزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبد القادرؒ، شاہ عبد الغنیؒ، شاہ اہل اللہؒ، شاہ محمد عاشقؒ، شاہ محمد اسماعیلؒ، شاہ محمد اسحاقؒ، شاہ عبد الغنی مجددیؒ اور میاں نذیر حسین دہلویؒ اور دیگر حضرات نے فیض حاصل کیا اور حدیث کے مستند علماء شمار کئے گئے، شاہ صاحب کے بعد یہ مدرسہ ۱۱۵۱ھ-۱۱۶۱ھ کے دوران "مہدیوں" سے "کلاں محل" منتقل کردیا گیا، اور اس کو شاہ عبد العزیزؒ نے مرکز درس وارشاد بنایا، پھر ان کے جانشیں شاہ محمد اسحاقؒ نے

(۱) تراجم علماء اہل حدیث مؤلفہ ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی ص ۱۱۷ تا ۱۱۸

اس میں درس حدیث جاری رکھا، اس مدرسہ سے ملک اور بیرون ملک کے ہزاروں علماء نے علم حاصل کیا اور ہندوستان میں تفسیر و حدیث اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا رواج ہوا۔

شاہ محمد اسحاقؒ کی محدثانہ خدمات

ان کا سب سے بڑا تحدیثی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کا ذوق اور اس کی نشر و اشاعت کو علماء ہند کے درمیان عام کیا اور علم حدیث کی اہمیت اور اس کی عظمت کو اہل اللہ کے حلقے میں رواج دیا اور محدثین کی ایک وسیع نسل کو پیدا کیا اور حجاز مقدس میں اپنے قیام کے دوران علماء کی ایک بڑی جماعت کو درس حدیث دیا اور سند اجازت عطا کی، حدیث کی مشہور کتاب ''مشکوٰۃ شریف'' کا اردو ترجمہ بھی علم حدیث میں آپ کے بلند مقام کی شہادت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ ہر حدیث کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے اپنے خاص اسلوب میں کیا تھا، بعد میں ان کے شاگرد خاص شیخ محمد قطب الدین دہلویؒ نے اس کی تشریح اور اس سے مستنبط مسائل کا اضافہ کر کے شائع کیا، اس بنا پر یہ کتاب شیخ قطب الدینؒ کی طرف منسوب ہوئی، حالاں کہ اس کا اصل بنیادی کام شاہ اسحاق دہلویؒ نے کیا تھا اور اسی کی روشنی میں شیخ قطب الدینؒ نے تشریح اور فوائد و مسائل تحریر کر کے کتاب کی افادیت کا دائرہ وسیع کیا اور اپنے استاد شاہ محمد اسحاقؒ کی علم حدیث میں محققانہ بصیرت اور ان کی وہبی صلاحیت سے نہ صرف اس ملک کے علمی حلقوں کو روشناس کرایا، بلکہ عالم اسلام میں ان کی تحدیثی عظمت کا تعارف کرایا، اس عظیم الشان کتاب کی پہلی حدیث امیر المومنین عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے، اس میں اعمال کا دارومدار نیتوں پر بتایا گیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا ترجمہ و تشریح ''مظاہر حق'' کے نئے ایڈیشن سے جس کی ترتیب و تنقیح مولانا عبداللہ جاوید کے قلم سے ہے، کا مختصر خلاصہ پیش کر دیا جائے، اس سے بھی فن حدیث میں شیخ دہلویؒ کی مہارت و براعت اور ان کے تحدیثی مرتبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، تاکہ علوم دینیہ میں ان کی

الہامی بلندی کا راز کسی حد تک دریافت ہو سکے.

مظاہر حق اور مشکاۃ کی پہلی حدیث کا ترجمہ

عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إنما الأعمال بالنيات وإنما لامرئٍ ما نوى ، فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله، فهجرته إلى الله ورسوله، ومن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها أو امرأة يتزوجها فهجرته إلى ما هاجر إليه . (متفق علیہ)

اس کا ترجمہ شاہ صاحب نے اپنی خاص قدیم اردو میں کیا تھا، اس کو شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد رشید نواب قطب الدین نے مرتب کیا اور مولانا عبداللہ جاوید صاحب نے اس کو تنقیح وترتیب کے بعد عصر حاضر کی شگفتہ اردو زبان میں منتقل کیا، جو حسب ذیل ہے:

''حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام کاموں کا مدار نیتوں پر ہے (عمل کا ثمرہ نیت پر مرتب ہوتا ہے) لہٰذا جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے (بہ نیت خالص) ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہوگی، اور جس شخص نے دنیا حاصل کرنے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اس چیز کے لئے ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا۔'' (بخاری ومسلم)

شاہ اسحاقؒ کا مرتبہ اہل علم کی نظر میں

علامہ سید سلیمان ندویؒ شاہ محمد اسحاقؒ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بڑی برکت عطا فرمائی، تمام بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد تھے، چند رسالے بھی ان کی تصنیف ہیں، غدر کے بعد مکہ مکرمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور وہاں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، آخر وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی، ان کے تلامذہ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ، نواب صدر الدین خاں دہلویؒ، نواب قطب الدین خانؒ جنھوں نے

کتب حدیث کا اردو ترجمہ کیا ہے، مولانا سید نذیر حسین صاحب (بہاری) دہلویؒ، مولانا عالم علی صاحب مراد آبادیؒ، شیخ محمد صاحب تھانویؒ، مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ، مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتیؒ۔'' (۱)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' جلد پنجم ص ۳۷۹ پر شاہ محمد اسحاقؒ کے بارے میں رقمطراز ہیں: ''شاہ (عبدالعزیز) کے ذوق خاص، درس حدیث، اجازت واسناد اور علوم دینیہ کی نشر واشاعت میں آپ کے دونوں نواسے حضرت شاہ محمد اسحٰق (۱۱۹۷ھ ـ ۱۲۶۲ھ) اور شاہ محمد یعقوب (۱۲۰۰ھ ـ ۱۲۸۲ھ) تھے، جو شاہ محمد افضلؒ کے صاحبزادے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کو اپنا جانشیں بنایا، اور اپنی تمام کتابیں اور گھر وغیرہ آپ ہی کو ہبہ کر دیا، آپ شاہ صاحب کے بعد ان کی مسند درس پر بیٹھے اور ۱۲۳۹ھ سے لیکر ۱۲۵۸ھ تک دہلی میں اور ۱۲۵۸ھ سے (آپ نے مکہ معظمہ ہجرت کی) ۱۲۶۲ھ تک حجاز مقدس میں حدیث کی تدریس وخدمت میں سرتاپا غرق ومنہمک رہے اور ہندوستان کے صدہا علماء نے آپ سے حدیث کا درس لیا اور بڑے بڑے علماء واساتذۂ حدیث نے بلاد وامصار سے آکر آپ سے استفادہ کیا، اور حدیث کی سند لی، جن میں شیخ عبداللہ سراج مکیؒ اور دوسرے کبار علماء شامل ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو شاہ محمد اسماعیل (بھتیجہ) اور شاہ محمد اسحاق (نواسہ) کی شکل میں دو قوت بازو اور عصائے پیری عطا فرمائے اور اکثر آیت پڑھتے ''الحمد للہ الذی وھب لي علی الکبر إسماعیل وإسحاق'' دوشنبہ ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ مکہ معظمہ میں وفات پائی اور جنۃ المعلاۃ میں حضرت سیدہ خدیجہ کی قبر کے پاس دفن ہوئے''۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی کتاب ''شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک'' ص ۹۷ـ۹۸ میں شاہ محمد اسحاق کے بارے میں تحریر کیا ہے: ''۱۲۳۹ھ میں امام عبدالعزیزؒ

---

(۱) مقالات سلیمان جلد ۱ ص ۵۲-۵۳

فوت ہوئے تو آپ نے اپنا مدرسہ مولانا محمد اسحاقؒ کے سپرد کیا، یہ حزب ولی اللہ کی امامت کا عرفی دستور تھا، سید احمد شہیدؒ کا قافلہ جب حج سے واپس آیا، تو انہوں نے امام عبد العزیزؒ کے بعد شاہ محمد اسحٰقؒ کی امامت کو تسلیم کر لیا، اس زمانہ میں اگر جمعیت (۱) کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا ،مولانا محمد اسحاقؒ صدارت کرتے اور سید احمد شہیدؒ حلقہ میں بیٹھتے، اور جب مدرسہ سے باہر مجلس ہوتی تو سید احمد شہیدؒ صدر بنتے، اور مولانا محمد اسحاقؒ حلقہ میں شریک ہوتے، اس طرح حزب ولی اللہ کی اساسی مصلحت کی حفاظت اور رجال اور اموال جمع کرنے کیلئے کئی دعاۃ کا سلسلہ امام عبد العزیزؒ کے مدرسہ سے متعلق رہا، اور عسکری اور سیاسی قیادت سید احمد شہیدؒ کی جماعت سے وابستہ ہوئی''۔

دیگر تصنیفات

شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی دیگر تصنیفات میں جن کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے ان میں مسائل اربعین، مأۃ مسائل، تذکرۃ الصیام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، بعض اہل علم نے ان کی تصنیفات کی تعداد ۱۰ تک بتائی ہے۔

میں اپنے اس ناچیز مقالہ کو ان کی تاریخ وفات کے جملے ''اسحاق شیخ آفاق'' پر ختم کرتا ہوں جس سے ان کی تاریخ وفات ۱۲۶۲ھ نکلتی ہے۔

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقه محمد وعلی آله وصحبه وبارک وسلم

---

(۱) یہ جمعیت ایک اصلاحی تحریک کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے قائم کی تھی، اس کی شاخیں پورے ملک میں پھیلیں، اس طرح حزب ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ (ماخوذ از کتاب: شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی بصیرت)

اورنگ زیب عالمگیرؒ اور ان کا اہم کارنامہ

فتاوی عالمگیری: سبب تالیف

اورنگ زیب عالمگیر کے عظیم کارناموں میں فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب بھی ہے، ان کی عمر جب ۵۰؍سال کی ہوئی، اور دس سال نظام حکومت پر بھی گزر گئے تو ان کے ذہن میں اس عظیم کتاب کی تالیف کا خیال آیا، چنانچہ اس کام کا آغاز ۱۰۷۸ھ میں ہوا، اورنگ زیبؒ نے علمائے وقت کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ فقہ اسلامی کا ایک ایسا مجموعہ تیار کرنے کی ضرورت ہے، جو مرجع کی حیثیت رکھے اور اس کو حکومت کا قانون بھی بنایا جا سکے، چنانچہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، اورنگ زیب براہ راست اس کی نگرانی کر رہے تھے، روزانہ سونے سے پہلے کام کا جائزہ لیتے، اگر کوئی رائے ہوتی تو علماء سے بحث کرتے اور قرآن وحدیث اور اجماع سے دلیل طلب کرتے۔

بادشاہ وقت کی اس غیر معمولی دلچسپی سے ٹیم کے افراد میں نئی روح دوڑ گئی، انہوں نے اپنی ساری توجہ اسی پر مبذول کی، اس کام میں دن رات ایک کر دیا، یہاں تک کہ یہ مجموعہ دو سال میں ۶؍ضخیم جلدوں میں مرتب ہو کر ۱۰۸۰ء میں منظر عام پر آیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی کتاب ''الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند وتطوراتھا'' میں اس نیک صفت بادشاہ کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مؤرخین نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شریعت پر استقامت اور ان کی عبادت وتقویٰ کے ایسے واقعات ذکر کئے ہیں جو حیرت انگیز ہیں، نظام حکومت سنبھالنے کے بعد انہوں نے قرآن کریم حفظ کیا، چالیس حدیثیں

جمع کیں اوران کی شرح بھی لکھی، فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا بھی حکم دیا، تاکہ اس کو حکومت کے قانون کی حیثیت حاصل ہو، اور ایک کمیٹی تشکیل دی، براہ راست اس کی نگرانی کی، وہ روزانہ سونے سے پہلے کمیٹی کے تیارکردہ موادکو پڑھتے تھے، اس کو فتاویٰ عالمگیری کے نام سے جانا جاتا ہے"۔(۱)

فتاویٰ عالمگیری کی خصوصیات:

مندرجہ ذیل سطور میں ہم اس کتاب کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں:

۱۔اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اس اہم کتاب کی ترتیب میں دولاکھ روپئے صرف کئے، اس مبلغ کی اس زمانہ میں بڑی اہمیت تھی۔

۲۔پورے ملک میں بادشاہ نے یہ سرکاری فرمان جاری کردیا کہ تمام ذیلی اورمرکزی عدالتیں اس کتاب کی روشنی میں فیصلہ کریں۔

۳۔ملک کے چنندہ علماء اورفقہاء کی ایک کمیٹی تشکیل دی، اس کا سربراہ مولانا نظام الدین برھانپوری کو بنایا، یہ باشادہ کے خواص میں تھے، انہوں نے علماء کی ایک جماعت کے تعاون سے اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا، بتوفیق الٰہی دوسال کی مدت میں یہ کام مکمل ہوا۔

مرتبین فتاویٰ عالمگیری:

یہاں ہم ان علماء وفقہاء کے نام بالترتیب ذکر کررہے ہیں جنھوں نے اس کی تربیت میں حصہ لیا، چار علماء اس کام میں سرفہرست ہیں:

۱۔قاضی محمد حسین جونفوری محتسب

۲۔مولانا علی اکبر حسینی اسعداللہ خانی الہ آبادی

۳۔مولانا حامد بن ابی الحامد جونپوری

---

(۱)الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند وتطوراتھا:ص۔۲۰

۴۔مفتی محمد اکرم حنفی لاہوری

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل علماء کے نام حسب ذیل ہیں:

۵۔مولانا نظام الدین برھانپوری

۶۔مولانا نظام الدین تتوی سندی

۷۔مولانا ابوالخیر تتوی

۸۔مولانا رضی اللہ بھاگلپوری

۹۔مولانا محمد جمیل جونپوری

۱۰۔مفتی وجیہ الدین گوپامئوی

۱۱۔مولانا سید محمد بن محمد قنوجی

۱۲۔مولانا جلال الدین مچھلی شہری

۱۳۔قاضی عبدالصمد جونپوری

۱۴۔مولانا ابوالواعظ ہرکامی

۱۵۔مفتی ابوالبرکات دہلوی

۱۶۔مولانا احمد بن ابوالمنصور گوپامئوی

۱۷۔مولانا عبدالفتاح صدانی

۱۸۔مولانا قاضی عصمۃ اللہ لکھنوی

۱۹۔قاضی محمد دولت فتحپوری

۲۰۔مولانا محمد سعید سہالوی

۲۱۔مولانا محمد شفیق سرہندی

۲۲۔مولانا محمد غوث کاکوروی

۲۳۔مولانا عبدالرحیم دہلوی

۲۴۔مولانا فصیح الدین پھلواروی

۲۵۔قاضی سید عنایت اللہ مونگیری

۲۶۔مولانا وجیہ الرب ملا

۲۷۔مولانا غلام محمد ملا

۲۸۔علامہ ابوالفرح

فتاویٰ عالمگیری کے مراجع :

یہ کتاب فقہ اسلامی کے اہم ترین مصادر میں ہے، کیونکہ اس میں ایک مسلمان کی انفرادی اوراجتماعی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا حل موجود ہے، یہ ایسی گراں قدر خدمت ہے جس کی نظیر کمیاب ہے، علماء نے اس کتاب میں ایسے فقہی مسائل ذکر کئے ہیں، جن سے کوئی بھی شخص ،خواہ وہ عالم ہو یا جاہل ،حاکم ہو یا رعایا، مرد ہو یا عورت بے نیاز نہیں ہوسکتا، تمام مسائل آسان زبان میں انوکھے اسلوب میں لکھے گئے ہیں، فقہ کی مراجع کی روشنی میں ان کو مرتب کیا گیا ہے۔

چند مراجع حسب ذیل ہیں:

١۔الوافی

٢۔الکافی

٣۔الملتقط

٤۔الزادة

٥۔خزانة الفقه مؤلفه امام ابو اللیث

٦۔الهدایة مؤلفه فقیه برهان الدین مرغینانی

٧۔شرح الطحاوی مؤلفه امام بدرالدین العینی

٨۔البدائع

٩۔المغنی

١٠۔العنایة

١١۔الذخیرة

١٢۔الخلاصة

١٣۔الفرائض الزاهدیة مؤلفه ابو الرجاء مختار بن محمود(م٦٥٨)

١٤۔الظهیریة لظهیرالدین بخاری(م٦١٩)

١٥۔المحیط مؤلفه شیخ برهان الدین

١٦۔المحیط مؤلفه شیخ رضي الدین السرخسي

١٧۔فتاویٰ قاضي خان

١٨۔شرح الوقایة

١٩۔التبیین مؤلفه امام نسفی

٢٠۔السراج الوهاج

٢١۔فتح القدیر

٢٢۔البحرالرائق

٢٣۔الجامع الصغیر

٢٤۔الجامع الوجیز

٢٥۔الفتاویٰ السراجیة

٢٦۔الاختیاروالمختار

٢٧۔الکفایة شرح الهدایة

٢٨۔الجوهرة النیرة

٢٩.القنية
٣٠.النهرالفائق
٣١.المبسوط مؤلفه امام سرخسی
٣٢.فتاویٰ شیخ الاسلام المعروفة بخواهرزاده
٣٣.شرح المبسوط
٣٤.العتابية المعروفة بجامع الفتاویٰ
٣٥.خزانة المفتين
٣٦.شرح العينی علی الكنز
٣٧.المفيد والمزيد
٣٨.خزانة الفتاویٰ
٣٩.الأسرارفی الأصول والفروع
٤٠.الدبوسی(م-٤٣٠)
٤١.شرح الزيادات النقاية
٤٢.شرح المجمع مؤلفه ابن الملك
٤٣.التجنيس مؤلفه صاحب الهداية
٤٤.الفتاویٰ الولواجية
٤٥.فتاویٰ الامام الكرخي
٤٦.الفتاویٰ الكبریٰ
٤٧.الفتاویٰ الصغریٰ مؤلفه امام حسام الدين عمربن عبدالعزيز(م٥٣٦)
٤٨.الفتاویٰ التمرتاشی

٤٩۔فتاوی قراخانی

٥٠۔مختار الفتاویٰ مؤلفه ابو الفضل مجدالدین الموصلی (م٦٨٣ھ)

٥١۔تنویرلجامع الکبیر

٥٢۔شرح کتاب الاستحسان مرتبه شمس الائمة الحلوانی

٥٣۔فتاوی ابی الفتح مؤلفه مجد الدین ابو الفتح(م ٦٣٢ھ)

٥٤۔فتاوی الخجندی

٥٥۔فتاوی رشید الدین

٥٦۔فتاویٰ النفسی

٥٧۔فتاوی الفضیلی

٥٨۔شرح الزیادات مؤلفه عتابی

٥٩۔الاسعاف

٦٠۔المستصفیٰ

٦١۔شرح ادب القاضی

٦٢۔نوادرابن سماعة

٦٣۔الواقعات الحسامیة

٦٤۔فوائد نظام الدین

٦٥۔البحرالزاخر

٦٦۔فصول الاتروشنی

٦٧۔القدوری

٦٨۔ینابیع الأحکام

٦٩۔شرح مقدمة ابی اللیث

٧٠۔الوقایة

٧١۔المصفیٰ

٧٢۔الکفایة

٧٣۔التھذیب

٧٤۔جامع الجوامع

٧٥۔جواھر الاخلاطی

٧٦۔البرجندی

٧٧۔غایة البیان

٧٨۔اقرارالعیون

٧٩۔مختارات النوازل مؤلفه صاحب الھدایة

٨٠۔شرح الھدایة مؤلفه ابو العباس السروجی

٨١۔المنتقیٰ

٨٢۔المجتبیٰ

٨٣۔الواقعات

٨٤۔التحریرشرح الجامع الکبیر، للحصیری

٨٥۔الفصول العمادیة

٨٦۔الحاوی

٨٧۔الکفایة

٨٨۔النھایة

ان مراجع کا سرسری مطالعہ ہی اس مجموعہ فتاوی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے

کافی ہے، ان سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس مجموعہ کی ترتیب میں کس قدر دقت نظر ملحوظ رکھی گئی ہے، مرتبین نے کتنی جاں کاہی اور جگر کاوی کا ثبوت دیا ہے۔

ترتیب واسلوب:

کتاب عام فقہی کتابوں کی ترتیب سے مرتب کی گئی ہے، جیسے کتاب الطھارۃ، کتاب الصلاۃ، کتاب الزکاۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج، کتاب النکاح، کتاب الرضاع، کتاب الطلاق، وغیرہ۔ ہر کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے، سوائے چند کے: کتاب اللقیط، کتاب اللقطۃ، کتاب الاباق، کتاب المفقود، یہ چاروں اجزاء ابواب سے خالی ہیں، اور ہر جزء ذیلی مباحث اور فصلوں پر مشتمل ہے، اوران کے مندرجات ہیں، جن میں فروعی مسائل تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب الزکاۃ میں ۸ ابواب ہیں۔

۱۔ پہلا باب زکاۃ کے معنی، حقیقت اور شرائط پر مشتمل ہے

۲۔ دوسرا باب جانوروں کی زکوۃ کے بارے میں ہے، اس میں پانچ فصلیں ہیں، پہلی فصل میں تمہید ہے، دوسری فصل اونٹ کی زکوۃ کے بارے میں، تیسری فصل گائے کی زکوۃ کے بارے میں۔ چوتھی فصل بکرے کی زکوۃ، پانچویں فصل ایسی اشیاء کے سلسلہ میں ہے جس میں زکوۃ نہیں

تیسرا باب سونے چاندی، سامان وغیرہ کی زکوۃ کے سلسلہ میں ہے، اس میں دو فصلیں ہیں، پہلی فصل سونے اور چاندی کی زکوۃ کے بارے میں، دوسری فصل سامان وغیرہ کی زکوۃ۔

چوتھا باب عشر دینے والے کے باب میں

پانچواں باب معدنیاتی اشیاء کے بارے میں

چھٹا باب کھیتی اور پھل کے بارے میں

ساتواں باب مصارف زکوۃ کے بارے میں اس مال کو بیت المال میں جمع کرنے

کی چار شکلیں ہیں۔

آٹھواں باب صدقہ فطر کے بارے میں

فتاویٰ عالمگیری کے چند فقہی امتیازات:

اس کتاب کی فقہی اہمیت مسلم ہے، کیونکہ اس میں یا تو وہ مسائل ذکر کئے گئے ہیں جن کا تعلق ظاہر الراوایۃ سے ہے، ظاہر الروایۃ سے مراد امام محمدؒ کی چھ متعینہ کتابیں ہیں، (جامع صغیر، جامع کبیر، سیر صغیر، سیر کبیر،، مبسوط، زیادات وغیرہ) یہ بات معلوم ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد ان ہی چھ کتابوں پر ہے، یا اس کتاب میں وہ مسائل ذکر کئے گئے ہیں جو راجح اور مفتی بہ ہیں۔

کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ موضوع کی اہم کتابوں کا خلاصہ اور قابل اعتماد مصادر کا نچوڑ ہے، اس کتاب کو ماہر علماء، فقہاء کی ایک ٹیم نے تیار کیا ہے، طول وطویل مباحثے اور قانونی مذاکرے کے بعد اس کو ترتیب دیا گیا ہے، جن لوگوں نے اس کی ترتیب میں حصہ لیا وہ علم وعمل، اور روایت درایت کی اعلیٰ چوٹی پر تھے، تقوی وطہارت ان کا شعار تھا، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو نہ وہ اس عظیم کتاب کو مرتب کر سکتے تھے اور نہ یہ اغلاط سے پاک ہوتی۔

ہندوستان کی علمی اسلامی تاریخ میں فقہ اسلامی کا پہلا عظیم الشان کارنامہ ایک صداقت شعار، دیانتدار بادشاہ کے ذریعہ وجود میں آیا، جس میں فقہ اسلامی کے تمام مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے، بادشاہ نے پوری سخاوت وفیاضی کے ساتھ اس میں حصہ لیا، جبکہ مسلمان حکمرانوں کے زمانہ کی سینکڑوں کتابیں نہ تو وہ طبع ہو سکیں اور نہ انہیں دوام ملا۔

فتاویٰ عالمگیری کو یہ علمی درجہ حاصل ہے کہ علمی حلقوں میں اس کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، عبادات ہی مصنفین کی کاوشوں کا مرکز نہیں رہے، بلکہ معاملات پر بھی ان کی کوششیں لائق مبارک باد ہیں۔

کتاب کا ہر مسئلہ حوالہ سے مزین ہے، اگر حوالہ دستیاب نہیں ہوا تو جس شخصیت سے یہ مسئلہ منقول ہے اس کا نام دیا گیا۔

فتاویٰ عالمگیری مشاہیر علماء کی نظر میں:

مولانا محمد کاظم اپنی کتاب جہانگیر نامہ میں لکھتے ہیں:

''اورنگ زیب عالمگیر کی گوناگوں علمی اور اسلامی خدمات میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک دینی فقہی انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے پر پوری توجہ مبذول کی، کیونکہ ہندستان میں جو مسلمان فقہ اسلامی کے مطابق حنفی مسلک اور اس کے ائمہ کی اجتہادات کی روشنی میں زندگی گزار رہے تھے ان میں کمی آگئی ہے، بلکہ وہ تقریبا ترک کر چکے ہیں، جہاں تک ان مسائل کا تعلق ہے، جو فقہ وفتاویٰ کی کتاب میں موجود ہے، وہ ضعیف روایتوں اور مختلف فیہ اقوال سے بھری ہوئی ہے، اور ایک کتاب میں یکجا بھی نہیں ہیں، جس کی وجہ سے ان مسائل کا عمل بہت کم ہو گیا ہے، نہ عوام کو مسئلہ معلوم کرنے کے لئے کوئی فقیہ نظر آتا اور نہ ان کو صحیح مسئلہ بیان کرنے والا دکھائی دیتا، اللہ تعالیٰ نے اورنگ زیب عالمگیر کے دل میں بات ڈالی کہ انہوں نے ماہر علماء کرام کے تعاون سے اس کام کو انجام دیا، اور اپنی پوری توانائی مصادر فقہ کو جمع کرنے پر صرف کی، تاکہ مفتیان کرام تصنیف وتالیف کی بہترین خدمت انجام دے سکیں۔

علماء کی اس ٹیم کے صدر علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے، انہوں نے بھرپور محنت کی اور مسائل کی تدوین میں مشغول ہوگئے، بادشاہ نے کام کرنے والے افراد کے لئے معقول وظیفہ بھی متعین کیا جوان کو ماہ بماہ دیا جاتا تھا، انشاء اللہ بادشاہ کو اس جلیل خدمت کا خاطر خواہ اجر ملے گا''(۱)

---

(۱) عالمگیر نامہ: ۱۰۸۶-۱۰۸۷

مولانا عبدالرحمٰن بہراوی جنہوں نے مصر کے مختلف مکتبہ بولاق سے اس کتاب کو ۱۳۱۰ھ میں طبع کرایا، وہ کتاب کا پس منظر ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یاد رہے کہ اس آسان سہل کتاب کا پس منظر یہ ہے کہ عالی جناب بادشاہ وقت اورنگ زیب عالمگیرؒ جب دنیا میں دینی دعوت کو عام کرنے میں مصروف رہے، اور چاہا کہ مفتی بہ قول کے مطابق اختلافات اور ضعیف روایات سے گریز کرتے ہوئے ایسا مجموعہ مرتب ہونا چاہئے جو جامع ومانع ہو، تا کہ اس کا سمجھنا آسان ہو اور استفادہ ممکن ہو، چنانچہ انہوں نے نمائندہ علماء کو اس کام پر مامور کیا، مولانا نظام الدین کو ان کا صدر بنایا، انہوں نے جان توڑ کوشش کی اور اپنی نیتوں کو خالص کیا، اور چھوٹی بڑی کتابوں کی فہرست تیار کی، اور ان کو منگایا اور ان سے مسائل نکالنے میں لگے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس مجموعہ کو مکمل کرنے کی توفیق دی، اس طرح یہ کتاب جامع اور تمام فروعی مسائل کا احاطہ کرنے والی قرار پائی، اس کا نام فتاویٰ عالمگیری رکھا گیا، سلطان عالمگیرؒ نے اس کی ترتیب کا حکم دیا تھا“ (۱)

مؤرخ ہند مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ ”الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند“ میں اس فقہی مجموعہ کے متعلق رقمطراز ہیں:

”جہاں تک فتاویٰ عالمگیری کی بات ہے تو لوگ اس کو فتاویٰ ہندیہ بھی کہتے ہیں، یہ کتاب ایسی نفع بخش ہے کہ اس میں مسائل زیادہ، عبارتیں سہل، مشکل مقامات حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، عالم عرب میں یہ کتاب فتاویٰ ہندیہ کے نام سے مشہور ہے، یہ چھ بڑی جلدوں میں ہے، پہلی جلد کا آغاز ہوتا ہے۔ الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین“ سے یہ کتاب ہدایہ کے طرز پر مرتب کی گئی ہے، اور ظاہر الروایۃ کو اہمیت دی گئی

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری، مقدمہ طبع دوم: ۲

ہے، ہر عبارت اس کے لکھنے والے کی طرف منسوب کی گئی ہے، میں برابر فکر مند رہا کہ اس کے پیچھے کیا راز ہے، تو معلوم ہوا کہ سلطان اورنگ زیب نے مولانا نظام الدین برہانوی کو اپنی سلطنت کے آغاز میں اس کام پر مامور کیا تھا، انہوں نے علماء کی ایک ٹیم کے ساتھ اس کام کو انجام دیا، بادشاہ نے اس کی ترتیب میں دولاکھ روپے خرچ کئے۔"(۱)

فتاویٰ عالمگیری ہر مسلمان کی ضرورت:

بلاشبہ یہ فقہی انسائیکلوپیڈیا فقہ اسلامی کے مفید ترین مصادر میں ہے، بحث وتحقیق کے راہ رو کے لئے اس سے اعراض کرنا ممکن نہیں، خاص طور سے ان حضرات کے لئے جو قانون اسلامی کے سرچشمہ تک پہنچنا چاہتے ہیں، اور ہندوستان میں فقہی موضوعات پر کام کرنے والوں کو بھی اس کتاب کی شدید ضرورت ہے، اسی طرح یہ کتاب ان ملکوں، اداروں کی ضرورت ہے جو فقہ اسلامی سے نسبت رکھتے ہیں اور دستور اسلامی پر کام کرنا چاہتے ہیں۔

اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکلے، پہلا دوسرا ایڈیشن مصر میں ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوا، مولانا عبدالرحمٰن بہراوی نے اس کا اہتمام کیا، اس کتاب کا فارسی زبان میں بھی ترجمہ ہوا، علامہ عبداللہ رومی نے اس کام کو انجام دیا، مولانا عبدالرحمٰن رومی شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے، یہ دربار میں ایک کارکن کی حیثیت سے رہے، اس ترجمہ کے علاوہ ان کی متعدد کتابیں ہیں، فارسی زبان میں قاضی القضاۃ شیخ نجم الدین کاکوروی (۱۲۲۹ھ) نے کتاب الجنایات سے متعلق حصہ کی شرح لکھی ہے،، یہ مفید شرح ہے۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی۔

کتاب کا اردو ترجمہ علامہ سید امیر علی ملیح آبادی نے کیا ہے، وہ چودھویں صدی کے علماء میں ہیں، ندوہ سے انتظامی تعلق ایک عرصہ تک رہا ہے۔ باوجودیکہ کتاب پر تین سے زائد صدیاں گزر گئیں، لیکن کتاب کی جدت وندرت میں کوئی فرق نہیں آیا، برابر یہ کتاب

---

(۱) الثقافۃ الاسلامیہ ص/۱۰

فقہ اسلامی کا اسی طرح مرجع رہی ہے، جس طرح روز اول تھی، ہر آدمی کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اسلامی فقہ کا مطالعہ کرے، اس کی خصوصیات سے واقف ہو، اور اس فن کے دائرہ کو وسیع کرنے میں مصروف رہے۔

آج جبکہ سرکاری وغیر سرکاری سطح پر لوگوں کی دلچسپی فقہ وقانون سے بڑھ رہی ہے اور وہ اسلامی دستور کو لانا چاہتے ہیں اور عالمی سطح پر اس کو استنادی حیثیت دیتے ہیں، تو ہم قارئین کی توجہ اس اہم علمی کام کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں، امید ہے کہ انہیں اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ وماذلك على الله بعزيز

☆☆☆

شیخ الہند علامہ محمود حسن دیوبندیؒ

اوران کی علمی ودینی قیادت

علامہ محمد قاسم نانوتویؒ نے جہاں انگریزی استعمار کا مقابلہ کرنے اوراس کی ریشہ دوانیوں سے ہندوستان کو آزاد کرانے اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کیا اور انقلابی اقدامات کر کے اس سامراج کو اپنے خطرناک عزائم سے باز رکھنے کی کوشش میں اپنی جملہ توانائیوں کو صرف کیا، وہیں اس عظیم ملک کو علم ودین اور تعلیم وتربیت کا ایک قابل رشک وفخر گہوارہ بنا کر پورے عالم کے مسلمانوں پر ناقابل فراموش احسان کیا، انگریز کے خلاف جہاد کرنے اوراس کے استعمار کو ملک بدر کرنے میں جان تک کی بازی لگادی، ان کی اوران کے رفقاء علمائے کرام کی جہد مسلسل کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا، جس میں ہر مذہب ومسلک کے علماء شریک تھے، لیکن باہمی اتحاد واعتماد کے فقدان اور دیگر اقوام کے بعض ضمیر فروش لوگوں کی سازش سے یہ بغاوت ناکام ہوگئی، اور انگریزوں نے اس کا انتقام لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، علماء کرام کے ایک بڑے گروہ پر بغاوت میں حصہ لینے کا الزام لگا کر ہزاروں علماء کو تختۂ دار پر لٹکا دیا، روایت ہے کہ دہلی سے شاہجہاں پور تک کوئی ایسا درخت نہیں پایا گیا جس پر علمائے کرام کی لاشیں لٹکی ہوئی نہ پائی گئی ہوں اور اندازہ ہے کہ پچاس ہزار علمائے کرام نے جام شہادت نوش کیا۔

شیخ الہند علامہ محمود حسنؒ، حضرت نانوتویؒ کے شاگرد خاص تھے اوران کی تربیت میں رہ کر اولوالعزمی کا درس لیا، شیخ الہند حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے فرزند ارجمند تھے، اور مولانا ذوالفقار علیؒ نہ صرف ایک عالم وادیب اور عربی زبان کے ماہر شاعر تھے، بلکہ ایک بڑی

جماعت علماء کے استاذ ومربی بھی تھے، شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں دیوبند میں ہوئی، آپ کا شماران علمائے کرام کی صف اول میں تھا جودارالعلوم کے اولین طالب علم تھے اور فراغت کا درجہ امتیازی حیثیت سے حاصل کرنے کے بعد ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں دارالعلوم میں آپ کو منصب تدریس پر فائز کیا گیا، پھر ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں آپ دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوئے، علوم دینیہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے امتیازی شان عطا کی تھی، حدیث شریف اور علوم حدیث میں ملکہ تامہ اور فقہ واصول فقہ میں عظیم مہارت وقابلیت سے اللہ تعالیٰ نے سرفراز فرمایا تھا، اس عظیم علمی امتیاز کے ساتھ تقویٰ، تواضع، بلند ہمتی، عالی ظرفی اور تعلق مع اللہ میں اپنی مثال آپ تھے، دشمنان اسلام سے سخت نفرت کی وجہ سے انگریزوں کی حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ آپ کے رگ وریشہ میں پیوست تھا، یہی وجہ تھی کہ انگریزی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک خاموش اسکیم ۱۹۰۵ء میں آپ نے تیار کی، اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے آپ نے اپنے حوصلہ مند چند شاگردوں کی ایک جماعت کی تربیت کی، اس میں مولانا عبیداللہ سندھی متوفی ۱۹۴۴ء اور مولانا محمد میاں منصور متوفی ۱۹۴۶ء، یہ حضرات اس اسکیم کو نافذ کرنے کے سلسلے میں خط وکتابت ایسے لوگوں سے کرتے تھے جن کے بارے میں یقین تھا کہ وہ تحریک کو قبول کریں گے اور اس میں شریک ہوکر انگریزوں کے خلاف جہاد کو تقویت پہونچائیں گے، اس تحریک کے خطوط زرد ریشمی کپڑے پر لکھ کر بطور رومال ہدیہ بھیجتے تھے، اور وہ ریشمی رومال تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

شیخ الہندؒ کی پوری کوشش تھی کہ افغانی حکومت اور عثمانی خلافت دونوں ہی اس تحریک کو قبول کرکے اس کو کامیاب بنانے کی جدوجہد اعلیٰ پیمانے پر کریں، اس سلسلہ میں اپنی کبرسنی کے باوجود ۱۹۱۰ء میں حجاز تشریف لے گئے، تاکہ وہاں شریف حسین امیر مکہ سے مل کر اس اہم تحریک کے بارے میں تبادلۂ خیال کریں اور ان کو اس کے لئے پوری طرح آمادہ کریں، مدینہ منورہ میں خلافت عثمانی کے ذمہ داروں سے ملاقات کرکے بڑی حد تک اطمینان حاصل

کر چکے تھے کہ اچانک انگریزوں کو اس کا کسی جاسوسی ذرائع سے علم ہو گیا، اور انھوں نے امیر مکہ شریف حسین کے ذریعہ شیخ الهند کو گرفتار کرلیا، شریف حسین نے ۱۹۱۶ء میں عثمانی حکومت کے خلاف اپنی کوششیں جاری کردی تھیں، شیخ الہند کے ساتھ ان کے جملہ اصحاب وتلامذہ کو بھی گرفتار کرلیا گیا، ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بھی تھے، اور وہیں سے ان کو جزیرۂ مالٹا (کالے پانی) کی جیل میں منتقل کردیا گیا، جہاں تین سال تک قید بامشقت میں قیام فرمایا اور مئی ۱۹۲۰ء میں آپ کو قید سے آزادی حاصل ہوئی، اس خوشخبری سے سارا ہندوستان مسرور ہوا اور شیخ الهند کا استقبال نہایت گرم جوشی اور احترام کے ساتھ کیا گیا، اور شیخ الہند زندہ باد کے فلک شگاف نعرہائے تحسین سے پورا ہندوستان گونج اٹھا۔

بتایا جاتا ہے کہ شیخ الهندؒ نے دوران قید مالٹا مطالعہ قرآن اور اس کے معانی ومفاہیم میں پورے انہماک کے ساتھ غور وخوض کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کے نتیجہ میں ترجمہ قرآن بزبان اردو پوری احتیاط اور لفظ ومعنی کی انتہائی مطابقت کے ساتھ کرنے کا سلسلہ اپنے احباب وتلامذہ کے اصرار پر شروع کیا تھا اور خیال تھا کہ اس سے دور حاضر میں اردوداں طبقے کو قرآنی مفہوم ومعانی کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی، اس کے باوجود کہ خانوادہ ولی اللہی کے عالم جلیل، مفسر قرآن حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ قرآن ''موضح القرآن'' موجود ہے، اور اہل علم نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، شیخ الهندؒ نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ بامحاورہ مسمی بہ موضح القرآن کو دیکھ کر اول یہ سمجھیں کہ جناب شاہ صاحب ممدوح کا ترجمہ جس کا اپنی نوعیت میں اول وافضل ہونا جملہ اہل علم وفہم وارباب انصاف ودیانت کو مسلم ہے، اس میں ایسے امور کیا ہیں کہ جس کی وجہ سے ہم کو دوسرے کسی ترجمے کی ضرورت ہو''۔

پھر اس کے بعد اس کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت شاہ صاحبؒ ترتیب قرآنی کا بہت خیال رکھتے ہیں، اور

اصل اور ترجمہ کی مطابقت میں بہت زیادہ سعی فرماتے ہیں، مگر چونکہ ترجمہ بامحاورہ کا التزام کیا ہے، اس لئے بقدر ضرورت توضیح وتسہیل، بعض مواقع میں تقدیم وتاخیر لازم ہے، مگر جیسا کہ: (آٹے میں نمک) یہ نہیں کہ آخر کا ترجمہ اول اور اول کا آخر ہو جائے، الغرض فصل بعید سے احتراز کرتے ہیں الا ماشاء اللہ، کسی خاص ضرورت کے وقت دو تین کلموں کا فصل ہو جائے اور وہ بھی (النادر کالمعدوم)۔

دیکھئے عربی زبان میں مضاف کو مقدم ذکر کرتے ہیں اور اردو کا محاورہ یہ ہے کہ مضاف الیہ کو مقدم کرتے ہیں، وہ ''غلام زید'' کہتے ہیں تو ان کے محاورہ میں ''زید کا غلام'' کہیں گے، سو ترتیب تو بدل گئی مگر دونوں کلمے متصل ہی ہے، فاصلہ اور فرق کچھ نہیں ہوا، اس لئے حاجت کے وقت یہ تغیر کچھ تغیر نہیں سمجھا جاتا، اس قسم کی مثالیں شاہ صاحب کے ترجمے میں کثرت سے ملیں گی''۔

حضرت شیخ الہند شاہ صاحب کے ترجمۂ قرآن کی توثیق وتحسین فرماتے ہوئے اور اس سے اہل علم وفہم کے استفادہ کا ذکر کرتے ہوئے، اور اپنے محبین ومسترشدین کے اصرار اور دیگر تراجم قرآن کے موجود ہوتے ہوئے، نفع عام کے لئے حضرت شیخ الہند سے ترجمہ قرآن کو مکمل کرنے کے مطالبہ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

''یہ بات تو بحمد اللہ ہم کو خوب محقق اور منقح ہوگئی کہ تراجم موجودہ صحیحہ معتبرہ کے ہوتے ہوئے ہمارا جدید ترجمہ کرنا، لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا ہے، جس میں نہ مسلمانوں کو کوئی نفع معتبر پہنچ سکتا ہے نہ ہم کو، بلکہ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا جدید ترجمہ کرنا، گویا زبان حال سے یہ کہنا ہے کہ تراجم موجودہ میں کوئی خلل ہے، جس کا تدارک کیا جاتا ہے، یا ہمارے ترجمہ میں کوئی خوبی اور منفعت زائد ہے جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی حاجت ہوتی ہے''۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مفید و مبارک ترجمے میں لوگوں کو کچھ اشکال پیش آیا، خاص طور سے بعض الفاظ و محاورات کا متروک ہو جانا جو شاہ صاحب نے استعمال کئے ہیں، اور بعض جگہوں میں ترجمہ کے الفاظ کا اختصار اس اشکال کے پیش نظر ضروری معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الھندؒ بھی قرآن کریم کا ترجمہ کر دیں، تا کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ پیش ہو، نہ اس میں متروک محاورات کا استعمال ہو اور نہ ضرورت سے زیادہ اختصار ہو، جیسا کہ شاہ صاحب کے ترجمہ قرآن میں موجود ہونے کی وجہ سے اور ذوق علم وفہم میں تبدیلی آ جانے کی وجہ سے لوگوں کو سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، حضرت شیخ الہند تحریر فرماتے ہیں:

''اس لئے اس ننگ خلائق کو یہ خیال ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ممدوح کے مبارک و مفید ترجمہ میں لوگوں کو جو دو خلجان ہیں، یعنی بعض الفاظ کا متروک ہو جانا، دوسرے بعض مواقع میں ترجمہ کے الفاظ کا مختصر ہونا، جو اصل میں ترجمہ کی خوبی تھی، مگر ابنائے زمانہ کی سہولت پسندی اور مذاق طبیعت کی بدولت اب یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ جس سے ایسے مفید و قابل قدر ترجمہ کے متروک ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، سو اگر غور و احتیاط کے ساتھ ان الفاظ متروکہ کی جگہ الفاظ مستعملہ لے لئے جائیں اور اختصار و اجمال کے موقعوں پر تدبر کے ساتھ کوئی لفظ مختصر زائد کر کے کچھ کھول دیا جائے تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ صدقہ فاضلہ بھی جاری رہ سکتا ہے اور مسلمانان ہند بھی اس کے فوائد مخصوصہ سے خالی نہ رہ جائیں گے، اس مضمون کو سوچ سمجھ کر جو اپنے مکرمین مولفین کی خدمت میں پیش کیا تو ان حضرات نے بھی اس عاجز کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا اور یہی بات دل نشیں ہوگئی کہ مستقل ترجمہ سے یہ امر زیادہ مناسب اور مفید ہے کہ موضح القرآن میں جو شکایت پیدا ہوئی ہے اس کے رفع کرنے میں کوشش کی جائے، جب یہاں تک نوبت پہنچ چکی تو یہ عاجز بنام خدا اس خدمت کے لئے تیار ہو بیٹھا، گویا دوشالہ میں جگہ جگہ کمبل سے رفو کرنے کا ارادہ کر لیا، جب ایک ثلث قرآن کا ترجمہ ہو چکا تو بوجہ بعض عوارض ایسا طول طویل حرج پیش آیا کہ ترجمہ کی تکمیل کی توقع

بھی دشواری ہوگئی، مگر بتوفیق الٰہی عین ایام حرج اتنا اطمینان نصیب ہوگیا کہ ترجمہ موصوف ۱۳۳۶ھ میں پورا کرلیا۔ (ان ربی لطیف لمایشاء والحمدالله)۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس ترجمہ کو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ دنیا کے گوشے گوشے میں اس کا شہرہ ہوا اور امت مسلمہ کے افراد نے عالمی سطح پر اس سے فائدہ اٹھایا، دنیا کے تمام سیاسی مراکز و مدارس اور جامعات و مکتبات میں اس ترجمہ کی بڑی اہمیت اور شیخ الھند کے ترجمہ والا قرآن ہر شخص کی زبان پر جاری ہے۔

یہاں تک کہ جب سعودی عرب کے بادشاہ ملک فہد بن عبدالعزیز نے (مجمع خادم الحرمین الشریفین الملك فهد لطباعة المصحف الشريف) قائم کیا تو شیخ الھند کے ترجمہ والے قرآن کی اشاعت کی علمائے اسلام نے سفارش و درخواست کی کہ اس ادارہ نے نہایت واضح اور خوبصورت طباعت کے ساتھ اس کو طبع کرنے کا حکم دیا اور لاکھوں کی تعداد میں طبع کرا کے عالم اسلام اور مسلم اقلیات کے ملکوں میں بھیجا گیا اور شاید ہی کوئی ایسا مسلم ادارہ ہو جس کا اسلامی مکتبہ اس ترجمۂ قرآن سے خالی ہو۔

(مجمع الملك فهدلطباعة المصحف الشريف) سے شائع شدہ ترجمہ شیخ الھند والے قرآن کے شروع میں ایک مختصر پیش لفظ ہے، اس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اس ترجمہ کا تعارف اور اس کی توثیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اردو زبان میں یہ سب سے اچھا ترجمہ ہے، اس کی طباعت و اشاعت ہونی چاہئے“، ترجمہ شیخ الھند کی تفسیر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے لکھی ہے، جو ترجمہ کے ساتھ ملحق ہے، اور تفسیری نکات وفوائد سے پر ہے۔

حضرت شیخ الھندؒ نے مالٹا کی قید سے واپسی کے ساتھ انگریزی استعمار سے ملک کی آزادی کی جدوجہد تیز کردی اور مسلسل سفر اور دورے مختلف شہروں اور علاقوں کے شروع فرمادئے اور باوجود قید و بند کی مشقتوں اور ضعف و کمزوری کے شہروں شہروں، اور علاقوں، علاقوں میں

گھوم کر لوگوں کو انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لئے آمادہ کرتے رہے، اور اپنی تقریروں میں انگریزی کی غلامی کی شناعت اور نقصان بتاتے رہے، اس غلامی سے انگریز کس قدر اپنا فائدہ اٹھا رہا ہے، اور ملک کی دولت کو لوٹ کر اپنے ملک کو مضبوط کر رہا ہے، کس طرح وہ ہندوستانی قوم کے ساتھ ذلت کا معاملہ کر رہا ہے، کبھی وہ مسلمانوں کو تختہ دار پر چڑھا کر اپنی پیاس انتقام بجھا رہا ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی علالت وضعف اور کبرسنی کے باوجود انگریزی استعمار کو ملک بدر کرنے اور اس سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے ہر طرح کی قربانی اور مسلسل جلسوں اور اجتماعی ملاقاتوں میں اس سامراج کو سرزمین ہند سے نکالنے اور اس کا بائیکاٹ کرنے سے قوم کو راحت عطا کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، شیخ الہندؒ کے ساتھ ان کے شاگرد رشید حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ برابر اس جدوجہد میں شریک رہے، اور اس تحریک کو ریشمی رومال تحریک کے نام سے لوگوں نے پہنچانا، بلکہ تاریخ آزادی میں یہی نام مشہور ہے۔

شیخ الہندؒ نے ملک کی غیر ملکی سامراج سے آزاد کرانے کے لئے جہد مسلسل فرمائی اور انھیں کی ان مخلصانہ کوششوں اور دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ ان کی وفات کے ستائیس سال بعد ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا اور قوم کو آزادی کا تحفہ ملا۔

شیخ الہند نے ضعف ونقاہت کی حالت میں بھی برابر اپنی جدوجہد جاری رکھی اور اسی دوران ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد علی گڑھ میں رکھا جو بعد میں اوکھلا کے علاقے دہلی میں منتقل ہو گیا۔

حضرت شیخ الہند اپنے سفر علی گڑھ اور دہلی، اور وہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد دیوبند تشریف لائے، لیکن ضعف واضمحلال آخری درجہ کو پہنچ چکا تھا، اس لئے علاج کے لئے پھر دہلی تشریف لے گئے، کچھ ہی دن تک یہ سلسلہ علاج وہاں جاری رہا، یہاں تک کہ اچانک ۱۸؍ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰؍ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ندائے ربانی کو لبیک کہا اور دار فانی کو الوداع کہا۔ اور اپنی عظیم الشان زندگی کے حالات تاریخ کے

حوالے کر کے رخصت ہوئے، جو ہندوستان اور عالم اسلام کے لئے ایک درخشاں باب ہے، اور ہندوستانی اسلامی مستقبل کی تعمیر کا راز اس میں پوشیدہ ہے، کاش ہم اس راز کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور اس عظیم تاریخ کے صفحات کا کبھی کبھی مطالعہ کرلیا کرتے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

ابھی سال گزشتہ دسمبر ۲۰۱۳ء میں شیخ الہند ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام حضرت شیخ الہندؒ کی ریشمی رومال تحریک کی صد سالہ تقریبات دیوبند، دہلی میں حضرت مولانا محمود اسعد صاحب مدنی ناظم عمومی جمعیۃ العلماء کی طرف سے امن کانفرنس کی شکل میں منعقد ہوئی ہیں۔ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی علمی، دینی اور تحریکی کوششوں کی تجدید اور تعارف کا ایک زریں موقع نسل مسلم کو حاصل ہوا ہے۔

☆☆☆

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ

ایک مختصر مطالعہ اور کچھ حالات وکارنامے

۱۸۵۷ء اور انگریزی سامراج کے خلاف بغاوت

اس ملک کی تاریخ میں بہت سے یادگار ماہ وسال گذرے ہیں، لیکن ۱۸۵۷ء میں ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے اور برٹش سامراج کے بڑھتے ہوئے سیل رواں کو روکنے کے لئے ملک کے باشندوں اور ان کے ہر طبقہ میں انگریزی استعمار کو ختم کرنے اور اس کے ظالمانہ رویہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کردینے کا ایک ناقابل تسخیر بغاوت کا علم بلند ہوا، یہ بغاوت انگریزوں کو ملک سے نکالنے اور زمام حکومت ان کے ہاتھ سے چھین کر ہندوستانی ہاتھوں میں دینے کے مقصد سے شروع ہوئی، اس میں سبھی طبقہ کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا،، اور اسلامیان ہند نے اس بغاوت کی قیادت کرنا ایک دینی فریضہ سمجھا، انگریزوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس کو ناکام بنانے کے لئے سامراجیوں نے ہر طرح کی تدبیریں کیں اور ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے، اور اخیر میں وہ باغیوں کو سزائے موت دینے لگے اور تختۂ دار کے بجائے درختوں کی شاخوں میں پھانسی کے پھندے لگا کر ان کی ہستی کا خاتمہ کرنا شروع کردیا، کہا جاتا ہے کہ صرف وہ علماء جو بغاوت میں پیش پیش تھے، ان کی تعداد ۳۰۰۰۰ سے ۵۰۰۰۰ تک ہے اور دہلی سے لیکر شاہجہاں پور تک مشق ستم کا یہ سلسلہ ایک خاص مدت تک جاری رہا۔

بغاوت کی ناکامی اور اس کے نتائج

بغاوت کی ناکامی کے نتیجہ میں اہل علم کی اتنی بڑی تعداد کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ہر طرف مایوسی کا دور دورہ تھا، دبے کچلے عوام تابعدار غلام بن کر فقر وافلاس کی زندگی گذار رہے تھے، لیڈروں اور رہنماؤں کا صفایا ہو چکا تھا، اور انگریز غاصبانہ قبضہ کے رقبہ کو بڑھانے میں اور اہالیان ہند کو خوفزدہ کرنے میں مصروف تھا، اخلاقی قدریں زوال پذیر تھیں، مذہبی تعلیمات اپنی بے بسی کا شکوہ کر رہی تھیں، اور قریب تھا کہ عوام الناس اپنے وجود کو بچانے کے لئے ''انگریز زندہ باد''، ''برٹش امپائر زندہ باد'' کے نعرے بلند کرنے لگیں، بلکہ واقعہ ہے کہ کچھ ایسی صورت حال پیش بھی آئی، اور اسلامی وجود مختلف قسم کے سنگین خطروں کا شکار ہو گیا، اسلامی تعلیمات، آسمانی کتاب وشریعت اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی اور ان کی سیرت مطہرہ سے ناواقفیت، کتاب وسنت کے احکام وتعلیمات سے انحراف ایک عام بات ہو گئی، اس وقت علماء کی جماعت کے کچھ حساس اور ذمہ دارانہ شعور رکھنے والے حضرات اس صورت حال سے بیحد فکر مند ہوئے اور ہندوستان میں اسلامی اقدار وعلوم اور اسلامی شریعت وتہذیب اور سب سے بڑھ کر عقیدۂ توحید کو بچانے بلکہ صحیح معنوں میں اس کو پھیلانے اور اس کی کمزور کردہ جڑوں کو مضبوط کرنے میں مصروف ہو گئے، اسی کے نتیجہ میں اسلامی درسگاہیں اور مدارس قائم کرنے کی تدبیریں کرنے لگے، اور درسگاہ ولی اللہی کے طرز پر مدارس کا قیام عمل میں آنے لگا، ان میں سب سے زیادہ جس مدرسہ کو قبولیت اور پھیلاؤ حاصل ہوا، وہ دیوبند کا مدرسہ دار العلوم ہے

دار العلوم دیوبند ایک دینی قلعہ

اس کے قیام سے نہ صرف مسلمانوں کے طبقہ میں اطمینان وسکون کی ایک لہر پیدا ہوئی اور اخلاقی زوال کو روکنے اور اس کے سیلاب پر بند لگانے کا عمل شروع ہوا، بلکہ وہ تمام اہالیان ہند کے لئے انگریزوں کے خلاف علم کے ایک مضبوط قلعہ کی حیثیت اختیار کر گیا، اور

یہ ۱۵؍محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق یکم مئی ۱۸۶۶ء میں ابتداءً حضرت مولانا محمد قاسم نانا توی ؒ کے زیر اشراف اس تعلیمی مرکز کا افتتاح ایک مسجد سے ہوا، پھر ایک عظیم تعلیمی اور تربیتی مرکز بلکہ ایک عظیم علمی اور دینی قلعہ شمار کیا جانے لگا، اور اس قلعہ میں پناہ لینے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا، اسی کے ساتھ اس کو جنگ آزادی کی قیادت بھی حاصل ہوئی، علماء اور عوام سب کا اعتماد بحال ہوا، دوسری طرف انگریزی استعمار کی سازشوں اور علماء کے خلاف اس کے سخت رویے اور ان کو حراست میں لینے اور قید و بند کی سختیوں میں مبتلا کرنے کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، جب پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو ۱۴؍ستمبر ۱۸۵۷ء میں علمائے اسلام نے شاملی کے میدان میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا صور پھونکا، اور انگریزی سامراج کو یہ باور کرادیا کہ جنگ آزادی کا یہ سیلاب اب رکنے والا نہیں ہے، اس لئے جس قدر جلد ممکن ہو، انگریز اس ملک سے اپنا بوریہ بستر باندھ کر نکل جائیں۔

یہی وہ دور تھا جب تھانہ بھون کے ایک طالب علم اشرف علی تھانوی نے ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں اس مضبوط قلعہ میں پناہ لی، اور علوم اسلامیہ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا، اور ۵؍سال تک وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک ممتاز عالم دین کی حیثیت سے متعارف ہوئے، اور بعد میں اپنے علمی اور دینی فوائد اور معرفت الٰہی کی محنت کے بعد "حکیم الامت" کے لقب سے مشہور ہوئے، اس وقت انہوں نے اصلاح معاشرہ کے میدان کو افراد کی تربیت کے ذریعہ اپنا لیا، اور اپنے کمالات عارفانہ سے بگڑے ہوئے معاشرہ میں زندگی کی روح پیدا کردی، اور ایک عظیم مصلح کی حیثیت سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کا تعارف ہوا، اور لوگ ان سے دینی اور علمی فائدہ حاصل کرنے کے لئے دور دور سے آنے لگے، اور حضرت تھانوی ؒ کی ذات اقدس سے بیعت وارشاد کے ذریعہ وابستہ ہونے کا سلسلہ چل پڑا، اور ماحول کی سخت مزاجی اور دین کا فہم اور علماء کے آداب کے بارے میں ناواقفیت کا طلسم ٹوٹا، اور حضرت تھانوی ؒ کے مواعظ، ان کی منظم زندگی اور اصول پسندی اور اسلامی آداب

کو عملی شکل عطا کرنے کا اس میں بہت زیادہ دخل ہے۔

حضرت تھانویؒ کا علمی اور دینی امتیاز

باوجود اس کے کہ حضرت تھانویؒ کے زمانہ میں اہل علم کی بڑی شخصیات موجود تھیں، لیکن محض توفیق الٰہی سے اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانویؒ کو امت کی بیماریوں کو سمجھنے اور اس کی نبض شناسی کا ملکہ عطا فرمایا، وہ معاشرہ کی ان بیماریوں کے ساتھ انفرادی زندگی میں بھی علاج کے فن سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ ایک عظیم طبیب حاذق کا درجہ رکھتے تھے، وہ مریضوں کی نفسیات کو پوری طرح سمجھ کر علاج تجویز کرتے تھے، وہ معاشرے کے ہر طبقہ کے مزاج سے واقف تھے، چنانچہ ''بہشتی زیور'' کی عظیم الشان تصنیف میں آپ نے ہر طبقہ کے فائدے اور اسکی اصلاح کے لئے نہایت قیمتی مواد جمع کر دیا ہے، اس میں عورتوں، بچوں، مردوں اور ہر سطح کے لوگوں کے لئے ایسے مضامین، فوائد اور مواد جمع کر دیئے گئے ہیں، جو ہر اعتبار سے ایک تربیتی مدرسہ کہے جانے کے قابل ہے، لڑکیوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم ومعلومات کے لئے اس کتاب کے مضامین میں معانی ومفاہیم کا ایک سمندر موجزن ہے، اس کو پڑھ کر عورتوں کے طبقہ میں تعلیم کی کمی کا احساس ختم ہو جاتا ہے، اسلئے اس کتاب کی حیثیت ایک تربیت گاہ کے برابر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

بہشتی زیور کی خصوصیات

یہ کتاب نہ صرف عورتوں کے لئے ایک موسوعۃ (انسائیکلو پیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ اس کے مضامین، اس کے ابواب وفصول اور اس کا اسلوب بیان اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس سے اہل علم اور عوام وخواص سبھی ایک اسلامی زندگی کی تشکیل وتشریح میں مستقل طور سے استفادہ کر سکتے ہیں اور اس سے اپنے علم اور معلومات میں بیش قیمت اضافہ کر سکتے ہیں، صرف اسی ایک کتاب سے حضرت تھانویؒ کے تبحر علمی اور فراست ایمانی کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے، خاص طور سے جب کہ یہ کتاب اپنی اصلاحی اور تربیتی زندگی کی ابتدائی

مدت میں تالیف فرمائی، اوراس قدر مفصل اور جملہ حالات زندگی پر مشتمل اور فقہ اسلامی کے تمام ضروری مسائل پر حاوی کہ شاید ہی کوئی ایسا گوشہ رہ گیا ہو، جو کتاب کے دائرہ میں نہ آسکا ہو۔

کانپور میں اپنے زمانہ قیام کے دوران یعنی مدرسہ فیض عام اور مدرسہ جامع العلوم کی صدر مدرسی کے ساتھ تصنیف و تالیف اور دعوت وارشاد کا سلسلہ جاری رہا، اور مواعظ حسنہ کی مجلسیں قائم ہوتی رہیں، جن میں عوام وخواص شرکت کر کے اپنے دینی مستقبل کی تعمیر میں اور شرک ومعصیت کے شائبہ سے دل ودماغ کو پاکیزہ کرنے میں مصروف ہو جاتے اور لوگوں کا رجحان دین سے تعلق اور اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ سے محبت پیدا کرنے کی طرف نہایت شدت کے ساتھ ہو جاتا۔

تھانہ بھون میں مستقل قیام

ان مواعظ حسنہ کا سلسلہ تھانہ بھون کے زمانہ قیام میں بہت منظم انداز سے شروع ہوا اس وقت آپ اپنا سلسلہ کانپور سے ختم کر چکے تھے اور دو مرتبہ حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے، آپ کا بنیادی مقصد اصلاح باطنی اور اخلاقی بلندی اور دین سے گہرا تعلق قائم کرنا تھا، کتاب وسنت کے بحر زخار میں غوطہ زنی کرنے کی وجہ سے آپ پر تزکیہ واصلاح کے نئے نئے دروازے کھلتے تھے اور تعلیم وتزکیہ کے ذریعہ دین وشریعت کے اسرار وحقائق آپ پر منکشف ہوتے تھے اور اس کی روشنی کا فیض حاصل کر کے خود ایک مینارۂ نور کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اور ذہن ودماغ کی تاریکیوں کو اجالوں میں تبدیل کر دینا آپ کا شیوہ وشعار بن چکا تھا۔

حضرت تھانویؒ کی اصول پسندی اور اصلاح امت

حضرت تھانویؒ طریقۂ بیعت وارشاد میں اپنے اصولوں کے سخت پابند تھے، وہ ہر آنے جانے والے اور بیعت کا ارادہ ظاہر کرنے والے لوگوں سے سختی کے ساتھ پیش آتے تھے، اور جب تک وہ پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے، بیعت وارشاد کیلئے راضی نہیں ہوتے

تھے،اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ایک خط جوانہوں نے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں بھیجا تھا، اس کا مختصر خلاصہ اور مختصر جواب درج کرنا مناسب معلام ہوتا ہے، تا کہ حضرت تھانویؒ کا ارشاد و بیعت کے بارے میں نقطۂ نظراوراصول پسندی پوری طرح عیاں ہوجائے، یہ قصہ اس وقت کا ہے جب مولانا دریابادیؒ نے اپنے ماضی کی لغزشوں سے تائب ہوکر ایمانی زندگی کی طرف مراجعت کی تھی۔

مولانا دریابادیؒ کی اجازت کے بعد حاضری

انہوں نے اپنے خط میں لکھا:''ایک انگریزی خواں ہوں ،مدتوں مغربی فلسفہ کے اثر ضلالت بلکہ الحادکی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا،خدااوررسول کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا، برسوں کے بعداسلام وایمان کی طرف مراجعت نصیب ہوئی ،زیادہ تر مثنوی کی برکت سے گو اسے بھی بے سمجھے ہی پڑھا ،اکبرالہ آبادی کی صحبتیں بھی اصلاحی اثر ڈالتی رہیں،اب سچ ہفتہ وار کے ذریعہ سے اپنی بساط کے لائق دین کی خدمت میں لگالپٹا ہوا ہوں ،اوراپنے لکھے ہوئے کوآپ ہی مٹاتا رہتا ہوں۔

ماضی کی بیہودگیوں کا تو ذکر وحساب ہی نہیں،خدامعلوم اب بھی صراط مستقیم سے کتنی دور ہوں ، اب تک کسی بزرگ سے نہ بیعت نصیب ہوئی نہ طویل صحبت ،دل کی کشش صاحب مثنوی کے بعدشارح مثنوی حاجی صاحب مہاجرمکی کی جانب رہی،زندہ ہستیوں میں نظر بار بارمولاناحسین احمدصاحب کی جانب اٹھتی ہے،بعض احباب کا مشورہ مولانا انورشاہ صاحب سے متعلق ہے،مشیر ومبصرآپ سے بڑھ کراورکون مل سکتا ہے،جناب کی تصانیف سلوک حال میں دیکھیں،اوردل پھڑک گیا،اب تک آپ کوصرف مولوی کی حیثیت سے جانتا تھا،عارفانہ کمال کا حال تواب کھلا،گوگستاخی معاف،جناب کی سیاسی رائیں اب بھی میرے لئے معمہ ہیں۔

بہرحال درخواست اموزذیل میں رہنمائی کی ہے:

(۱) موجودہ بزرگوں میں سے کس کا انتخاب بیعت وصحبت کے لئے کروں؟

(۲) اپنی اصلاح قلب کے لئے خود جناب والا سے بھی مراسلت اور تھانہ بھون میں حاضری کی اجازت چاہتا ہوں"

از: اشرف علی

السلام علیکم

آپ کی راستی وسادگی سے جی خوش ہوا، اللہ تعالی آپ کو حقائق امور تک پہنچائے، ہر جزء کا مفصل جواب غیر ضروری ہے، بعد انتخاب مہمات کا جواب عرض کرتا ہوں:

(۱) بیعت کا معیار آپ نے کیا تجویز کیا ہے، اس کی تنقیح اول ضروری ہے، تاکہ اسی معیار پر مصلح کا انتخاب ہو سکے۔

(۲) تھانہ بھون کا ارادہ کس خیال سے ہے، ضرورت تحقیق کی یہ ہے کہ میں دیکھ سکوں کہ آپ کا وہ مقصود یہاں آنے سے حاصل ہوسکتا ہے یا نہیں؟ نیز اس کا ظاہر فرمانا بھی ضروری ہے کہ آپ یہاں تشریف لا کر خاموش رہیں گے یا کچھ بولیں گے بھی۔

(۳) امراض قلبی کا علاج ترتیب میں تجویز شیخ سے مؤخر ہے۔

والسلام

از تھانہ بھون (۱)

تھانویؒ اور مدت اصلاح وارشاد

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ستاون سال تک تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ میں اصلاح وارشاد کے کاموں میں اشتغال فرمایا، اور نہایت انہماک ودلجمعی کے ساتھ تعلیم وتربیت ، اصلاح وارشاد، بیعت وسلوک ،تصنیف وتالیف اور عوام وخواص کے درمیان مربیانہ شفقت کیساتھ ایک طویل مدت گذارنے کی توفیق حاصل ہوئی ، اور اللہ تعالی نے آپ کو اپنے فضل

(۱) حکیم الامت نقوش وتأثرات مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

خاص سے خصوصی مقبولیت عطا فرمائی، یہاں تک کہ انحائے ملک اور دور دراز علاقوں سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جب کہ اجازت کے بغیر حاضری ممنوع تھی، آپ کی عظمت شان ہی کا نتیجہ تھا اور نہایت مخلصانہ تعلق اور اللہ اور اس رسول ﷺ کی اطاعت سے دل ودماغ کے معمور ہونے کا کرشمہ تھا کہ ان تمام پابندیوں کے باوجود ہر طرف سے لوگ کشاں کشاں صلاح وفلاح کے جذبہ سے اس شمع معرفت پر پروانہ وار گرتے تھے، خاص طور سے اہل علم کی منتخب شخصیات نے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور آپ سے اصلاح وارشاد کا درس لینے کے لئے حاضری کی اجازت طلب کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی، ندوۃ العلماء کے حلقہ سے علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، مولانا مسعود علی ندوی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمھم اللہ، حضرت تھانوی سے نہایت گہری عقیدت اور اصلاح حال کا تعلق رکھتے تھے اسی طرح پورے ملک کے بے شمار علمائے کبار عقیدت وارادت کا تعلق رکھتے تھے اور علماء دیوبند وسہارنپور اور کبار علماء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

لکھنؤ میں مولانا تھانویؒ اور ان کی مجالس

۱۹۳۸ء میں حضرت تھانویؒ علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے، اور چالیس دن تک لکھنؤ میں قیام فرمایا، یہ واقعہ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے کہ حضرت تھانویؒ نے سفر کرنا چھوڑ دیا تھا اور تھانہ بھون میں مستقل طریقہ سے قیام پذیر تھے، اسی زمانہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا رسالہ ''القول المنصور'' زیر طبع تھا، حضرت تھانویؒ کو اس کام سے انتہائی درجہ کا تعلق تھا، انہوں نے اس کی تصحیح کا اہتمام نہایت شدومد سے کیا اور اس کی ذمہ داری حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کی، مولانا بیان فرماتے ہیں:

''اگست ۱۹۳۸ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے، اور چالیس دن قیام فرمایا، یہ نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ دور ونزدیک کے اضلاع کے لئے بھی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی کہ حضرت مولانا عرصہ سے سفر ترک فرما چکے تھے، اور طالبین ومخلصین کے لئے تھانہ بھون جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، مگر اب کنواں خود پیاسوں کے پاس آ گیا تھا اور معالج روحانی جسمانی علاج کے لئے مریضوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا، بھائی صاحب نے جو ایسے مواقع کی قدر وقیمت خوب جانتے تھے، اور خاندانی طور پر مولانا کے معتقد اور انکے کمال کے قائل تھے، ایک طالب علم کی طرح اس مدرسہ میں جو بعد ظہر مولوی حسن صاحب (مالک انوار المطابع لکھنؤ) کے مکان اور بعد عصر ''مسجد خواص'' میں لگتا تھا، حاضری دینی شروع کی، مجھے بھی وہ التزاماً اپنے ساتھ لیجاتے تھے، قسمت سے اس وقت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا رسالہ ''القول المنصور'' زیر طبع تھا، اور مولانا کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا، جس میں طویل طویل عربی کی عبارتیں تھیں، وصل بلگرامی صاحب نے تصحیح ومقابلہ کا کام میرے سپرد کردیا، اس تقریب سے مولانا سے اور قرب وحضوری کا موقع ملا، ۱۵ ستمبر ۳۸ء کو مولانا اپنی خواہش سے ''مسجد خواص'' سے پیدل چل کر ہمارے مکان پر تشریف لائے اور بھائی صاحب کے مطب میں تھوڑی دیر تشریف رکھ کر اس خصوصیت کا اظہار فرمایا، جو سارے علماء ومشائخ دیوبند کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے رہی ہے''(۱)

مختصر حالات زندگی کے بارے میں

حضرت تھانویؒ کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ چہارشنبہ کے دن ہوئی، ابتدائی

(۱) کاروان زندگی ج ۱/ ۱۷۳۔ ۱۷۴

تعلیم مولانا فتح محمد تھانویؒ سے حاصل کی ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۰۱ھ تک دار العلوم دیو بند میں بحیثیت طالب علم داخل ہوئے اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے درس حدیث لیا، فراغت کے بعد کانپور کے مدرسہ میں مسلسل چودہ سال تک قیام فرمایا اور درس وتدریس کے ساتھ اپنے مواعظ اور فتاوی کا سلسلہ بھی جاری رکھا، ابتداءً حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے واسطہ سے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے غائبانہ بیعت کی، یہ ۱۲۹۹ھ کا زمانہ تھا، ۱۳۰۱ھ میں حج کی نیت سے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہوکر براہ راست بیعت کا شرف حاصل کیا، اور ان کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا، حج سے واپس آنے کے بعد تقریباً نو سال تک علمی مشاغل، درس وتدریس، تصنیف وتالیف میں مشغول رہے، اور ۱۳۱۰ھ میں دوبارہ حج کا ارادہ کیا اور وہاں حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی کی خدمت میں ایک عرصہ تک قیام کیا، اور تربیت وتزکیہ کا فائدہ اٹھایا، حاجی صاحب کے مشورہ کے مطابق ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے منتقل ہوکر تھانہ بھون میں مستقل قیام کی نیت فرمائی، اور مسلسل ستاون سال تک خانقاہ امدادیہ میں بیٹھ کر روحانی فائدہ پہنچایا، اور ایک خلق کثیر کو اپنی برکات ومواعظ سے اور اپنی تصنیف وتالیف سے لاکھوں انسانوں کو فائدہ پہونچایا، ان میں سے ایک بڑی تعداد کو اللہ تعالی نے ولایت کا درجہ عطا فرمایا۔

کچھ تصنیفات کے بارے میں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات ورسائل کی تعداد تقریبا آٹھ سو بتائی جاتی ہے، اور جملہ تصنیفات علمی تحقیقات، دینی حقائق اور احسان وتزکیہ کے اسرار سے معمور ہیں، اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کا اقتباس حضرت کی تصنیفات کے بارے میں یہاں نقل کردیا جائے جس سے ایک طائرانہ معلومات کا مقصد حاصل ہوجائے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:

’’حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف ورسائل کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے،

اور کل کی کل تحقیقات علمیہ، حقائق دینیہ اور نکات احسانیہ سے لبریز ہیں، ان میں تفسیر البیان، شرح مثنوی، فتاوی امدادیہ، التعرف الی التصوف اور بہشتی زیور وغیرہ کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں، ملفوظات اور مواعظ وخطبات کی تعداد سینکڑوں کی حد تک ہے، ان تصانیف میں قرآن پاک کی مشکل آیات کریمہ کی تفسیر، احادیث شریفہ کی شرح، فقہ کے مشکل مسائل کا جواب، سلوک وتربیت کے نکتے، اخلاقی فضائل ورذائل کی حکیمانہ تحقیق اوران کے حصول وازالہ کی تدابیراور زمانۂ حال کے شکوک وشبہات کے جوابات سب کچھ ہیں، تصانیف میں متفرق علوم ومسائل اس کثرت سے ہیں کہ اگران میں سے کسی ایک موضوع کے مباحث کوعلیحدہ کیا جائے تو ایک ایک مستقل کتاب بن جائیں، چنانچہ حضرت کے تربیت یافتوں نے اس قسم کے بیسیوں مجموعے تیار کئے ہیں، سب سے اخیر میں اس قسم کا مجموعہ ''بوادر النوادر'' کے نام سے ایک ہزار صفحوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے، خطوط کے جوابات کا جن کے متعلق وفات کے دن تک یہ اہتمام رہا ہے کہ آج کے خط کا جواب کل کے لئے اٹھا نہ رکھا جائے، عظیم الشان دفتر الگ ہے۔

تصنیفات بلکہ ہر تحریر میں اہل نظر کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا مصنف کے سامنے مسائل ومواد یکجا ہیں، اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے، عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مصنف جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے، اس کو اس میں ایسا غلو ہو جاتا ہے کہ دوسرے گوشوں سے اسکو ذہول ہو جاتا ہے، حضرت کی تصانیف کی خاص بات یہ ہے کہ قلم ہر ایک کی احتیاط اور رعایت کر کے اور غلو سے بچ کر اس طرح نکلتا ہے کہ جاننے والوں پر حیرت چھا جاتی ہے، حضرت کا ترجمۂ قرآن پاک تاثیر وسہولت بیان اور وضوح مطالب میں اپنی آپ نظیر ہے، بہشتی زیور کہنے کو تو عورتوں کی کتاب ہے، مگر فقہ حنفی کی ضروریات کے لئے انتہائی احتیاط وکاوش کا نتیجہ ہے، تفسیر القرآن کو یوں سمجھنا چاہئے کہ روح المعانی اور تفاسیر ماسبق کی اردو میں حد درجہ محتاطانہ ترجمان ہے، سلوک وطریقت کی کتابوں کا بھی یہی حال ہے''۔(۱)

---

(۱) یاد رفتگاں: ۲۵۵۔۲۵۶

حضرت تھانویؒ سب کے لئے نمونہ

حضرت تھانویؒ کی زندگی متوازن جامعیت کی نمائندگی کرنے میں بے مثال کردار کی حامل ہے، آپ کی ہمہ جہت شخصیت امت اسلامیہ کے ہر فرد کے لئے ایک عظیم الشان نمونے کی حیثیت رکھتی ہے، غور کیجئے کہ ایک طرف تقوی اور تعلق باللہ اور معرفت الہی اور ولایت ومعاملات میں درجہ کمال تک پہونچے ہوئے ہیں، تو دوسری طرف تبحر علمی، کتاب وسنت کے اسرار ورموز کی گہرائیوں تک پہونچنے اور اتباع سنت ودعوت الی اللہ اور اس تربیت کے اسلوب کو حکمت وموعظت کی باریکیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اختیار کرنے میں یکتائے روزگار ہیں، اور اس غیر معمولی صفت میں اپنے معاصر علماء کے مابین امتیازی شان کے مالک ہیں۔

حضرت تھانویؒ کے مواعظ میں علم وحکمت کا سمندر موجزن ہے، ان کے فوائد کسی ایک طبقہ کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ حاضرین کے لحاظ سے مضامین کی آمد ہوا کرتی تھی، اور اسلامی زندگی اور سیرت کی تعمیر میں ان کا کردار نہایت مؤثر ہوتا تھا اور آج بھی ان مواعظ کی حیثیت ایک باعمل مربی اور مرشد کی ہے، اس لئے ان کا فیض تا قیامت جاری رہنے میں کوئی شک نہیں ہے۔

اصلاح کے میدان میں فکرمندی اور اس کے بہترین نتائج:

بہت سے غلط رسوم وعادات مسلم معاشرہ میں داخل ہو جانے کی وجہ سے حضرت تھانویؒ ان کی اصلاح کے لئے فکرمند اور ہر سطح پر ان کو مٹانے کی کوشش میں سرگرم رہا کرتے تھے، بدعات اور پیر وقبر پرستی کی مخالفت اور مسلم معاشرے کو اس سے پاک کرنے کی سعی مسلسل میں مشغول رہتے اور ہر ممکن ذریعہ اس کو ختم کرنے کے لئے استعمال کرنا ضروری خیال کرتے تھے، مجالس وعظ میں شرکت کرنے والے اور بعد میں مواعظ سے مستفید ہونے والے ہر شخص نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، اسی لئے حضرت تھانویؒ کو اس نظر سے دیکھا جائے تو وہ اپنے زمانہ کے مجدد شمار کئے جانے کے پوری طرح اہل ہیں اور بہت سے

سوانح نگار حضرات نے آپ کو مجدد کے لقب سے متصف بھی کیا ہے۔

اگر چہ حضرت تھانویؒ ہمارے درمیان جسمانی حیثیت سے موجود نہیں ہیں، لیکن ان کی پاکیزہ زندگی پورے آب وتاب کے ساتھ نہ صرف ہندوستان کے گوشے گوشے میں جلوہ گر ہے، بلکہ ان کی تعلیمات وہدایات اور ان کا طریقہ دعوت وتربیت، ان کے مواعظ وارشادات کے اثرات دنیا کے ہر زندہ انسانی معاشرہ میں موجود ہیں، ان کی خدمات، زندگی اور کارناموں پر عربی زبان میں مفصل کتاب منظر عام پر آچکی ہے، اس سے عرب دنیا کے علماء وصالحین کو بھی ان کے کارناموں اور دعوت وتربیت کے میدان میں انکی بے مثال کوششوں اور کاوشوں سے بھی واقفیت ہوگی، اس کتاب کے مصنف ایک ندوی عالم ادیب جناب مولانا رحمت اللہ ندوی ہیں اور وہ قطر میں وزارت دفاع میں مؤظف ہیں، کئی اہم کتابوں کے محقق اور مصنف ہوتے ہوئے اس کتاب کو انہوں نے زیادہ مرکز توجہ بنایا، اللہ تعالی ان کو ہر طرح کی جزائے خیر دین ودنیا ہر جگہ عطا فرمائیں، اور اس کتاب کو لباس قبولیت سے مزین فرمائیں۔

☆☆☆

دارالمصنفین، اوراس کے اولین معمار!

دارالمصنفین کے مؤسس اعظم علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں، ان کے ہاتھوں اس عظیم ادارہ کا سنگ بنیاد نومبر ۱۹۱۴ء میں رکھا گیا، اوراس نے اپنی علمی و تحقیقی شناخت بہت جلد قائم کرلی، اور ملک وملت میں اس کی پہچان ایک علمی تحقیقی اور تصنیفی ادارہ کے حیثیت سے قائم ہوئی، علامہ شبلیؒ کے ذہن میں اس عظیم ادارہ کی تأسیس کا خیال سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں آیا اور اس کو ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی کی صدسالہ رپورٹ میں انھوں نے پیش کیا، اوراس ادارہ کوقائم کرنے کا جذبۂ صادق علامہ کےدل میں کچھ اس طرح سمایا کہ انھوں نے ندوۃ العلماء کی رکنیت سے مستعفی ہوکراس علمی خواب کو بروئے کارلانے کے لئے اور جملہ مشغولیات سے یکسو ہوکر اپنے وطن اعظم گڑھ میں قیام کرلیا، اور من جانب اللہ اس کام میں بڑی برکت اور پیش رفت ہوئی اور سیرت کے اس عظیم الشان کام کی بنا پڑگئی، جس کی تکمیل بعد میں علامہ کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کرکے دارالمصنفین کے مقام کا تعارف پورے عالم میں کرایا۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ جو نہ صرف برصغیر ہندوپاک میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے، بلکہ پورے عالم اسلام میں وہ اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے، اور پورے عالم اسلام میں وہ اپنی نادرۂ روزگار اور بیش بہا علمی وادبی خدمتوں کی وجہ سے متعارف ہے، اگر وہ اپنی خدمات سے ملک کوروشناس کرانے اور علمی طبقہ میں اپنی اہمیت واضح کرنے کے لئے کوئی ایسا اجتماع منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، جس میں ہر طبقہ علم اور مکتب فکر کے نمائندے اور اہل علم وبصیرت جمع ہوں تو یہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی جس پر تعجب یا حیرت کا اظہار کیا جاسکے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ماضی میں بھی اس طرح کے اجتماعات کے منعقد ہونے کی ضرورت تھی، اور بلاشبہ

نصف صدی پورے ہونے کے انتظار میں یہ کام کافی موخر ہو گیا تھا۔

دارالمصنفین ہی وہ واحد ادارہ ہے، جس نے بلند نظر اور ژرف نگاہ علماء اور مصنفین کی ایک ایسی جماعت تیار کی، جو عہد حاضر میں اسلام کی خدمت کے میدان میں ایک اہم خانہ پر کرتے ہیں، اور جو موجودہ متمدن دنیا میں وہ کردار ادا کر سکتے ہیں، جو دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر کو اسلام کے ابدی اور ہمہ گیر پیغام پر غور کرنے اور سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کرنے پر مجبور کر سکتا ہے، اس ادارہ نے جس پروگرام کو اپنایا اور جس نقطہ نظر کو عام کرنے کی ذمہ داری قبول کی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک وقوم میں ایک عظیم ذہنی اور فکری انقلاب برپا ہو، اس نے زندگی کے ہر میدان میں اور علم وادب کے ہر شعبہ میں جو خدمت انجام دی ہے، وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، اور جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

"اگر ہم آج سے پچاس سال قبل ہندوستان کی علمی اور فکری تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات بالکل واضح طور پر نظر آئے گی کہ اس وقت ہندوستان میں ہر قسم کی تعلیمی اور تمدنی خدمت کے لئے کوئی نہ کوئی مرکزی ادارہ موجود تھا، لیکن صرف مصنفین کا ایک ایسا بے سروسامان گروہ تھا جس کی وابستگی کے لئے ہندوستان کے طول وعرض میں کوئی مرکز موجود نہ تھا"۔

اور یہی نہیں، بلکہ مستشرقین یورپ نے جب اسلامی علوم وآداب پر تحقیق کا کام شروع کیا تو ان میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا، جس نے مخالفانہ نقطہ نظر سے اسلامی علوم وآداب پر نظر ڈال کر "تحقیق وریسرچ" کے نام سے ایک نیا محاذ جنگ قائم کیا، اور اسلام، داعی اسلام، اور اسلامی علوم وآداب اور اسلامی تہذیب وتمدن پر اس نے بے پناہ حملے شروع کر دئے۔

یورپ کے اس قسم کے لٹریچر سے جو بظاہر تحقیق وریسرچ کا ایک مرقع تھا اسلام کو ایسا شدید نقصان پہنچا کہ اگر اس زہر قاتل کا کوئی تریاق نہ تیار کیا جاتا تو اسلامی علوم وفنون شکوک وشبہات کا ایک ذخیرہ بن کر رہ جاتے، جو ذہن ودماغ کو متاثر کرنے اور اسلام کی برتری اور اس کی ابدیت سے انکار کا ذہن پیدا کرنے کے لئے ایک بہت بڑا محرک ثابت ہوتے۔

علامہ شبلیؒ نے یہ سب کچھ دیکھا، ان کی ناقدانہ نظر اور زمانہ شناس نگاہ نے علوم وآداب کی راہ سے اسلام پر کئے جانے والے اس حملہ کا احساس کر لیا، انہوں نے اپنے احباب وتلامذہ کی ایک جماعت کے ساتھ دارالمصنفین کو اسی مقصد کے لئے قائم کیا، اسلامی علوم وآداب اور اسلامی تاریخ کو تحریفات سے محفوظ رکھنے کے لئے اور اس کے سرچشمہ ہدایت کو جاری رکھنے کے لئے انھوں نے ایسا انقلابی قدم اٹھایا جس کی بنیاد محض اخلاص اور خدمت دین پر تھی۔

۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کے ذمہ دار حضرات اور ارباب حل وعقد سید صباح الدین عبدالرحمن اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی سربراہی میں ادارہ کا جشن طلائی منعقد ہوا، اور ۲۰ رفروری ۱۹۶۵ء کو اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس کا افتتاح کیا، اور اس موقع پر ایک بہترین اور مؤثر تقریر فرمائی، اس جشن میں ملک کے مختلف حصوں سے بڑی تعداد میں اونچی ثقافت اور علم وادب سے آراستہ ایسے لوگ شریک ہوئے، جو ملک کے اندر تعلیمی وادبی تحریکیں چلاتے ہیں پہلے دن کے جلسے میں حکومت اترپردیش کی وزیراعلیٰ مسز سوچتا کرپلانی اور شہزادی ساجدہ بیگم، ریاست بھوپال کی امیرہ، اور ہندوستان میں مملکت عربیہ سعودیہ کے سفیر جناب شیخ احمد الشبیلی شریک ہوئے، ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر اعانت کا اعلان کیا، حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی طرف سے ۵۰ رہزار، حکومت اترپردیش اور بیگم بھوپال کی طرف سے ۱۰ رہزار، سعودی سفیر کی طرف سے ۵ رہزار جو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی معرفت پیش کیا گیا۔

اس جشن میں ندوۃ العلماء کا وفد حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ کی سربراہی میں شریک ہوا، اس کے پروگراموں کی ترتیب میں اس نے پورے جوش وسرگرمی سے حصہ لیا، حضرت مولانا نے تمام مندوبین کے سامنے سعودی سفیر کا تعارف بھی کرایا، اور ان کے سامنے دارالمصنفین کا تخیل پیش کیا، جس کو علامہ شبلیؒ نے قائم کیا تھا، وہ اپنے عہد میں جامع اور باکمال شخصیت کی حیثیت سے ابھرے، اور مختلف جہات سے مسلمانوں کی

قیادت کا فریضہ انجام دیا، اور جدوجہد آزادی میں ناکامی کی بنیاد پر یہاں کے مسلمانوں پر مایوسی اور افسردگی کی کیفیت کو مٹانے اور ان کو جوہر علم سے آراستہ کرنے میں اپنی تمام تر توانائیوں کو صرف کرنے میں مشغول ہوئے، انہوں نے عالم اسلام کو اپنے قلم کی جولانی اور اپنی فکر کی شادابی سے بہت کچھ عطا کیا، ان کی ہمہ جہت روشن اور شاندار زندگی کا ہر پہلو نہایت مشہور ومعروف ہے، وہ روشن خیال ہونے کے ساتھ روشن ضمیر بھی تھے، وہ اپنی تابناک زندگی میں یکتائے روزگار تھے، وہ وسیع الخیال، ودور اندیش اور ایک شاداب اسلامی فکر کے نمائندے تھے، وہ قدیم وجدید کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا تھے، وہ اپنے عصر کے ممتاز عالم ومؤرخ اور ادیب تھے، وہ جس موضوع پر لکھتے اس کا حق ادا کردیتے اور ایسے نت نئے گوشوں کو عالم آشکار کرتے تھے کہ بڑے بڑے مؤرخین اہل علم ودانش اور سنجیدہ فکر کے حامل حضرات بھی ششدر رہ جاتے اور ان کا علمی لوہا مانتے، اور ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوجاتے، انھوں نے اپنے بیش قیمت ویگانہ روزگار تصانیف کے ذریعہ تحقیق وادب کی دنیا میں انقلاب برپا کیا، اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے اور اس کی گہرائیوں کا جائزہ لینے کے لئے، انھوں نے علم وتحقیق کا ایک نیا باب کھولا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سیرت مبارکہ سے مستفید ہونے اور منہج اسلامی کا خوبصورت اور چمکدار چہرہ دیکھنے اور اس پاکیزہ اور بلند سراپا کو اسلام کے نام لیواؤں اور اسلامی زندگی کی نمائندگی کرنے والوں کو کس طرح اپنے اندر سمولینا چاہئے، اس کے لیے انھوں نے نہایت پختہ اور مؤثر اسلوب کو اپنی کتاب سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جلدوں میں پیش کیا، اور علم وتحقیق کے میدان میں ایک نئی دریافت کا اضافہ کیا۔

علامہ شبلیؒ نے اپنی زندگی کے آخری ۳۲ (بتیس سال) از ۱۸۸۲ء تا ۱۹۱۴ء کے درمیان علم وتحقیق کی دنیا میں ایک ایسا زندۂ جاوید نمونہ پیش کیا، جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں شاذونادر پائی جاتی ہے، اور ہندوستان کی تاریخ میں اس کو ایک درخشاں باب

تصور کیا جاتا ہے، اور عہد جدید میں وہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے اسلامی معاشرے کو اپنی خداداد صلاحیتوں سے ہر اعتبار سے باشعور بنانے کی کوشش کی، انھوں نے علی گڈھ اور ندوہ سے وابستہ رہ کر مقصدیت کی روح کو ترجیح دینے میں اہم کردار ادا کیا، جیسا کہ ان کے ہم عصر مؤرخ اور عالم وادیب علامہ سید عبدالحی حسنیؒ متوفی ۲۰ رفروری ۱۹۲۳ء (والد بزرگ حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ) نے اسلامی کتب خانہ کو اپنی تحقیقی اور تاریخی تصنیفات کے ذریعہ زینت بخشنے اور ہندوستان کے تاریخی اسلامی ورثہ سے اہل علم کو متعارف کرانے کا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔

تدوین سیرت کے مطالعہ میں انہماک کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانیؒ نے مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے نام خط میں تحریر کیا ہے۔

"میں اب سیرت ابتداء سے اس طرح لکھ رہا ہوں کہ مکمل ہوتی جاتی ہے، اور ساتھ ہی مطبع میں دیدی جاتی ہے،، لیکن اس ترتیب میں بعض جگہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اور بعض مباحث ایسے پیش آجاتے ہیں کہ استفسار وتحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے، سیرت کے لئے چندروز بہ استقلال الہ آباد میں رہنا بھی ضروری ہے"۔

کتاب سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پہلا حصہ قریب بہ تکمیل تھا، غزوات پر ایک مستقل باب کتاب کے اخیر میں کرتے ہوئے اپنے شاگرد سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کے نام بھیجے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

" سیرت کا پہلا حصہ گویا ختم ہوگیا ہے، غزوات کا ایک مستقل باب اخیر میں لکھا ہے، اور تمام غزوات ایک خاص سلسلہ میں آگئے ہیں، بہت سی باتیں نئی ہاتھ آئیں، ارادہ ہے کہ دوتین مہینے میں ابتدائی اجزاء مطبع میں بھیج دوں، غزوات کا پلین نہایت مرتب مسلسل اور صاف ہوگیا ہے، تمام سراپا چند خاص قبائل سے تعلق رکھتی ہے، جو قریش کے حلیف تھے جن کے پیشۂ غارت گری

کو نقصان پہونچتا تھا، اور مراحل بھی اچھی طرح طے ہو گئے ہیں۔ علالت کی وجہ سے ہر روز دو گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرسکتا"۔

علامہ شبلیؒ نے سیرت نبویؐ کی ہمہ گیریت کو ایک نئے انداز اور خالص تحقیقی اسلوب میں پیش کرنے کے لئے کتنی محنت اور جانفشانی کی، اور اس راہ میں انھوں نے کسی رکاوٹ کو حائل نہیں ہونے دیا۔ ان کو ذات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کس درجہ گہرا اور والہانہ تعلق تھا؟ اس کا مختصر خاکہ حیاتِ شبلی میں علامہ سید سلیمان ندوی (رحمہ اللہ) نے جامعیت اور اختصار کے ساتھ کھینچا ہے، ملاحظہ ہو:

"۱۹۱۰ء سے جب وہ ہر طرف سے سمٹ کر سرکار رسالت کے آستانہ پر حاضری کے لئے بے تاب ہو رہے تھے، ان کی ساری ذہنی توجہ دوسرے علمی وکلامی مباحث سے ہٹ کر صرف اسی ایک مرکز پر مجتمع ہو گئی تھی، ان کے پاس نہ ابن رشد وغزالی اور رازی وبوعلی سینا کا گذر ہے، نہ تاریخ وکلام وفلسفہ کا نام ہے، شب وروز کتب احادیث وسیرت کی کتابوں کا مطالعہ تعلیمات نبوی کی ترتیب، اخلاق نبوی کی تحریر، سوانح نبوی کی تلاش، اور سیرت نبوی کی نادر کتابوں کی جستجو، اور جہاں بیٹھتے، کھری چارپائی ہو، یا چٹائی ہو، ہر طرف حدیث کی کتابوں اور سیرت کے نسخوں کا ڈھیر ہوتا، اور انھیں درباریوں کی ہم نشینی میں ان کا سارا وقت گذر جاتا، اور خوش ہوتے کہ اب وہ ہے اور دربار رسالت کا آستانہ، (مکاتیب اول عبدالحکیم ۳)۔ چنانچہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے یہی ایک خیال ان پر چھارہا تھا، یہی ان کے مجلس کی گفتگو تھی، اسی کے لئے خط وکتابت تھی، اس زمانہ سے لے کر اخیر عمر تک ان کے سارے خطوط ومکاتیب کو پڑھ ڈالیے، ان میں تین باتیں آپ کو ملیں گی، ندوہ کی اصلاح، اسلام کی اشاعت وحفاظت، اور سیرت نبوی، یہاں تک کہ دم نزع میں بھی آخر لفظ جو ان کی زبان سے نکلا وہ سیرت ہے، سیرت کی حیثیت ان کی نظر میں ایک کتاب کی نہ تھی، بلکہ وقت کے علم کلام کی، سب سے بڑی ضرورت کا نام ان کی زبان میں سیرت تھا، فرماتے ہیں:

''اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا، اس کے حالات واخلاق اور عادات کیا تھے۔ (مقدمہ سیرت)

اس بنا پر ان کی اصطلاح میں سیرت کلمہ اسلام کے دوسرے جزء یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تشریح وتفسیر کا نام تھا، اور یہی ان کی اخیر زندگی کا کارنامہ تھا، اور اس کو وہ سرمایۂ سعادت دارین سمجھتے تھے''۔

دارالمصنفین کی مطبوعات میں سیرت کی اور بھی کئی کتابیں ہیں، ان میں علامہ شبلی کی کتاب ''الفاروق'' ہے، جو حضرت عمر بن خطابؓ کی سوانح حیات پر مشتمل ہے اور اپنی تحقیقی نوعیت میں منفرد ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن کریم کے موضوع پر مختلف قیمتی کتابیں اور فن بلاغت واعجاز سے متعلق معارف میں شائع شدہ مضامین بھی بکثرت ہیں، ان میں چند اہم مقالات اور مضامین کا تذکرہ کرنا اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے، اس وقت جو اہم ترین کتاب یہود اور قرآن کے نام سے شائع ہوئی ہے، اور اس کے مؤلف پروفیسر جناب ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب ہیں۔ اس کا مطالعہ فلسطین اور اسرائیل کے مابین موجودہ کشمکش اور یہودیوں کے مظالم کی داستان سمجھنے کے لئے بہت ضروری اور اہل علم طبقے کے لئے باعث افادہ ہے۔

شبلی اکیڈمی کی طرف سے قرآنی موضوع پر شائع شدہ مضامین ومقالات جو رسالہ معارف میں شائع ہوئے ہیں ان کا ذکر کرنا بھی اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے، اور اس مختصر مقالہ میں ان کو سلسلہ وار اختصار کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے۔

۱۔ (معجزۂ قرآن کی نوعیت: معنوی پہلو) از مولانا عبدالسلام ندوی، شائع شدہ معارف جلد نمبر/

۶۶،شمارہ نمبر/ ۵-۶

۲۔(نزول القرآن علی سبعۃ احرف) ازمولانا عبدالسلام ندوی، معارف جلد نمبر/ ۲۵،شمارہ نمبر/ ۵

۳۔ (خصائص قرآن مجید) ازمولانا عبدالسلام ندوی، معارف جلد نمبر/ ۴۵،شمارہ نمبر/ ۱

۴۔ اور علامہ حمید الدین فراہی کی عربی تصنیف (تفسیر نظام القرآن وتأویل الفرقان بالفرقان) میں سورۂ قیامہ کی تفسیر کا اردو ترجمہ وتشریح مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہے، اور معارف جلد نمبر/ ۷ شمارہ نمبر/ ۱ میں شائع ہوا ہے۔

۵۔(قرآن مجید اور شاعری) ازمولانا عبدالسلام ندوی، شائع شدہ ماہنامہ معارف جلد نمبر/ ۵،شمارہ نمبر/ ۵

۶۔ (حکمۃ اللہ) ازعلامہ سید سلیمان ندوی، ماہنامہ معارف جلد نمبر/ ۴۶،شمارہ نمبر/ ۴ تا ۶

۷۔ (قرآن پاک، تاریخی اعجاز) ازعلامہ سید سلیمان ندوی، ماہنامہ معارف جلد نمبر/ ۴۳،شمارہ نمبر/ ۲

۸۔ (معیار تاویل لفظ صلاۃ قرآن شریف میں) ازعلامہ سید سلیمان ندوی، شائع شدہ معارف جلد نمبر/ ۲۰،شمارہ نمبر/ ۴

۹۔ (جواہر تفسیر)ازعلامہ سید سلیمان ندوی، شائع شدہ معارف جلد نمبر ۴۱۔شمارہ نمبر ۲

۱۰۔ (احکام القرآن بحیثیت ایک مستقل فن)ازعلامہ سید سلیمان ندوی معارف جلد نمبر ۱۷/ شمارہ/ ۴

۱۱۔ (کیا قرآن رسول کا کلام ہے؟) ازعلامہ سید سلیمان ندوی معارف جلد نمبر ۴۶/ شمارہ/ ۴ تا ۶

۱۲۔ (فہم قرآن کے اصول وشرائط)ازمولانا شاہ معین الدین ندوی معارف جلد/ ۴۵/ شمارہ/ ۳

۱۳۔ (تدوین قرآن)ازمولانا شاہ معین الدین ندوی معارف جلد/ ۶۳/ شمارہ/ ۶

۱۴۔(السامری)ازمولانا ابوالجلال ندوی معارف جلد/ ۶۴/ شمارہ/ ۱

۱۵۔(اصحاب الفیل کا واقعہ اور تاریخ)ازمولانا ابوالجلال ندوی، معارف جلد/ ۶۴/ شمارہ/ ۴۔۵

۱۶۔ (تاریخ بابل) ازمولانا ابوالجلال ندوی معارف جلد/ ۶۵/ شمارہ/ ۱

۱۷۔(ہاروت وماروت)ازمولانا ابوالجلال ندوی معارف جلد/ ۶۶/ شمارہ/ ۲

۱۸۔آزر: (قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات)ازمولانا ابوالجلال ندوی معارف جلد/ ۶۱/ شمارہ/ ۲

۱۹۔(الناسخ والمنسوخ فی القرآن) ازمولانا ریاست علی ندوی، معارف جلد/ ۲۷/ شمارہ/ ۳/ ۴

۲۰۔(مستشرق نولدیکی اور قرآن)ازمولانا محمد اویس ندوی، معارف جلد/ ۵۰/ شمارہ/ ۶

۲۱۔ (قرآن کریم کی ایک آیت کا مفہوم موسی اور طور والی آیت) ازمولانا مجیب اللہ ندوی

معارف جلد/۷۸/شمارہ/۶

۲۲۔(قرآن مجید زبان وادب کی کسوٹی) از ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، معارف جلد/۶۶/شمارہ/۵

۲۳۔(سورہ تکویر کے عجائب واسرار) ازمولانا شہاب الدین ندوی، معارف جلد/۷۲/شمارہ/۱۔۲

۲۴۔(زیتون کی کرشمہ سازیاں اور قرآن کی ایک عظیم پیشین گوئی از مولانا انیس الرحمٰن ندوی، معارف جلد/۷۵/شمارہ/۶

۲۵۔تفسیر ماجدی کے مراسلاتی مآخذ)ازمولانا عمیر الصدیق ندوی، معارف جلد/۷۳/شمارہ/۱

واقعہ ہے کہ علامہ شبلی علیہ الرحمہ کے مدرسہ اوران کے مکتب فکر کے تربیت یافتہ اور ان کے قریب ترین شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تھے، وہ دارالمصنفین کو ایک عظیم علمی تحقیقی اور ہندوستان کی تاریخ میں اپنی معنویت کے اعتبار سے منفرد ادارہ بنانا چاہتے تھے، اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی جملہ توانائیوں کو صرف کیا، اور اپنے مشفق استاذ کے حق منت شناسی کو ادا کرنے کے لئے ہر طرح کی مصروفیت کو ناقابل اعتناء تصور کر کے دارالمصنفین کو علم وتحقیق اور اسلامی علوم ثقافت کا عظیم بلکہ عالمی مرکز بنانے کے لئے ہمہ تن مشغول ہو گئے، اور سب سے بڑھ کر اپنے استاذ ومربی کے شروع کئے ہوئے سیرت کے اعلیٰ ترین کام کو مکمل کرنے میں عالی ہمتی کی عظیم مثال قائم کی۔

سید صاحب نے بذات خود قرآن کریم کی کوئی مستقل تفسیر تیار نہیں کی، لیکن اگران کے مضامین اور کتابوں میں جا بجا پھیلے ہوئے تفسیری نکات اور اعجاز قرآنی کی مثالیں، اور نہایت گہرائی کے ساتھ کتاب اللہ کا مطالعہ اور اس کے اندر چھپے ہوئے معانی ومفاہیم کو یکجا کر دیا جائے تو ایک مستقل تفسیر کی کتاب تیار ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کا اپنے اس مخلص بندے پر انعام خاص ہے کہ ان کی قرآن فہمی اور قرآن کی بلاغت واعجاز پر جو تحریریں سیرۃ النبی اور معارف کے شذرات ومقالات میں موجود ہیں، ان کو مدون کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے، اور اس کی پہلی جلد (علامہ سید سلیمان ندوی کے تفسیری نکات) کے نام سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا محمد فرمان ندوی کے قلم سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ سید صاحب کے شاگرد تھے، اور ان سے مطالعہ کی گہرائی، عالی ہمتی، اور مسلسل تلاش علم میں رہنا اور اسکی گہرائیوں سے موتیوں اور جواہرات کو نکالنا، اور اپنے علمی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے کتب خانوں کی وسیع فضاؤں میں گم ہوجانا اور تصنیف وتالیف میں اس طرح مشغول ہوجانا کہ اپنے گرد وپیش کی کوئی خبر نہ رہ جائے، ان ساری علمی اور تحقیقی صفات کو حضرت مولانا نے اپنے استاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھا تھا، چنانچہ سید صاحب کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سید صاحبؒ نے نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بے مثال خدمت کرنے کا تمغہ حاصل کیا، بلکہ انہوں نے دارالمصنفین کو علامہ شبلی کی وفات کے بعد ایک عظیم علمی اور تحقیقی ادارہ کی حیثیت سے پروان چڑھایا اور سیرت النبی کی تکمیل کرکے اپنے استاد ومربی علامہ شبلی کی روح کو سرشار کیا، اسی طرح وہ بھوپال میں رئیس القضاۃ (چیف جسٹس) کی حیثیت سے اہم عہدہ پر فائز رہے''۔

سید صاحب اپنی تمام علمی خصوصیات اور تحقیق وتصنیف، مطالعہ کی وسعت اور گہرائی میں ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے، اور اپنی عالمانہ شان وجامعیت میں ایک انفرادی مقام ان کو حاصل تھا، بلکہ وہ اسی کے ساتھ عالمی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے، اور وہ پورے ملک کو (براعظم نما ہندوستان) انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لئے پوری طرح فکرمند تھے، اور ان کے اس عہد میں سب سے اہم مسئلہ خلافت عثمانیہ کا بکھراؤ، جنگ بلقان کی ستم ظریفیاں تھیں، جو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ان کے صبر وتحمل کا بڑا امتحان تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا نے لکھا ہے:

''سید صاحبؒ ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں انتہائی فکرمند ہوتے، وہ اس ملک کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے اپنی دینی اور علمی ذمہ داری

کی بنا پر بے چین تھے، پوری دنیا میں اس وقت ایک سیاسی کشمکش اور ایک طوفان بر پا تھا، خلافت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا، طرابلس الغرب پر اٹلی کے حملہ نے عالم اسلام کو مضطرب کر دیا تھا، جنگ بلقان کے شعلے ہندوستانی مسلمانوں کے خرمن صبر کو خاکستر کر رہے تھے، اس وقت کے حالات سے سید صاحب کس قدر آگاہ تھے اور عالمی سیاست میں تیز رفتاری کے ساتھ جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان پر سید صاحب کی نظر کتنی گہری اومبصرانہ تھی، آپ مجھے اجازت دیں تا کہ میں سید صاحب کی ژرف نگاہی، وسعت نظر اور عالمی سیاست پر ان کی مبصرانہ رائے، نیز عالم اسلام کے حالات پر ان کی بے چینی اور ہندوستانی عوام اور مسلمانوں کی آزادی اور ملک کو غیر ملکی سامراج سے نجات دلانے کے لئے ان کی جدوجہد کی شہادت کے طور پر ان کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کروں، وہ لکھتے ہیں:

> ''حوادث اور اتفاقات ایسے پیش آئے کہ ۱۹۰۸ء میں خلافت عثمانیہ میں انقلاب پیش آیا، نو جوان ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کی خفیہ تدبیریں کامیاب ہوئیں، اور انور بے، وغیرہ نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے دستوری حکومت کا اعلان کر دیا، اور یہی وہ وقت تھا جب یورپ کی سلطنتوں نے مل کر یہ چاہا کہ ان نو جوان ترکوں کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ترکی حکومت کے حصے بخرے کر لیں، اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ نو جوان ترکوں کے اعلان کے چند ہی روز بعد اٹلی نے دولت عثمانیہ کے آخری افریقی مقبوضہ طرابلس الغرب (ٹریپولی) پر حملہ کر دیا، اس حملے نے سارے عالم اسلام میں آگ لگا دی، خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے جوش وخروش سے اس میں حصہ لیا، اور شبلی واقبال جیسے شعراء باکمال نے اپنے ترانوں سے مسلمانوں کو باور کرایا''۔(۱)

میرے خیال میں ان کے معاصرین علماء میں اور کم از کم ہندوستان کی حد تک فضلائے مدارس عربیہ میں کوئی ایسا نہیں ہے جو عقل وقلب، قدیم وجدید، مشرقیت ومغربیت، دین وادب

(۱) برید فرنگ

یا دین وفلسفہ کے درمیان جامعیت میں ان کا ہمسر ہو، وہ ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل، سیرۃ النبی کے مؤلف، سیاست کے پیچ وخم سے واقف اور ایک صاحب بصیرت ادیب تھے، انہوں نے یورپ کا سفر کیا، اور اپنے چشم فیاض سے ایک مدت تک شجر علم کی آبیاری کی، اور اس کی گھنی چھاؤں میں رہے، تاریخ کو موضوع بنایا، اور علم کے فلسفۂ انقلاب اور اس کے عروج وزوال پر بحث کی، مگر تحقیق کی ان وادیوں کو پار کرنے کے باوجود ان کے دل میں یہ خلش باقی تھی کہ ان کو مزید کسی روحانی چشمۂ صافی سے استفادہ کی ضرورت ہے، باوجودیکہ ان کے تلامذہ اور شناسایان علم یہ محسوس کرتے تھے کہ اب ان کو مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، اور ان کے قلم سے خطبات مدارس، سیرۃ النبی اور سیرت عائشہ جیسی کتابیں نکل چکی تھیں، جنھوں نے ہزاروں دلوں میں جذبہ ایمانی کو چمکایا تھا، اور ان کو حلاوت ایمانی کی دولت سے مالامال کیا تھا، مگر ان کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی نے بالآخر ان کو اس مقام پر پہنچایا، جس کو حدیث میں لفظ احسان اور قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے"۔

دارالمصنفین کی مطبوعات علم وتحقیق کی اپنی امتیازی شان رکھتی ہیں، اور بجاطور پر ان کو علم ومعارف کا گنجینہ اور تحقیق وریسرچ کا کتب خانہ کہا جاسکتا ہے، اور اس ملک میں دارالمصنفین کو اسلامی ثقافت کا نشان قرار دینا ہر اعتبار سے بالکل صحیح اور درست ہوگا۔

الحمدللہ یہ تحقیقی اور علمی، ادارہ وسعت وترقی کی شاہ راہ پر مقصدیت کی روح کے ساتھ گامزن ہے، اور اس کے پیش رو علماء وادباء مورخین ومصنفین نے جو شاہ راہ متعین کی تھی اسی پر آج کے ذمہ داران حضرات، علماء ومحققین چل کر اس عظیم اور تاریخی ادارہ کی شمع علم وتحقیق کو مزید روشن کرکے اپنے اسلاف کرام کو خراج عقیدت پیش کررہے ہیں، اور دارالمصنفین کے ناظم مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب اور رفیق دارالمصنفین جناب مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب خاص طور سے اس کو ہر نوعیت سے ترقی کی راہ پر لے کر چل رہے ہیں، اور اس کے حسن وجمال میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق برابر اضافہ کررہے ہیں۔ (فالحمد لله علی ذلك)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

نقوش وتأثرات

جامعہ مفتاح العلوم مئو جو پہلے اعظم گڑھ ضلع میں تھا (اوراب خود ضلع بن گیا ہے) میں عربی کے ابتدائی درجوں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ مدرسہ میں ایک دن اچانک اعلان ہوا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لا رہے ہیں اور چند گھنٹے مدرسہ کے مہمان خانہ میں قیام فرمائیں گے میں اور میرے ساتھی سراپا شوق بن کر حضرت مدنی رحمہ اللہ علیہ کو دیکھنے کے لئے مدرسہ کے باہر کھڑے ہوگئے، تھوڑی دیر میں حضرت مدنی کی گاڑی آئی، مدرسہ کے ذمہ داروں نے استقبال کیا، ہم کم عمر بچے حضرت مدنی کی نورانی شکل دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے، گاڑی سے اتر کر حضرت مدنی کے چلنے کا انداز، ان کا طرز تکلم ان کی مجلس اور کھانے کے وقت سنت کا اہتمام ساری چیزیں دیکھ کر شخصیت کی عظمت ومحبت کا ایک شعور دلوں میں بیدار ہوا، کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کا انتظام تھا، گرمیوں کا زمانہ تھا، قیلولہ پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوا، لوگ مہمان خانہ میں حضرت کے قریب بیٹھ گئے، اس وقت بجلی کے پنکھے کا انتظام نہیں تھا، تو بیٹری کے ذریعہ ایک چھوٹا سا پنکھا حضرت کے جسم مبارک کو ہوا دیتا رہا، عصر کا وقت قریب تھا، حضرت قیلولہ فرما چکے تھے، وضوء کے لئے قریب ہی انتظام تھا، ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میں حضرت کے وضوء فرمانے کا طریقہ دیکھ لوں، مدرسہ سے ملحق جامع مسجد میں عصر کی نماز حضرت نے جماعت کے ساتھ پڑھی، اور مغرب کی نماز کی امامت فرمائی، محراب میں کچھ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے، حضرت نے اسے ہٹانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ محراب کے اندر سادگی ہونی چاہیے، دوسرے ہی دن اس حکم پر عمل کیا گیا، نقش نگار

ہٹادئے گئے اور محراب سادہ کردی گئی، حضرت مجلس میں تشریف فرما تھے، علماء کرام کی ایک بڑی جماعت حاضر خدمت تھی، مدرسہ کے ایک معزز ممبر حضرت سے ملنے کے لئے آگے بڑھے، اور مصافحہ کر کے بیٹھ گئے، لوگوں نے تعارف کرایا، ان کی داڑھی نہ ہونے کے برابر تھی، حضرت نے صراحت سے فرمایا: نام اتنا خوبصورت، اور چہرے پر داڑھی نہیں، اس زمانہ میں بھی اور ہمیشہ حضرت مدنی رحمہ اللہ علیہ داڑھی سنت کے مطابق رکھنے کی تاکید فرماتے تھے، اور نہ صرف داڑھی بلکہ جملہ امور زندگی میں سنت کا اتباع کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔

یہ واقعہ ۱۹۴۵ء سے پہلے کا ہے، ان دنوں ملک کی آزادی کا ہر طرف چرچا تھا، جلوس نکلتے تھے، اس میں مسلم وغیر مسلم سبھی شریک ہوتے تھے، اس زمانہ میں حضرت ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے تھے اور انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے کے موضوع پر جو جلسے ہوا کرتے تھے اس میں شرکت فرما کر پر اثر تقریروں سے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، جمعیت علماء ہند کے صدر ہونے کے ساتھ حضرت کا سیاسی تعلق کانگریس سے تھا اور مسلم لیگ ان کوششوں کی مخالفت کر رہی تھی، وہ حضرت مدنی کی کانگریس کے ساتھ آزادی حاصل کرنے کی کوششوں کو غلط سمجھتی تھی، مسلم لیگ کے لوگ ملک کو آزاد کرا کے ایک بڑا پاکستان وجود میں لانا چاہتے تھے اور حضرت مدنی کی شان میں گستاخیوں کا ارتکاب کیا کرتے تھے۔

اس زمانہ میں حضرت مدنی کا ایک سفر صوبۂ بہار کے مختلف علاقوں کا ہوا، مسلم لیگ کے لوگوں نے حضرت کا بائیکاٹ کرنا طے کیا اور بھاگلپور میں ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو کر حضرت کے ساتھ نہایت گستاخانہ سلوک کیا، جس کی مذمت کے لئے الفاظ نہیں ہیں، ہندوستان کے علماء کرام کو اس نازیبا حرکت کی خبر پہونچی، سخت ترین احتجاجات ہوئے اور مسلم لیگ کے خلاف جلوس نکالے گئے، مئو ضلع اعظم گڑھ کے ایک جلوس میں بچوں کی جماعت کے ساتھ میں بھی لگا ہوا تھا، اس میں حضرت مدنی کے ساتھ ناروا سلوک پر جلوس کے ذمہ داران ایک نظم پڑھ رہے تھے، اس کا ایک شعر یاد ہے۔

وہ بھاگلپور میں نقشہ نظر آیا مدینہ کا
کب ان کو چھوڑ کر جائیں گے غداروں کی جھرمٹ میں
امیر الہند ، شیخ الہند ، مولانا حسین احمد
انہیں کے ساتھ مرنا ہے ، انہیں کے ساتھ جینا ہے

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے حضرت مدنیؒ کی شان میں اضافہ فرمایا، اور جہاں ایک طرف آزادیٔ ہند کے لیڈروں نے حضرت کو سر پر بیٹھایا وہیں جماعت علماء ہند میں ان کا مرتبہ اور زیادہ بلند ہوا، اور سبھی لوگوں نے یک زبان ہو کر ان کو دینی پیشوا اور قائد آزادی تسلیم کر لیا اور حضرت کا دورہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں جاری رہا، ہر جگہ توقیر و تعظیم کے ساتھ استقبال ہوتا، عوام وخواص سبھی حضرت کو اپنی آنکھوں اور سروں پر بیٹھاتے اور ان کی تمام باتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتے۔

الحمد للہ حضرت مدنی جمعیت علمائے کرام ہند کے صدر الصدور تھے، اور آپ کے ساتھ پورے ہندوستان کے موقر علماء کرام کی ایک بڑی جماعت تھی، آپ کی کوششوں سے ملک کے سبھی لیڈر (جس میں گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پیش پیش تھے) اور اس دور کے سبھی بڑے علماء کرام آپ کی قیادت میں ہندوستان کی آزادی کے لئے کام کر رہے تھے اور شب و روز اس کے لئے محنت کرتے تھے، خود حضرت مدنی ان کے ساتھ تمام کاموں میں شریک رہتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان مخلصانہ کوششوں کو قبول فرمایا، اور آخر کار سامراجیوں کو ملک چھوڑنا اور اس کو اہل وطن کے حوالے کرنا پڑا، اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہو گیا، اس آزادی میں جمعیت علماء ہند کے صدر نشین حضرت مدنیؒ کی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے جو ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا اور آنے والی نسلیں اس سے سبق حاصل کریں گی، اور ان کی معلومات میں زبردست اضافہ ہوگا۔

آزادی کے بعد حضرت مدنیؒ کا ایک سفر اعظم گڑھ ضلع میں ایک گاؤں پورہ معروف کا ہوا، وہاں کے لوگ حضرت مدنیؒ سے بے پناہ محبت کرتے تھے، اور دل وجان سے فدا تھے، وہاں کی جامع مسجد پر جس کی نئی تعمیر ہوئی، صحیح قبلہ رخ ہونے کے بارے میں اعتراض کیا گیا، اس کا فیصلہ کرانے کے لئے حضرت مدنیؒ سے درخواست کی گئی کہ حضرت والا جو فیصلہ فرمادیں اس پر عمل کیا جائے گا۔

اعلان ہوا کہ پورہ معروف میں حضرت مدنیؒ فلاں تاریخ کو تشریف لا رہے ہیں، لوگ جوق درجوق وہاں جانا شروع ہو گئے، جس میں، میں بھی اپنے مدرسے کے ساتھیوں کے ساتھ والد معظمؒ کی اجازت سے حضرت سے ملنے کے لئے گیا، جب وہاں پہونچا تو حضرت والا وضو فرمارہے تھے اور کئی حضرات وضو کرا رہے تھے، حضرت مدنیؒ نے موزہ پر مسح کیا تو اس سے مسح کا طریقہ اس ناچیز نے سیکھا، وضو کرنے کے آداب کا علم ہوا، پھر حضرت کی امامت میں مغرب کی نماز ادا کی گئی اور قبلہ کا اختلاف الحمدللہ ختم ہو گیا۔

اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے زمانہ میں حضرت کی تشریف آوری ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی کے دولت کدہ پر ہوئی، مرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ تشریف فرما تھے، میں بھی اپنے دوست مولانا محمد حسنی کے ساتھ کمرہ میں کنارے بیٹھا ہوا تھا، حضرت کے حسن وجمال، نورانیت اور ہیبت کا احساس ہوتا رہا، حضرت کی باتیں جس انداز سے فرماتے تھے، سن کر عجیب وغریب لذت وچاشنی محسوس کرتا رہا، حضرت مدنیؒ وہاں سے اٹھ کر غالباً امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور فاروقیؒ سے ملنے کے لئے دار المبلغین تشریف لے گئے۔

۱۹۵۶ء میں اچانک حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کی اہلیہ محترمہ اور صدیق محترم مولانا محمد حسنیؒ کی والدہ صاحبہ کا حادثہ وفات پیش آیا، ڈاکٹر صاحب پر اس کا شدید اثر ہوا، اور پورے خاندان کے لوگ غم زدہ ہوئے، ڈاکٹر صاحب کے حزن وملال کو دیکھتے ہوئے

مرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی ایسا سفر ہو جائے جس سے رنج وغم دور ہو، حضرت مولانا علی میاںؒ نے ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے طے فرمایا کہ حضرت مدنیؒ کی خدمت میں دیوبند جہاں وہ مقیم تھے کا سفر کرنا زیادہ انسب ہوگا، خاص طور سے اس تعلق کو دیکھتے ہوئے جو ڈاکٹر صاحب کو حضرت مدنیؒ سے تھا، اس سفر سے ڈاکٹر صاحب کا غم ہلکا ہوا، حضرت مدنی کی دعائیں غم کے ازالے کا باعث بنیں اور ڈاکٹر صاحب اطمینان کے ساتھ واپس تشریف لائے۔

میں نے سادات حسنیہ کو حضرت مدنیؒ اور ان کے خاندان سے کس قدر محبت وتعلق ہے، اس کی ایک جھلک بچشم خود دیکھا ہے، اگر چہ اب حضرت مولانا علی میاں حسنیؒ اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلیؒ، ان کے فرزند اور دیگر اہل تعلق موجود نہیں، لیکن موجودہ حضرات کا تعلق اور بے حد محبت وعقیدت حضرت مدنی اور خاندان مدنی سے اسی طرح موجود ہے، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی اس وقت اس محبت وتعلق کے نہ صرف نمائندے بلکہ اس کے علم بردار ہیں۔

حضرت مدنیؒ کا وصال ۱۹۵۸ء میں ہوا، ان کے بعد حضرت کے جانشیں حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ ہوئے، انہوں نے اس جانشینی کا پورا حق ہر اعتبار سے ادا کیا، سیاسی، اجتماعی، دینی اور دعوتی ہر میدان میں مولانا اسعد صاحبؒ نے حضرت مدنی کے نقش قدم کو اپنایا، مجھے بار بار حضرت مولانا اسعد صاحب سے ملاقات کرنے اور ان کی تقریر سننے کا موقع ملا، وہ ہمیشہ لکھنؤ آمد کے موقع پر حضرت مولانا علی میاںؒ سے ملنے ندوہ تشریف لایا کرتے تھے، اس طرح حضرت سے ملاقات اور ان کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملا، اسی طرح حضرت مولانا سید محمد ارشد مدنی مدظلہ سے شروع-شروع کی ملاقات اور ان کے بارے میں حسن ظن اور شعور محبت کا موقع حاصل ہے، ان کے زندگی میں بھی حضرت مدنیؒ کا عکس جمیل موجود ہے، وہ سیاست میں بھی حصہ لیتے ہیں، لیکن ملک کے مثبت مسائل اور خاص طور سے مسلم مسائل کے

بارے میں نہایت جرأت مندانہ اقدام کرتے ہیں اور اصحاب اقتدار سے نہایت بے تکلفی اور بلندی سے ملتے ہیں اور مسائل کو حل کرنے کی طرف جرأت کے ساتھ توجہ دلاتے ہیں، حضرت مولانا اسجد مدنی صاحب، حضرت مولانا محمود مدنی صاحب اور اسرۂ مدنیہ کے سبھی حضرات سے تعلق ومحبت، دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے، میرے برادر بزرگ حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمی اس خاندان سے بے تکلفانہ تعلق رکھتے تھے اور حضرت مدنیؒ کے وہ بے حد معتقد تھے اور ہمیشہ حضرت کی عظمت کے قصے بیان کیا کرتے تھے، میرے والد معظم حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل حضرت مدنیؒ سے والہانہ تعلق رکھتے تھے اور بہت تعظیم کرتے تھے۔

امید ہے کہ حضرت مدنیؒ کی نیابت اس خاندان کے علماء اور ان کی آنے والی نسلیں ہمیشہ کرتی رہیں گی اور تاریخ مدنی کو روشن کرتے ہوئے حضرت کے نقش قدم پر چل کر اپنی خاندانی عظمت اور دین وتقوی وقیادت کی شمع روشن کرتی رہیں گی، یہ مختصر تحریر اپنے ذاتی احساسات کی چند سطریں ہیں جو نذر قارئین ہیں، ورنہ :

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

☆☆☆

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ

ہندوستان کو ہمیشہ سے یہ فخر حاصل رہا ہے کہ یہاں کی زرخیز مٹی نے بڑے بڑے علماء اوراہل صلاح وتقویٰ پیدا کیے، اس کے زمین وآسمان نے بڑی بڑی علمی اورروحانی سلطنتوں کا مشاہدہ کیا، تاریخ کے ہر دور میں ایسے عارفین اوراہل اللہ پائے گئے، جنہوں نے اصلاح وتربیت کا بیڑا اٹھایا اور ہزاروں بندگان خدا کی ہدایت کا سبب بنے، کتنے ایسے لوگ جن کا رشتہ پاکیزہ اور معتبر زندگی سے منقطع ہو چکا تھا اور وہ ضلالت وگمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، ان کو زندگی کی حقیقت سے آشنا کیا، اور ایمان ویقین کی روشنی سے ان کے دلوں کو گرمایا ، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کے تحفظ وبقا اوراس کے پھلنے پھولنے کا بہت بڑا ذریعہ یہ بزرگان دین ہی تھے، انہیں کے اخلاص وللہیت کی بدولت بڑے بڑے علمی واصلاحی مراکز یہاں قائم ہوئے اورانہیں کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ آج بھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں دین کی شمع روشن ہے، اوراتنی بڑی تعداد میں مسلمان موجود ہیں۔

اس وقت ہم خانقاہ تھانہ بھون کے تربیت یافتہ بزرگ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کررہے ہیں، جو حضرت تھانوی کے اکابر خلفاء اوران کے بہت مخصوص اورقریبی اجازت یافتہ بزرگوں میں سے تھے اور جنہوں نے صحیح معنوں میں اپنے مرشد کی قائم مقامی اوران کی جانشینی کا حق ادا کیا، جن کی اصلاحی کوششوں سے ہزاروں بندگان خدا کو ہدایت نصیب ہوئی اور جن کے علمی اورروحانی فیوض سے امت کو سیراب ہونے کا موقع ملا، اوراخلاص وتقویٰ کا بازار گرم ہوا، شاہ صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ خاموش اصلاحی کاموں میں صرف ہوا، انھوں نے ابتداء اپنے آبائی وطن فتحپور تال نرجا ضلع اعظم گڑھ میں قیام فرما کر

رشد و ہدایت کی شمع روشن کی اور راہ گم کردہ مسافروں کو روشنی دکھاتے رہے اور معرفت و سلوک کے طالب علموں کی پیاس بجھاتے رہے، پھر ایک عرصہ تک آپ نے گورکھپور میں قیام فرمایا اور اس کے بعد ایک عرصہ تک الٰہ آباد کو اپنا مستقر قرار دیا تھا، جہاں آپ کی کوششوں سے ایک بڑی خانقاہ اور ایک مدرسہ قائم ہوا۔ اسی کے ساتھ ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی، جو مدرسہ اور خانقاہ کے درمیان ایک کڑی تھی، اور جو شاہ صاحب سے فیض حاصل کرنے والے ہر طالب علم کی تربیت گاہ تھی۔

لیکن صحت کی خرابی کے باعث معالجوں کے مشورہ اور اہل بمبئ کے شدید اصرار پر آپ نے بغرض تبدیلی آب و ہوا بمبئ میں قیام فرمالیا تھا، بمبئ جیسے پرہجوم اور مشغول شہر میں شاہ صاحب کے مختصر قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے ہزاروں مسلمانوں کو دین کی صحیح سمجھ عطا ہوئی، اور کتاب و سنت کی روشنی میں زندگی گزارنے کا سبق ملا، ایک بڑی تعداد ان مسلمانوں کی جو نسلاً بعد نسل شرک و بدعت کی تاریکیوں میں بھٹکتے چلے آرہے تھے، شاہ صاحب کے ہاتھوں پر بیعت ہوئی اور ان میں صحیح اسلام قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، اس طرح بمبئ جیسے عظیم شہر کی دینی فضا میں زبردست تبدیلی آئی اور وہاں ہر طرف شاہ صاحب کے معتقدین و مریدین نظر آنے لگے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے مرشد حضرت تھانویؒ سے علم ظاہر و باطن کی جو امانت حاصل کی تھی اس کو انتہائی امانتداری اور حق شناسی کے ساتھ ادا کیا، اور اپنی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ اسی حق کے ادا کرنے میں صرف کیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ دور و قریب ہر جگہ کے لوگ اس مرد حق آگاہ کے پاس جوق در جوق آئے اور اپنی اپنی جھولی بھر کر واپس ہوئے، کم ہی ایسے لوگ ہوں گے جو اس آفتاب رشد و ہدایت کی شعاعوں سے محروم رہ گئے ہوں، اور توفیق الٰہی نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو۔

شاہ صاحب کا بنیادی طریقہ تربیت کتاب و سنت کی تعلیمات تھیں، آپ کی کوئی

مجلس ان تعلیمات کے ذکر سے خالی نہ ہوتی، اتباع سنت کی تشویق اور حضور اکرمؐ کی زندگی کو نمونہ بنا کر اس کی تقلید پر ابھارنا آپ کا خاص طرز تھا، صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین، اور علمائے اسلام کی زندگی ہمہ دم آپ کے پیش نظر ہوتی، اور اس زندگی کے خلاف آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی نہ گزرتا، آپ کی انتہائی کوشش ہوتی کہ ہر مرید اپنی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی کے سانچے میں ڈھالے اور کتاب وسنت پر اس کا مکمل عمل ہو، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے ہو۔

یہی وجہ تھی کہ آپ ذرا ذرا سی باتوں پر سخت مواخذہ کرتے اور ہرگز کسی ایسے عمل کو خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو، برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جس میں خلاف سنت ایک ذرہ کا بھی شائبہ ہو، بسا اوقات آپ کئی کئی دنوں اور کبھی کبھی ہفتوں اور مہینوں تک مواخذہ فرماتے اور جب تک یہ یقین نہ کر لیتے کہ اب دوبارہ ایسی غلطی اس مرید سے صادر نہ ہوگی۔ ہرگز معاف نہ کرتے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے، ایک صاحب جو حضرت سے مرید نہیں تھے، جب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے بڑا اکرام فرمایا اور ان کو بالکل اپنے قریب فرش پر بٹھایا، وہ جب بھی جاتے تو حضرت شاہ صاحب ان کے ساتھ اسی طرح اکرام کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، بعض قریبی مریدوں کو اس بات پر ناگواری ہوئی، حضرت کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے اس ناگواری کو خلاف سنت عمل قرار دے کر ان کا سخت مواخذہ کیا۔ اور ان کے نفس کا علاج کرنے کے لئے حکم دیا کہ وہ بھرے مجمع میں ان حاضر ہونے والے صاحب کا پاؤں دبائیں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور وہ بالکل ٹھیک ہو گئے۔

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جو حضرت شاہ صاحب کی تربیت واصلاح کے باب میں پیش آتی رہتی تھیں، اس سختی کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ سے تعلق رکھنے والے بیشتر لوگ صحیح اسلامی زندگی کے حامل ہیں۔ اور وہ حضرات جو آپ سے قریب رہتے تھے اور جن کو آپ سے استفادہ کا زیادہ موقع ملا، وہ ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے صالح اور پرہیزگار ہیں اور

بڑے دیندار اور باعمل لوگ ہیں، کسی مرشد کی مرتبت کا اندازہ اس کے قریبی مریدوں اور متبعین سے جتنا صحیح لگایا جاسکتا ہے کسی اور بات سے نہیں، شاہ صاحبؒ کے قریبی مریدوں کی حالت بلاشبہ بہت اچھی اور قابل تقلید ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس بدعقیدگی کی سختی سے تردید فرمائی کہ فرائض میں مرتبہ ولایت اور قرب خداوندی اس قدر نہ سمجھی جائے، جتنا نوافل اور کم درجہ کی عبادت میں، شاہ صاحبؒ فرائض کے خاص اہتمام کرنے اور ان کو نوافل سے افضل سمجھنے پر بہت زور دیتے تھے۔اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت کی تعلیم بہت اہمیت سے دیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ کلام اللہ کی تلاوت کرنی چاہئے، تلاوت کے لئے فہم بھی ضروری ہو، ایسا نہیں، بلکہ فہم تلاوت بھی موجب قرب الٰہی، اور رضائے خداوندی ہے، اس سے ایمان کو تقویت پہنچتی ہے، عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اخلاص وتقویٰ کی روح بیدار ہوتی ہے۔

حضرت شاہ صاحب صرف ایک مصلح اور سالک راہ طریقت ہی نہیں، بلکہ وہ ایک زبردست عالم دین بھی تھے، اور کتاب وسنت کے اسرار ونکات پر علمی اور تحقیقی نظر رکھتے تھے، ان کی بہت سی علمی اور تحقیقی تصانیف جو ان کی علمی بلندی کی شاہد ہیں، ان کے عارفانہ مضامین اور ان کی مجلسیں ہمیشہ راہ طریقت کے سالکوں کو روشنی دکھاتی رہیں گی، اور ان کا کبھی نہ ختم ہونے والا فیض ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے پر ابھارتا رہے گا، وہ صحیح معنوں میں ”الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون“ کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

شاہ صاحبؒ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی عظیم تربیت اور ان کی اصلاحی کوششوں کا ثمرہ موجود ہے۔ہم ان کے بنائے ہوئے اصول کی روشنی میں اپنی زندگی کو اسلامی زندگی اور اپنے ایمان کو پختہ ایمان بنا سکتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس سے ہم ان کا حق ادا کر سکتے ہیں اور ان کی روح کو مسرور کر سکتے ہیں۔ یأیتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضیة مرضیة۔

حضرت شاہ صاحب نے ۱۹۶۷ء میں اہل بمبئی کی خواہش اور کوششوں کے صلہ میں حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا اور رمضان ارض مقدسہ میں گزارنے کے خیال سے سب سے پہلے جانے والے جہاز میں سفر طے ہوا، شاہ صاحبؒ کے ساتھ مریدین ومعتقدین اور قریبی لوگوں کا ایک قافلہ تھا، ۲۲ر نومبر ۱۹۶۷ء کو مظفری جہاز بمبئی کے ساحل سے روانہ ہوا، لیکن شاہ صاحبؒ کے لئے حجاز پہونچنا اور رمضان ومناسک حج کی تمنا کا پورا ہونا اس دفعہ قسمت میں نہیں لکھا تھا، چنانچہ ۲۵ر نومبر کی شب میں جب شاہ صاحب رات کو تہجد کی نماز سے فارغ ہوکر نماز فجر کے انتظار میں لیٹے تو روح ہمیشہ کے لئے قفص عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان اچانک سانحہ سے رفقاء ومریدین کو جو سفر میں ساتھ تھے کس قدر صدمہ ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو سفر میں ساتھ تھے، لیکن ہندوستان میں جونہی یہ خبر پہونچی عام طور سے مسلمانوں کے لئے ایک عظیم صدمہ کا باعث بنی، بمبئی، الٰہ آباد اور گورکھپور، اعظم گڑھ اور ان تمام مقامات پر جہاں شاہ صاحبؒ کے معتقدین اور تربیت یافتہ مریدین موجود تھے صف ماتم بچھ گئی، لیکن اللہ کے حکم کے سامنے کسی کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا، سب کی زبان پر رنج والم کے کلمات جاری تھے اور دل فرط غم سے نڈھال، بظاہر یہ سانحہ ایک عظیم صدمہ ہے اور اسی طرح دوران سفر میں وفات پانا بڑا دردناک حادثہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت ومصلحت اور مقبول بندوں کے ساتھ اس کا خاص معاملہ بندوں کی سمجھ سے باہر ہے، اس حادثہ میں جو مصلحت الٰہی پنہاں ہے کوئی ضروری نہیں کہ ہر شخص اس کو سمجھ لے۔

جہاز کے قانون کے مطابق کسی بھی مسافر کی لاش زیادہ دیر تک روکی نہیں جاسکتی، بلکہ اسے نذر سمندر کردیا جاتا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ یہ استثنائی معاملہ کہ لاش پانچ روز تک محفوظ رکھی گئی اور حجاز مقدس تک اسے انتہائی عزت واکرام کے ساتھ پہونچایا گیا، بلاشبہ یہ ان کی کرامت ہے اور ان کی مقبولیت عند اللہ اور محبوبیت کی دلیل ہے۔

بڑی خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے ملفوظات کو ان کے

معتمد خاص اور شریعت وطریقت میں ان کے جانشیں حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب مدظلہ اور شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمرالزماں صاحب الہ آبادی نے جمع کرنے کی کوشش شروع فرمادی ہے، اور مجموعہ ملفوظات کی جلد اول تیار ہوگئی، اور ''معارف مصلح الأمت'' کے نام سے شائع ہورہی ہے، ہمیں یقین ہے کہ ان ملفوظات سے تعلیم وتربیت اور شریعت وطریقت کا وہی طریقہ دستیاب ہوگا جو حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلسوں میں لوگوں کو حاصل تھا، اور ملک کے ایک عظیم رقبے پر ان کے فیوض تربیت کا سلسلہ جاری تھا وہ اب انشاء اللہ اس مجموعہ ملفوظات سے بھی عوام وخواص سبھی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض دینی عطا ہوگا، اور رضائے الٰہی اور اطاعت نبوی کا ایک گنجینہ رشد وہدایت میسر آئے گا۔ اور زندگی کے معمولات میں سہولت وبرکت کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ وماذلك على الله بعزيز۔

☆☆☆

علامہ عبدالباری ندویؒ
مایہ ناز شخصیت اور عظیم فلسفی

مایہ ناز شخصیت کے عناصر ترکیبی:

علوم نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ انسان علمی، تہذیبی اور عقلی اعتبار سے خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ ہو جائے، مگر وہ اپنے اندر اکثر حالات میں ایک کمی کا احساس رکھتے ہوئے بھی اسے ظاہر کرنا کسی حد تک اپنی توہین سمجھتا ہے، یا اس سے ملتی جلتی ہوئی کسی شعوری کیفیت میں مبتلا رہتا ہے، اس کے باوجود اس کی جستجو اپنی اس کیفیت کو ختم کرنے یا اس کا علاج کرنے کے بارے میں قائم رہتی ہے، اور غالبا یہ ایک فطری تقاضا ہے، جس کو پورا کرنا شخصیت کی تکمیل کے لئے انتہائی ضروری ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم بہت سے ایسے باا ثر اہل علم وقلم کا ذکر کر سکتے ہیں، جو خود اپنی علمی اور ثقافتی شخصیت کے اعتبار سے مشہور تھے، مگر ان کو ہمہ وقت اس بات کا شعور قائم رہا کہ وہ اپنے اندر پائی جانے والی کمی کو دور کرسکیں، اسلامی تاریخ میں بہت سی ایسی شخصیات کا ذکر موجود ہے، جنہوں نے کمال کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہوئے اپنا گوہر مقصود حاصل کرنے کی کوشش کی اور کسی اضافی نسبت یا کمی وزیادتی کی فکر سے بے پرواہو کر انہوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کر لی، علمائے سلف میں شاید ہی کوئی ایسا ہو، جس نے اپنے آپ کو انسان کامل سمجھ کو دوسرے اپنے ساتھیوں سے استفادہ نہ کیا ہو۔

عالم جلیل اور ماہر عقلیات حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی

تمام علمی وجاہتوں کے باوجود اپنے آپ کو اس کا اہل تصور کیا کہ وہ معرفت الٰہی میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ربانیت اور معرفت کی دولت حاصل کریں اور آستانۂ تھانوی کا انتخاب اپنے گوہر مقصود کو حاصل کرنے کے لئے دل کی گہرائیوں سے قبول کر کے ایک عالم جلیل اور ماہر علوم وفنون ہونے کے ساتھ مربی ومرشد کی سند لے کر عالم قلب کو معرفت کے نور سے روشن کر سکیں ، چنانچہ اس مرحلہ پر فائز ہونے کے بعد کتنی ہی کتابیں اس موضوع پر مختلف عنوانات سے تصنیف کر کے حضرت تھانویؒ کے ذریعہ مقام خلافت پر فائز ہوئے اور اشرفی کتب خانہ کی زینت میں ان کتابوں سے اضافہ ہوا۔

قدیم وجدید کے رمز شناس

قدیم زمانے سے علوم عقلیہ اور اسلامی تہذیب کے درمیان کشمکش جاری ہے، اس کی وجہ سے دو فریق وجود میں آئے، ایک علوم عقلیہ کا داعی تھا، اور دوسرا ان کو سرے سے مسترد کرتا تھا، اور دونوں کے درمیان کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ہمزۂ وصل کا کام دیتی، اور اعتدال وتوازن کے ساتھ جمع کرتی ، باوجود اس کے کہ صحیح اسلامی زندگی کا تصور اس وقت نہیں کیا جاسکتا، جب تک اس دین کی جامعیت کا اعتراف نہ ہو، جو دینی اور سائنسی علوم کا جامع ہے، دین ودنیا کی اس نوعیت سے بعض ذہنوں میں یہ شکوک وشبہات درآئے تھے کہ دین ودنیا کا اجتماع نہیں ہوسکتا، اور دین میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں ہیں، چنانچہ مادہ پرستوں نے اس جامعیت کے نظریہ کو مسترد کیا، اور اس کو انسانی معاشرہ کے لئے ناسور بتایا۔

علامہ عبدالباری ندویؒ: ایک تعارف

علامہ عبدالباری ندویؒ ندوۃ العلماء کے فارغ ہونے والے پہلے بیچ میں ممتاز مقام کے حامل تھے، وہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے رفیق درس اور علامہ شبلیؒ کے ہونہار شاگرد تھے، علامہ عبدالباری ندویؒ دونوں ثقافتوں کے جامع تھے، وہ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر بھی رہے، اور شعبہ فلسفہ کے صدر بھی مقرر ہوئے، اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں ہیں، جن میں

مذہب وسائنس موضوع کی جدت اور اسلوب کی لطافت کی وجہ سے ممتاز ہے، انہوں نے تجدید دین و معاشرت وسلوک کے نام سے کئی کتابیں تصنیف کی، ان کی کتاب مذہب وسائنس مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے شائع ہو چکی ہے۔

علامہ عبد الباری ندویؒ نے فلسفہ کو مسلمان بنانے اور اسلامی کتب خانہ کو علمی کارناموں سے معمور کرنے میں زبردست حصہ لیا، وہ مذہب وسائنس، روح وجسم، اصل ونقل کی جامعیت کے نہ صرف یہ کہ قائل تھے، بلکہ داعی بھی تھے، جبکہ دوسرے فلاسفہ انحراف والحاد کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، اور وہ مذہب وسائنس میں دوئی کے نظریہ کے حامی تھے، ایسے ماحول میں علامہ عبد الباری ندویؒ نے طاقتور دلائل سے ثابت کیا کہ اسلامی زندگی کا فلسفہ یونان وروم کی طرح کوئی پہیلی نہیں، بلکہ زندگی کی ضرورت اور وقت کی پکار ہے، جس سے کسی طرح بھی اغماض نہیں برتا جاسکتا، اور اس کی زمانی اور مکانی قیمت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اسرار شریعت کے ماہرین اور علامہ عبد الباری ندویؒ کا ان سے استفادہ

تاریخ شاہد ہے کہ شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسرار شریعت کے فلسفہ پر بارہویں صدی ہجری میں حجۃ اللہ البالغۃ کے نام سے ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی ہے، ان کا قیام دہلی میں رہا، وہاں انہوں نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس سے اسلامی فلسفہ کے نمائندگان اور ماہرین نکلے، اور قانون اسلامی کے ماہرین کی ایک بڑی جماعت فارغ ہو کر نکلی، اسی طرح امام غزالیؒ نے بھی سنجیدہ اور مثبت انداز میں لادینی فلسفہ کا ابطال اور اسلامی فلسفہ کا احیاء کیا، اور اپنی مایہ ناز کتاب تھافت الفلاسفہ لکھی، اور یہ ثابت کیا کہ اسلامی قانون عقل انسانی کے بالکل مطابق ہے، ان کی کتاب احیاء علوم الدین اس سلسلہ کی اہم کتاب شمار کی جاتی ہے۔

بلاشبہ علامہ عبد الباری ندویؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم سے استفادہ کیا، اور دین وعقل کے جامعیت کے تصور سے بھی کسب فیض کیا، اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا، اور ان کو اپنی کتابوں کا موضوع بنایا، اور

تجدید کے نام سے کئی سلسلے تصنیف کیے۔

تجدید دین کامل، ایک جامع کتاب

ان میں اہم ترین کتاب ''تجدید دین کامل'' ہے، جو حکیم الأمت حضرت تھانویؒ کی تعلیمات و افادات پر مشتمل ہے اور اس میں عقیدہ وعبادت، اجتماع واخلاق میں مسلم معاشرے کے افراد کی کوتاہیوں کا ذکر ہے اور ان کا علاج دین وشریعت کی روشنی میں تجویز کیا گیا ہے، حکیم الامت نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی وصیتوں کو بطور علاج ذکر فرمایا ہے جو درج ذیل ہیں:

''طالب حق پر لازم ہے کہ اول مسائل ضروریہ عقائد اہل سنت وجماعت حاصل کرے، پھر ان رذائل سے تزکیہ کرے: حرص، امل، غضب، جھوٹ، غیبت، بخل، حسد، ریا، کبر وکینہ، اور یہ اخلاق پیدا کرے: صبر، شکر، قناعت، علم، یقین، تفویض، توکل، رضا، تسلیم، اور شرع کا پابند رہے، اگر گناہ ہو جائے نیک عمل سے جلد تدارک کرے، نماز باجماعت وقت پر پڑھے، کسی وقت یاد الٰہی سے غافل نہ ہو، لذت ذکر پر شکر بجالائے، کشف وکرامات کا طالب نہ ہو، اپنا حال یا سخن تصوف غیر محرم سے نہ کہے، دنیا ومافیہا کو دل سے ترک کرے، خلاف شرع فقراء کی صحبت سے بچے۔

لوگوں سے بقدر ضرورت اخلاق سے ملے، اپنے کو سب سے کمتر جانے، کسی پر اعتراض نہ کرے، بات نرمی سے کرے، سکوت وخلوت کو محبوب رکھے، اوقات منضبط رکھے، تشویش کو دل میں نہ آنے دے، جو کچھ پیش آئے، حق کی طرف سے سمجھے، غیر اللہ کا خطرہ نہ آنے دے، دینی کاموں میں نفع پہنچاتا رہے، نیت خالص رکھے، خورد ونوش میں اعتدال رکھے، نہ اتنا زیادہ کھائے کہ کسل ہو، نہ اتنا کم کہ عبادت سے ضعف ہو، کسب حلال افضل ہے، اگر توکل کرے تو بھی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ طمع نہ رکھے، نہ کسی سے امید وخوف کرے، حق تعالیٰ کی طلب میں بے چین رہے۔

نعمت پر شکر کرے، فقر وفاقہ سے تنگ دل نہ ہو، اپنے متعلقین سے نرمی برتے، ان

کے خطا وقصور سے درگذر کرے، ان کا عذر قبول کرے، کسی کی غیبت وعیب نہ کرے، اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے، کسی سے تکرار نہ کرے، مہمان نواز ومسافر پرور رہے، غرباء ومساکین، علماء وصلحاء کی صحبت اختیار کرے، قناعت وایثار کی عادت رکھے، بھوک وپیاس کو محبوب رکھے، ہنسے کم، روئے زیادہ، عذاب الٰہی سے لرزاں رہے۔

موت کا ہر وقت خیال رکھے، روزانہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرلیا کرے، نیکی پر شکر، بدی پر توبہ کرے، صدق مقال واکل حلال اپنا شعار رکھے، غیر مشروع مجلس میں نہ جائے، رسوم جہل سے بچے، شرمگیں، کم گو، کم رنج، صلاح جو، نیکوکار، رفتار باوقار، بردبار رہے، ان صفات پر مغرور نہ ہو"۔(۱)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا تأثر مذکورہ کتاب کے بارے میں

علامہ عبدالباری ندویؒ کی ایک اہم کتاب تجدید دین کامل ہے، اس کا پہلا نام جامع المجددین تھا، بعد میں اس کا نام "تجدید دین کامل" پڑا، یہ کتاب علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مقدمہ سے مزین ہوکر منظر عام پر آئی ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ اس کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> "اس میں مؤلف نے حضرت والا کی ان تجدیدی واصلاحی کوششوں کو جوامت مرحومہ کی ہر نوع وہر صنف کے لئے مفید ہیں، پورے استقصاء کے ساتھ جمع کردیا ہے، ان کو پڑھ کر خاص وعام ہر شخص حضرت کے ان اصلاحی کارناموں کو تجدیدی رنگ میں پاکر ان کے مجدد وقت ہونے کے قوی سے قوی تر احتمال کے ماننے پر مجبور ہوگا، اور یہ بھی اللہ تعالی کا ایک فضل ہے کہ حضرت والا کے ان تجدیدی کارناموں پر ایک فاضل ولائق شخص نے ظن وتخمین کو قوی کرنے کے لئے شواہد ودلائل بھی یکجا کردئے ہیں اور یہ ایک ایسی زبردست چیز ہے کہ جو کسی زمانہ میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

---

(۱) تجدید معاشرت ص:۳۴۹۔۳۵۱

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کسی کو یہ شبہ نہ گذرے کہ اس تحریر یا تالیف کا مدعا کسی شخص کی مجددیت کے دعوی کی تشہیر یا منصب تجدید کی دعوت وتلقین ہے، بلکہ یہ مؤلف کی عقیدت مندانہ تعبیر ہے کہ وہ حضرت کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہیں‘‘(۱)۔

مفکر اسلام کے تأثرات علامہ عبدالباری ندوی کے بارے میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ علامہ عبدالباری ندویؒ کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’مولانا تھانویؒ کے رنگ کا مولانا عبدالباری صاحب پر ایسا غلبہ ہوا کہ مولانا (جن کی طبیعت ہمیشہ سے کسی چیز کو پورے طور پر قبول کرنے اور ماسوا کے نفی کی صلاحیت تھی) کے علمی خیالات اور طرز تحریک تک پر اثر پڑا، وہ دبستانِ شبلی کے ایک کامیاب وممتاز ادیب وصاحب قلم تھے، تحریر میں پختگی وشیفتگی، استدلال وعقلیت کا رکھ رکھاؤ اور زبان وادب کی چاشنی، جملوں کی برجستگی، دونوں پہلو بہ پہلو ہوتے، اور یہی مولانا کی تربیت کا فیض تھا، ان کا رسالہ ’’مذہب وعقلیات‘‘ اوران کا مضمون ’’معجزات‘‘ پر جو سیرت النبیؐ کے پانچویں حصہ میں شامل ہے، اس کا نمونہ ہے، لیکن اب ان کو اپنے اس قدیم طرز تحریر میں تلبیس یا تدلیس کا (اور یہ الفاظ خود انھی کے ہیں) شبہ ہونے لگا، اور انھوں نے مولانا تھانوی کے طرز کی تقلید شروع کردی، اگر ’’چھوٹا منھ بڑی بات‘‘ نہ سمجھی جائے تو بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس میں محبت کو دخل زیادہ تھا، عقل وزمانہ کے تقاضوں کی رعایت کو کم، اگر وہ ان حقائق کو بھی جوان کو مولانا تھانوی کی صحبت یا ان کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوئے تھے، دبستانِ شبلی ہی

---

(۱) مقدمہ کتاب: ۲۸

کی زبان میں ادا کرتے تو اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے جس کے لئے وہ کتابیں لکھتے تھے، زیادہ مفید ہوتا اور نوجوانوں کا وہ طبقہ اور ملک کا دانشور حلقہ حقیقت دین سے زیادہ آشنا اور قریب ہوتا۔

ان کے اس دور کی تصنیفات ''جامع المجد دین'' اور سلسلۂ تجدید کی کتابیں ہیں، جو ہندوستان اور پاکستان میں مقبول ہوئیں، تجدید تصوف وسلوک کا ترجمہ کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں بھی ہوا، یہ خدمت میرے بھانجے مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی نے انجام دی، میں نے اس پر مقدمہ لکھا جو کئی جگہ نقل ہوا، پھر میں نے اسی کو اپنی کتاب ''ربانیۃ لا رھبانیۃ'' کا مقدمہ بنایا، عربی ترجمہ دمشق سے شائع ہوا، اور اس سے ترکی میں ترجمہ کیا گیا، مولانا نے دونوں ترجموں کو اپنی زندگی میں دیکھ لیا اور اپنی آواز کو بلاد عرب اور ترکی میں سن کر بہت خوش ہوئے''۔(۱)

تجدید تصوف وسلوک:

علامہ عبد الباری ندوی کی ایک کتاب تجدید تصوف وسلوک ہے وہ خود اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تصوف سے متعلق ہر قسم کی علمی وعملی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتلایا گیا ہے کہ حقیقی تصوف دراصل کمال اسلام اور کمال ایمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور بے صوفی بنے اسلام کی دنیوی واخروی، انفرادی اور اجتماعی برکات وثمرات کا حاصل ہونا عملاً ناممکن ہے''

حضرت مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا نے اس کتاب میں تصوف کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ ''یہ فقہ باطن ہے''، جو فقہ ظاہر سے زیادہ اہمیت کا مستحق ہے، اذکار واشغال کی کیا حقیقت ہے، مجاہدات کا کیا مطلب ہے، بیعت وارادت کیوں اور کس حد

(۱) پرانے چراغ ج ۱۰۸/۲

تک اور کس منزل پر ضروری ہے، عشق ومحبت کا دعوی بغیر عمل صالح کے لغو ہے ،امانت کا اصل مفہوم کیا ہے؟ غرض اس کتاب میں اصولی باتیں ہیں، جن کو ملفوظات اور مکاتیب تھانوی سے استفادہ کر کے مرتب کیا گیا ہے، تقریبا ۵۰۰/صفحات پر یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی تھی"۔ (۱)

علامہ عبدالباری ندویؒ پر ایک جامع کتاب

علامہ عبدالباری ندویؒ ندوۃ العلماء کی نمائندہ شخصیت تھے، ندوۃ العلماء کے ممتاز علماء علامہ حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (والد بزرگوار حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ) علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ وغیرہ سے ان کے اچھے مراسم تھے، علامہ عبدالباری ندویؒ کی شخصیت پر مولانا محمود حسن حسنی ندوی نے "حیات عبدالباری" کے نام ایک کتاب لکھی ہے، یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔اور مجلس صحافت ونشریات لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے مقدمہ سے مزین ہے، یہ ایک مبارک کوشش ہے، جس میں علامہ عبدالباری ندویؒ کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، میرے ایماء پر عزیز گرامی مولوی عطاء الرحمٰن ندوی بن مولانا حفظ الرحمٰن ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے عربی میں ترجمہ بھی کیا، ماشاء یہ ترجمہ بھی مجلس سے شائع چکا ہے۔

وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين.

(۱) تجدید تصوف وسلوک، کتاب کا تعارف (جدید ایڈیشن)

حکیم الاسلامؒ اور دارالعلوم دیوبند

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان کے سب سے ممتاز اور عظیم الشان علمی اور دینی ادارے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی ذمہ داری ایام شباب ہی میں مجلس شوریٰ کی طرف سے عطا کردی گئی تھی، اس وقت ان کی عمر ۲۵-۲۶/سال کے درمیان تھی، اس لئے کہ آپ کا سنہ ولادت ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء ہے، اس وقت ہندوستان میں انگریزی سامراج کے قدمِ اقتدار پوری طرح جم چکے تھے، اس نے سب سے زیادہ دینی تعلیم کے پہلو کو ناکام بنانے میں اپنا زور صرف کیا، اور علوم اسلامیہ کی اہمیت کو کم کرنے اور کتاب وسنت کے علوم کی ہیبت کو خود مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی، اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے عصری تعلیم کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرنے پر اکتفا کیا، بلکہ دیوبند کی مرکزیت کو ختم کرنے کے لئے عصری تعلیم کا ایک بڑا مرکز جو پہلے انگریزوں کی نگرانی میں علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا، اس کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہونچانے کے لئے ہر طرح کے مادی وسائل واسباب کو فراہم کرنے میں حصہ لیا، تاکہ اس کے تعلیمی اور زمینی رقبہ کو وسیع کیا جاسکے، ظاہر ہے کہ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ قوم مسلم کے دینی مزاج کو بدل کر ایسا مزاج پیدا کیا جائے جو دینِ اسلام سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے صورت حال نہایت فکر انگیز تھی، اور دینی نشر واشاعت کا کام متاثر ہو رہا تھا، اس خطرے کو علمائے دیوبند نے پوری طرح محسوس کیا، اور دارالعلوم کو ایک عظیم اسلامی مرکز اور علوم اسلامیہ کے مضبوط قلعہ کی حیثیت سے تیار کرنے میں وہ پوری طرح مشغول ہوگئے اور انگریزی سامراج کے خلاف ایک ایسا محاذ کھولنے میں کامیاب ہوئے، جہاں سے ملک کو اس سامراج کی غلامی سے آزاد کرانے

اورامت مسلمہ کے علم وعقیدہ اورایمان ویقین کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے علماء ومجاہدین کی ایک نسل تیار کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی۔

اب دارالعلوم دیوبند ایک طرف علوم اسلامیہ کی نشرواشاعت، ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا ایک عظیم مرکز تھا، تو دوسری طرف انگریزی سامراج کا مقابلہ کرنے اوراس راستہ میں ہرطرح کی قربانی دینے کا جذبہ ایک حقیقت منتظر بن گیا تھا، دارالعلوم کے مؤسس اول حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے گرد اس وقت کے تمام علمائے کرام جمع ہوگئے، علوم اسلامیہ کا یہ قلعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، انگریزوں کی نفرت دلوں میں پیوست ہوتی گئی، اور ان کے ہر حملے کا جواب دینے کے لئے علمائے کرام کی فوج تیار ہی تھی کہ اچانک شاملی کے میدان میں علماء نے مقابلہ کیا، اور انگریز پسپا ہورہا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے منصب اہتمام کے لئے پہلے نائب مہتمم کی حیثیت سے لئے گئے، یہ واقعہ آپ کی تعلیمی فراغت کے ۵؍سال کے بعد پیش آیا، اس لئے کہ آپ نے دارالعلوم سے سندِ فضیلت ۱۹۱۹ء میں حاصل کی تھی، اور اس کے پانچ سال کے بعد نائب مہتمم کے منصب پر فائز ہوئے، آپ کا دور اہتمام دارالعلوم کے تمام شعبوں میں ترقی اور وسعت کا ذریعہ بنا، آپ کی جدوجہد سے تعمیری ترقی کا راستہ بھی آسان ہوا، چنانچہ سب سے پہلے دارالعلوم میں دارالحدیث کی وسیع اور خوبصورت عمارت ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، اسی کے ایک سال بعد ۱۹۳۳ء مطابق ۱۳۵۰ھ میں دورۂ تفسیر کا شعبہ اپنی خصوصی محنت اور ذوق سے شروع کرایا، اس کے دوسال بعد ۱۹۵۳ء میں صدارت اہتمام کا منصب علامہ شبیر احمد عثمانی کو سونپا گیا، اس کے ایک سال بعد جامعہ ازہر مصر کا وفد آپ ہی کے دورِ اہتمام ۱۳۵۵ھ میں علامہ رشید رضا کی قیادت میں دارالعلوم آیا، اس نے دارالعلوم کا ہمہ جہتی معائنہ کرکے اپنے بہترین تأثرات کا اظہار کیا اور کتاب المعاینہ میں اس کو تحریر بھی کیا، ۱۳۵۸ھ میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سفر کے دوران سلطان عبدالعزیز

بن سعود سے ملاقات ہوئی، اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وساطت سے دارالعلوم کے کتب خانہ کو بہت قیمتی حدیث وتفسیر کی کتابوں کا ہدیہ ملا، اس کے بعد ہی حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ افغانستان تشریف لے گئے، تاکہ وہاں ظاہر شاہ کی تخت نشینی کی مبارکباد علمائے دارالعلوم کی طرف سے پیش کرسکیں، اوران کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوکر افغانستان میں علوم دینیہ کی فضا قائم کرسکیں، اس موقع پر ظاہر شاہ نے دارالعلوم کو جو تعمیری عطیہ دیا اس سے باب الظاہر کی تعمیر آپ نے کرائی، جواحاطہ دارالعلوم کا صدر دروازہ قرار پایا، باب الظاہر کا سنگ بنیاد نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سے ۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۵۸ھ میں رکھوایا گیا تھا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے دور اہتمام میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام پائے، اور بیرون ملک سے بہت سے مؤقر حضرات دارالعلوم دیکھنے اور وہاں کے تعلیمی نظام کو قریب سے سمجھنے کی غرض سے آئے، انہیں کے دور اہتمام میں مصر کی نمایاں شخصیت جناب انورالسادات دارالعلوم دیکھنے آئے، اور انہوں نے آپ ہی کے دورِ مبارک میں بحیثیت مہتمم ان کو دورۂ مصر کی دعوت پیش کی، انہیں کے دور اہتمام میں ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رجندر پرشاد حضرت مہتمم صاحب کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے دارالعلوم تشریف لے گئے، اور افغانستان کے محمد ظاہر شاہ نے بھی دارالعلوم کی زیارت کی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے دارالعلوم کا تعارف کرانے اوراس کے پیغام کو دور دور تک پہونچانے میں مختلف ممالک کا سفر کیا، افریقہ کے مختلف ملکوں کا سفر کیا، برما تشریف لے گئے، اور ۱۹۶۳ء میں جنوبی افریقہ اور جمہوریہ مصر کا سفر فرمایا، اور مؤتمر اسلامی کی دعوت پر مہتمم صاحب نے یورپ کے مختلف ممالک کا سفر کیا، اور ہر جگہ دارالعلوم کے تعارفی اجتماعات منعقد کرائے۔

جب ندوۃ العلماء کی جانب سے ۱۹۷۵ء میں پچاس سالہ جشن منعقد ہوا، تو تقریباً ۷۵؍ نمائندے اور وفود دنیا کے مختلف ممالک سے اس میں شریک ہوئے، شیخ الأزہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود

حکیم الاسلامؒ کی دعوت پر دارالعلوم دیکھنے تشریف لے گئے، ۱۹۷۶ء میں حضرت مہتمم صاحب کی دعوت پر دوسرے صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد نے دارالعلوم دیکھنے کے لئے قدم رنجہ فرمایا۔

حکیم الاسلام کے اسفار و کارناموں کی یہ مختصر تفصیلات ان زبردست کارناموں کے مقابلے میں بہت کم ہے، جو حکیم الاسلام کو بتوفیق الٰہی میسر ہوئیں، انہوں نے اپنی پوری زندگی دارالعلوم کے لئے وقف کردی تھی، اور دنیا کے گوشے گوشے میں دارالعلوم کا تعارف کرانے کے لئے ہر طرح کے سفر کی مشقتیں برداشت کیں، اور جان و مال کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔

مجھے اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت مسرت محسوس ہورہی ہے کہ میرے والد ماجد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب صاحب سابق ناظم جامعہ مفتاح العلوم مئو، اور سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل نے طالب علمی کا ایک طویل زمانہ دارالعلوم میں بحیثیت طالب علم کے گذارا، وہ محدث کبیر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے قریبی تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، اور کئی کتابوں میں حکیم الاسلام کے رفیقِ درس بھی رہے، اس طرح حکیم الاسلام کے خاندان سے ہمیشہ قریبی وابستگی رہی، چنانچہ ہمارے برادر معظم حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی صاحب جنہوں نے دارالعلوم کے طبیہ کالج کے ایک اہم استاد کی حیثیت سے تقریبا ۲۷ رسال دارالعلوم میں گذارے، اس دوران ان کا قلبی اور مخلصانہ تعلق حکیم الاسلام اور ان کے فرزندگان کرام سے بہت قریبی رہا ہے، اور حضرت محدث کشمیری علامہ انور شاہ کے صاحبزادگان عظام سے بہت بے تکلفانہ تعلق قائم رہا، جو بحمد اللہ آج بھی اس خاندان کے افراد سے ہمارا تعلق قائم ہے، مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب کا دارالعلوم میں قیام حکیم الاسلام کے دور اہتمام میں رہا، اور اختلافات و خلفشار کے زمانہ میں ان کا بڑا علمی نقصان ہوا، اور ان کی قیام گاہ پر دھاوا بول کرنا معلوم لوگوں نے ان کی بہت سی کتابوں کے مسودات جو طباعت کے لئے بالکل تیار تھے، لوٹ لیا، اور ان کو ہمیشہ کے لئے ان مسودات کی طباعت سے محروم کردیا۔

۱۹۸۰ء میں صدسالہ اجلاس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات کو بھی شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا، چنانچہ اجلاس میں شریک ہونے کے لئے ندوۃ العلماء کا وفد حضرت مولانا کی قیادت میں شریک ہوا، اور دہلی ہوتے ہوئے اجلاس میں شرکت کے لئے حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پیشوائی میں دارالعلوم حاضر ہوا، اس وفد کا ایک معمولی ممبر یہ راقم الحروف بھی تھا، تقریباً ۲/ یوم کے پروگرام میں شرکت کرنے کے بعد واپسی ہوئی، حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اجلاس کو پوری طاقت کے ساتھ خطاب فرمایا، اور اجلاس کے بہتر نتائج کی امید ظاہر فرمائی، اس اجلاس میں اس وقت کی وزیر اعظم جناب اندرا گاندھی صاحبہ نے حاضر ہوکر افتتاح کی خدمت انجام دی، حکیم الاسلام اور ان کے رفقائے کار نے اجلاس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں، اور ہندوستان کے منتخب علماء کی بڑی تعداد جمع کرلی تھی، اور اس اجلاس کا چرچہ عالم کے گوشے گوشے میں ہوا، مضامین لکھے گئے، بہترین توقعات کا اظہار کیا گیا، اور اجلاس کی خوبصورت قلمی تصویریں پیش کی گئیں، اجلاس کا یہ واقعہ بہت پراثر اور ایک اچھے مستقبل کی طرف اشارہ کرنے والا تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ یہی اجلاس حضرت حکیم الاسلام کی نیک فال کا باعث نہ بن سکا، اور ۱۹۸۲ء میں حضرت حکیم الاسلام نے اہتمام کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو الگ کرلیا، اور مجلس شوریٰ کو اپنا استعفیٰ پیش کردیا، اس کے تقریبا ایک سال بعد آپ نے سفر آخرت اختیار کیا، اس وقت آپ کی عمر ۸۸/ سال تھی۔ آپ کی وفات ہجری سال کے اعتبار سے آج سے ۳۳/ سال قبل ۶/ شوال ۱۴۰۳ھ کو ہوئی، نماز جنازہ صاجزادہ گرامی حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نے پڑھائی، جنازہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد لاکھوں تھی رحمه الله رحمة واسعة، وأدخله في الجنات والنعيم۔

متعدد بیش قیمت تصنیفات آپ نے ایک علمی ورثے کے طور پر امت کو عطا فرمائیں، ان میں اسلام میں اخلاق کا نظام، حدیث کا قرآنی معیار، قوموں کی ترقی وزوال کے اسباب،

اسلامی مساوات، دعوت اسلامی کے اصول، سائنس اور اسلام، انتہائی قابلِ استفادہ کتابیں ہیں، سائنس اور اسلام ان مقالات کا مجموعہ ہے جن کو آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی میں طلباء اور اساتذہ کے سامنے پیش کئے تھے۔

آپ کے پسماندگان میں سب سے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب ہیں، جنہوں نے جانشینی کا حق ادا کیا، اور کرر ہے ہیں، دوسرے صاحبزادے مولانا محمد عاصم قاسمی مرحوم ہیں، جن کی وفات ۱۴ رسال کی عمر میں ہوگئی تھی، تیسرے صاحبزادے مولانا محمد اسلم قاسمی ہیں، جو ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے اور حصولِ تعلیم کے لئے حضرت حکیم الاسلام نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے اپنے مخلصانہ تعلق کی بنا پر ۱۹۵۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کرایا تھا، وہ کچھ دن یہاں قیام کر کے چلے گئے، اور تعلیم کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی اور وہاں کے شعبہ تنظیم وترقی کے ناظم ہوئے، صدسالہ اجلاس میں انہوں نے ناظم اجلاس کی حیثیت سے خدمت انجام دی، چوتھے صاحبزادے محمد اعظم قاسمی ہیں، جنہوں نے دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور پی، ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، پھر ترقی کر کے پروفیسر کے عہدے تک پہونچے اور ۲۰۰۶ء میں اس عہدے سے ریٹائر ہوگئے، اور اب وہ اپنی علمی زندگی علی گڑھ میں گزار رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ایک مثالی قائد ورہنما

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے نجات پاچکا تھا، جنگ آزادی میں حصہ لینے والے ہندو اور مسلم رہنماؤں کی ایک طویل فہرست ہے، خاص طور سے طبقۂ علماء نے آزادی کی لڑائی لڑنے میں اپنا عظیم کردار ادا کیا، سب سے پہلے جس شخصیت نے انگریزوں کے خلاف آزادی کا بگل بجایا، وہ سادات حسنیہ کے مجاہد اور امام ہجرت و جہاد سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی نہ صرف یہ کہ سرفہرست ہے، بلکہ انہوں نے جنگ آزادی کے میدان میں عملی قیادت کر کے طبقۂ علماء کو بیدار کیا، اور رفتہ رفتہ یہ جہاد جنگ آزادی کی شکل اختیار کر گیا، جس نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا پیغام دیا، مسلم علماء کی ایک بڑی تعداد انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنی، ان کو گولیوں سے بھونا گیا، سولیوں پر چڑھایا گیا، اوران کی جائدادوں کو قرق کیا گیا اور کالے پانی کی سزادی گئی، اور علمائے دیوبند کی قیادت میں پورے ملک کے علماء اور غیرت قومی سے سرشار سبھی لوگوں نے اپنے اپنے پیانے کے مطابق اس جنگ میں پوری طاقت کے ساتھ حصہ لیا۔

جنگ آزادی کا یہ سلسلہ بلا انقطاع جاری رہا، رہنمایان ملک وملت اس کی قیادت کرتے رہے، ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو کچل دینے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، شیخ الہند، محمد علی اور شوکت علی، حضرت مدنی، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، موتی لال نہرو، سردار پٹیل، سبھاش چندر بوس اور اس وقت کے سب سے بڑے قائد اور رہنما مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر مختار انصاری میدان جنگ میں ڈٹ گئے، اور انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے

کی ٹھان لی، جب انگریزوں کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اب سیلاب آزادی رکنے والا نہیں ہے، تو انہوں نے بدرجۂ مجبوری ہندوستان کو آزاد مملکت قرار دینے کی تاریخ مقرر کردی، اور آخرکار ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوگیا، اور اس کے مغربی حصے کو پاکستان کے نام سے موسوم کیا گیا، مشرقی حصہ کو مشرقی پاکستان کہا گیا، نقل مکانی کے نتیجہ میں آپس میں خونریزیاں بھی ہوئیں، آزادی کے بعد کا وقفہ مشکلات کے گھیرے میں رہا، آزاد ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت کی تشکیل ہوئی، اس کے پہلے صدر جمہوریہ بابو راجندر پرشاد ہوئے، اور پنڈت نہرو وزیر اعظم اور مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم ہوئے، فرقہ پرستوں نے مسلمانوں کو پاکستان نواز قرار دے کر ان کو سخت تکلیفیں پہونچائیں، دہلی پنجاب اور اس کے گردونواح میں خونریزیاں ہوئیں، اس کی وجہ سے امن وامان قائم کرنے میں بہت رخنہ پڑا، اور مشرقی پاکستان میں بھی یہ وبا شدت اختیار کرگئی، نواکھالی کے مقام پر زبردست خونریزی ہوئی، جس کے نتیجہ میں فسادات کا رقبہ وسعت اختیار کرتا گیا، مولانا آزاد نے ملک کے اندر امن وامان کی فضا قائم کرنے کی بڑی کوشش کی، مولانا آزاد نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ۱۰/سال سے زیادہ کا عرصہ گذارا، اور تاحیات اس ملک کی ہمہ جہت خدمت میں مشغول رہے، ۲۲/فروری ۱۹۵۸ء کو ان کا انتقال ہوگیا، پنڈت نہرو نے ان کے انتقال پر اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کیا، اس موقعہ پر اگر وہ اپنے کو بے یار ومددگار سمجھنے لگے تو اس میں تعجب کی بات نہیں ہے۔

ملک کی آزادی کا جشن منانے کے لئے دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی تھی، جو آزاد کانفرنس کے نام سے شہرت پذیر ہوئی، اس کانفرنس میں ملک بھر سے جنگ آزادی میں حصہ لینے والے خاص طور سے مدعو تھے، اس کے منعقد کرنے میں مولانا آزاد کا رول کافی اہمیت رکھتا ہے، کانفرنس میں وزیر اعظم اور دیگر ارباب حکومت اور جنگ آزادی کے پروانے شریک تھے، میری عمر ابھی بارہ سال کی تھی، لیکن مجھے والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ کی اجازت سے جامعہ مفتاح العلوم کے طلباء کے وفد کے ساتھ کانفرنس میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل

ہوئی، کانفرنس کا افتتاح ہوا، مولانا آزاد اور دیگر زعماء ڈائس پر تشریف فرما تھے، شاعر حریت جناب انور صابری صاحب نے ایک قطعہ پڑھا، اس میں انہوں نے مشرقی پاکستان کے نواکھالی شہر کے ایک خونریز فساد کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کو مخاطب کیا، وہ قطعہ درج ذیل ہے:

نواکھالی سے جو پھوٹا تھا چشمہ
اسی کے تیز رو دھارے نے مارا
ہمیں ہندو سے کچھ شکوہ نہیں ہے
مسلمانوں کو بٹوارے نے مارا

ہر طرف سے واہ واہ کی آواز آئی، اور انہوں نے مکرر پھر اسی قطعہ کو پڑھا، اس کے بعد مولانا آزاد کی افتتاحی تقریر ہونے والی تھی، مولانا کھڑے ہوئے، اور اللہ کے نام سے اپنی تقریر کا آغاز کیا، انہوں نے جو ابتدائی جملے کہے تھے وہ مجھے آج بھی یاد ہیں، انہوں نے کہا:

"کہانی شروع کروں تو کہاں سے کروں، یہ ایک بہت طویل داستان ہے، اس لئے سوچتا ہوں کہ کہانی کہاں سے اور کس طرح سے شروع کروں"۔

یہی موقع تھا کہ میں نے مولانا آزاد کو پہلی اور آخری بار قریب سے دیکھا، اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، تقریر کافی دیر تک جاری رہی، تاریخ آزادی کے اہم عناوین پر مشتمل یہ تقریر انتہائی شگفتہ اور بلیغ پیرایۂ بیان میں جاری رہی، ابھی تقریر ختم نہیں ہوئی تھی کہ ہمارے ساتھیوں نے قیام گاہ پر واپس ہونے کا ارادہ کر لیا۔

یوں تو مولانا ۱۲؍ برس کی عمر میں ایک ہفتہ وار اخبار "المصباح" کے ایڈیٹر ہوئے، اس میں ہر طرح علمی اور سوانحی مضامین شائع ہوتے تھے، اسی طرح ان کو "مرقع عالم" ہردوئی، "خدنگ نظر" لکھنؤ کی ادارت کرنے کا موقع ملا، ہفت روزہ "الہلال" ۱۳؍ جولائی ۱۹۱۲ء کو منظر عام پر آیا، اس کے بند ہونے کے بعد پھر نومبر ۱۹۱۵ء میں پندرہ روزہ "البلاغ"

جاری ہوا، اور تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہنے کے بعد وہ بھی بند کرنا پڑا، مولانا آزاد کے علمی اور تعلیمی نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے ان کی یہ عبارت کافی ہے:

''زمانہ بدل چکا ہے، تعلیم بھی بدل گئی ہے، کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی، اگر وہ وقت اور زندگی کی چال کے ساتھ نہ ہو، زمانہ اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا، اور آپ وہیں بیٹھے رہے، آپ ان ہی مدرسوں میں بیٹھے رہے، جن مدرسوں میں آپ نے آج سے پانچ سو برس پہلے قدم رکھا تھا، اس پانچ سو برس کے اندر دنیا بیٹھی نہیں رہی، زمانہ بھی چلتا رہا، وہ پانچ سو برس کی مسافت طے کر چکا ہے، اور آپ وہیں کے وہیں بیٹھے ہوئے ہیں، آج جو تعلیم ان مدرسوں میں آپ دے رہے ہیں، وقت کی چال سے اسے کیسے جوڑ سکتے ہیں، ہرگز نہیں جوڑ سکتے، نتیجہ یہ ہے کہ زمانے میں اور آپ کے درمیان ایک اونچی دیوار کھڑی ہوگئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم جس سے ملک کے بہترین مدبر، ملک کے بہترین منتظم اور ملک کے بہترین عہدے دار پیدا ہوئے تھے، آج انہیں مدرسوں کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ بالکل نکمے ہیں، اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں انہوں نے حقیقت کو نہیں سمجھا ہے، لیکن ہمیں یہ ماننا پڑے گا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم زمانے سے دور ہوگئے ہیں، آپ نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ آپ اپنے مدرسوں کو زمانے کی چال کے ساتھ جوڑ سکیں، زمانہ چلتا رہا اور ترقی پر پہنچ گیا، اور آپ وہیں رہے جہاں تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم کا زمانہ کی مانگوں سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا اور زمانے نے آپ کے خلاف آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ کر دیا، زمانہ نے آپ کو بیکار سمجھا ہے، ہم کو ماننا چاہئے کہ ماضی میں ہمارا فرض تھا کہ ہم زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتے، مگر ہم نے زمانے کا ساتھ نہیں دیا''۔(۱)

---

(۱) ماخوذ از رسالہ سائنس، نئی دہلی ۲۰۱۱ء

مولانا آزاد کا ندوۃ العلماء سے بہت گہرا تعلق تھا، وہ جب بھی لکھنؤ آتے تو ندوہ کے علماء اور طلباء ان سے ملنے جاتے، خاص طور سے ہمارے مرشد و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ندوۃ العلماء کی نمائندگی کرتے ہوئے بارہا ان سے ملے، مولانا آزاد آزادی سے ایک سال قبل ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ آئے تو حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اپنے دوستوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان سے ملنے گئے، وہ اس وقت کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کے ساتھ مولانا محمد عمران خان ندوی، مولانا محمد اویس صاحب نگرامی، مولانا عبدالسلام ندوی قدوائی، اور مولانا محمد ناظم ندوی بھی تھے، نماز فجر کے بعد یہ حضرات وہاں پہونچے، اور ملاقات ہوئی، مولانا آزاد نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ندوہ کے نصاب تعلیم کے بارے میں دریافت کیا اور ندوہ کے حالات اور یہاں کی سرگرمیوں کا حال معلوم کیا، ملک کی آزادی کے بعد مولانا آزاد کا لکھنؤ بار بار آنا ہوا، اسی درمیان ندوہ کے طلباء مولانا آزاد کو دارالعلوم لے آنے میں کامیاب ہوئے، اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے اپنی کتاب پرانے چراغ حصہ دوم میں تحریر فرمایا ہے:

> ''ایک مرتبہ ندوہ کے طلباء ''دروغ مصلحت آمیز'' سے کام لے کر مولانا کو دارالعلوم میں لے آنے میں کامیاب ہوئے، اس ''دروغ مصلحت آمیز'' کی تشریح یہ ہے کہ مولانا نے اپنے معاصرین کے طبقے مقرر کر رکھے تھے، ایک وہ جس کا وہ کسی قدر احترام ولحاظ فرماتے تھے، اور ان کو اپنا مخاطب ومکتوب الیہ بنانا مناسب سمجھتے تھے، اس انجمن میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر نشین تھے، جن کو مولاناؒ نے عالم خیال میں اپنا مکتوب الیہ اور مخاطب بنایا اور احمد نگر جیل کے لکھے ہوئے وہ خطوط جو بعد میں ''غبار خاطر'' کے نام سے شائع ہوئے اور جن کی ہندوستان کے ادبی حلقہ میں دھوم مچ گئی، انہی کو سامنے رکھ کر لکھے، اسی زمانہ میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور

دارالعلوم کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، ندوہ کے ذہین طلباء یہ سمجھتے تھے کہ ''عنقارا بلند است آشیانہ'' مولانا آزاد اگر کسی کے نام اور کشش سے ندوہ آسکتے ہیں تو وہ صرف مولانا شیروانی تھے، جو اتفاق سے اس وقت اپنی ہمیشہ کی قیام گاہ کاکوری کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

طلباء نے جن کے درس میں ادب و بلاغت کی کتابیں بھی داخل تھیں، اور جس اشارے وکنائے اور توریہ کی تعریف کی گئی تھی، اس انداز سے مولانا سے گفتگو کی کہ مولانا اپنی غیر معمولی ذہانت کے باوجود یہ محسوس نہیں کر سکے کہ مولانا شیروانی لکھنؤ میں ہیں، لیکن اس وقت ندوہ میں نہیں ہیں، اور ان کی ملاقات کے شوق میں ندوہ تشریف لے آئے، میں اس وقت درجہ میں پڑھا رہا تھا، معلوم ہوا کہ مولانا آزاد مہمان خانہ میں تشریف رکھتے ہیں، آیا تو دیکھا کہ مسجد کی محراب میں بیٹھے ہوئے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی پہلو میں ہیں، طلباء سامنے جمع ہیں، مولانا کچھ خطاب فرمارہے ہیں، انہوں نے بڑے لطیف طریقہ پر اس ''سازش'' کا ذکر کیا ،جس کا وہ تمام احتیاطوں اور فراست وذہانت کے باوجود شکار ہو گئے تھے، لیکن اس میں ناگواری واحتجاج کی تلخی نہ تھی، ایک بزرگانہ شکایت جس میں محبت وشفقت کی آمیزش تھی، ایک مرتبہ اور بھی طلباء کی دعوت پر مولانا طلباء کی انجمن ''الاصلاح'' میں تھوڑی دیر کے لئے تشریف لائے تھے، رات کا وقت تھا، یہ واقعہ اور پیشتر کا ہے یہاں بلاترتیب لکھ دیا گیا۔''

☆☆☆

حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ اور عشق الٰہی

انسان کسی گوشت و پوست کے ڈھانچہ یا ظاہری شکل وصورت کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جامعیت کا لباس پہنایا ہے، جسم و روح اور عقل و عاطفہ اور قول و عمل اور درد و عشق اور دعوت و محبت ہر اعتبار سے اس کو ایک مابہ الامتیاز مخلوق بنایا ہے، اس امتیاز اور جامعیت کا سرچشمہ دین اسلام کے پیغام اور کتاب وسنت کی تعلیمات میں مضمر ہے، جو لوگ علم وایمان کے سچے نمائندے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی ہوتے ہیں، اور زندگی کے ہر معاملہ میں راہ اعتدال اختیار کر کے اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں، ان کی زندگی ہمیشہ مؤمن کامل کا آئینہ پیش کرتی ہے، اور وہ خلق عظیم کی نمائندگی کا فرض انجام دیتے ہیں، وہی لوگ دراصل اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار نظر آتے ہیں، اور ان کے نزدیک محبت الٰہی کی شرط اسی وقت پوری ہوتی ہے، جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر صغیر و کبیر میں سچی اتباع کر کے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ صحیح معنوں میں وہ دین کی نمائندگی کا حق رکھتے ہیں، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی مؤمن (کامل) نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے رگ وپے میں میری محبت گھر نہ کر جائے اور اس کے اندرون میں میں پوری طرح سما نہ جاؤں۔

کیڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے\
انسان کیا جو نہ دل دلبر میں گھر کرے

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ کے دل میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت گھر کر گئی تھی، اور اسی درد عشق ومحبت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو شاعر اسلام

وایمان بنادیا، اورانہوں نے اپنے جذبات محبت کی عکاسی کرنے کے لئے شاعری کا سہارا لیا، اور اصناف شعر میں ایک نئی صنف کا اضافہ کیا، سب سے پہلے سماعت فرمایئے حمد کے چند اشعار:

تو ہی مالک تو ہی رب العالمین
تیرے در پر جھکتی ہے سب کی جبیں
مثال تیری کون سمجھے گا بھلا
ابتدا توہی ہے، تو ہی انتہا
تو ہی ہے مقصود ، تو ہی مدعا
جان و دل کرتاہوں میں تجھ پر فدا
قید سے شیطان کے یارب چھڑا
اور شرور نفس سے مجھ کو بچا
یا الٰہی مجھ کو تو اپنا بنا
کر لے تو مقبول ، احمد کی دعا

اورحمد کی اس صنف میں دوسرے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کسی کے سامنے میں کیوں جھکوں پرواہ کیا مجھ کو
خدا کے سامنے جب شوق سے گردن میری خم ہے
مجھے ہے ناز اس کی بندگی پر اور غلامی پر
نہیں جس کے علاوہ اور کوئی خلاق عالم ہے
ہم ان کو یاد کرتے ہیں، وہ ہم کو یاد کرتے ہیں
یہ وہ دولت ہے جس کے سامنے جو چیز ہے کم ہے
رسول پاک لا احصی ثناء جب کہ فرمائیں
کرے تعریف پھراس کی کوئی، کس میں یہ دم خم ہے

جوتن من دھن سبھی قربان کر دے ان کی مرضی پر
وہی اللہ والا عاشقِ فخرِ دوعالم ہے
مجھے اپنا بنائیں گے ، مجھے جلوہ دکھائیں گے
میں اس قابل نہیں، لیکن یقین مجھ کو یہ تاہم ہے

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق ومحبت میں اس عاشق زار کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جب زباں پر محمد کا نام آگیا
دوستو ، زندگی کا پیام آگیا
آگیا ، انبیاء کا امام آگیا
لے کے فیضان دارالسلام آگیا
اللہ اللہ ہوئی دل کی دنیا حسیں
جب مقدر سے حسن تمام آگیا
پا گیا ، پا گیا حاصل زندگی
در پہ آقا کے ، جس دم غلام آگیا

اور مدینہ پاک تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے، بہت سے شاعروں نے مدینہ کی گلیوں اور وہاں کے ہر ذرہ کی تعریف میں اپنے پاکیزہ جذبات کا اظہار کیا ہے، دیکھئے کہ احمد شیریں زبان نے دل میں بسی ہوئی مدینہ کی یاد پر شوق ومحبت کے اپنے جذبات کو کس طرح قلم وقرطاس کے حوالہ کیا ہے، چند اشعار سن لیجئے:

سبز گنبد کو دیکھنے والے دولت قرب تم نے پائی ہے
ذکر ہوتا رہے مدینہ کا بات یہ میرے دل کو بھائی ہے
آتش عشق نے جلا ڈالا زندگی ہم نے مر کے پائی ہے

اور حرم شریف دیکھنے اور بار بار دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر حاضری کا موقع عطا فرمایا، تو یوں گویا ہوئے:

مبارک ہو، ہم پھر حرم جا رہے ہیں
مقدر پر اپنے اب اترا رہے ہیں
تڑپ اپنے دل میں جو ہم پا رہے ہیں
وہ شاید ہمیں یاد فرما رہے ہیں
ہماری مسرت کا عالم نہ پوچھو
حرم جا رہے ہیں، حرم جا رہے ہیں
مبارک، مبارک، مبارک، مبارک
وہ یاد آ رہے ہیں، وہ یاد آ رہے ہیں
جہاں رات دن کا ہے عالم نرالا
وہاں جا رہے ہیں، وہاں جا رہے ہیں

اور حرم میں حاضری کب ہوگی؟ اور کب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ دیکھیں گے؟ گنبد خضراء کو دیکھ کر کب آنکھیں ٹھنڈی کریں گے، چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں:

کب حرم کی بہار دیکھیں گے ۔۔۔ کب نبی کا دیار دیکھیں گے
خود کو جب شرمسار دیکھیں گے ۔۔۔ رحمتیں بے شمار دیکھیں گے
روضۂ پاک مصطفیٰ کب تک ۔۔۔ میرے پروردگار، دیکھیں گے
حق نے چاہا تو سبز گنبد کو ۔۔۔ شوق میں باربار دیکھیں گے

مدینہ کی یاد نے پھر تڑپایا، اور بیساختہ زبان بابرکت پر یہ اشعار جاری ہو گئے:

غلامان سرکار یاد آ رہے ہیں ۔۔۔ وہ اعوان و انصار یاد آ رہے ہیں
جو چون و چرا جانتے ہی نہیں تھے ۔۔۔ خدا کے وفادار یاد آ رہے ہیں
خدا ان سے راضی، وہ راضی خدا سے ۔۔۔ محبت کے بیمار یاد آ رہے ہیں
وہ صدیق و فاروق و عثمان و حیدر ۔۔۔ وہ ابرار و اخیار یاد آ رہے ہیں
لٹا دی خدا کے لئے ساری دولت ۔۔۔ وہ امت کے سردار یاد آ رہے ہیں

وہ دونور والے رفیق پیمبر　　　وہ عثمان زردار یاد آرہے ہیں
تھے حسان، جو عاشق فخر عالم　　　ہمیں ان کے اشعار یاد آرہے ہیں
تڑپنے لگا دل میرا اللہ اللہ　　　مدینہ کے کہسار یاد آرہے ہیں

پھر دریائے محبت جوش میں آتا ہے، اور وہ اس میں ڈوب کر اور اپنے گرد وپیش سے بے خبر ہو کر عشق الٰہی کے نغمے کچھ اس طرح گنگناتے ہیں کہ وہ فردوسِ گوش بن جاتا ہے اور سننے والے تھوڑی دیر کے لئے اس عالم مادی کو فراموش کر جاتے ہیں:

ارے ناداں! نہ سمجھے گا یہ اسرارِ محبت ہیں
کبھی رنجور ہوجانا ، کبھی مسرور ہوجانا

تعلق سے غنی کے ہوگیا غیروں سے مستغنی
پسند آئے نہ کیوں ان کو، میرا مغرور ہو جانا

یہ اکرام محبت ہے، یہ انعام محبت ہے
کہ اس کے فضل سے ذاکر کا بھی مذکور ہوجانا

یہی جان محبت ہے، یہی روح اطاعت ہے
تیرا مختار ہونا اور میرا مجبور ہوجانا

وہ مالک ہیں، جسے چاہیں نوازیں اپنی رحمت سے
نہیں دیکھا ہے کیا ذو النار کا ذوالنور ہوجانا

جو ہیں اہل محبت، بس وہی اس کو سمجھتے ہیں
کسی کا دیکھ لینا، درد کا کافور ہوجانا

عرب کا شاعر بھی عشق الٰہی میں ڈوب کر نغمہ سنج ہوا تھا اور تمنا کی تھی کہ:

”اللہ تعالیٰ آپ کی رضا مجھے درکار ہے، چاہے زمانہ مجھ سے ناراض رہے، اور آپ سے محبت کی چاشنی مجھے مطلوب ہے، چاہے زندگی بے کیف ہوجائے اور گرد وپیش سے میرا

رشتہ منقطع ہو جائے، مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے، اگر آپ اور صرف آپ کے تعلق سے میری دنیا آباد رہے، اور اہل دنیا سے میرا تعلق ختم ہو جائے، مجھے تو آپ کی محبت چاہیے جس کے سامنے ہر نعمت ہیچ ہے، جو نعمتیں بھی روئے زمین پر ہیں، آپ کی محبت کے صدقے وہ میری نظروں میں مٹی کا ایک ڈھیر بنے"۔

یہ ایک عربی شاعر کی تمنائیں تھیں، وہ عشق الٰہی میں فنا ہو کر دنیا و مافیہا سے مستغنی ہو چکا تھا، شاید اس سے بھی زیادہ مولانا کی شاعری میں عشق الٰہی کی عکاسی ہوتی ہو، چند شعر ملاحظہ ہوں :

ان کو رو روکے ہے اب منانا
بخت خفتہ کو یوں ہے جگانا
رٹ تیرے نام کی ہے لگانا
اپنے دل کو ہے، اب دل بنانا
ان کا ہر حال میں یاد آنا
لطفِ جنت ہے دنیا میں پانا
جان ودل ان پر سب ہے لٹانا
کوئی آساں نہیں، دل لگانا
دل میں شمع محبت جلانا
اور پروانہ خود کو بنانا
اف ، کسی کا تصور میں آنا
میرے احساس کا جگمگانا
عشق کی داستاں ہے سنانا
ان کا عاشق جہاں کو بنانا

کیا عربی شاعر نے کسی مفہوم محبت کو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر کسی جذبۂ محبت کا سہارا لیا ہے،؟

عربی کے یہ اشعار بھی سماعت فرمایئے اور دونوں شاعروں کے درمیان موازنہ کیجئے کہ کس کا کلام فنا فی حب اللہ کی ترجمانی میں زیادہ مؤثر ہے۔

وليتك تحلو، والحياة مريرة
وليتك ترضى، والأنام غضاب

وليت الذي بيني وبينك عامر
وبيني وبين العالمين خراب

إذا صح منك الود، فالكل هين
وكل الذي فوق التراب تراب

(کاش آپ میرے لئے شیریں زبان ہوتے، اگر چہ پوری زندگی تلخ ہوتی، اور کاش آپ مجھ سے خوش ہوتے، اگر چہ تمام لوگ خفا ہوتے، کاش میرے اور آپ کے درمیان کے تعلقات استوار ہوتے، اگر چہ پوری دنیا مجھ سے ناراض ہوتی، جب آپ کی محبت مجھے حاصل ہو جائے، تو تمام چیزیں ہیچ ہیں، اور زمین کے اوپر کی تمام چیزیں مٹی کے برابر ہیں)۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی فنائیت عشق ومحبت میں ایسے سرشار تھے کہ محبت کے اسی پیمانہ کو وہ ہمہ وقت اور ہر لحہ اپنی پاکیزہ زندگی کے ہر ہر جزء پر منطبق کرتے تھے، وہ کسی محدود اصلاح کے قائل نہیں تھے، بلکہ ہمہ دم امت کی اصلاح ان کے پیش نظر رہتی تھی، وہ مسلمانوں کی کمزوری اور ان کے روز افزوں مسائل، ان کی بے حسی کو یا بالفاظ دیگران کی بے عملی اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بے تعلقی سمجھتے تھے، وہ قرآن کریم کو اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی اپنے ہر عمل سے

دعوت دیا کرتے تھے، انہوں نے قرآن پاک اور مسلمان کے عنوان سے جو اشعار کہے ہیں، وہ نہ صرف امت مسلمہ کو دعوت عمل دیتے ہیں، بلکہ یہ اشعار قرآن کریم کی حقیقت بیان کرنے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کا پیغام دیتے ہیں، بلکہ اس جہان آب وگل کے بقاء اور انسانیت کے شجر سایہ دار کے پھلنے پھولنے اور انسانوں کو صحیح معنی میں انسان بنانے اور امن ومحبت کے پیغام کو دلوں میں جاگزیں ہونے کا اول وآخر ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

مناسب ہے کہ ان اشعار کو شاعر عشق ومحبت کے ایک عظیم پیغام کے طور پر پیش کر دیا جائے:

غضب ہے ہم کو اب حاصل نہیں لطف روحانی
بھلا دی آہ دل سے ہم نے تعلیمات قرآنی

وہ قرآں، آخری پیغام ہے جو رب عزت کا
مبارک ہو مبارک، قدر اس کی جس نے پہچانی

وہ قرآن، بزم روحانی ہوئی آباد پھر جس سے
وہ جس نے دور کر دی آکے دنیا کی پریشانی

وہ قرآں جو سراپا نور ہے، رحمت ہے برکت ہے
پلاتا ہے جو اپنے عاشقوں کو جام عرفانی

وہ قرآن جو غذا بھی ہے، دوا بھی ہے، شفا بھی ہے
وہ قرآن جس سے طے ہوتے تھے، سب درجات روحانی

وہ قرآن جس کی برکت کا بیاں ہو ہی نہیں سکتا
بناتا ہے جو اپنے ماننے والوں کو ربانی

وہ قرآں جس نے مردوں کو حیات جاوداں بخشی
جہاں میں عام جس نے کر دیا ہے، آب حیوانی

وہ قرآں جس نے کفر وشرک کی جڑ کاٹ کر رکھ دی

مئے توحید کی، جس سے ہوئی دنیا میں ارزانی
وہ جس سے کفر کی ظلمت ہوئی کافور دنیا سے
ہوئی روشن جہاں میں جس سے ہر سو شمع ایمانی
وہ جس کے حکمراں ہوتے ہی دنیا بن گئی جنت
نرالا ہے، جہاں میں، جس کا آئین جہانبانی
وہ جو ابر کرم بن کر جہاں میں چار سو برسا
وہ جس سے ہر طرف جاری ہوئے دریائے احسانی
وہ جس کا ایک نقطہ بھی نہ بدلے گا قیامت تک
وہ جس کی خود خدائے پاک کرتا ہے، نگہبانی
اخوت کا سبق جس نے پڑھایا ساری دنیا کو
غلاموں کو عطا جس نے کیا ہے تاج سلطانی
وہ قرآں آج بھی موجود ہے، لیکن مسلمانو!
نہیں باقی رہا، کیوں آہ ! تم سے ربط پنہانی
خزانہ گھر میں ہے موجود پھر بھی آہ، مفلس ہیں
بھٹکتے پھر رہے ہیں، چار سو اے وائے نادانی
پڑھو قرآن سمجھ کر اور عمل دل سے کرو اس پر
فنا ہو حق کی مرضی میں ، بنو محبوب سبحانی
عمل جو شوق سے کرتا ہے قرآن معظم پر
وہی ہوتا ہے بیشک موردِ الطاف رحمانی
ہوئی ہے صبح صادق سے گریزاں رات کی ظلمت
جہاں خورشید کی کرنوں سے ہوجائے گا نورانی

میرا پیغام ہے، سارے زمانے کے لئے احمؔد
میرا پیغام کیا ہے، بلکہ ہے پیغام ربانی

عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ گذشتہ صدی کے جید علماء اور اصحاب شریعت وطریقت میں ایک بلند مقام رکھتے تھے، وہ حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کے تربیت یافتہ اوران کے خلیفہ تھے، انہوں نے اپنی تواضع اور کسر نفسی سے دعوت وتربیت کے میدان میں زبردست خدمت انجام دی، ان کی شاعری بمنزلہ غذائے روحانی کے ہے، اس پر سچی محبت کا عنصر پوری طرح چھایا ہوا ہے، اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق حقیقی اور معرفت کا رنگ ان کا انتہائی پختہ ہے، وہ طریقت وشریعت کے جامع تھے، محبت ان کے روشن چہرے سے عیاں تھی، اسی کے ساتھ ان کی خداداد بصیرت، ان کا ورع اور تقویٰ، ان کی حکمت ودعوت، نہ صرف قابل صدرشک بلکہ لائق تقلید تھی۔

یہی وہ جامعیت تھی، جس نے ان کو اس بلند مقام پر پہونچایا، جہاں عشق ومحبت اور حکمت ومعرفت کا سورج روشن تھا، اوراس کا نور نگاہوں کو خیرہ کررہا تھا، اس موقع پر حضرت مولانا کے چنداشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کس نے جام محبت پلادیا سب کو
اسی لئے ہیں یہ سب نشۂ سرور میں آج

وفور شوق میں رقصاں ہوئے زمان ومکاں
خبر نہیں کہ کیا آئے گا ظہور میں آج

تیری نگاہ محبت کا فیض کیا کہنا
غرور اب نہیں باقی، سر غرور میں آج

عزیز ہو گئیں ان کی ادائیں سب دل کو
عجیب شان نمایاں ہوئی شعور میں آج

راہ عشق میں کس طرح چلنا چاہئے، اس لئے کہ اس راستہ میں نہ جانے کتنے چور اور ڈاکو گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں، تا کہ آپ کو راہ عشق و محبت سے ہٹا کر اپنے نفس امارہ کو تسکین دلائیں: ارشاد ہے:

دیکھیں ذرا سنبھل کے چلیں راہ عشق میں
ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں چوک جایئے

ہوشیار باش، راہ میں ڈاکو ہیں، چور ہیں
چلئے، سنبھل کے آپ، کہیں لٹ نہ جایئے

دل چاہتا ہے اپنا کہیں اب نہ جایئے
یہ داستان عشق ہے، کس کو سنایئے
ہوش وخرد کا کام نہیں راہِ عشق میں
ان کی طلب میں اپنے کو مجنوں بنایئے

اب ذرا عشق کی مناسبت سے عشق کی وسعتوں میں کھو جایئے اور جگر مراد آبادی کے یہ دو شعر سماعت فرمایئے:

عشق کی وسعتیں، خدا کی پناہ
حوصلہ چاہئے وفا کے لئے
مجھ کو جو چاہو ناصحو کہہ لو
کچھ نہ کہنا، اسے خدا کے لئے

☆☆☆

باب دوم

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

ایک جامع الکمالات شخصیت

معاصر مسائل وقضایا میں

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا معتدل موقف

اعتدال ایک فطری نظام

انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے میانہ روی کا قدرتی نظام ودیعت فرمایا ہے، اس لئے کہ انسان اپنی جملہ جسمانی اور روحانی ضرورتوں میں عقل وقلب کے باہمی تعاون کا محتاج ہے، اور وہ اپنی زندگی کو کامیابی سے ہم کنار کرنے اور دین ودنیا کی سعادت کے تصور کو بروئے کار لانے میں اعتدال اور میانہ روی کا کردار پیش کرتا ہے جو ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے، اور اس کو ایک ایسا نظام عمل عطا کیا ہے جس کو ہم شریعت سے تعبیر کرتے ہیں۔

اعتدال اور امت وسط:

آخری شریعت کا نزول حضور اکرم ﷺ پر ہوا اور اس کا تعارف اسلام کے نام سے ہوا، اس طرح انسان اور اسلام دونوں کو لازم وملزوم کی حیثیت عطا کی گئی، اور دین ودنیا کی تمام کامیابیوں کے لئے اسلام کو شرط اول قرار دے کر امت مسلمہ کو عالمی قیادت وامامت کی عزت عطا کی گئی، اور اسلام کے ماننے والوں کو خیر امت کے لقب سے نوازا گیا، اور انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری اس امت کے سپرد فرمائی گئی، اللہ تعالیٰ نے خیر امت کو امت وسط یا اعتدال ومیانہ روی کی امت بنانے کا اعلان اس طرح فرمایا: "کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله" تم خیر امت ہو، جو لوگوں کے نفع کے

لئے نکالی گئی ہے، بھلائی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بھی پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ اس دین کے ماننے والوں کے لئے درمیانی راستہ ہی اختیار کرنا ضروری ہے، تاکہ صرف اچھائیوں کا حکم دینے کی وجہ سے برائیوں سے روکنے کا عمل ناقص نہ رہ جائے، بلکہ دونوں میں اعتدال کی راہ اختیار کرنا ہی ضروری ہے، مثبت اور منفی کی درمیانی راہ پر چل کر انسانی زندگی کا قافلہ منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے، اس لئے کہ صرف مثبت پہلو اپنانے اور منفی طریقے کو چھوڑنے سے خیر امت کی ذمہ داری ادا نہیں ہوسکتی، جب دونوں مفہوم سامنے ہوں گے تو از خود اعتدال کی راہ ہماری امتیازی شان بن جائے گی اور خیر امت کا تعارف امت وسط کے نام سے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو کس قدر وضاحت اور اعجاز کیساتھ اپنی کتاب عزیز میں بیان کیا ہے: "وکذلك جعلناکم أمة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا "ہم نے تمہیں امت وسط بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور رسول تمہارے گواہ بن جائیں۔

اعتدال یا میانہ روی کا مفہوم تغیر پذیر دنیا میں

بہت سے لوگوں نے وسطیت کا مفہوم صرف عقل کی ہدایت کی بنیاد پر رکھا، اور وہ انہیں ہدایات پر قائم ہیں، ان میں سرفہرست ایسے لوگ ہوسکتے ہیں، جو دور حاضر کی مادی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں، اور مادی حیثیت سے عقل کی ہدایات کے مطابق نفع وضرر اور حسن وقبح اور ظاہر وباطن کی تشریح کرتے ہیں، اسلامی تاریخ کے قدیم دور میں کچھ ایسی جماعتیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے عقل وفہم کو وسطیت کی بنیاد بنایا، لیکن جمہور علمائے اسلام نے اس نقطۂ نظر کو رد کر کے یہ ثابت کیا کہ دین اسلام ایسی وسطیت کی نمائندگی کرتا ہے جس کا تعلق عقل اور قلب دونوں سے ہو، اور وسطیت کے صحیح مفہوم میں اسی عمل کو شمار کرتے ہیں،

جو عقل سلیم اور قلب مؤمن کی ہدایات کے مطابق پیش کیا جاتا ہو۔

چونکہ وسطیت کے مفہوم کو خلط ملط کرنے کی کوششیں عصر حاضر میں خاص طور سے مغربی افکار وثقافت سے متاثر طبقات میں جاری ہیں، اس لئے اس کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، حدیث پاک میں آیا ہے: الدین یسر، ولن یشاد الدین أحد الا غلبه، فسددوا وقاربوا واستعینوا بالغدوة والروحة وشیئ من الدلجة (دین آسان ہے، اور جو شخص بھی دین سے مقابلہ کرے گا تو دین اس کو پچھاڑ دے گا، لہذا صحیح عمل کرو، میانہ روی اختیار کرو، اور صبح وشام، اور رات کے ایک حصہ کے ذریعہ اللہ سے مدد کے طالب رہو)۔ اس حدیث پاک سے ہمارے لئے اس حقیقت کا سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ زندگی کے کسی مسئلہ میں غلو کرنا اور حد سے تجاوز کرنا یا راہ اعتدال سے ہٹ کر زندگی کے معاملات کو طے کرنا طرح طرح کے مسائل اور مشکلات پیدا کرنے کے مرادف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اعتدال اور میانہ روی کی زبردست ہدایات موجود ہیں، ایک دفعہ حضرات صحابہ میں سے تین حضرات حضور ﷺ کی عبادت کے متعلق دریافت کرنے کے لئے امہات المومنین کی خدمت میں آئے، جب ان کو تفصیل معلوم ہوئی تو غالباً ان کے اندازے کے مطابق حضور ﷺ کی عبادت ان کو کچھ کم معلوم ہوئی اور کہنے لگے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، ہماری ان کے سامنے کیا حیثیت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ معاف فرمادیئے ہیں، ان میں ایک صاحب نے کہا کہ میں پوری رات عبادت کروں گا، اور نیند کو خیرباد کہوں گا، دوسرے صاحب نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، اور کبھی افطار نہیں کروں گا، تیسرے صاحب نے کہا کہ میں کبھی شادی نہیں کرونگا اور عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا، حضور ﷺ ان کی یہ بات سن رہے تھے، باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا تمھیں لوگوں نے یہ باتیں کہی ہیں، واللہ! میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم

سے زیادہ تقویٰ رکھنے والا لیکن میں عبادت بھی کرتا ہوں، اور سوتا بھی ہوں، روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، (یہی سنت ہے) اور جو بھی میری سنت سے بے رغبتی کرے گا وہ میری امت سے نہیں ہوگا۔

اعتدال کی حقیقی نمائندہ شخصیت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اسی رسول پاک ﷺ کی اولاد میں سے ہیں اور انھیں کی سنت پر تمام امور میں اعتدال کی راہ پر گامزن رہے، اور اپنے قول وعمل اور زندگی کے تمام معاملات میں میانہ روی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، تقریر ہو یا تحریر، دینی عمل ہو یا دنیا سے متعلق معاملات ہوں، موافق کیساتھ ہوں یا مخالف کیساتھ، ہر حال میں یہاں تک کہ اپنے چھوٹوں اور شاگردوں کے ساتھ بھی ہمیشہ اعتدال اور میانہ روی کا رویہ قائم رکھا اور اسی کی نصیحت بھی کی، جب بھی کسی نے آپ کے ساتھ عامیانہ یا معاندانہ سلوک کیا تو آپ نے اس کو سختی کیساتھ جواب دینے کے بجائے نرم اخلاق کا مظاہرہ فرمایا، اور ایسے شخص کو اپنی نرم گوئی سے متاثر فرمایا: "الحب فی الله، والبغض فی الله" میں بھی راہ اعتدال سے کبھی دور نہیں ہوئے، اور عقل وقلب کے رشتہ کو علم وعمل کی روشنی میں ہمیشہ تازہ دم رکھا۔

حضرت مولانا نے نہ صرف عوام وخواص کے درمیان میانہ روی کی شان قائم رکھی، بلکہ دنیا کے ارباب حکومت اور اصحاب قوت وطاقت کے سامنے بھی کبھی نہیں جھکے، اور وسطیت کے امتیاز کو ہمیشہ اور ہر موقع پر برقرار رکھا، آپ نے بلاد عربیہ کے حکام وملوک اور امراء ووزراء، اپنے ملک کے اصحاب اقتدار وحکومت سبھی لوگوں کے ساتھ اپنی اسی میانہ روی کا طریقہ اپنایا، جس کے نتیجے میں سب نے آپ کا آخری درجہ تک احترام کیا، اور آپ کی مثالی شخصیت کا اعتراف کیا، آپ کسی بڑے سے بڑے انسان کے سامنے نہ جھکے اور نہ کبر وغرور کا انداز اپنایا، اتنی تواضع نہیں برتی جو کسی طالب منصب ومال کی ہوتی ہے اور نہ اپنی بڑائی کا سکہ جمانے کی کبھی کوئی جھلک آپ کی زندگی میں محسوس کی گئی۔

آپ کی زندگی توازن کا اعلیٰ نمونہ تھی، دین ودنیا دونوں کے حقوق ہمیشہ آپ کے سامنے ہوا کرتے تھے اوران کو انتہائی توازن واعتدال کیساتھ ادا فرماتے تھے، دین کے معاملے میں غلو کسی درجے میں آپ کے اندر کبھی نہیں پایا گیا، اورنہ دنیاوی امور میں فراخ دلی اس حد تک کہ حد شریعت سے تجاوز کر جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

"فمن الناس يقول ربنا آتنا في الدنيا وماله في الآخرة من خلاق ، ومنهم من يقول ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار، أولئك لهم نصيب مما كسبوا والله سريع الحساب)

"پس لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: اے رب! ہمیں دنیا میں سب کچھ عطا فرمادے، اوران کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اورانھیں میں ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم کو دنیا کی بھلائی بھی عطا فرما، اورآخرت کی بھلائی بھی، اورہم کو جہنم کے عذاب سے محفوظ فرما، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ان کے کئے ہوئے اعمال کا حصہ ہوتا ہے، اوراللہ تعالیٰ تو جلد حساب لینے والے ہیں"۔

قرآن کریم کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو دنیا اوراس کی زیب وزینت، مال ودولت، عزت ووجاہت طلب کرتے ہیں اوراس کے علاوہ ان کا کوئی اور مقصد حیات نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو یقیناً ان کی خواہش کے مطابق دنیا عطا کردیتے ہیں اورآخرت میں ان کو سوائے محرومی اور بدنصیبی کے کوئی اور چیز نہیں ملتی، یہ دراصل بے اعتدالی اورعدم توازن کا نتیجہ ہے، صرف ایک پہلو کی طرف جھک جانا اوراسی پر قائم رہنا، اوردوسرے پہلو سے بے تعلق رہ کر یک طرفہ معاملہ کرنا ان لوگوں کا شیوہ ہے جو اعتدال کی عظمت واہمیت سے یا تو واقف نہیں ہیں یا قصداً ایسا کرتے ہیں، اس زمرہ میں سارے دنیا پرست اورعہدہ ومنصب، مال ودولت کے حریص اورآنے والی دائمی نعمت والی زندگی سے غفلت اختیار کرنے والے سبھی انسان آجاتے ہیں، لیکن زندگی کے دونوں پہلوؤں، روح وجسم، اورعقل وقلب، دین

و دنیا کو توازن کے ساتھ جمع کرنے کا عمل صرف انھیں مردان دانش مند کے ساتھ مختص ہے جن کو زندگی کے صحیح مقصد کا علم عطا ہوا ہو اور اپنے اسی علم یزادنی کے ماتحت توازن و اعتدال اور دونوں پہلوؤں کو ساتھ لیکر چلنے کی توفیق سے وہ بہرہ ور ہیں۔

تاریخ قدیم میں بھی ایسے واقعات پیش آئے ہیں، جن میں صرف عقل کو اصل رہنما بنایا گیا ہے، اور اس کی ہدایات کے بموجب کچھ ایسی جماعتیں وجود میں آگئیں، جن کو عقل پرستی کے لقب سے نوازا گیا، اس میں مثال کے طور پر جہمیہ، مرجئہ، قدریہ، معتزلہ اور باطنی فرقے آجاتے ہیں، ان جماعتوں کے پیشواؤں نے عقل پر اعتماد کر کے اسلام کے عقیدۂ وسطیت کو پامال کیا، اور راہ اعتدال سے جو اسلامی شریعت کا امتیاز ہے فرار اختیار کرنے کی کوشش کی، اور امت وسط کو جسے اللہ تعالیٰ نے ''اُمۃ واحدۃ'' سے تعبیر کیا ہے، ٹکروں اور فرقوں میں تقسیم کر دیا اور مناظرہ ونقاش کا دروازہ کھول دیا، اس کی واضح مثالیں آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس بے اعتدالی کو ہوا دینے میں بہت سی طاقتیں متحد ہو کر امت مسلمہ میں انتشار و بے اعتمادی کی فضا پیدا کرنے میں سرگرم ہیں، عصر حاضر میں جب مادہ پرستی اپنا اعتبار کھو چکی ہے اور مغرب و مشرق کے انسان اس کی حقیقت سے آشنا ہو کر عقیدۂ اسلام کو اختیار کرنے اور اسلامی شریعت کو اپنانے کے لئے بے چین ہیں، اور مغربی مادیت زمین کو اپنے پیروں سے کھسکتے ہوئے محسوس کرنے لگی ہے، اسلام کے خلاف اپنی ایجنسیوں کو پوری طاقت سے لیس کر رہی ہے اور اسلامی وسطیت کے اس رجحان کو مٹانے کے لئے تمام وسائل و ذرائع اور ہر قسم کے اسلحہ کو استعمال کر کے وسطیت کے اس تیز دھارے کو روکنے میں مصروف ہے۔

اس حقیقت کا ہم آج کسی طرح انکار نہیں کر سکتے کہ اس صورت حال کو حضرت مولاناؒ نے نہ صرف محسوس فرمالیا تھا، بلکہ اس کا مشاہدہ بھی کیا تھا اور وہ اس کو بدلنے اور اس غیر فطری عمل کو روکنے کے لئے اپنی تمام توانائیوں کو صرف کر رہے تھے، جہاں بھی تشریف لے جاتے، اسی احساس کے ساتھ اور اسلام کی دعوت کو حکمت و موعظت کے اپنے

خاص اسلوب اور قصد واعتدال کی روح کیساتھ پیش کرتے،اس کا اثر یہ ہوتا کہ غیر مسلم حضرات تک آپ کی مخلصانہ دعوت اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے،اور کتنے ہی لوگوں نے اسلام کی خوبیوں سے واقف ہوکر اسے اپنا لینے کی تمنا پوری کی۔

تاریخ انسانی کا عظیم انقلاب اعتدال کا مرہون منت

اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں آخری نظام حیات دے کر مبعوث فرمایا، یہ نظام اپنی آفاقیت وجامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے،فطرت انسانی کے تمام تقاضوں کی تکمیل،اور انسانی زندگی کے جملہ مسائل کا بہترین حل اس میں موجود ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله، ذلك الدين القيم، ولكن أكثر الناس لا يعلمون. (سورۂ روم:۳۰)

’’اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے،اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے، پس سیدھا دین یہی ہے،لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔‘‘

اسلام کی آمد سے تاریخ انسانیت میں ایسا عظیم الشان انقلاب رونما ہوا جس نے لوگوں کو خواہشات نفسانی کے کج راستوں سے ہٹا کر صراط مستقیم پر ڈال دیا،اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسا صالح معاشرہ وجود میں آیا جس میں ایمان ویقین،سچائی وراست بازی،تقویٰ وطہارت اور کردار وعمل کے دلچسپ ودلکش مظاہر کی کارفرمائی رہی، وہ معاشرہ ایسے پاک طینت افراد پر مشتمل تھا جو بجا طور پر انسانیت کے لئے بہترین نمونہ تھے،ان کی اس افضلیت وبرتری کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ساخت وپرداخت شریعت اسلامیہ کی ہدایت کی روشنی میں کی گئی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اسلامی تربیت کی کرشمہ سازی اپنا جمال وجلال دکھائے بغیر نہیں رہتی، بلکہ اس کے زیر

سایہ ایسے انسانوں کی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے جو مستقبل میں امامت وقیادت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی اعتدال ومیانہ روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، وہ غلو وتقدیس سے پاک اور حق تلفی وناانصافی سے کوسوں دور ہوتے ہیں، اخلاص وتعلق مع اللہ ان کی زندگی کا نمایاں جوہر اور حقیقی مقصد ہوتا ہے۔

مرد مومن کے اصل مقصد اور راہ اعتدال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''مومن کا دنیاوی موقف وہ ہے جس کی توضیح زبان نبوت نے بڑے اچھے ڈھنگ سے فرمائی ہے، اور ایسی لطافت ونزاکت اور دقیق تعیین کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے کہ اس کے سامنے زبان وبیان اور لطافت وباریکی کے تمام طرز وادا ہیچ نظر آتے ہیں، فرمایا: "إن الدنيا خُلقت لكم وإنكم خُلقتم للآخرة." (دنیا کی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کی گئی ہیں اور تم لوگ آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو) لہٰذا ایک مسلمان دنیا وآخرت کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ دنیا اور اس کے سارے وسائل وذرائع کی حیثیت محض ایک وسیلہ کی ہے، مقصد وغایت اور حقیقی مطمح نظر تو بس آخرت کی زندگی ہے، لہٰذا اسی مقصد کے حصول کے لئے اس مادی دنیا کے تمام وسائل سے حتی الامکان استفادہ کرنا چاہیے، ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقیقت کو یوں آشکارا کیا ہے۔'' مالي وللدنيا وما أنا والدنيا إنما أنا كراكب استظل تحت شجرة ثم راح وتركها۔ (مجھ کو دنیا سے کیا لینا دینا، میرا تعلق تو اس سے بس اتنا ہے جتنا ایک مسافر سوار کا کسی سایہ دار درخت سے ہوتا ہے کہ وہ اس کے نیچے سایہ حاصل کرتا ہے، پھر اٹھ کر چل دیتا ہے)۔

مذکورہ بالا قرآنی نظریہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کی تعلیمات وارشادات، احساسات ورجحانات، اور اَوراد واذکار، ادعیہ ومناجات اور خلوت وجلوت کی

زندگی میں مکمل طور پر ظاہر ہوا، اسی طرح آپ ﷺ کی آغوش تربیت میں پرورش پانے والے صحابہ کرامؓ اور اس امت کے مومنین صالحین کی زندگیوں میں بھی یہ وصف پورے آب وتاب کے ساتھ پایا گیا، حتی کہ وہ ان کی زندگی کا جزء لاینفک بن گیا اور اس نے ثابت شدہ تاریخی حقائق کا درجہ اختیار کرلیا جس میں بحث ومباحثہ اور کسی کلام کی کوئی گنجائش نہیں۔

امت اسلامیہ کے فرزند ارجمند

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ اپنی ذات سے ایک انجمن، امت اسلامیہ کے عظیم وہونہار فرزند ارجمند، اور عالم انسانیت کے لئے بہترین نمونہ اور ایک مثالی انسان تھے، آپ کی اسلامی شخصیت کے تعارف کیلئے کسی دلیل وبرہان کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کی جملہ تصنیفات سے جن کی تعداد تقریبا ۲۰۰ ر بلکہ اس سے زائد ہے پورا عالم باخبر ہے، حتی کہ مسلم نوجوانوں کے اندر ان کتابوں کو جمع کرنے اور ان سے خالص اسلامی فکر کی غذا حاصل کرنے میں مقابلہ اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ پایا جارہا ہے، کیونکہ ان میں اسلامی فکر کا ایسا خلاصہ اور نچوڑ پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ اور ہر محاذ سے ہے، ان میں ایسی طاقت وصلاحیت ہے جو اسلام اور اس کے نظام پر لوگوں کا اعتماد بحال کرسکتی ہے، اور مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت رفتہ اور اس کے سطوت وغلبہ کی بازیابی کے لئے ایمان ویقین کی چنگاری روشن کرسکتی ہے اور انہیں عالمی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالنے اور عالم انسانی کو جدید جاہلیتوں، خودساختہ نظریات حیات اور مادی تہذیبوں کے جہنم سے نکالنے پر آمادہ کرسکتی ہے، مولانا مرحوم کی اسلامی شخصیت کو، آپ کی روشن فکر، کائنات کے متعلق آپ کے بے مثال نظریۂ حیات اور مادی تہذیبوں کے متعلق آپ کی وسیع معلومات کے آئینہ میں دیکھا جاسکتا ہے، اس بناپر مولاناؒ بجاطور پر اس بات کے سب سے زیادہ حق دار تھے کہ آپ کی محبت میں اکرام وتعظیم اور ادب واحترام کے گلہائے عقیدت پیش کئے جاتے رہیں۔

آپ کا وجود ابر رحمت تھا

مفکر اسلام حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ عالم اسلام کے لئے کسی ابر رحمت سے کم نہ تھے، آپ کا وجود مسلمانوں کے لئے بڑے خیر و برکت کا باعث تھا، آپ ان کے لئے سرچشمہ ہدایت اور ایک مشفق و مربی کا درجہ رکھتے تھے، امت مسلمہ کے مسائل و مشکلات سے بخوبی واقف تھے، اس لئے ان مسائل میں دلچسپی لے کر ان کا بہترین حل پیش کرتے تھے، اطراف عالم کے مسلمان آپ سے دعوت و تبلیغ کے میدان میں حکمت و موعظت کا سبق سیکھتے تھے، حالات چاہے جیسے بھی ہوں، ہمیشہ اسلامی موقف پر جمے رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اصل مقصد دعوت الی اللہ اور اس کے لئے عالم کی سیاحت

الغرض آپ ہر ممکن طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں سرگرم عمل تھے، آپ کے لئے اگر ایک طرف تالیف و تصنیف کی بے پناہ مشغولیت تھی تو دوسری طرف اسفار و ملاقات کا لامتناہی سلسلہ تھا، اعلاء کلمۃ اللہ آپ کی زندگی کا حقیقی ہدف اور اصل نصب العین تھا، چنانچہ آپ نے امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بحالی، اسلامی تہذیب و تمدن کا پرچم پورے عالم میں لہرانے، دشمنان اسلام کے اعتراضات کا کافی وشافی جواب دینے، ان کے ناپاک عزائم اور ان کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے مصر و فلسطین کی خاک چھانی، امریکہ و یورپ کے شہروں اور وہاں کے تعلیم و تہذیب کے مراکز کی سیر کی، اسپین کے شکستہ در و دیوار کی عبرت ناک داستانیں سنا کر مسلمانوں کی حمیت دینی اور ان کی غیرت کو للکارا، خلافت عثمانیہ کے زوال کے اسباب بیان کر کے ان کے ذہن و دماغ کو جھنجھوڑا، کتب تاریخ کے اوراقِ پارینہ کو کھنگھالا اور اسلامی تہذیب کے ایک ایک پہلو کو روشن و بے غبار ثابت کر کے دم لیا۔

اس کا ثمرہ پورے عالم اسلام میں اسلامی بیداری کی شکل میں نمودار ہوا، مگر افسوس کہ آپ ایسے نازک وقت میں راہئ دار بقا ہوئے جب کہ امت کو آپ جیسے قائد و مجاہد کی اشد ضرورت تھی، آج عالم اسلام کو عموما اور امت اسلامیہ ہندیہ کو خصوصا مسائل و مشکلات

کے ایک سیلِ رواں کا سامنا ہے، عربی مثل میں ذرا تغیر کے ساتھ کہنا کتنا بجا معلوم ہوتا ہے "قضايا ولا أبا حسن لها"۔

حضرت مولانا کی فکرِ اعتدال کے چند مظاہر

ندوۃ العلماء فکرِ وسطیت کا ترجمان

تحریک ندوۃ العلماء دراصل دو مد مقابل نظریوں (خالص دنیاداری، اور نرا تقشّف و زہد) کو ایک دوسرے سے نہایت توازن کے ساتھ جوڑنے اور امتِ مسلمہ کو منصب قیادت پر فائز کرنے والی امت بنانے کے لئے شروع کی گئی تھی، تاکہ امت وسط اپنی جامعیت اور قیادت کا آئینہ دنیا کو دکھا سکے، اور اپنی قیادت کی صلاحیت کا عملی نمونہ ہر زمان و مکان میں اور ہر عصر و مصر میں پیش کرنے والی امت قرار پائے، اس موقع پر حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا تحریک ندوۃ العلماء کے بارے میں مختصر اظہار خیال پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

> ''ندوۃ العلماء کی فکری تحریک (۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء) جس کے بانی مولانا محمد علی مونگیریؒ تھے، اور جس کی رہنمائی ان کے بعد عرصے تک مولانا شبلی اور ان کے نامور رفقاء نے کی، اور اس کے قائم کردہ دارالعلوم میں اس کی صلاحیت تھی کہ وہ اسلامی اور مغربی ثقافت اور علمائے دین و جدید طبقہ کے درمیان پل کا کام کر سکے اور ایک ایسا متوازن فکر تیار کر سکے جو قدیم و جدید دونوں کے محاسن کا جامع ہو اور اس مدرسۂ فکر کے ذمہ داروں کے الفاظ میں ''اصول و مقاصد میں سخت اور بے لوچ، اور فروع اور وسائل میں وسیع اور لچکدار ہو''۔(۱)

ردِ قادیانیت اعتدال کے ساتھ

حضرت مولانا کے مرشد و مربی حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ نے خاص توجہ اور

---

(۱) اسلامی ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش: ۹۰

اصرار کے ساتھ عالم اسلام میں قادیانیت کا تعارف کرانے اور وہاں کے علمی اور دینی حلقوں کو اس نئی نبوت سے متعارف کرانے کے لئے عربی میں ایک مکمل کتاب کی تالیف کا حکم دیا، اور حضرت رائے پوریؒ کی خصوصی توجہ سے یہ کتاب عربی زبان میں تین ہفتوں کی مشغولیت کے بعد تیار ہوگئی، جس کا نام "القادیانی والقادیانیة" رکھا گیا، اور اس کی عالم اسلام کے تمام حلقوں میں پذیرائی ہوئی، پھر اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا، اور کافی مقبول ہوا، اور رد قادیانیت میں اس کتاب کا فائدہ وسیع پیانہ پر ظاہر ہوا، یہ کتاب ادب اور حکمت وموعظت کے اسلوب میں لکھی جانے کی وجہ سے قادیانی حلقوں میں بھی اس کا اچھا اثر پڑا، اور عقیدۂ ختم نبوت کے سمجھنے میں اس کتاب کا کردار نہایت مؤثر اور مقبول ثابت ہوا، اور اس حلقہ کے لوگوں نے بھی اسے دلچسپی سے پڑھا اور عقیدۂ ختم نبوت کو تقویت حاصل ہوئی۔

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا قیام

ردقادیانیت کی اس کوشش اور عقیدۂ ختم نبوت کو دل کی گہرائیوں میں راسخ کرنے کے اس مثبت اور مؤثر انداز کے بعد ایک نئے فتنے اور لاشعوری ارتداد کی طرف حضرت مولانا کا ذہن متوجہ ہوا، جس نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، یعنی یورپ کی مغربی تہذیب اپنی آب وتاب کے ساتھ عالم اسلام پر حملہ آور ہے، اور لاشعوری طور پر لوگ اسلامی شریعت اور اس کے نظام حیات سے غافل ہوکر اس تہذیب کی چمک دمک کا شکار ہو چکے ہیں، یہ فتنہ حضرت مولانا کے ذہن ودماغ پر چھایا رہا، اس کی اہمیت کے پیش نظر مولانا نے "ردۃ ولا أبابکر لها" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، وہ دمشق سے نکلنے والے عربی زبان کے مشہور مجلہ ''المسلمون'' میں شائع ہوا، مضمون کی دوسری قسط ''دعوة جدیدة'' کے عنوان سے اسی پرچے میں شائع ہوئی۔

اس صورتِ حال کا حضرت مولانا پر شدید اثر ہوا، اور اسی کے نتیجہ میں ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' کا ادارہ قائم کیا گیا، مناسب ہوگا کہ اس لاشعوری فتنہ ارتداد کے سلسلہ میں

خود حضرت مولانا کی تحریر پیش کردی جائے، تاکہ مفہوم اچھی طرح واضح ہوجائے:

''میں نے اسلام میں ایک نئے قسم کے ارتداد کی نشان دہی کی، یہ وہ ارتداد ہے جو شرق اسلامی پر یورپ کی سیاسی وتہذیبی تاخت کے پیچھے پیچھے آیا ہے، اور یہ سب سے عظیم ارتداد ہے جو عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کی اسلامی تاریخ میں رونما ہوا ہے، یہ دین لادینیت ہے، جو مسلمان تعلیم یافتہ طبقے کے بے شمار افراد کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے، لیکن پچھلی ارتدادی تحریکوں اور لہروں کے برخلاف اس ارتداد کی زد میں آنے والا اور ضروریاتِ دین اور حقائقِ دینی کا انکار کرنے والا کسی کلیسا یا مندر میں نہیں جاتا اور نہ تبدیلیٔ مذہب کا خود اعلان کرتا ہے، اور نہ اس کا اسلامی معاشرہ اس پر چونکتا ہے اور نہ اس سے فصل وانقطاع کا وہ معاملہ کرتا ہے، جو مرتدینِ وسابقین کے ساتھ کیا جاتا ہے، درحقیقت اس خیال کی بنیاد اور اس مسئلہ کی طرف توجہ فاضلِ گرامی ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کے ایک مضمون سے ہوئی تھی، میں نے یہ بنیادی تصور لے کر اس کو اس مضمون میں شرح وبسط کے ساتھ لکھا، لادینیت کی عالمگیر اشاعت کا راز بھی بتایا، عالم اسلام میں اس کے اہم مظاہر کی بھی نقاب کشائی کی، پھر اس کے علاج کے طریقے، نئی طاقتور دعوت ایمان، اور اس کے لئے نئے علمی اداروں کی ضرورت، نئے ذہن کو سامنے رکھ کر طاقتور لٹریچر کی تیاری پر زور دیا، اور اس سنگین صورتِ حال کی تصویر کشی کی، جس سے عالم اسلام دوچار ہے۔

یہ مضمون دو قسطوں میں "ردۃ جدیدۃ" اور "دعوۃ جدیدۃ" کے عنوان سے ''المسلمون'' میں شائع ہوا، بعد میں یہی ایک مستقل رسالہ کی شکل میں "ردۃ ولا أبا بکر لها" (فتنہ ارتداد ہے، اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی ابوبکر نہیں) کے عنوان سے شائع ہوا، جو مختلف وقتوں میں اور مختلف اداروں کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوا، اور منی وعرفات تک میں اس کی تقسیم ہوئی، غالباً راقم کا کوئی مضمون، رسالہ یا کتاب اتنی بڑی تعداد میں نہ شائع ہوئی، نہ اثر

انداز، اس مضمون کے لکھنے اور شائع ہونے کے بعد شدت سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس اعتقادی اور تہذیبی ارتداد اور اس فکری واخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک مستقل مجلس (Academy) کی تاسیس ہونی چاہئے، جو اس کام کا بیڑا اٹھائے، اور اسی کو اپنا موضوع بنائے، چنانچہ مئی ۱۹۵۹ء میں ایک صاحب خیر کی ایک ہزار کی رقم سے اس کی تاسیس "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" Academy of Islamic Reserch and Publication کے نام سے عمل میں آئی، اس نے پہلی کتاب مقالات سیرت مصنفہ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کے نام سے شائع کی، ان سطور کی تحریر کے وقت تک اس کی مطبوعات کی تعداد ۱۶۸ تک پہنچ گئی ہے، اور کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم انگریزی میں اس تحت براعظم میں کسی ادارہ نے دعوتی وعلمی انداز اور اچھی اور معیاری انگریزی میں دین وشریعت، عقائد اور ارکان اسلام، حدیث وسنت، سیرت طیبہ، خلفائے راشدین، اور تاریخ اصلاح وتجدید، نیز ہندوستان میں اسلام اور مسلمان کے تعمیری ودفاعی کاموں کے تعارف میں اس سے زیادہ لٹریچر شائع نہیں کیا، یورپ، امریکہ، اور جنوبی افریقہ اور عرب ممالک میں اس کی کتابیں بحمد اللہ بہت مقبول ہیں، یہ سب کام محض تائید الٰہی سے ایسے تھوڑے سرمایہ اور ایسے محدود ومختصر عملہ کے ذریعہ وجود میں آیا جس پر آسانی سے یقین کرنا مشکل ہے"۔(۱)

دینی تعلیمی کونسل، الحادی تعلیم کے خلاف مثبت پہل

لاریب حضرت مولانا کو پوری دنیا کی امت مسلمہ سے نہایت ہی قلبی اور روحانی تعلق تھا، وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان صراط مستقیم پر قائم رہیں، اور دنیاوی وجاہت کو اسلام پر کسی حال میں بھی ترجیح نہ دیں، ان کو یہ بھی احساس تھا کہ مسلمان اپنے ایمانی طریقہ اور عقیدہ کے ستھرے پن سے دور ہوگئے ہیں، دنیا کی مادی تہذیبوں اور تمدنی فلسفوں کا اثر بڑی حد تک قبول کرنے

---

(۱) کاروان زندگی ج۴/۲۵۲-۲۵۴

لگے ہیں، وہ مادی مال ومتاع کی بھول بھلیوں میں پہنچ کر اپنے عقیدہ اور ایمان سے کسی حد تک بیگانہ ہوگئے ہیں، انہوں نے مختلف اسلوب وانداز کے ساتھ امت مسلمہ کو خواہ عرب ہو یا عجم، ہر جگہ مخاطب کیا، اور ان کو اپنا منصب قیادت، اور اپنی عظمت رفتہ کا احساس دلایا، وہ ہر اس تحریک اور دعوت کے مؤید اور اس سے منسلک تھے، جو اسلام کی سر بلندی، اعلائے کلمۃ اللہ اور مسلمانوں کو ان کے منصب قیادت وہدایت کی طرف لے جاتی ہو، اور دین ودنیا کے بارے میں اس کا موقف واضح ہو، ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ان کے وسیع قلب میں بڑی گنجائش تھی، اور وہ ان کے مستقبل کے لئے بے حد فکر مند تھے، ان کی آنے والی نسلوں کے لئے دین پر باقی رہنے کی بے چینی ان کے رگ وریشہ میں سرایت کر گئی تھی، وہ دینی تعلیمی کونسل کے ذریعہ آنے والی نسلوں کے بنیادی عقائد اور ان کے ایمان بالغیب کی حفاظت کے لئے ہمہ وقت بے چین رہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نے اس اہم ترین پہلو کو بے توجہی کا شکار بنا دیا تو مسلمان بچوں کو عقیدۂ توحید ورسالت، حساب وکتاب اور آخرت کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ معلوم ہو سکے گا، اور ان کے اور غیر مسلم نسل کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہ پائے گا، ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بارے میں تو شاید ہی کچھ معلوم ہو، لیکن بتوں کے آگے جھکنے اور دیوی دیوتاؤں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا، اس صورت حال کو روکنے کے لئے جو مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، بچوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ کرنے کی انتہائی ضرورت اور وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔

ان کا خیال تھا کہ اگر انبیائے کرام بھی اپنی نئی نسلوں کے دین وایمان کی فکر نہ کریں تو وہ بھی غفلت کا شکار ہو سکتی ہیں، یہی جذبہ تھا جس کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنی وفات سے قبل اس بات کا اطمینان کر لینے کا اتنا شدید تقاضہ تھا کہ میری اولاد میرے نہ رہتے ہوئے کس چیز کی عبادت کرے گی، حالانکہ اولاد کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا کہ والد کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، انہوں نے اپنی اولاد کو جمع کر کے پوچھا کہ تم میرے بعد کس کی

عبادت کرو گے، اولاد نے یک زبان ہو کر عرض کیا کہ اسی اللہ کی عبادت کریں گے، جس کی عبادت آپ اور آپ کے آباء واجداد اور اولیاء کرام کیا کرتے تھے، قرآن کریم میں ہے:

أم كنتم شهداء اذ حضر يعقوب الموت، اذقال لبنيه: ما تعبدون من بعدى ، قالوا نعبد إلٰهك وإله آبائك إبراهيم وإسماعيل وإسحاق إلٰها واحدا ونحن له مسلمون.(بقره :)

ترجمہ: ''کیا حضرت یعقوب کے انتقال کے وقت تم موجود تھے، جب انہوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے، تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود کی ، اور آپ کے آباء واجداد ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے معبود کی ، جو معبود ایک ہی ہے اور ہم اس کے فرمانبردار رہیں گے۔''

حضرت مولانا اکثر اپنی تقریروں میں اس آیت کو پڑھ کر بڑے درد سے فرمایا کرتے تھے کہ ہماری اولاد اور آنے والی نسلوں کو دین پر باقی رکھنے اور اللہ کی عبادت پر ثابت قدم رکھنے ہی میں ہمارے مسائل کا حل موجود ہے، انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا :

''کسی ملک کے مسلمانوں کا خواہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہوں، یا اقلیت میں، اولین واہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے بالغین کی دینی واقفیت اور بچوں کی دینی تعلیم کا کیا بندوبست کیا ہے؟ میں اپنے محدود مطالعہ اور دینی واقفیت کی بنا پر یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہوں کہ یہ مسئلہ ان کے تمام قومی مسائل سے مقدم اور اہم ہے، یہ ان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے، یہ ابدی نجات یا اس کی ہلاکت کا سوال ہے۔

ایک ایسے ملک میں بھی جہاں کوئی متوازی اور جارحانہ نظام تعلیم موجود نہ ہو، جہاں بچوں کی سادہ تختی پر اسلامی تعلیم کے نقوش ثبت کرنے کی پوری سہولت اور گنجائش ہو، یہ مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، مسلمان

اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام اور اپنی آئندہ نسلوں کے اسلام پر قائم رکھنے کا اطمینان حاصل کرنے کے ذمہ دار ہیں، اور ان کو ایک دن کی تاخیر اور ایک لمحہ کے التواء کے بغیر وہ تمام تدبیریں اور وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو اس مقصد کے حصول کے لئے مفید اور ضروری ہوں۔

لیکن اس ملک میں ان کی ذمہ داری دوہری اور نہایت شدید ہو جاتی ہے، جہاں لازمی طور پر کوئی ایسا نظامِ تعلیم ونصاب تعلیم جاری ہو جو اسلام کے بالمقابل عقائد کی تعلیم دیتا ہو اور جس کے مضامین اور مندرجات توحید ورسالت کے بنیادی اسلامی عقائد کے منافی اور شرک وگمراہی کے علانیہ داعی اور مبلغ ہوں، جہاں مسلمان بچے بھی کسی دوسری مذہبی قوم کی دیو مالا (Mythology) پڑھنے پر مجبور ہوں، جس کا یقین کرنے سے کوئی مسلمان تاویل وتکلف کے ساتھ بھی مسلمان نہیں رہ سکتا، جہاں مسلمانوں کی اس محبوب شخصیت کا جس کی محبت وتعظیم مسلمانوں کا ایمان ہے، تذکرہ وتعارف ایسے نازیبا اور خلاف واقعہ انداز میں کیا جائے، جس کا پڑھنا مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی روحانی اذیت اور ایمانی خطرہ ہے، جہاں قوموں کی تاریخی شخصیتوں کو ایسے حقیر وداغدار طریقے پر پیش کیا جائے کہ مسلمان بچوں میں حقارت اور اپنے ماضی سے نفرت پیدا ہو، جہاں مسلمانوں کو جو اس ملک کے برابر اور ہندوستانی جمہوریہ کا ایک ضروری عنصر ہیں، ان الفاظ سے یاد کیا جائے جو نیچ ذات اور ملچھ اقوام کے لئے بولے جاتے ہیں، ایسے حالات میں مسلمانوں پر دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایک اس نامناسب صورتِ حال کی اصلاح وتبدیلی کی کوشش، دوسرے جب تک وہ قائم ہے اس کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان، اور خواہ وہ قائم رہے یا دور ہو جائے، دونوں حالتوں میں مسلمان بچوں کی اسلامی تعلیم کا مستقل بندوبست"۔(۱)

---

(۱) کاروان زندگی: ۱۹۴۔۱۹۶

حالات کے پس منظر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام

ہندو پاک جنگ، بنگلہ دیش کا قیام اور حالات کی بے رحمی، مایوسی کا دور دورہ، اسلامی تشخص کے خاتمہ کا اندیشہ اور قومی دھارے میں ضم ہو جانے کے اشارات، ان تمام باتوں نے مسلمانوں کی شخصیت کو مجروح کرنے اور ان کے مستقبل کو تاریک بنانے کے لئے منفی کردار ادا کرنا شروع کیا، سیاسی موقع پرست لوگوں نے ایک طرف مسلمانوں کا استحصال کیا اور دوسری طرف حکومتوں کی ہاں میں ہاں ملا کر ان کو ان کے آئینی حق سے تنازل پر آمادہ کرنے کی کوششیں کیں، یہ ایک ایسا عجیب وغریب اور نازک دور تھا کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا جاتا تو مسلمان ہمیشہ کے لئے درجۂ دوم کے شہری بن کر رہ جاتے، نہ ان کی کوئی آواز ہوتی، اور نہ کوئی وزن ہوتا، اور نہ ان کو اپنے حقوق کا علم ہوتا۔

اس لئے صورت حال نہایت نازک تھی، علمائے غیور ان حالات کو بنظر غائر دیکھ رہے تھے، اور مستقبل کے تاریک آثار بھی نظر آرہے تھے، اس لئے ان کا بے چین ہونا اور کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرنا نہایت ضروری تھا جو مسلمانوں کے اندر اعتماد کی فضا پیدا کر سکے، اور ان کے دلوں میں ایمان ویقین کی کھوئی ہوئی روشنی واپس لا سکے، اور وہ اپنے آپ کو اس ملک کا ایک اہم عنصر تسلیم کرنے لگیں اور جو باتیں انکے دین وایمان اور ان کی شریعت کے اصولوں کے خلاف ہو، اس کو قبول کرنے سے نہایت جرأت کے ساتھ صاف صاف انکار کر دیں، جہاں بت پرستی کا شائبہ ہو، وہاں سے دور بھاگنے ہی میں عافیت سمجھیں، جہاں قومی دھارے کا مطلب اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی ہو، جہاں اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے ہچکچاہٹ اور شرم محسوس کی جائے، ان تمام باتوں اور جگہوں کو دور سے سلام کرنا اپنا مذہبی فرض گردانا جائے۔

ان حالات میں اگر علمائے کرام نے ایک مشترکہ مجلس کے قیام کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو نہ صرف متاع ایماں لٹ جانے کا خطرہ تھا، بلکہ اس ملک میں اندلس کی تاریخ دہرانے کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا، اور مسلمانوں کو مذہب چھوڑ کر بت پرست اور مشرک بن جانے کا حکم دیا جاتا۔

یہ وقفہ بہت ہی نازک اور تیز رفتار تبدیلی لانے کا متقاضی تھا، ایک مذہبی وحدت قائم کر کے سول کورٹ جیسے ناپاک منصوبوں کو بروئے کار لانے کے عمل کو پسپا کرنا سب کا مذہبی فرض تھا، اگر چہ بہت سے ضمیر فروش مسلمان شریعت کے اندر تبدیلی لانا اور چودہ سو سال کے دینی مزاج کو بدلنا ضروری سمجھنے لگے تھے، اور قومی دھارے میں شامل ہو جانے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، وجود مسلم برف کی طرح پگھل جانے کے خطرہ سے دوچار تھا، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور ہمارے علمائے کرام کو توفیق کامل نصیب ہوئی کہ وہ مسلم عائلی قانون کے تحفظ کی راہ میں ہر قربانی کے لئے تیار ہو جائیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں علماء کی جماعت میں سب سے زیادہ جو لوگ متفکر تھے وہ بزرگان دین تھے، جو ان ناپاک منصوبوں اور خطرات کا مشاہدہ کر رہے تھے، ان کی آہ سحر گاہیاں، ان کا اللہ کے حضور میں دین کی تقویت کے لئے دست سوال دراز کرنا، اسلام اور مسلمانوں کی عزت کے لئے اللہ سے بھیک مانگنا، اس کے لئے علماء کی ایک جماعت کھڑی ہوگئی، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ پیش پیش رہے، اور وہ بزرگوں اور خواص کے مشورہ سے جمع ہوئے اور اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے انہوں نے ایک اجتماع مرتب کیا، اور ۲۷،۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن میں ہر مکتب خیال کے نمائندوں اور تمام مذہبی فرقوں اور جماعتوں کو دعوت دی، اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے متحدہ محاذ قائم کیا جائے، اس کنونشن میں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی پورے جوش و خروش کے ساتھ مکمل نمائندگی ہوئی، حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمہ اللہ علیہ نے کنونشن میں شریک ہونے والے حضرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ملت اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی، شرکاء میں بریلوی مکتب خیال کے عالم و قائد مولانا برہان الحق جبل پوری، اثنا عشری فرقہ کے نمائندے مولانا کلب عابد صاحب، بوہرہ

فرقہ کے نمائندہ اور ذمہ دار ڈاکٹر نجم الدین، اہل حدیث حضرات کے متعدد مقتدر علماء وزعماء شریک تھے، رات کو مدن پورہ کے وائی، ایم، سی، اے، کے میدان میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں ایک لاکھ کے قریب مجمع ہوگا، متعدد عالمانہ ومفکرانہ تقریریں ہوئیں، بمبئی بلکہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے بڑی گرم جوشی سے اس مقصد کے ساتھ تعاون کیا، اور بڑی فراخ دلی سے میزبانی کے فرائض انجام دیئے، ایک آل انڈیا بورڈ کی تشکیل ہوئی، جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند، اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے، اور اس طرح اس مبارک مہم کا آغاز ہوا، جو مسلمانوں کے لئے (دینی وشرعی نقطۂ نگاہ سے) موت وحیات کا مسئلہ ہے، اور یہ جد وجہد ابھی تک جاری ہے"۔(۱)

کنونشن کے بعد اخبارات میں جو رپورٹیں آئیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کنونشن بہت کامیاب رہا، اس کنونشن میں مسلمانان ہند کے تمام مکاتب فکر اور تمام سیاسی، مذہبی، تہذیبی انجمنوں کے نمائندے شریک ہوئے، اور سب نے بلا کسی اختلاف وتذبذب کے شریعت اسلامیہ پر ہر قسم کی قربانی دینے کا ہمہ وقت اعلان کیا، اخبارات نے صاف صاف لکھا کہ ہندوستان کی مسلم سیاست کی تاریخ میں ایسا اتحاد اور ایسا جوش وخروش کبھی نہیں نظر آیا۔

بعد میں مسلم پرسنل لا کی عملی تنفیذ اور اس کے بقاء واستحکام کے لئے ماہرین شریعت اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک بورڈ بنایا گیا، جس کے پہلے صدر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بالاتفاق منتخب ہوئے، اور اس کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے بعد ہمارے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بورڈ کے صدر ہوئے اور تاحیات اس کے صدر باقی رہے، بورڈ میں ان حضرات کے

---

(۱) کاروان زندگی ج ۲/ ۱۳۸

بعد سب سے نمایاں شخصیت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، انہوں نے حضرت مولانا کی وفات کے بعد صدر کا عہدہ سنبھالا، اور باوجود اپنی علالت اور کمزوری کے آخری سانس تک بورڈ کی خدمت مختلف طریقوں سے انجام دیتے رہے، ان کی جماعت کے خاص افراد میں جناب مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، اپنے علم و فضل اور وسعت نظر کے اعتبار سے بہت اہم رکن تھے، اور آج بھی وہ اسی اہمیت کے ساتھ بورڈ کی خدمت میں مصروف ہیں۔

قاضی مجاہدالاسلام کی وفات کے بعد اراکین بورڈ کے شدید اصرار پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بورڈ کے صدر نشین ہوئے اور اپنی جملہ مصروفیات کے باوجود اپنے خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے نقش قدم پر چل کر بورڈ کو مزید فعال اور موثر بنایا۔ اس کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب امیر امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور جھارکھنڈ ہوئے۔(۱) اور تاحال اسی عظیم مقصدیت کی روح سے بورڈ اپنی امتیازی شان کے ساتھ مصروف عمل ہے اور حضرت مولانا محمد ولی رحمانی اس کے کارگذار سکریٹری جنرل ہیں، اور بورڈ کو فائدہ پہونچارہے ہیں اور اب امیر شریعت سابع کے طور پر آپ کا بالاتفاق انتخاب ۲۹/ نومبر ۲۰۱۵ء کو عمل میں آیا۔

برادران وطن میں تعارف اسلام کا ایک معتدل نظریہ:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایمانی بصیرت اور روشن ضمیری سے اہل وطن کو اسلام سے قریب لانے اور ان تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے لئے ''پیام انسانیت'' کے نام سے ایک دعوتی تحریک کی بنیاد ۱۹۵۵ء میں ڈالی تھی، اور اس کے حلقے کو حکمت وتدبر کے ساتھ برابر وسیع فرماتے رہے، ملک کے مختلف بڑے شہروں اور مرکزی مقامات پر اس کے جلسے کئے جاتے تھے اور اس میں غیر مسلم دانشوروں، اور تعلیم یافتہ طبقے کو خاص طور سے دعوت دی جاتی تھی اور عام جلسے کے علاوہ ان حضرات کی ایک خصوصی نشست بھی رکھی جاتی تھی جس کو حضرت

(۱) حضرت مولانا نظام الدین کی وفات ۱۷/ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو پٹنہ میں ہوئی۔

مولانا خود خطاب فرماتے تھے اور دعوت کی حکمت کو پیش نظر رکھ کر ان کو بغیر کسی صراحت کے اسلام کی اعلیٰ اخلاقیات کی طرف متوجہ فرماتے تھے، جس کا بے حد گہرا اثر پورے مجمع پر پڑتا تھا اور لوگ حضرت والا کی وطن دوستی، اور خدمت خلق اور انسانیت کے احترام کا جذبہ جو اُن کے اندر موجزن تھا، اس کا لوہا ماننے پر مجبور ہوتے تھے۔

زبان وادب کے سلسلہ میں حضرت مولانا کا معتدل موقف:

ملیشیا کی ''الجامعۃ الاسلامیۃ'' کے شعبۂ عربی کے استاذ ڈاکٹر منجد مصطفیٰ بہجہ، عربی زبان وادب کے سلسلہ میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے نظریات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ شیخ ندویؒ نے زبان وادب کے سلسلہ میں دو کامل نظریات پیش کیے، پھر تیسرا نظریہ پیش کیا جس کا تعلق زبان کی تدریس و تعلیم سے ہے، آپ نے ایسے اصول وآداب کا استنباط کیا جو ادب اور زندگی پر اس کے اثرات کو پوری طرح بے نقاب کرتے ہیں، اکثر محققین نے کہنا شروع کردیا تھا کہ تمام نظریات کے موجدین مغرب کے فلاسفہ اور اس کے ناقدین ہیں، لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے میدان عمل میں اتر کر اس تصور کو مسترد کردیا، اور عربی زبان وادب کے حسن وجمال کو آشکارا کرنے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے پر زور دیا، آپ کے اس عظیم کارنامہ پر ہمیں فخر ہے''۔

''ہندوستان میں اسلامی عربی ادب کے ارتقاء کی تاریخ میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا حصہ'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اگر ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء کو مولانا کی زندگی اور سرگرمیوں سے جدا کردیں تو بات تشنہ رہ جائے گی، کیونکہ آپ کو اسی ادارہ سے یہ فکری رہنمائی ملی تھی، ندوۃ العلماء نے یہ صدا لگائی کہ عربی زبان کتاب وسنت کے خزانوں کی شاہ کلید ہے، اور ہندوستانی مسلمانوں کو ان دونوں سے واقفیت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ عربی زبان کو ایک زندہ جاوید زبان کی حیثیت سے نہ پڑھیں گے، اس احساس کی بنا پر حضرت مولاناؒ نے عربی زبان میں کتابوں کے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ادب اطفال

سے لے کر بہت سے ادبی وعلمی موضوعات پر خالص علمی، تحقیقی اور تاریخی مطالعہ کی روشنی میں ہزاروں صفحات سیاہ کرڈالے۔

چنانچہ آپ کی سرپرستی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جانب سے بہت سی ایسی گرانقدر کتابیں منصۂ شہود پر آئیں جو تعلیم وتربیت، اسلامی تہذیب وتمدن کی وضاحت، مقاصد دین اور اسلامی زندگی کی تشریح، بحث وتحقیق کے معیار کی تصحیح، اور شریعت اسلامیہ کی حقانیت کو آشکارا کرنے میں بنیادی کردار ادا کررہی ہیں۔ آپ نے اس راہ میں عربی ادب کو ایک مؤثر ترین ذریعہ کے طور پر استعمال کیا اور یہ کام ایسے نامساعد حالات میں انجام دیا جب لوگ عربی زبان کو ازکار رفتہ شمار کررہے تھے، اور اسے ایک مردہ اور زندگی سے محروم زبان سمجھ کر صرف فقہی واصولی کتابوں کے تنگ دائرے میں محدود کرنے پر زور صرف کررہے تھے، مگر آپ نے محض توفیق ربانی اور اپنی بلند حوصلگی کے ذریعہ اس زبان کے دائرہ کو وسیع کیا، حتی کہ اس کو زندگی کے مسائل، بحث ونظر، علم وفکر، تاریخ وتذکیر، تہذیب وتمدن، سماج وسوسائٹی، سیاسیات واقتصادیات اور عالمی مجالس سے مربوط کرکے دکھایا، اس راہ میں آپ نے زبان وقلم دونوں کا سہارا لے کر سلیس عربی زبان اور واضح اور فصیح اسلوب میں کتابوں کی تصنیف فرمائی، چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، آپ کے مبارک دور میں اگر ایک طرف علم وادب، اور دین وشریعت کا بلند مینار تھا تو دوسری طرف قلب وقلم، ریشم وفولاد، وسیع علم اور پختہ ایمان کی جامعیت کا یکتائے روزگار نمونہ تھا۔

اسی جامع ومعتدل تخیل کی بنا پر حضرت مولاناؒ نے فکر وادب اور تمدن وثقافت کے مراکز میں آئے دن تبدیلیوں، اور مادی افکار ونظریات والے ممالک کی جدید تہذیبوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب درس میں قدیم صالح اور جدید نافع کے اصول کے مطابق تبدیلیاں کیں، تاکہ ایک عالم دین اپنے گردوپیش کی دنیا، اور آئے دن کی فکری وعلمی وتہذیبی تبدیلیوں اور چیلنجوں سے باخبر ہوکر اللہ کی شریعت کی جانب سے دفاع کا فریضہ انجام دے سکے، اور اس پر لوگوں کا مکمل اعتماد بحال کرسکے۔ اور اسے دنیا وآخرت کی سعادتوں کے درمیان ایک رابطہ بناسکے،

چنانچہ آپ نے اسلامی ممالک کی دیگر یونیورسٹیوں کے طرز پر عربی زبان وادب کی تعلیم کے لئے کتابوں کی تصنیف کے ذریعہ اپنا مستقل تربیتی کورس تیار کرایا۔ "قصص النبیین"، "القرأة الراشدة"، "مختارات من أدب العرب"، "منثورات من أدب العرب"، جیسی مایہ ناز کتابیں زبان وادب اور بہترین اسلوب بیان کی ایسی عدیم النظیر مثالیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کے دورآخر کے مصنفین کے لئے مشعل راہ کا کام دیا، اور عربی زبان کے زندہ جاوید زبان ہونے کا بین ثبوت دے کران کے ایمان ویقین میں اضافہ کا سامان فراہم کیا۔

ہندوستان میں عربی زبان وادب کی ترویج کے لئے حضرت مولاناؒ کی یہ کوششیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ مقصدیت کی روح سے معمور تھیں اور اگر یہ کہا جائے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کی جو بھی، جس شکل میں بھی، اور جہاں کہیں بھی کوئی متاع پائی جارہی ہے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اوراس کے مخلص مردانِ حق کا فیض اورانہیں کے آفتاب علم وعمل کا پرتو ہے۔

حضرت مولانا کے بعدان کی فکر کی نمائندگی

حضرت مولانا کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور دیگر متعلقین اس فکراعتدال کے حامل ہیں، اوراسی کے مطابق ندوۃ العلماء، اوراس کے تمام شعبے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں، توفیق الٰہی ہرایک کے شامل حال ہے، اس لئے تمام کام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پارہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اعتدال میں اللہ رب العزت نے خطرات سے حفاظت کا سامان رکھا ہے، اسی کے طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالی نے ارشادفرمایا: وأن هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله۔ (یہی میرا سیدھا راستہ ہے، اسی کی پیروی کرو، اس کے علاوہ دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو، ورنہ گمراہ ہوجاؤ گے)۔

☆☆☆

مفکر اسلامؒ اور نوجوان

کسی بھی ملک میں نوجوان نسل کو اس ملک کا سب سے قیمتی سرمایہ تصور کیا جاتا ہے، اور اس کی تربیت کا خاص اہتمام ہر سطح پر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اکثر ملکوں میں نوجوانوں کے نام سے تنظیمیں اور انجمنیں قائم ہیں، مصر میں ''شبان المسلمین'' کے نام سے ایک جمعیت قائم ہے، اس کے ذریعہ نوجوانوں کی تربیت کا ایک اہم ترین فریضہ انجام پاتا ہے، کسی زمانہ میں اس کے صدر نشیں اور سربراہ شیخ احمد الشرباصی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو بعد میں وزیر اوقاف ہوگئے تھے، انہوں نے نوجوان نسل کی سرپرستی کر کے اس کو ایک صحیح رخ دیا، اسلامی نہج پر ان کے لئے تربیت کا دروازہ کھولا، اور غلط راستوں سے نوجوانوں کو بچانے کی کوشش کی، اس کے نتیجہ میں مصر کا نوجوان ملک کا ایک با مقصد عنصر بن کر زندگی میں اپنے کردار کو سمجھ سکا، اور قیادت کی باگ ڈور سنبھالنے کا شعور اس میں بیدار ہوا۔

دوسرے بعض مسلم ممالک میں نوجوان نسل کی تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی، اور اس کے لئے الگ سے وزارتیں قائم کی گئیں، یوں تو ہر اسلامی پہچان رکھنے والے ملک میں اوقاف اور امور مذہبی کی وزارتیں نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے فروغ اور ترقی اور ان کے لئے با مقصد زندگی کا خاکہ تیار کرتی ہیں، اور ان کو غلط راستے سے بچانے اور فاسد خیالات سے محفوظ رکھنے کا فرض انجام دیتی ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ حکومتی سطح پر نوجوان نسل کی حفاظت اتنی نہیں ہوسکتی جو پرائیوٹ اداروں اور نجی کوششوں کے ذریعہ ممکن ہے۔

اس وقت عالمگیر سطح پر نوجوانوں کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے، لیکن اس کو جسمانی صحت اور معاشی مقاصد تک محدود رکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کے لئے ہر قسم کے

کھیل کی سرپرستی حکومتوں کی طرف سے جاری ہے، اور مختلف النوع کھیلوں میں ہر ملک اپنے نوجوانوں کو آگے بڑھانا چاہتا ہے اور وہ اس کی تربیت دیکر اپنے نوجونواں کو نمونہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

اس کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک کی دفاع میں نوجوان نسل کے ذریعہ فوجی طاقت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو، اور کسی بھی عسکری ضرورت کے وقت وہ اپنا مثبت کردار ادا کرسکیں، اس کے علاوہ مذاہب کی سطح پر بھی نوجوانوں کو زیادہ قابل توجہ سمجھا گیا ہے، اور ان کے اندر مذہبی روح پیدا کرنے کی ضرورت اس لئے لازمی سمجھی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے مذہب کے مبلغ بن کر ایک دینی بیداری پیدا کرنے کا فریضہ سرانجام دیں، اور معاشرہ کی اصلاح میں ایک بامقصد کوشش کر کے اس کو زیادہ سے زیادہ سنجیدہ بنائیں۔

نوجوانوں کی اس اہمیت کے پیش نظر اسلام میں ان کو بہت خاص مقام عطا کیا گیا ہے، ان کو مستقبل کا معمار اور انسانی قیادت کا سپہ سالار قرار دیا گیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نوجوان عنصر کو خاص اہمیت دی اور ان کو مرکز توجہ بنایا، صحابہ کرامؓ میں ایک بڑی تعداد نوجوانوں کی تھی، ان میں علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، مصعب بن عمیر، سعد بن ابی وقاص، محمد بن اُبوبکر، عبداللہ بن عبداللہ بن اُبی، سعد بن ربیع رضی اللہ عنھم وغیرہ، یہ دراصل اس نئے دین کا بہت بڑا سرمایہ تھے، اور انہوں نے تاریخ اسلام میں اسلامی زندگی کی بہترین نمائندگی کی اور ان کے ذریعہ سے اخلاقی بلندی اور عظمت اسلام کا پیغام مستقبل میں آنے والی نسلوں اور قوموں تک پہونچا، یہی وہ نوجوان تھے جو مدرسہ نبوت کے تربیت یافتہ اور دین کے سپاہی کی شان رکھتے تھے، انہوں نے ہر چیز کو دین کی مصلحت کے سامنے قربان کرنے میں ذرا بھی پس وپیش سے کام نہیں لیا، ان کے نزدیک جان کی قیمت صرف اسی قدر تھی کہ وہ اسلام کی سربلندی کی راہ میں قربان ہوجائیں، وہ ''کوئے دوست'' میں گردن کٹوانا اپنی عظیم سعادت تصور کرتے تھے، قرآن

کریم نے اگرچہ اصحاب کہف کے نوجوانوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے،:

إنهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى، وربطنا على قلوبهم، إذ قاموا فقالوا ربنا رب السموات والأرض لن ندعو من دونه إلها، لقد قلنا إذاً شططا، هؤلاء قومنا اتخذوا من دونه آلهة، لولا يأتون عليهم بسلطان بين، فمن أظلم ممن افترى على الله كذبا۔(کہف:۱۳۔۱۵)

یہ لوگ (چند) نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے انھیں ہدایت میں ترقی دی تھی، اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے تھے، جب وہ پختہ اور مستعد ہو گئے تو بولے: ہمارا پروردگار وہی تو ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، ہم تو اس کے علاوہ کسی معبود کو نہ پکاریں گے، ورنہ پھر تو ہم بڑی ہی بیجا بات کے مرتکب ہوں گے، ان لوگوں (یعنی) ہماری قوم والوں نے اللہ کے علاوہ اور معبود قرار دے رکھے ہیں، یہ لوگ ان معبودوں (کے وجود) پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے، سو اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے۔

ایک موقع پر نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی آیت تلاوت کی، اور اس کی تشریح کرتے ہوئے کچھ اس طرح مخاطب ہوئے:

”میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "إنهم فتية" وہ گنتی کے چند نوجوان تھے، حکومت وقت نے غذائی سامان اور معاشی وسائل پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ غلہ دے تو لوگوں کو غلہ ملے، وہ لوگوں کو ملازمتیں دے تو لوگوں کو ملازمتیں ملیں، تو وہ حکومت گویا ایک طرح سے ”مصنوعی رب“ بن گئی تھی، ”آمنوا بربهم“ لیکن وہ اپنے

حقیقی رب پر ایمان لائے کہ ہمارا پالنے والا، ہمیں غذا دینے والا اور ہماری زندگی کی ضروریات پوری کرنے والا، ہمیں عزت دینے والا وہ کوئی اور ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ رب حقیقی ہے، جب انہوں نے یہ منزل طے کرلی، تو ''زدناھم ھدی'' ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب عیسائیت نئی نئی جزیرہ نمائے سینا اور اپنے اصل مرز بوم سے نکل کر روما پہنچی تو وہاں کٹر قسم کی بت پرست حکومت تھی، جب یہ داعی وہاں پہونچے تو ان کی تبلیغ سے نوجوان بھی متاثر ہونے لگے، تاریخ کے بہت سے ادوار میں ایسا نظر آتا ہے کہ نوجوان پہلے متاثر ہوئے ہیں، اس لئے کہ زیادہ عمر رکھنے والے معمر لوگوں کے ساتھ بہت سے وزن بندھے ہوتے ہیں جیسے تیرنے کے لئے آپ دریا میں جاتے ہیں، جتنے ہلکے ہوں گے، اتنی ہی آسانی سے تیر سکیں گے، لیکن اگر کسی کے ساتھ بوجھل پتھر بندھے ہوں، کچھ سامان بھی اس کے ساتھ ہو تو اس کے لئے دریا کو پار کرنا مشکل ہوگا، جو جتنا ہلکا ہوتا ہے، وہ اتنی ہی جلدی منزل طے کرتا ہے: ''سبک سار مردم سبک تر روند''

اس میں ہم کو یہ سبق بھی ملتا ہے کہ پہلے ایمان مستحکم ہو جانا چاہئے، اگر ہم طالب علم ہیں تو علمی انداز کے ساتھ، اور اگر عوامی مسلمان ہیں تو بھی پوری صداقت کے ساتھ ہمارا ایمان اللہ پر قائم ہونا چاہئے، نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے مفکر اسلامؒ نے سیرت کی تعمیر کی طرف توجہ دلائی اور کتاب وسنت کی روشنی میں اس عمل کو پائے تکمیل تک پہونچانے کا پر خلوص مشورہ ہمیشہ دیا، اس لئے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے زمانے میں خاص طور سے لوگ دوسروں کو نصیحتیں کرنے کا جذبہ ضرورت سے زیادہ رکھتے ہیں اور خود اپنی اصلاح حال کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور نہ زندگی کا جائزہ لینے کی فرصت ملتی ہے اور ہمارے قول وعمل میں مثبت کے بجائے منفی پہلو کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے، اس طرز عمل کو بدلنے کی ضرورت سے

انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ ذمہ داری خاص طور سے ہماری نوجوان نسل پر عائد ہوتی ہے، لندن کی ایک تقریر میں ۱۹۶۴ء کے دوران مسلم نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"آپ کے اس مجمع میں بہت سے ایسے نوجوان ہیں جو اپنے ملکوں کی زمام قیادت ہاتھ میں لیں گے اور وہاں کی بڑی اہم ذمہ داری سنبھالیں گے، آپ یہاں تعلیم حاصل کررہے ہیں، لیکن آپ کے ملکوں میں قیادت کی مسندیں اور رہنمائی کی کرسیاں آپ کی منتظر ہیں، میں آپ کی روشن پیشانیوں کی لکیروں اور خطوط میں آپ کے درخشاں مستقبل کو دیکھ رہا ہوں، کسی زمانہ میں کسی ملک کی قیادت حاصل کرنے کے لئے اور کسی ملک وقوم کو اپنے اقتدار وانتظام میں لینے کے لئے زور بازو اور تلوار کے جوہر کی ضرورت تھی، سکندر اور چنگیز وہلاکو نے نوک شمشیر سے دنیا فتح کی اور قوموں کو مسخر کیا، اب اس کے لئے جنگی قوت کافی نہیں، اس وقت قیادت اور اقتدار کے لئے علم کی طاقت کی ضرورت ہے، اس وقت دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک اور خود اسلامی ممالک جمہوریت کے جس راستہ پر چل رہے ہیں اور جن حالات ومسائل کا ان کو سامنا ہے ان کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان ملکوں کی سربراہی اور ان کی قیادت وہی لوگ کریں گے جو جدید علوم سے واقف ہیں، مغربی زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں اور جن کو جدید جمہوری نظام میں اقتدار کے منصب تک پہنچنے کے لئے ضروری مسائل ومواقع حاصل ہیں، اس کی بنا پر امید کی جاسکتی ہے کہ آپ اپنی ان صلاحیتوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے ذمہ داری کی ان جگہوں تک پہنچیں گے اور آپ کو اپنے ملک وقوم کی خدمت کرنے کا موقع ملے گا، یہ آپ کے لئے ایک بڑا نازک امتحان ہے، ان ملکوں کی قسمت بڑی حد تک آپ سے وابستہ ہے اور ان کے مستقبل کا انحصار آپ پر ہے۔" (۱)

حضرت مفکر اسلامؒ نوجوانوں سے عظیم والہانہ تعلق رکھتے تھے، ان کو مستقبل کا معمار

---

(۱) خطبات مفکر اسلام ج ۴ ص: ۱۸-۱۹

اور قوموں کی قسمت کا تاجدار سمجھتے تھے، ابتدائی دعوتی اور تربیتی دور میں بیسویں صدی کے نصف ثانی کا آغاز کرتے ہوئے ۱۹۵۱ء میں جب مصر تشریف لے گئے تو وہاں کے نوجوانوں نے عقیدت وفریفتگی کے ہالے میں ان کو گھیر لیا، اور ان نوجوانوں سے مل کر انہوں نے نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ پر امید اور مستقبل بعید تک نظر ڈالنے پر اکتفا کیا، بلکہ اسلام کے مستقبل کا ان کو روشن ستارہ قرار دیا اور ان کے عزم وحوصلہ کو دیکھ کر ان کو اپنا مرکز توجہ بنایا اور وہاں کی مختلف تنظیموں، اسلامی مرکزوں اور شبان المسلمین کے سربراہوں کی سرگرمیوں کی دیکھ کر بے ساختہ ان کے زبان وقلم سے "إلى الراية المحمدية أيها الشباب" (اے نوجوانو! محمدی جھنڈے کے نیچے آجاؤ)، اور "إلى الإسلام من جديد" (نئے سرے سے اسلام کے طرف لوٹو) کا آوازہ بلند ہوا، اس موقع پر ہم اس تقریر کا اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو مصر میں ازہر اور کالج کے نوجوانوں کے سامنے کی گئی تھی:

> ”میں نے ان کو دین اور دینی تحریکات سے متعلق باتوں کے سننے کا مشتاق وپیاسا پایا، کلیۃ اُصول الدین کے طلباء میں سے ایک ذہین طالب علم یوسف قرضاوی(۱) اسٹیج پر آئے، اخلاص وحرارت ایمانی سے بھرپور سلجھی ہوئی مختصر تقریر کی، پھر اس رات کے مقرر کو خوش آمدید کہا اور اس کو دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے پیش کیا۔
>
> میں نے تقریر شروع کی اور کہا کہ اس عالم کی دو شکلیں ہیں، ایک شکل تو خالق کائنات اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق رکھتی ہے ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں اور نہ اس کے بارے میں ہم سے کچھ پوچھا جائے گا، وہ ہے خلق وتکوین کی شکل، اللہ تعالیٰ نے جیسا چاہا اس عالم کو بنایا، وہ خوب جاننے والا ہے اور باخبر ہے، اللہ ہی کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مستحکم کیا، ہم صرف اس کے مکلف ہیں کہ اس میں غور وفکر کریں اور مخلوق کے ذریعہ سے

---

(۱) خطبات مفکر اسلام ج ۳ ص: ۷۳-۷۴

خالق کو پہچانیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: الـذيـن يـذكـرون الله قياما وقعودا وعلى جنوبهم ويتفكرون في خلق السمٰوات والأرض، ربـنـا ماخلقت هذا باطلا ‘ (وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہونے کی حالت میں اور بیٹھنے کی حالت میں اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے، اور غور کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش کے بارے میں، اے ہمارے رب! تو نے اس کو بے مطلب نہیں پیدا کیا)، لیکن ہم اس عالم کی خلق وتکوین کے مکلّف نہیں ہیں اور ہم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ستاروں کو اس طرح پھیلایا اور بکھیرا کیوں گیا، سورج مشرق سے کیوں طلوع ہوتا ہے، مغرب میں کیوں غروب ہوتا ہے، پہاڑ یہاں کیوں نہیں ہیں، وہاں کیوں ہیں؟ کائنات کی تخلیق کے بارے میں اسی طرح اور دوسرے سوالات ہو سکتے ہیں، مگر ہم دوسری شکل کے مکلّف ہیں، اس کے متعلق ہم سے سوال ہوگا وہ کائنات کے اس وسیع نظام کی تشکیل و تنظیم کے بارے جس کو خدا نے بنایا ہے اور اس کو ہمارے ہی لئے مستقل و مستحکم اور اچھی طرح منظّم ومرتب کیا ہے، اور وہ بنیادی اصول جن کو قانون الٰہی کہا جاتا ہے اور جو ہم کو اس تنظیم کی بقاء اور عالم کی ذمہ داری سنبھالنے کا مکلّف بناتے ہیں، خدا نے اس زمین پر خلیفہ بنا کر ہم پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے: فرمایا: إني جاعل في الأرض خليفة‘‘ میں زمین پر ایک خلیفہ اور نشین بنانے والا ہوں، یکے بعد دیگرے انبیائے کرامؑ اسی لئے تشریف لے آئے کہ اس عالم کو منظّم کریں، یہاں کی زندگی کو اللہ کی پسند ومرضی کے مطابق ڈھالیں اور سنواریں، اس میں سے ہر ایک اس عالم کی اصلاح اور اس کے نظم ونسق کی حفاظت کا حریص اور خواہاں تھا، یہاں تک کہ جب بعض بدطینت لوگوں نے زمین کے اس نظام کو بگاڑنا چاہا تو انہوں نے کہا’’ تم لوگ زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، اس کی درستگی کے بعد

(ولا تفسدوا في الأرض بعد إصلاحها) اور جب کسی قوم یا خاندان یا کسی جماعت نے اس بگاڑ اور عالم کے نظام کو نقصان پہنچانے پر کمر باندھ لی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو نیست ونابود کر دیا"۔(۱)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ تھا کہ مستقبل دراصل انہیں عرب نوجوانوں کا ہے ،جنہوں نے اسلام کو سینہ سے لگایا اور اس کو ایک آسمانی پیغام اور ایک عظیم نعمت سمجھ کر اپنے رگ وپے میں سمولیا، میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے سب سے پہلے مخاطب جزیرۂ عربیہ کے نوجوان ہی تھے، اگر چہ وہ اپنے آباء واجداد کے طریقے پر آخری درجہ تک قائم تھے، اور اس طریقے کو چھوڑنا ان کے لئے دشوار گذار امر تھا، یہاں تک کہ وہ کسی نئی دعوت بلکہ کسی نئی آواز کو سننے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن جب حقیقت ان پر واشگاف ہوگئی اور پورے اطمینان قلب کے ساتھ خدائے واحد کے سامنے جھکنے اور اس عظیم کائنات کو اس کی عظمت وکبریائی کی ایک نشانی سمجھنے کا یقین ان کے دلوں میں پیوست ہو گیا تو وہ اپنی اس دعوت کو پھیلانے اور اس کو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے راہ سعادت کھلنے والا اور ذات الٰہی سے ایک مضبوط تعلق قائم کرنے والا اور اس کی رحمتوں سے زندگی کو معمور کرنے والا اور دین ودنیا کی خوبیوں اور کامیابیوں کو جمع کرنے والا تابندہ وپائندہ دائمی مذہب کے علم بردار اور داعی بنکر دنیا کے گوشے گوشے میں نکل پڑے، یہ وہی عرب نوجوان تھے جنہوں نے اسلام کی روح کو سمجھا تھا اور اس کی تاثیر ونتائج کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا اور نہ صرف جزیرہ عرب بلکہ پوری دنیا میں انسانیت کی بے توقیری اور اس کی بے عزتی کے حالات سے واقف تھے اور انہوں نے انسانوں کو بے جان پتھروں اور بے حس وحرکت معمولی چیزوں کے سامنے جھکتے ہوئے اور ان کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہوئے دیکھا تھا، وہی عرب نوجوان اب اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور لوگوں کو بندوں کی بندگی کی ذلت سے نکالنے اور عدل وانصاف کا بول بالا کرنے اور ظلم وجور کی خندقوں کو پاٹنے اور کفر وشرک کی تمام شکلوں کو مٹا کر اللہ اور صرف اللہ کے سامنے

---

(۱) شرق اوسط کی ڈائری: ۷۳-۷۴

سر جھکانے کی عالمگیر دعوت کو عام کرنے نکلے، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس دنیا کا نقشہ بدل دینے میں پوری طرح کامیاب ہوگئے۔

ان عرب نوجوانوں کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیتے ہوئے حضرت مفکر اسلامؒ نے کچھ اس طرح اس کا نقشہ کھینچا ہے:

"یہ عرب جب دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلے، بلکہ انسانیت کا نجات دہندہ بن کر نکلے، اس مقصد سے نکلے کہ انسانیت کو وحشت و بربریت کی چنگل سے چھڑائیں، اور انسانیت کو اس ظلم و جور سے نجات دلائیں، جو صدیوں سے جاری تھا، جب ان پر وہ حقیقت کھلی جو اوپر بیان ہوئی، وہ جب لوگوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت واطاعت کی طرف بلانے کے لئے نکلے، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کی طرف لانے کی غرض سے نکلے، ادیان و مذاہب کے ظلم و جور سے نکال کر اسلامی عدل وانصاف کی طرف بلانے کے مقصد سے نکلے تو یہ بے روح جاہ وجلال ان کو ہیچ نظر آئے، بڑی بڑی حکومتیں ان کو کٹھ پتلی کا کھیل معلوم ہوئیں، ان کے جھنڈوں کو سرنگوں کرنا بچوں کا کھیل معلوم ہوا، آسمان سے باتیں کرنے والی فلک بوس عمارتیں ان کو خس وخاشاک کا ایک تودہ معلوم ہوئیں، بڑے بڑے لشکر ان کو بھیڑ بکری کا گلہ معلوم ہوئے، انہوں نے ان کو غیر عاقل بے شعور جانور سمجھا جس میں نہ رحم وکرم کا مادہ ہے، نہ لطف ومہربانی کا جذبہ، وہ انہیں انسانوں کی شکل میں بھیڑئے اور درندے نظر آئے۔

قرآن پاک نے اُن اَن پڑھ عربوں کو، قافلۂ حیات سے بچھڑے ہوئے عربوں کو، تہذیب وتمدن سے ناآشنا عربوں کو قوت وطاقت اور حوصلے سے بھر دیا، انہوں نے ان کے سرد اور خالی دلوں کو اس نعمت عظمی پر فخر وناز، خود اعتمادی وخود شناسی اور رفعت وبلندی کے لئے نئے "سیل" اور نئے مسالے سے بھر دیا، انہوں نے ان کو اشیاء کے خواص واثرات کو

جاننے کا ملکہ عطا کیا، وہ ان ساری توانائیوں سے مالا مال ہوکر نکلے اور سارے عالم کو زیر کرلیا، اس لئے نہیں کہ مالک بن جائیں، نہ اس لئے کہ اس پر حکومت وفرمانرائی کریں، جیسا کہ ان قوموں نے کیا، بلکہ وہ اس لئے نکلے تھے کہ یہ گم کردہ راہ اور دردر کی ٹھوکریں کھاتی انسانیت کو خدائے واحد کے سامنے جھکائیں، اور اسے اسلام کے عدل وانصاف کے سائے میں لے آئیں"۔(۱)

انہیں چند اقتباسات پر میں اپنی اس تحریر کو سردست ختم کرتا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ یہ مختصر تحریر بھی مفکر اسلام کے داعیانہ مزاج، نوجوانوں سے وابستہ ان کی امیدوں اور قیادت کے خلا کو پر کرنے کی راہ میں ان کے صحیح نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے، اور نوجوانوں کو اپنا بھولا ہوا مقام یاددلانے اور کائنات، انسان اور زندگی کے بارے ان کے رویے اور ان کے مثبت کردار کو بروئے کار لانے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوسکتی ہے، خاص طور سے اس دور میں جب کہ نوجوان عام طور سے بے حسی کا شکار ہیں اور اپنے چھپے ہوئے طاقت کے خزانوں سے غافل ہیں اور اپنے بیش قیمت وقت کو نہایت بے دردی کے ساتھ ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں مفکر اسلام کے خیالات اور ان کے بے چین دل کی کیفیات ان کو صحیح راستہ کی طرف واپس ہونے اور اپنے قائدانہ مقام کی طرف لوٹنے میں بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوسکتی ہیں، اور ان کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے اور ماضی کی غلطیوں کی تلافی کرنے اور "نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز" کی عملی تفسیر پیش کرنے میں ان کا کردار بہت بلند ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

---

(۱) خطبات مفکر اسلام ج ۴ ص: ۱۷-۱۸

حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

اوران کے دعوتی خطبات کے چند نمونے

ایک بلند قامت انسان کی زندگی، اسکی جامعیت کی ہشت پہل شخصیت کا جائزہ لینے اس کے فکری رجحانات، اس کی دعوتی مساعی اور علمی سرگرمیوں کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب محض توفیق الٰہی سے دین اسلام کو ایک زندہ وتابندہ حقیقت سمجھتے تھے اور ساری انسانیت کے لئے اس کو ایک زندۂ جاوید نعمت ہونے کا یقین رکھتے تھے اوور عالم انسانیت کے لئے اس کو ہر زمان ومکان میں مبنی برانصاف نظام ہونے کی شہادت دینا، اپنا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی علمی، ادبی، فکری اور تاریخی معلومات کی روشنی میں تمام دعوتی سرگرمیوں کو مرتب کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی پوری زندگی میں ایک داعی کی فکرارجمند اور اس کے اخلاص کا جوہر جلوہ فگن نظر آتا ہے۔ اسی کے ساتھ بین الاقوامی حالات وتغیرات پر ان کی گہری نظر سے ان کی علمی وتاریخی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی زندگی میں ایک بیدار مغز مومن، ایک داعی کا اخلاص، ایک عالم دین کی انکساری وتواضع، ایک متکلم کی حکمت اور اس کا اجلال، ایک مصنف کی بصیرت وفراست، ایک ادیب کی فصاحت وبلاغت، ایک خطیب کی تاثیر وآہنگ اور بے ساختگی پوری طاقت کے ساتھ موجود تھی۔

حضرت مولاناؒ کی زندگی میں روح علم اور سوز دروں کا حسین امتزاج موجود ہے۔ اس میں ان کے بے چین دل، ان کی فکر ایمانی، ان کے تعلق باللہ، ان کے اخلاص و بے لوثی کا صاف وشفاف آئینہ نظر آتا ہے۔ اور اس میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے اور اپنے آپ کو خوب سے خوب تر بنانے کے طریقے اپنا سکتا ہے۔ مولاناؒ کی تحریریں اس کے ہر جملے، اس

کے الفاظ کے تمام حروف موتیوں سے تولنے کے قابل ہیں، ان کی وسعت معلومات، گہرائی وگیرائی اور سوچنے کا صحیح انداز، ان کے دعوتی پہلو کا خاص امتیاز ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو سچی اسلامی فکر انتہائی توازن اور اعتدال کے ساتھ پیش کرنے کا ملکہ عطا فرمایا تھا، ان کی کوئی بات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سرچشمہ ہدایت سے ہٹ کر نہیں ہوتی تھی۔ انہیں اسلامی تاریخ کے ایسے موثر اور مستند واقعات جمع کرنے کی توفیق عطا ہوئی جو بہت سے مورخین ومصنفین کی نظروں سے اوجھل تھے، انہوں نے ان تاریخی واقعات سے عبرت وموعظت اور دعوت وحکمت کے وہ دریچے کھولے جو علمائے حق اور داعیان اسلام کے لئے ایک مستند مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو ایمان ویقین، علم وعشق، دعوت وطلب، تبلیغ وارشاد اور ایک مثالی اسلامی ندگی سے نوازا تھا، ان کی فکر پر ہمیشہ اس بات کا غلبہ رہا کہ وہ کس طرح اللہ کے بندوں کے دلوں میں عقیدۂ توحید اور ایمان ویقین کی روح اتار دیں اور کس طرح محمد ﷺ کی امت اور ان کی عرب اولاد کو ان کے احسانات سے روشناس کرائیں، تا کہ وہ اس پیغام کو سینہ سے لگا کر دنیا کی قیادت کی باگ ڈور دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے سکیں اور عالم کے اندر پھیلے ہوئے بگاڑ کو کس طرح اور انسانیت کو سر بازار رسوا کرنے والے افراد کو اپنے صحیح مقام پر کس طرح واپس لائیں اور انسانوں کو صحیح معنوں میں انسان بنانے کا کام کس طرح اور کتنی تیزی کے ساتھ انجام دے سکیں۔

علم وعمل اور اخلاص وایمان کی جامعیت اور اس میں انتہائی توازن کی صفت حضرت مولاناؒ کی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر تھی، ان کا ہر لمحہ، ہر عمل، ہر بات، ہر سانس اللہ کی رضاء اور ان کے دین کی سربلندی اور امت کی سرخروئی کے لئے وقف تھی، حالات خواہ جیسے بھی ہوں اظہار حق میں کبھی بھی پس وپیش نہیں کیا، اور وہی بات کہتے رہے جو اللہ اور اس کے رسول کے عین منشاء کے مطابق ہو۔

سب سے پہلی تقریر جو میں نے سنی

شوال ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں حضرت مولاناؒ نے تعلیمی سال کے افتتاح کے موقع پر دار العلوم کی مسجد میں تمام طلباء اور اساتذہ کے سامنے تقریر فرمائی تھی اور نئے سال کے موقع پر طلباء کو ضروری نصیحتوں سے نوازا تھا اور تعلیم کے چند بنیادی پہلوؤں کی طرف رہنمائی کی تھی، اس میں اخلاص اور احتساب کی تشریح فرماتے ہوئے تاریخ کے صفحات سے بعض اہم شخصیتوں کا ذکر اور ان کے روشن کارناموں کو بیان کرنے کے بعد وقت کی قیمت کو پہچاننے اور اس کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے ک طرف بہت خصوصیت سے توجہ دلائی تھی، اس زمانہ میں دار العلوم میں طلباء کی تعداد بہت کم تھی، اسی سال دو نئے طالب علم داخل ہوئے تھے، ان کا ذکر کر کے اظہار مسرت کیا تھا، ان میں ایک طالب علم یہ خاکسار راقم الحروف تھا۔

حضرت مولاناؒ اسی زمانے میں شرق اوسط کے ملکوں کا ایک طویل دعوتی سفر کر کے تشریف لائے تھے، مصر میں خصوصیت کے ساتھ طویل قیام کیا تھا اور وہاں کے علماء ودانشوروں سے ملاقات کا موقع ملا تھا، جب وہاں کے شیخ الازہر شیخ شلتوت سے ملاقات ہوئی اور دوران گفتگو ندوۃ العلماء کا تخیل ان کے سامنے پیش کیا اور اس کی تشریح کی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے اور برملا اعتراف کیا کہ ابھی تک ہم نے ایسے جامع اور متوازن تصور کے بارے میں غور نہیں کیا تھا، وہ حضرت مولاناؒ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور مختلف اداروں اور جمعیات میں ان کے دعوتی پروگراموں کا انتظام کیا اور جب تک مولانا مصر میں قیام پذیر رہے، ان سے ملاقات اور تبادلہ خیال کرتے رہے۔

یہی وجہ تھی کہ مصر کا زمانہ قیام دعوتی لحاظ سے بہت مفید اور بار آور رہا، وہاں کے سنجیدہ حلقوں سے ملاقات، گفتگو اور تقریر ومحاضرات کا سلسلہ عجیب وغریب والہانہ انداز سے جاری رہا، وہاں کی بعض تقریروں میں مولانا کا موثر انداز بیان اور انوکھا طرز تعبیر کچھ اس طرح ظاہر ہوتا ہے:

جماعت انصار السنۃ مصر میں تقریر

ارشاد فرمایا کہ: ''میں نے دعوت الی اللہ کی اہمیت، اس کی عظمت ونزاکت، اس کے مطالبات کی باریکیوں نیز اس کے شرائط وآداب پر روشنی ڈالی، میں نے کہا: بہت سے لوگ جو کوئی کام یا پیشہ اچھی طرح نہیں کر سکتے وہ دعوت الی اللہ کا کام اپنا لیتے ہیں، شاید وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں سب سے آسان کام یہی ہے، حالانکہ وہ بہت وسیع، نازک اور مہتم بالشان کام ہے، یہ کام سیاسی، اقتصادی، علمی اور فکری دعوتوں سے کہیں زیادہ اہم اور ذمہ داری کا کام ہے، کوئی انقلاب اور کسی ڈھانچہ کی تبدیلی یا کسی پرانے نظام کی جگہ نئے نظام کا قیام، اخلاق اور روح اور تقاضۂ انسانیت کے بغیر بھی ہو جاتا ہے، ان دعوتوں کے کارکنان اپنی دعوت اور جدوجہد میں مخلص ہونے کے باوجود بعض اوقات اخلاق اور کیریکٹر کے لحاظ سے بہت گھٹیا اور گرے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن س کو دعوت کے منافی ومخالف نہیں سمجھا جاتا، مگر دعوت الی اللہ حسن اخلاق اور تمام دینی اور انسانی تقاضوں کی طالب ہوتی ہے، اور طاقتور ایمان، سچے یقین، نمایاں قربانی، کھلی ہوی بہادری، صحیح عقل وشعور اور صحیح علم، ذاکر زبان، خدا کی طرف رجوع ہونے والے دل کی متقاضی ہوتی ہے۔ وہ عبادت میں خشوع، دعاء میں ابتہال وتضرع اور خدائی چوکھٹ پر پڑ جانے کی متقاضی ہوتی ہے، یہ صرف تبلیح وتعلیم ہی نہیں ہے، بلکہ تبلیغ وتعلیم، تربیت وتزکیہ سب کا نچوڑ اور خلاصہ ہے، یہ اس نبی کی خلافت وجانشینی ہے جس کے اوصاف اور فرائض چہارگانہ: تلاوت کتاب، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ بیان کئے گئے ہیں: ﴿هو الذي بعث في الأميين رسولاً منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفي ضلال مبين﴾

پھر عہد اسلامی کے دور اول کے داعیوں کی جاندار مثالیں پیش کیں اور ہندوستان کے بعض داعیوں اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے واقعات بیان کئے، جیسے مولانا یحی علی عظیم آبادی، مولوی محمد جعفر تھانیسری، ان کے علاوہ ان لوگوں کے قصے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول

کے مصداق تھے ﴿من المومنين رجال صدقوا ماعاهدوا الله عليه، فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر، وما بدلوا تبديلاً﴾

اس کے بعد ہم نے اپنے ملک میں دعوت کے طریقۂ کار کی تفصیل بیان کی، دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ہفتہ وار اجتماع اور ہر طبقہ کے لوگوں کا اپنے خرچ پر شہروں، گاؤں اور قصبوں کی طرف نکلنے اور اس رضا کارانہ عمومی دعوت کے فوائد اور اچھے نتائج کا نقشہ کھینچا، پھر میں نے کہا کہ آج تمام دعوتیں سرد پڑ چکیں ہیں، کمزور و بے روح ہوگئی ہے، بس ایک دعوت مادیت کا دور دورہ ہے، یہی دین اسلام کے لئے جدوجہد کرنے والے لشکر کا سب سے بڑا حریف ہے، اب ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنی طاقت کو مضبوط بنائیں اور اس سے برسر پیکار ہونے کی تیاریاں کریں، اس سے آنکھ ملانے بلکہ اس کی کلائی موڑنے کی علمی، فکری، اخلاقی اور روحانی تیاریاں کریں، اس کے بغیر ہمارے لئے ممکن نہیں کہ کما حقہ ہم زمانہ پر اثر انداز ہوں اور مادیت کے ان دبیز پردوں کو چاک کریں جو دل ونگاہ پر چھا چکے ہیں، ہم موثر دینی شخصیت اور مسحور و مسخر کرنے والی روحانی قوت ہی سے اس پر غالب آسکتے ہیں۔

سامعین کے چہروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ تقریر کا ان پر اثر ہوا، اور داد و تحسین کی آوازیں آئین، یہ اثر شاید مخلص داعیوں اور مجاہدین کے ان اثر انگیز واقعات کی وجہ سے تھا جو میں نے بیان کئے، ان واقعات سے ایسا اثر ہوتا ہے جو کسی اور چیز سے نہیں ہوتا"، (۱)

مدرسہ کا کام

حضرت مولاناؒ نے اپنے دعوتی اسفار میں مدارس اسلامیہ کے ایوانوں، مدرسہ کا مقصد اور اس کی اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے طلبائے علوم اسلامیہ کی آنکھوں سے لامقصدیت کے دبیز پردے کو اٹھا کر، ان کو مادہ پرستی کے اس دور میں یاد دلایا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کس طرح ان کو عالمی قیادت کے لئے تیار ہونا چاہئے، جے پور میں شیخ طریقت

شرق اوسط کی ڈائری: ۶۳-۶۴-۶۶

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب مجددیؒ نے ۱۷؍اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اعلیٰ پیمانے اور جامع شکل میں ایک مدرسہ جامعہ ہدایت کے نام سے قائم کرنے کا ارداہ کیا تو حضرت مولانا علی میاں صاحب سے سنگ بنیاد رکھوایا، اس موقع پر مولانا نے ایک بہت بلیغ اور مفصل تقریر کی اور اخیر میں مدرسہ کا کام کیا ہے؟ کے زیر عنوان اپنی تقریر میں کہا:

”مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر، عقیدہ، ایسے باایمان، ایسے باحوصلہ اور ایسے باہمت فضلاً پیدا کرے جو اس ضمیر فروشی، اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کے مینار کی طرح قائم رہیں کہ وہ کہیں نہیں جاتا، اپنی جگہ پر کھڑا رہتا ہے، راستہ بتاتا ہے، جیسے کہ قبلہ نما کہ آپ کہیں ہوں وہ آپ کو قبلہ بتادے گا۔ ہندوستان میں بتائے گا دوسرے ملکوں میں بتائے گا، پہاڑ پر رکھیں تو بتائے گا، پل پر رکھیں تو بتائیگا، یہی عالم کا کام ہے وہ ہر زمانہ میں ہر جگہ قبلہ نما ہے۔

یہ جامعہ ہدایت جہاں تک سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان مقاصد عالیہ پر اسکی بنیاد رکھی جاری ہے، اور حقیقت میں ہر دینی مدرسہ کی بنیاد اسی پر رکھی گئی ہے، اور یہی اس کی اصل قدر و قیمت ہے، ان کو آپ ان کی عمارتوں سے نہ پہچانئے، آپ ان کے بوریوں اور وہاں کے فرنیچر کی کمی اور وہاں پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کی تہی دامنی اور ان کی بے بضاعتی سے ان کا درجہ قائم نہ کیجئے جیسا کہ کہنے والوں نے کہا: گدائے شاہی میں اور دلق فقیری میں وہ شاہانہ مزاج رکھتے ہیں، ان کا مزاج شاہانہ ہے اور ان کا لباس فقیرانہ ہے، یہ ہمارے علمائے سلف تھے، اور آج انہیں علمائے سلف کی اس وقت ضرورت ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہوا کے رخ پر چلنا مدرسہ کا اصول نہیں ہے، اگر مدرسہ کا یہ اصول ہو تو وہ کب کے انگریزی کے، عربی کے کالج بن چکے

ہوتے، لیکن جو اس وقت چند گنے چنے مدرسے باقی ہیں، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مدرسوں نے ہوا کے رخ پر چلنا قبول نہیں کیا ہے"۔(۱)

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

حضرت مولانا نے علماء اور تعلیم یافتہ لوگوں کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے ان پر یہ واضح فرمایا کہ دین کوئی موروثی اور روایتی حکایت نہیں ہے اور نہ صرف لفظ دین کو بار بار دہرانے سے دین پیدا ہوتا ہے، دین نام ہے ایک مکمل نظام حیات کا، یہ نظام عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے، اس کی تعلیمات زندگی کی تعمیر کرتی ہیں اور انسانی زندگی کو بروئے کار لانے اور اس پر ہر اعتبار سے ایک امتیازی شان عطا کرنے کے لئے خالق کائنات کی طرف سے نازل کی گئی ہیں، آج امت مسلمہ کے بہت سے افراد اور تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک بھی دین کا مطلب کچھ خاص اوقات میں عبادت کے نام سے کچھ کام کر لینے کا نام ہے، حالانکہ یہ دین اسلام انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے اور وہ ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں ہوسکتا ہے، ورنہ ان کی زندگی بے مقصد اور نامکمل ہو کر رہ جائیگی اور دین کا علم ہوتے ہوئے بھی دین کے فیض سے محروم رہ جائیگا، آج کے دور میں ہمارے علماء کے طبقہ میں بھی بڑی حد تک دین سے مایوسی کی فضا پیدا ہوگئی ہے وہ مادہ پرست قوموں کے خیال سے کسی حد تک متاثر ہو کر دین کا اہتمام، عبادت کا ذوق اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنے اور اطاعت ومحبت کے جذبے سے قلوب کو معمور کرنے کی توجہ سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ دین کا رقبہ بہت محدود ہے اور اس کا علم سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے، اصل چیز سائنس اور ٹکنالوجی ہے، اس سے تمدن پیدا ہوتا ہے اور اسی کے فیض سے تہذیبیں وجود میں آتی ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب سے سائنس اور کائنات کے علم کا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ کائنات کی نشانیوں کو سائنسدانوں کی دین سمجھتے ہیں

---

(۱) خطبات مفکر اسلام ج ۴ ص ۱۲۶

اوران کو مذہب سے الگ کوئی دوسری شئ تصور کرتے ہیں۔

فطرت انسانی سے غیر ہم آہنگ اور درجہ یقین تک پہنچے ہوئے اس تصور کو جو ایمان وعقیدہ کے سراسر خلاف ہے اور عصر جدید میں رواج پذیر ہے، مولانا نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اپنے بلیغ دعوتی انداز میں فرمایا:

''عصر جدید میں اسلام کے علماء، جامعات کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان اور ہمارے قانون داں اور ہمارے ادیب و دانشور طبقہ کی ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ ثابت کریں کہ یہ دین جہالت کے بطن سے اور فوجی طاقت سے نہیں پیدا ہوا ہے، معرفت سے پیدا ہوا ہے، اللہ کی رہنمائی سے پیدا ہوا ہے، وحی سے پیدا ہوا ہے، یہ زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے، یہ تمدن کی رہنمائی کرسکتا ہے، اسکی نگرانی کرسکتا ہے کہ یہ تمدن بے راہ نہ ہونے پائے، فاسد نہ ہونے پائے، تخریبی راستہ اختیار نہ کرنے پائے، یہ تاثیر علمائے دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی دے سکتا ہے، اور یہ بڑی ذمہ داری ہے، اگر کسی دین یا کسی قوم کے متعلق یہ خیال قائم ہوجائے کہ اس کا علم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے، بلکہ علم سے اس کو نقصان پہنچتا ہے اور جہالت سے اس کو فائدہ، خواہ تھوڑے عرصے کے لئے، تو خواہ وہ اپنے زور شمشیر، اپنے بازو سے، اور وہ دعوت یا جماعت یا قوم دنیا کے کسی حصے پر قبضہ کرلے، لیکن دماغوں پر اس کا قبضہ نہیں ہوسکتا، سب یہی خیال کریں گے کہ اس کو زندہ رہنے کے لئے جہالت کی تاریکی چاہئے، جب تک وہ تاریکی رہے گی وہ زندہ رہے گا اور جب علم آئے گا وہ غائب ہوجائیگا، اسکا پردہ چاک ہوجائیگا، اور جس طرح بدلی آفتاب کی روشنی سے چھٹ جاتی ہے، اس طرح وہ چھٹ جائیگا، عیسائیت کا معاملہ یہی ہوا، عیسائیت نے علم کا ساتھ نہیں دیا، عیسائیت ایک خالص روحانی تحریک اور ایک معاشرتی انقلاب کے طور پر تو آئی، حضرت مسیح علیہ السلام کا جب تک زمانہ رہا، ان کی

مقبولیت، ان کا تقدس، ان کی روحانی طاقت ہی رہنمائی کرتی رہی، لیکن اس کے بعد پھر اس کو ایک زمانہ تک ذہین اور صاحب نظر لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا، پھر جب مسیحیت یورپ پہنچی تو سمجھا گیا کہ یہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لئے زندگی سے اس کو علیحدہ کر لینا چاہئے۔

یہ بات عالم اسلام میں الحمدللہ نہیں ہونے پائی، اس لئے کہ شروع سے اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ تھا، میں نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کی پہلی وحی اقرأ کے لفظ سے شروع ہوئی ہو اور جس کی پہلی وحی میں قلم کو فراموش نہیں کیا گیا، وہ علم اور قلم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اسلام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ دین وعلم میں کبھی بھی دوری ہوگی، اس لئے کہ اسلام اور علم شروع سے ساتھ رہا ہے، جب بدر کے قریشی قیدی مدینہ پہنچے تو ان میں کئی ایسے تھے کہ وہ فدیہ ادا کر کے رہائی نہیں حاصل کر سکتے تھے، ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ ہر شخص انصاریوں اور مہاجرین کے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے"۔(۱)

مصر میں مسلم طلبہ کے سامنے ایک تقریر

۳ مارچ ۱۹۵۱ء کی جامع ازہر کے طلبہ کے سامنے جو تقریر ہوئی، اس میں حضرت مولاناؒ نے ان کی اپنی دینی امانت کی حفاظت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا:

"ہماری تقریر اس پیغام و ذمہ داری سے متعلق تھی، جس کو حضور ﷺ اور مسلمانوں کی پہلی نسل نے چھوڑا تھا، اور جس کی ذمہ داری ایک عالم دین پر عائد ہوتی ہے، یہ دینی امانت زمانہ کے اسلامی عقیدہ اور شریعت اسلامی کی حفاظت کی مستلزم ہے، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا آج ہمارے نوجوان علماء اور فکر اسلامی کے حامل اہل قلم اور اصحاب فکر اس ورثہ کی پوری

(۱) خطبات مفکر اسلام ج ۳ ص ۲۱۰-۲۱۴

حفاظت اور نگہداشت کر رہے ہیں؟ کیا وہ دین میں غلو کرنے والوں، اہل باطل کی فتنہ پردازیوں، جاہلوں کی بے معنی تاویلات کی نقاب کشائی کر رہے ہیں؟

انہیں ذمہ داریوں میں دینی ارکان وفرائض اور واجبات کی حفاظت بھی شامل ہے، ایک عالم دین اس کی صورت وحقیقت، نظم وضبط دونوں ہی کا محافظ ہوتا ہے اس میں وہ کسی آن ادنی تغافل اور لاپرواہی سے کام نہیں لیتا ہے، عالم جس قدر خود ان ارکان کی پابندی کریگا، ظاہر وباطن پر نظر رکھے گا، عوام اسی قدر اس کا اہتمام کریں گے اور اگر وہ خود اس میں غفلت وتساہلی کریگا تو عوام سے اس کے اہتمام کی کوئی توقع نہیں۔

ساتھ ہی دینی روح اور قلبی کیفیات مثلاً اخلاص، خدا کی ذات پر اعتماد وبھروسہ، دعا میں اس کے سامنے رونا، گڑگڑانا، نماز میں خشوع وخضوع کی کیفیات یہ بھی اس دین اور وراثت نبوی کے اہم اجزاء میں سے ہے، جس میں مسلمانوں کی پہلی نسل اور صحابہ کرام ممتاز تھے، دشمنوں پر ان کو کامیاب وفتح یاب ہونے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے، ہرقل نے ایک شخص سے جو مسلمانوں کے ساتھ قید ہوا تھا کہا کہ مجھے ان لوگوں کے حالات بتاؤ تو قیدی نے کہا، میں آپ کے سامنے ان کا ایسا نقشہ کھینچوں گا کہ جیسے آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، وہ دن میں شہ سوار اور رات میں عبادت گزار ہوتے ہیں، ذمیوں کے مال کو بے قیمت نہیں لیتے، کسی کے پاس آنا جانا ہوتا ہے تو سلام پہلے کرتے ہیں، اپنے حریف سے اس طرح جم کر لڑتے ہیں کہ بالادستی حاصل کر کے ہی دم لیتے ہیں، یہ باتیں سن کر ہرقل نے کہا کہ یہ حالات جو تم نے بیان کئے ہیں اگر یہ حقیقت ہیں تو ایک نہ ایک دن وہ ہمارے تخت وتاج پر قبضہ کرلیں گے، ایک دوسرے قیدی نے ان کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں وہ رات کو

عبادت گزار اور دن میں شہ سوار ہوتے ہیں، اگر تم اپنے قریب بیٹھنے والوں میں باتیں کرو تو ان کے ذکر و تلاوت کی بلند ہونے والی آواز کی وجہ سے وہ تمہاری بات کو نہ سمجھ سکیں گے۔

علماء اور دین کے کارکنوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ سنت پر عمل کریں، مردہ سنتوں کو پھر سے زندہ کریں، ان کا رواج ڈالیں، اور حدیث شریف سے رہنمائی حاصل کریں، انکی جدوجہد، کدوکاوش، اس تحریک ودعوت کا مقصد اولین فرائض کا قیام، دین اور اس کے ارکان کی شیرازہ بندی ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ نے اسی کو ان کے اخلاص قبولیت کا پیمانہ (بیرومیٹر) قرار دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے: الذین ان مکناهم في الأرض أقاموا الصلاة وآتوا الزكاة وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنكر والله عاقبة الأمور" وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین وآسمان میں اقتدار دیدیں تو نماز قائم کریں گے، زکوہ دیں گے، بھلائی کا حکم دیں گے، برائی سے روکیں گے اور معاملات کا انجام تو خدا ہی کے ہاتھوں میں ہے"(۱)

حضرت مولاناؒ نے جہاں ہر طبقہ کے لوگوں اور دیگر اقوام کو بھی دعوت کی زبان واسلوب میں مخاطب کیا، وہیں سب سے زیادہ عرب قوم کو اپنے خطاب، اپنی گفتگو، اپنی تقریروں اور ملاقاتوں سے اور اپنی جملہ زبان وبیان اور قلم وقرطاس کی طاقت سے ان کو جھنجھوڑا اور ان کو اپنے عہد رفتہ، اسلام کی صداقت وعظمت اور اس کی قیادت کی طرف لوٹنے کی تلقین کی اور امت عربیہ کو اپنے اصل اور منفرد کردار کی طرف واپس آنے کی دعوت دی، اور ان کو اپنے منفرد قائدانہ مقام کی طرف لوٹنے کی طرف متوجہ کیا، تاکہ سارا عالم رشد وہدایت، ایمان وعقیدہ کی روشنی سے بقعۂ نور بن جائے اور مادی تمدن کی وجہ سے جو ناہمواریاں پائی جاتی ہیں اور عالم انسانیت کو جن پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، ان کا حل خود بخود نظروں کے سامنے آئے، انہوں نے اس صاحب دعوت قوم کو مختلف اوقات میں متعدد طریقوں سے مخاطب کیا، عربی زبان میں

(۱) شرق اوسط کی ڈائری ص: ۱۹۱-۱۹۳

مہارت تامہ پیدا کرنے کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ عربوں کو نئے سرے سے اسلام کی طرف واپس ہونے کی دعوت دے سکیں اور دوبارہ جاہلیت کی طرف ان کے قدم نہ اٹھنے پائیں۔

سرزمین عرب کو اللہ تعالیٰ نے معدنی دولت نہایت فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہے، اس لئے اس کو مثبت اور تعمیری کاموں میں صرف کرنے ہی میں دراصل اللہ تعالیٰ کا حق شکر کسی حد تک ادا ہو سکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا نشہ انحراف وضلالت کے دروازے کھول دے، اور یہ امت اپنے پیغام کو بھلا بیٹھے اور نت نئے تہذیبی اور مادی فلسفوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائے۔

اسی عزم کے ماتحت حضرت مولاناؒ نے عالم اسلام کے عرب ممالک کا سفر کیا، انہوں نے سعودی عرب، مصر، سوڈان، شام و فلسطین، خلیج کی ریاستوں اور کویت، قطر، بحرین، مغرب اقصیٰ (مراکش) وغیرہ ممالک کا دعوتی مقصد سے سفر کیا، اور وہاں کے نوجوانوں علماء دعاۃ، اہل فکر کے سامنے نہایت کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور اسلام سے ان کی غفلت اور نادانستہ طور پر مغربی تہذیب سے مماثلت اور اس پر فریفتگی کو اپنی گفتگو کا محور بنایا، اور ایک داعی اور مرد مومن کی جرأت کے ساتھ نہایت صراحت سے ان کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی اور اسلامی غیرت وحمیت کو از سر نو زندہ کرنے کی طرف متوجہ کیا، خاص طور سے عرب قومیت اور عرب نسل پرستی کو اسلام کے خلاف ایک بغاوت سے تعبیر کیا اور اس کے علمبرداروں کو اپنی زبردست تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کی حقیقت اور ان کے چھپے ہوئے راز کو واشگاف کر کے ان کو غیرت دلائی اور اسلامی تہذیب کو اختیار کرنے اور اس کے روشن ماضی کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔

مسئلہ فلسطین کا تجزیہ کر کے اس کے حل کے بارے میں سوچنے اور اس کو بروئے کار لانے کا مطالبہ کیا اور اس مسئلہ میں کہاں اور کس طرح غلطی ہو رہی ہے اس کو تلاش کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی، اور عربوں کی کمزوریوں، ان کی کوتاہیوں اور ان کی بے باکانہ تصرفات کو ان کی فکری بے بضاعتی اور ذہنی دیوالیہ پن کا نتیجہ قرار دیا، اور ایک رسالہ خاص

طور سے انہیں کے لئے ’’الی الرایة المحمدیة ایھا العرب ‘‘ کے نام سے شائع کیا، اکثر عرب ممالک کے دورے کے موقع پر وہاں کے لوگوں کو ایک دعوتی پیغام ’’اسمعیات‘ ‘کے عنوان سے پیش کرنے کا اہتمام کیا، اسمعی یامصر، اسمعی یاز هرة الصحراء، اسمعی یا ایران‘ اور بلاد حرمین کو (من العالم الی جزیرة العرب) کے عنوان سے اسلام کے دامن کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہنے کا درس دیا، اسی ضمن میں حضرت مولانا نے سربرہان مملکت کو بھی آگاہ کیا اور ایک سے زیادہ باران سے نہ صرف یہ کہ ملاقاتیں کیں، بلکہ ان کے نام ذاتی طور پر خطوط بھی تحریر فرمائے، خصوصیت کے ساتھ سعودی عرب کے فرمارواؤں کو جو خطوط لکھے ان کا مجموعہ ’’کیف ینظر المسلمون الی الحجاز‘‘ کے نام سے چھپ چکا ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت مولانا کی ایک تقریر کے چند اقتباسات نقل کر کے عربوں کے بارے میں ان کی رائے پیش کریں اور ان کی صاف گوئی اور تلخ نوائی کو درس عبرت بنائیں۔

اسلام سے بغاوت

’’آج ہماری ذلت ونکبت کا کیا حال ہے، اور ہم دنیا کی نگاہوں سے کتنے گر گئے ہیں، ہم اس وقت صحیح احساس کر رہے ہیں کہ اللہ کے سوا کہیں پناہ نہیں، تمام راستے تاریک اور مسدود ہیں، اسلئے ہمیں حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہنا چاہئے کہ ہم نے اسلام سے بغاوت کر کے کچھ نہ پایا، ہمیں اب کہنا چاہئے کہ ہم اسلام کے دائرے میں آتے ہیں اور اس کی طاقت آزمانا چاہتے ہیں جو ہماری مدد کو تیار کھڑا ہے اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں بلندی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

صاف گوئی اور تلخ نوائی

میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے ان عرب بھائیوں پر سخت تنقید کی ہے جن سے

مجھے محبت وعقیدت ہے اور جن کی میں عزت کرتا ہوں اور اللہ نے جن کے مستقبل سے میرا مستقبل اور جن کی عزت سے میری عزت وذلت وابستہ کر رکھی ہے۔ میں نے یہ بات ہندوستان میں بار بار کہی ہے کہ عالم اسلام کا مستقبل عربوں کے مستقبل سے وابستہ ہے، عربوں کی ذلت اور عزت اسلام کی ذلت وعزت ہے، یہ وہ قوم ہے جسے چھوڑ کر میں کسی قوم کو اپنا نہیں سکتا اور جس کی کتاب اور جس کی زبان، جس کی تہذیب سے کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہوسکتا ہے، اسی پر میں جیتا رہا ہوں اور اسی پر مرنا چاہتا ہوں، یہ صراحت اور تلخی میں نے اسلئے اختیار کیا ہے کہ میں بھی اس انجام میں شریک ہوں اور جن حالات کے آپ شکار ہیں میں بھی انہی میں اپنے کو مبتلا پاتا ہوں، لہٰذا پھر کہتا ہوں کہ محمدی جھنڈے تلے جمع ہوجایئے، قومی وطنی یا اور کسی جھنڈے کے نیچے نہیں۔

اللہ نے آپ کے ذریعہ ان لعنتوں سے نجات دی تھی، جاہلیت میں ہر قوم کے پاس تہذیب ومذہب تھا اور ان کے آداب ورسوم بھی تھے، لیکن جب اسلام کا پیغام لے کر آئے تو آپ نے انہیں بچایا، پھر خود ادھر کیوں جارہے ہیں؟

روشنی کی کرن

اے اہل عرب، اے اہل مکہ اور اے خادمان دین! آپ نے اپنے ہاتھوں سے اس مقدس گھر کو بنایا تھا کہ ہر گھر سے اونچا ہوجائے اور ہر صنم وہیکل سے بلند دکھائی دے، آپ کے لئے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ پھر ان ناقابل ذکر بتوں کا سہارا لیں، یہیں سے عالم انسانیت کی آواز اٹھی، جس نے امتیازات کے بتوں کو توڑ کر اور نسلی، وطنی، غلامی کے طوق وسلاسل کو کاٹ کر رکھ دیا، جس نے تاریخ کا رخ پھیر دیا، جس نے حوادث کا منہ موڑ دیا، یہیں سے وہ روشنی کی کرن پھوٹی جو دنیا میں پھیل گئی اور جس نے انسانیت کے تن مردہ میں روح زندگی دوڑادی۔

جاہلیت کا رجحان

ہمیں حیرت ہے کہ آپ کیسے اس جاہلیت کی طرف جارہے ہیں، جسے ہر ہوشیار قوم نے چھوڑ دیا ہے اور آج یورپ بھی قومیت کی تباہ کاریوں کے بعد اس سے تائب ہوگیا ہے،

یورپ کا اگلا ہوا لقمہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کو دیکھنا نہیں چاہتا، آپ وہی قوم ہیں جس نے دنیا کو اپنے خوان کرم پر صدائے عام دیا تھا، اور قومیں آپ کے دستر خوان پر مہمان ہوئی تھیں، جس کے لئے کہا گیا ہے کہ

ادیم زمین سفرۂ عام اوست
بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

آپ کے لئے کیسے زیبا ہو سکتا ہے کہ آپ خود ہی دوسروں کے یہاں طفیلی بن کر جائیں اور ان کے پس خوردہ پر قناعت کر لیں"۔ (۱)

میں انہی چند تقریری نمونوں پر اس وقت اکتفا کرنا چاہوں گا اسلئے کہ اس موضوع کو پورے پھیلاؤ کے ساتھ پیش کرنے کے لئے محنت و کاوش اور یکسوئی و فراغت کی ضرورت ہے، یہ ایک بحر بیکراں ہے اور یہ ایک مضبوط و وسیع تر سفینہ کا طالب ہے، ع "سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے" اگر زندگی نے وفا کی اور وقت نے ساتھ دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور توفیق عمل سے نوازا، تو اس موضوع کو کسی رسالہ یا کتاب کا عنوان بنایا جا سکتا ہے، **واللہ ولی التوفیق والسداد۔**

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مختصر مضمون کو حضرت العلام علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اقتباس پر ختم کیا جائے:

> "آج تمام دنیا میں مسلمان ہیں، کون ایسا ملک ہے، جہاں آپ کے ملک کے لوگ موجود نہیں؟ لیکن کس کے لئے ہیں، بس یہی مسئلہ ہے، دعوت پھیلانے کے لئے نہیں، ایسا نہیں ہے کہ انسانیت پر رحم کھا کر انگلستان، کنیڈا، امریکہ، خود عرب ملکوں کی موجودہ خطرناک حالات دیکھ کر وہ بے چین ہو کر اپنے گھروں سے نکلے ہوں، یہ "أخرجني مخرج صدق" نہیں ہے، اور جو وہاں گئے تو یہ "ادخلنی مدخل صدق" نہیں ہے،

(۱) عالم عربی کا المیہ، ص ۱۰۴-۱۰۶

معاشی مصلحت کے مفاد نے ان کو نکالا، معاشی مفاد نے ان کو وہاں داخل کیا، معاشی وذاتی وخاندانی مفاد نے ان کو وہاں رکھا، جب اس کا تقاضہ ہوگا کہ مکہ کے بجائے نیویارک چلے جائیں تو وہ چلے جائیں گے، آپ جب چاہیں امتحان لے کر دیکھ لیجئے، اور جب اس کا تقاضہ ہوگا کہ مکہ چلے جائیں تو وہ وہاں چلے جائیں گے، اسلئے نہیں کہ وہاں حرم ہے، بلکہ اس لئے کہ معاشی مسئلہ کا تعلق وہاں سے ہے، یہ نہ ''مدخل صدق'' پر عمل کر رہے ہیں اور نہ ''مخرج صدق'' پر چل رہے ہیں'' (۱)

☆☆☆

(۱) خطبات مفکر اسلام ج ۶ ص ۳۳-۳۴

مفکر اسلامؒ
عربی کے صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ابتدائے عمر ہی میں اپنے ادبی ذوق کے لئے معروف تھے، ان کے خاندان میں اس وقت کئی ایسے لوگ موجود تھے جو ادب وشعر کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اور اس کی نمائندگی کرتے تھے، ان میں حضرت والا کے ماموں زاد بھائی سید حبیب الرحمٰن حسنی شعر وشاعری کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے، اردو کے قدیم شعراء جو شعر وادب میں حجت کا درجہ رکھتے تھے ان کے کلام سے ان کو خاص شغف تھا، اسی طرح خاندان کے بزرگ عالم دین ومحدث مولانا سید ابوالخیر صاحب لکھنؤ کے ادب وزبان اور اس کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے خود بھی شاعر تھے شعر کہتے تھے اور برق تخلص فرماتے تھے، خود حضرت والا کے والد مرحوم مولانا سید عبدالحی حسنی اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے حالات پر ایک وقیع تصنیف کے مالک تھے جس کا نام ''گل رعنا'' ہے جو شروع ہی سے آپ کے زیر مطالعہ رہا کرتی تھی جس سے آپ نے ادبی ذوق حاصل کرنے میں بڑا استفادہ کیا، بہتر ہے کہ ہم حضرت مرحوم کے ادبی ذوق کی تعمیر اور اس کو پروان چڑھانے میں جن عوامل کا بھرپور اثر ہے اس کو خود ان ہی کی زبان سے سنیں، فرماتے ہیں:

''یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ ابتدائے عمر اور عربی تعلیم کے آغاز ہی کے زمانے میں میں نے اردو زبان وادب کی معیاری کتابیں پڑھ لیں، دین

کے جن داعیوں اور علماء کو ابتدائے عمر میں اپنے ملک کی زبان وادب کے مطالعہ اور اس کا ذوق پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا، یا بڑی عمر میں وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کو دین کی مؤثر دعوت دینے اور دینی حقائق کی تفہیم وتعلیم میں نیز جدید تعلیم یافتہ طبقے میں دینی مقاصد کو دل نشیں کرنے میں دقت پیش آتی ہے، اوران کی انشاء وتحریر میں وہ طاقت ودل آویزی نہیں ہوتی جس کی اس عہد میں ضرورت ہے؟ رائے بریلی کے قیام میں جو کبھی کبھی طویل ہو جایا کرتا تھا، میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی ''الفاروق'' آ گئی مطبع نامی کانپور کی چھپی ہوئی سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے، اشخاص، شعراء اوران کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گئے جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اوران کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔

''گل رعنا'' گھر کی کتاب تھی اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنے معلومات ہو گئے کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے ماموں زاد بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے ان کو اردو شعر وشاعری کا بڑا شوق تھا، ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے ، اور اردو میں تقریر وتحریر کے مقابلے کرواتے، اس سلسلہ میں خاص طور پر، مومن، غالب، ذوق، اور لکھنو کے شعراء میں سے آتش، اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اوران کا مطلب بیان کرنے کے سلسلے میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی، شعرفہمی اور ذوق آفرینی میں ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برق کا بھی حصہ ہے، جو لکھنؤ کی زبان کے عاشق، محاورات

اور الفاظ کی تذکیر وتانیث میں سند اور استاذ کا درجہ رکھتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اچھے کہتے تھے۔

اس زمانے میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں بعض عزیزوں کا ذخیرہ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' بھی تھی عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان وادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر فنی کا ایک مرصع نمونہ ہے بہت اثر پڑا، بہت دنوں تک ''نیرنگ خیال'' اور ''آب حیات'' کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدے سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا زمانہ تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، مولانا شبلی مرحوم مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد، شرر مرحوم، اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں، میرے ماموں حافظ سید عبیداللہ صاحب کے یہاں مولانا آزاد کے شہرۂ آفاق اخبار ''الھلال'' کے کئی سال کے فائل تھے، وہ بھی ذوق وشوق سے پڑھے، اور ان کے زور قلم اور جوش بیان کا طبیعت نے پورا اثر قبول کیا، کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلادی جائے، بیکار اور بے اثر نہیں رہتی اپنا اچھا یا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب ''یادایام'' کا تھا جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے، اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے، جو میرے علم میں مصنف ''گل رعنا''

اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا پہلا مضمون جواب یاد آتا ہے اندلس پر تھا"۔

اسی ادبی ذوق و مطالعہ کا اثر تھا کہ عربی زبان و ادب کی طرف توجہ ہوئی اور علامہ محمد تقی الدین ہلالی جو عربی زبان و ادب کے محقق اور بلند پائے کے عالم و ادیب تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تشریف لائے اور عربی ادب کے استاذ مقرر ہوئے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا، اور شب و روز ان کے ساتھ رہ کر عربی زبان پر پورا عبور حاصل کرلیا، اور عربی ادب کے بارے میں ان کے افادات اور ان کے طریقہ تعلیم سے ذوق ادب کو پروان چڑھانے میں بہت مدد ملی، اسی زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" بھی جاری ہوا، اس کی سرپرستی اور نگرانی تو علامہ سید سلیمان ندویؒ اور علامہ ہلالیؒ کرتے تھے، مگر اس کی تحریر و ترتیب اور اشاعت کی تمام تر ذمہ داری حضرت مولاناؒ اور مولانا مسعود عالم ندویؒ پر تھی، اس عربی ماہنامہ نے دارالعلوم میں عربی ادب کا ذوق پیدا کرنے میں بڑا کردار ادا کیا اور عربی مضمون نگاروں کی ایک ٹیم اس کی وجہ سے تیار ہوگئی اس میں حضرت مولانا بے تکلف عربی بولنے اور لکھنے کے لئے مشہور و معروف ہوگئے۔

حضرت مولاناؒ کا سب سے پہلا عربی مضمون حضرت سید احمد شہیدؒ پر مصر سے شائع ہونے والے مشہور عربی رسالہ "المنار" میں شائع ہوا یہ رسالہ وہاں کے مشہور عالم اور ادیب سید رشید رضا کی ادارت میں نکلتا تھا، انھوں نے اس مضمون کو نہ صرف یہ کہ شائع کیا بلکہ اس کو الگ سے رسالہ کی شکل میں بھی طبع کیا، یہ واقعہ دراصل حضرت مولانا کی ادبی عظمت کی دلیل ہے، اور عربی ادب میں ان کے عالی مقام کی نشاندہی کے لئے کافی ہے۔

اس کے بعد حضرت مولاناؒ برابر اپنی ادبی استعداد بڑھانے اور عربی زبان میں مہارت پیدا کرنے کے لئے عربی رسائل و اخبارات اور عربی ادب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہے عربی زبان و ادب کا ذوق پیدا کرنے اور انشاء و تحریر کی مشق کی طرف متوجہ کرنے اور اس کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرانے میں حضرت مولانا کے برادر بزرگ مولانا سید عبدالعلی

حسنیؒ کی فکر اور ان کے اہتمام کا بڑا دخل ہے۔ حضرت مولاناؒ کاروان زندگی میں فرماتے ہیں:

"بھائی صاحب عربی اخبارات ورسائل کے مطالعہ کے بڑے شائق تھے، شاید ہندوستان کے چند ہی آدمی بلادعربیہ کے اخبارات سے واقف ہوں گے اور ان کے مطالعہ کا اہتمام کرتے ہونگے جب سے وہ حج ۱۳۴۴ھ-۱۹۲۶ء سے آئے تھے مکہ مکرمہ کا اخبار "ام القریٰ" ان کے نام جاری تھا، اس مکان میں منتقل ہونے کے بعد انھوں نے ایک ندوی فاضل مولوی سید معید اشرف صاحب سے جو لکھنؤ کے مشہور اردو اخبار "ہمدم" میں عربی سے اردو میں ترجمہ کا کام کرتے تھے، یہ طے کرلیا تھا کہ وہ عربی اخبارات پڑھنے اور ان سے کام لینے کے بعد ان کو پہونچادیا کریں گے، مولوی سید معید اشرف صاحب کے ذریعہ جو اخبارات بھائی صاحب کے پاس واپس آتے تھے، ان میں دمشق سے نکلنے والا "فتی العرب" اور فلسطین سے نکلنے والا "الجامعۃ الاسلامیۃ" یاد ہے ان دونوں اخبارات کی عربی بڑی اچھی اور طاقتور ہوتی تھی، خاص طور پر "الجامعۃ الاسلامیۃ" (جو مفتی امین الحسینی صاحب کا ترجمان تھا) کے افتتاحیئے بڑے طاقتور، فصیح وبلیغ اور آتشیں قلم کے لکھے ہوئے ہوتے تھے اور "الھلال" کے مولانا آزاد کے لکھے ہوئے افتتاحیوں کے یاد تازہ کرتے تھے، میں اگر چہ عربی ادب کی ابتدائی کتابیں پڑھ چکا تھا، لیکن ان اخبارات کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی، اس میں بھائی صاحب نے میری رہنمائی فرمائی، وہ جدید تعبیرات واصطلاحات کی تشریح فرماتے اور میں رفتہ رفتہ ان کو بلا تکلف پڑھنے لگا اور مجھے اس سے انشاء وتحریر میں بڑی مدد ملی کہ اخبارات میں تنوع بھی ہوتا ہے اور تکرار بھی، ان دونوں اخباروں کے ایڈیٹر فصیح اللسان، صحیح التعبیر اور عربی پر بڑی قدرت رکھنے والے اہل قلم اخبار نویس تھے۔

اس وقت دار العلوم کی جمعیۃ الاصلاح کے دار المطالعہ میں "المنار"

''الھلال'' المقتطف'' مجلہ الزھراء'' المجمع العلمی'' العرفان'' وغیرہ رسائل آتے تھے، مولانا مسعود عالم ندویؒ کی دوستی اور رفاقت کی وجہ سے میں بھی ان کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا، ہلالی صاحب آئے تو انھوں نے استاذ محب الدین الخطیب کے ہفتہ وار رسالہ ''الفتح'' کا تعارف کرایا اور اس کے منگوانے اور پڑھنے کی ترغیب دی، اس رسالہ میں اس وقت کے بلند پایہ اسلامی مفکر اھل قلم امیر البیان امیر شکیب ارسلان وغیرہ مضمون لکھتے تھے اس رسالہ کے مطالعہ سے جو ادب عالی اور فکر اسلامی کا جامع تھا ہم لوگوں کو بڑا فائدہ پہونچا'' (۱)

عربی زبان وادب کا ذوق اور مہارت حاصل ہونے کے بعد حضرت مولاناؒ نے ۱۹۴۰ء میں ہندوستان کے عربی مدارس کے لئے عربی زبان وادب کا نصاب تیار کرنے کی طرف توجہ فرمائی، اور بچوں کے لئے کتاب (قصص النبیین للاطفال) (جو تین حصوں پر مشتمل تھی اور بعد میں اس سلسلہ میں دو حصوں کا اضافہ ہوا) اور ''القراۃ الراشدۃ'' کا سلسلہ شروع فرمایا، اور درجات عالیہ کے طلبہ کے لئے ''مختارات من ادب العرب'' دو حصوں میں لکھ کر نہ صرف ہندوستان کے مدارس عربیہ کے حلقوں میں ایک ادبی اور فکری انقلاب برپا کیا، بلکہ اس کتاب کے ذریعہ جو قرن اول سے لیکر عصر حاضر تک کے ادبی نمونوں پر مشتمل تھی اور زندہ عربی زبان وادب کی بھرپور نمائندگی کر رہی تھی، خود بلاد عربیہ کے علمی اور ادبی حلقوں اور وہاں کے مدارس وجامعات میں عربی ادب کی اس نئی نمائندگی کو رشک وشکر کے جذبے کے ساتھ دیکھا گیا، اور وہاں کے تعلیمی مراکز نے اس کو قبول کیا، اور داخل نصاب کیا۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی اس ادبی کوشش کی کامیابی کے بعد ۱۹۴۴ء میں اپنی وہ عظیم المرتبت اور معرکۃ الارآء کتاب عربی زبان میں لکھی جس کا نام بھی اپنی ایک اہم شخصیت رکھتا ہے، یعنی (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) اس کتاب نے تمام علمی اور ادبی حلقوں سے

---

(۱) کاروان زندگی ج۱: ۱۲۵-۱۲۶

خراج تحسین حاصل کیا، اور ایک نئے اسلامی نظریئے کا ان کو علم ہوا، کہ مسلمانوں کے عروج وزوال سے عالم انسانیت کو نقصان پہونچ سکتا ہے، کتاب کے اندر اسی نقطۂ نظر کو عقلی اور نقلی دلائل سے اتنا مستحکم کر کے پیش کیا گیا ہے کہ کسی کو بھی اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس کتاب کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اور اس کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس موقع پر ہم اس جانب بھی اشارہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ نے عربی ادب کا ایسا معتدل اور سنجیدہ اسلوب اختیار کیا جسے ''اسلوب الدعوۃ'' اور ''ادب الدعاۃ'' کا نام دینا بالکل مناسب ہے اور عصر حاضر کا کوئی بھی مؤرخ جدید عربی ادب کی تاریخ لکھتے وقت اس اعلیٰ اسلوب سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نظر میں ادب کے عناصر

حضرت مولاناؒ کی نظر میں ''اخلاص وسچائی'' ادب کے دو اہم بنیادی عنصر ہیں جو خصوصیت کے ساتھ دعا ومناجات اور اذکار واوراد میں پائے جاتے ہیں۔ اور ادب کی طاقت وقوت اور تاثیر بڑھانے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں، چنانچہ مولاناؒ رقمطراز ہیں ''ادب کے اہم ترین عناصر میں سے اخلاص وسچائی بھی ہے مگر اس کی اہمیت سے اکثر ناقدین ادب غفلت برتتے رہے ہیں، حالانکہ یہی دونوں عنصر ادب کے اندر طاقت وقوت اور زندگی کی روح پھونکتے ہیں، اور اسے ایک ابدی حقیقت کا درجہ عطا کرتے ہیں، دعا ومناجات کے علاوہ ادب کی کوئی صنف ان دونوں عنصروں سے بیک وقت مزین نہیں ہوتی آپ غور کریں کہ داعی ومناجی اگر نرم دل، نرم خو، زخم خوردہ، اور حالات کا مارا ہوا ہو، نیز اپنے رنج وغم کو بیان کرنے پر اسے قدرت تامہ بھی حاصل ہو تو کیا اس کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات کسی ادبی معجزہ سے کم ہوں گے؟ یقیناً وہ کلمات دل کے ٹکڑوں اور اشک جگر سوز سے کم نہ ہونگے جو برسہا برس تک ہزاروں انسانوں کو رلانے کے لئے کافی ہوں گے، ان کلمات کی تاثیر اور اعجاز پر ایک حیثیت سے اور غور فرمائیے جبکہ وہ اس زبان مبارک سے ادا ہوئے ہوں جو وحی الٰہی

سے ہمیشہ تروتازہ رہتی تھی، اور فصاحت وبلاغت جس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، مثال کے طور پر طائف والی دعا کو دیکھئے!

اہل طائف نے آپ کی دعوت کو ٹھکرادیا، اور آپ کے ساتھ بڑی سنگدلی کا معاملہ کیا، آپ پر پتھروں کی بارش کی، حتیٰ کہ آپ کے قدم مبارک لہولہان ہوگئے اس بے کسی وکرب کے عالم میں آپ کی زبان پر وہ دعا جاری ہوئی جو طاقت وقوت اور تاثیر وصداقت سے لبریز ہے، آپ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا:

"اللّٰهم اليك أشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهو انی علی الناس، رب المستضعفين: أنت ربی الی من تکلنی؟ الی بعيد يتجهمنی أو الی عدو ملكته أمری! ان لم يكن بك عليّ غضب فلا أبالی، غير أن عافيتك هی أوسع لی، اعوذبنوروجهك الذی أشرقت له الظلمات، وصلح عليه أمر الدنيا والآخرة، من أن يحل لی غضبك أو ينزل علی سخطك، لك العتبی حتی ترضی، ولاحول ولاقوة الاباللّٰه"

(ترجمہ("الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں میں تحقیر کے بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندہ اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے، اور میرا مالک بھی تو ہی ہے، مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے، کیا بیگانہ ترش رو کے، یا اس دشمن کے جو میرے اوپر قابو رکھتا ہے، اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی پروانہیں، لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے، میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہوجاتی ہیں اور دنیا ودین کے کام اس سے ٹھیک ہوجاتے ہیں، کہ تیرا غضب مجھ پر اترے، یا تیری نارضامندی مجھ پر وارد ہو، مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے، اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے"۔

حضرت مولاناؒ کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے ادب کو مختلف اصناف میں تقسیم کیا اور ہر صنف کی خصوصیت واہمیت کو اجاگر کیا، مثلاً خطوط نویسی کے ادب کو ادباء وناقدین کے نزدیک سادگی وحقیقت پسندی اور تکلف وتصنع سے دوری میں وہ اہمیت حاصل تھی جو کسی اور صنف کو حاصل نہ تھی، لیکن حضرت مولاناؒ نے اس کے اندر مزید اضافہ فرمایا وہ تحریر فرماتے ہیں، ''شخصی رسائل کو سادگی وسچائی اور تکلف وتصنع سے دوری کی وجہ سے ناقدین ادب نے بڑی اہمیت دے رکھی ہے، حالانکہ انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ادب کی ایک ایسی صنف بھی موجود ہے جس میں مذکورہ صفات ان رسائل کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں، اور اس میں تاثیر کی وہ طاقت ہے جس کے سامنے ان رسائل کے تمام لغوی مصطلحات ھباءاً منثوراً ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ اس صنف میں متکلم اپنے دل کی باتوں کو نکال کر رکھ دیتا ہے، اور اس کی زبان اس کے دل کی صحیح اور قادر الکلام ترجمان ہوتی ہے، چنانچہ وہ القاب وآداب اور مدح وتعریف سے بے نیاز ہوکر، سامع کو خاطر میں نہ لاکر اپنے قلب سے مخاطب ہوتا ہے، اور اپنے جذبات واحساسات اور ضمیر سے سرگوشی کرتا ہے ادب کی اس اعلیٰ قسم کا نام ''دعا'' ومناجات ہے۔

ادب کی ایک دوسری صنف بھی ہے جسے ہم ادب تراجم یعنی سوانح عمری کا ادب کہتے ہیں، ادباء کے نزدیک اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی بلکہ ان کا خیال تھا کہ اس راہ میں کسی ادبی بلاغت اور فنی جمال کی ضرورت نہیں، چنانچہ جب وہ لوگوں کی سوانح عمری اور کتابوں کی تقدیم کے لئے قلم اٹھاتے تو ہر ایک کے لئے ایک ہی قسم کے اسلوب بیان اور متشابہ اصطلاحات اور ایک دوسرے سے قریب الفاظ استعمال کرتے اور وہ اس سلسلہ میں کسی جداگانہ امتیازی خصوصیت کی رعایت نہیں کرتے، بلکہ ہر شخص کی سوانح عمری اور ہر کتاب کی تقدیم کے وقت ایک ہی طرز بیان کو اپناتے، جس کی وجہ سے ادب تراجم کا دائرہ تنگ ہوگیا تھا، لیکن حضرت مولانا نے اس کو اس کے تنگ دائرہ سے نکال کر آفاقی وسعت عطاء کی، اور بلاسوچے سمجھے بے محل کلمات کے استعمال پر پابندی عائد کی، اور الفاظ کے درجہ

حرارت وبرودت(TEMPERATURE) کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی تاکہ کسی بھی شخص کی سوانح عمری یا کسی کتاب کی تقدیم کے وقت بے جا الفاظ کا استعمال نہ ہونے پائے، اس اہم پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ رقمطراز ہیں ''بہت سے ادباء ومصنفین سمجھتے ہیں کہ کسی عظیم المرتبت شخصیت کی سوانح عمری کا موضوع نہایت آسان کام ہے، لہٰذا جب وہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو بڑی فیاضی اور دریادلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے القاب واوصاف کا پل تعمیر کر دیتے ہیں، جو عموماً مدح سرائی وثنا خوانی پر مبنی ہوتا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے کلمات میں ایسا اشتراک پایا جاتا ہے کہ اس میں عالم ادیب، صالح ومتقی، حاکم اور سپہ سالار لشکر، سب شامل ہوسکتے ہیں، ان کلمات سے کسی ایک شخصیت کی تحدید وتعیین نہیں کی جاسکتی، اور نہ کسی کے حسن وجمال، کمالات وامتیازات اور آثار وعلامات کی ایسی تصویر کشی ہوسکتی ہے جس سے ایک آدمی دوسرے آدمی سے اور ایک کا چہرہ دوسرے کے چہرہ سے ممتاز ہوجائے، حقیقت تو یہ ہے کہ سوانح عمری کا موضوع اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے، کیونکہ اس کے لئے چند اہلیتیں اور لیاقتیں درکار ہوتی ہیں، اس کے لئے سب سے پہلے تو ناقدانہ شخصی معرفت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ بات ایک ساتھ زندگی گزارنے کی راہ سے حاصل ہوجائے تو فبہا، ورنہ منصفانہ مطالعہ کی روشنی میں اس شخصیت کے حالات اور اس کی خصوصیات وامتیازات کا پتہ لگایا جائے گا، اسی کے ساتھ مافی الضمیر کی ادائیگی اور تعبیر پر قدرت، لغوی ذخیرہ اور تعارفی الفاظ کی صلاحیت بھی ضروری ہے اس کے بعد انصاف پسندی اور احساس ذمہ داری کا وہ نازک مرحلہ آتا ہے جس میں سوانح نگار زیر بحث شخصیت کو اسی کے سانچہ وڈھانچہ کے مطابق اور اسی کے قد وقامت کے موافق الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، لہٰذا وہ اسے ایسا ڈھیلا ڈھالا جامہ نہیں پہنا سکتا جس میں وہ شخصیت حقیر وپست قامت معلوم ہو، اور اس بات کی غمازی کرے کہ وہ جامہ کسی دوسری بڑی شخصیت کے لئے تیار کیا گیا ہے، ایسا اس وجہ سے ہے کہ ہر انسان قامت وقیمت کے دونوں پہلوؤں کا

حائل ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اکثر اوقات قامت کے مقابلہ میں قیمت کی حق تلفی بہت زیادہ ہو جاتی ہے، سوانح عمری کے اندر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کوئی پاکیزہ محرک، اندرونی داعیہ ہو اور اس سے فکری ہم آہنگی اور قلبی تعلق ہو، یا نظر انداز کی ہوئی عزت کو بحال کرنے اور چھینے ہوئے حق کی دفاع کی خاطر ہو، یا عظمت رفتہ کی بازیابی، علم دوستی یا کسی کے جمال وکمال پر فریفتگی کی وجہ سے ہو، اگر سوانح عمری مذکورہ عوامل ومحرکات سے خالی ہوگی تو اس کی حیثیت اس جامد وخشک تصویر اور اس نقش ونگار کے مانند ہوگی جو محض مادی منفعت اور تجارتی مفاد کے حصول کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اس میں مصنف وشاعر اور ادیب کا کردار بالکل وہی ہوگا جو ایک پیشہ ور مغنی (گایک) اور کرایہ پر حاصل ہوئی نوحہ خواں عورت کا ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے درجہ حرارت وبرودت سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ وہ کسی زیادہ طاقت والے لفظ کو کم والے لفظ کی جگہ استعمال نہ کر سکے، اور کسی معتدل الفاظ والی شخصیت کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال نہ کرے جن سے کسی باعظمت وباکمال، یا کسی ذہین وفطین، یا کسی بااخلاق وباادب یا کسی صاحب علم، روشن ودماغ اور حاضر جواب شخصیت کی عکاسی ہوتی ہو، اس کے بعد سوانح نگار کو چاہئے کہ وہ زیر بحث شخصیت کو اس کے اختصاص کے طبقہ میں جگہ دے، لیکن یہ امر اس وقت دشوار گذار ہو جاتا ہے جب کہ شخصیت مختلف علوم وفنون اور جداگانہ امتیازات وکمالات کی جامع ہوتی ہے، جیسا کہ عام طور سے علماء متقدمین تھے، ایسی صورت میں شخصیت کے اختصاص کی تعیین اسی وقت ممکن ہے جب کہ سوانح نگار اس کی تمام تصنیفات سے واقف اور اس کے سلسلہ میں اس کے معاصرین کی آراء سے باخبر ہو“۔

کتابوں کی تقدیم اور پیش لفظ کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ اپنے ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ”کسی معاصر بڑے عالم یا عزیز دوست کی کتاب کا مقدمہ لکھنا کوئی تقلیدی عمل نہیں ہے جو کسی کو خوش کرنے یا مؤلف وناشر کی خواہش کی تکمیل

کرنے کی غرض سے انجام دیا جاتا ہو بلکہ وہ ایک طرح کی شہادت اور تصدیق نامہ کا درجہ رکھتا ہے، اور اس کے لئے بھی اپنی جگہ پر کچھ آداب واحکام اور ذمہ داریاں ہیں، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقدمہ نگار سچی گواہی دینے، کتاب کی علمی تقسیم کرنے، اس موضوع پر دیگر کتب کے درمیان اس کی اہمیت بیان کرنے، مصنف کی جدوجہد کا صحیح ذکر کرنے، اور تالیفی وتصنیفی میدان میں اس کی کامیابی کی حد متعین کرنے کے بجائے تعریف ومدح سرائی سے کام لیتا ہے، اور سامان تجارت سمجھ کر اس کے اندر ایک دلال کا کردار کرتا ہے جس کی وجہ سے مقدمہ اپنی علمی وادبی اہمیت کو کھو کر زندگی اور روح سے محروم ہو جاتا ہے، مقدمہ میں کتاب کے موضوع اور اس کے مقاصد، مؤلف کی حیات، معاصرین علماء کے درمیان اس کے مقام ومنصب کی تعیین، اس کی عقلی وعلمی نشو ونما، اور تالیف کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی ہے، لہٰذا وہ تعریف وتمہید کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جسے ہر کتاب کے سرورق پر فٹ کیا جاسکتا ہو۔

اسی وجہ سے مقدمہ نگار اور کتاب کے موضوع کے درمیان علمی یا فکری تعلق کا پایا جانا ضروری ہے، اس موضوع پر اس کا مکمل مطالعہ ہونا چاہئے، کتاب اگر کسی علمی یا ادبی فکری یا دعوتی موضوع سے تعلق رکھتی ہو تو مقدمہ نگار کا مصنف کے عقلی وعلمی اور جذباتی رجحانات اور مزاج سے واقف ہونا ضروری ہے، اور اگر کتاب کا تعلق کسی دینی موضوع مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ سے ہو تب بھی مقدمہ نگار اور مصنف کے درمیان گہرے روابط کا ہونا ضروری ہے، تاکہ مصنف کے اخلاص واختصاص کا پتہ لگایا جاسکے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ مقدمہ کا محرک اندر کا داعیہ اور وہ قلبی جذبہ ہو جو کتاب کے پڑھنے کے بعد از خود دل میں پیدا ہوا ہو، اور پھر وہ مقدمہ نگار کو بے تاب کردے اور سوچنے پر مجبور کردے کہ اگر وہ مقدمہ نہ لکھے گا تو ایک اہم فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہوگا، اور جذبات وتاثرات کے اظہار کی حسرت دل ہی میں باقی رہ جائے گی، یقیناً اس طرح کے طبع زاد اور منصفانہ مقدمے اپنے جلو میں تاثیر وفوائد کا ایک بحر ناپیدا کنار سموئے ہوئے ہوتے ہیں"۔

اسی طرح حضرت مولاناؒ نے ادب کی ایک دوسری بہت ہی اہم صنف کی طرح لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے، اس کو ہم ''اُدب الرحلات'' (سفر ناموں) سے تعبیر کرتے ہیں یقیناً سفر نامہ میں زندگی سماج اور ممالک واقوام کی ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے جس سے خود سیاح کی ذہنیت اور اس کے افکار ورجحانات کی غمازی ہوتی ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاح بعض اہم اور بنیادی باتوں کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے، اکثر وبیشتر سفر ناموں سے جذبات درون اور مقصدیت کی روح ور سچی تصویر کشی کا اسلوب مفقود ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی حیثیت ذہنی لطیفوں اور تسکین خاطر کے سامان سے زیادہ نہیں ہوتی۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عالمی طور پر سفر وسیاحت میں گزار، اور آپ کے سفر ناموں کا اسلوب نہایت ممتاز اور حقیقت پسندی پر مبنی ہے، زندگی وسماج، طرز معاشرت اور علم وادب کے بارے میں حقائق ومعلومات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان میں موجود ہے بعض اسفار کو آپ نے خود قلمبند کیا ہے، مثلاً ''مذکرات سائح فی الشرق العربی'' (۱)۔

ان سفر ناموں میں بہت ہی دلکش ودلچسپ ادبی انداز کی کارفرمائی ہے یہ سفر نامے ادب واسلوب، ایمان وعقیدہ، دعوتی وتربیتی روح کے اعتبار سے تاریخ کے تمام مشہور سفر ناموں سے بالکل مختلف ہیں، بلاشبہ سفر ناموں کی دنیا میں حضرت مولاناؒ کا یہ ایک انقلابی قدم اور بے مثال ادبی اسلوب کی دین ہے، جدید ادبی تاریخ کے رائج سفر ناموں کے اسلوب اور ان کے غیر مفید پہلوؤں پر تنقید کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں ''موجودہ زمانہ میں عربی میں سفر نامے بڑی تعداد میں لکھے گئے، لیکن وہ زیادہ تر علمی، جغرافیائی فوائد ومعلومات پر مشتمل ہیں، وقت گذاری اور تفریح کا مواد اس میں خاصا موجود ہے، اور باوجود اس کے کہ اس سے زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، تاہم ان کا مرکزی نقطہ سیر وسیاحت، آثار قدیمہ وقابل دید مقامات کی عکاسی ہے اور اگر زندگی کے کسی پہلو کی عکاسی

---

(۱) اس کا اردو نام ''شرق اوسط کی ڈائری'' ہے۔

ان میں ہے بھی تو بہت واجبی حد تک اور صرف اتنی جو مصنف کے دائرہ ذوق میں آتی ہو، یا اس کے سفر کیساتھ ہم آہنگ ہو، مثلاً سیاح اگر ادیب ہے تو اس نے مشاہیر ادب کے تذکرے اور اس ملک کی ادبی سرگرمیوں کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے، اور اگر کوئی مذہبی شخص ہے تو اس نے دینی حالات پر پوری تفصیل سے کلام کیا ہے، اور اگر کوئی سیاسی یا منتظم ہے تو اس نے سیاسی شخصیتوں کے تذکرے اور سیاسی تحریکوں اور مکاتب خیال کی تصویر کشی میں سفرنامہ کا بڑا حصہ صرف کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ اکثر یہ کتابیں ایمانی جذبے اور عقیدہ سے خالی اور لطیف احساسات سے عاری ہوتی ہیں اور ان کتابوں کے مصنف کیمرہ یا رکارڈ کا رول ادا کرتے ہیں، واقعات ومشاہدات پر خود کوئی تبصرہ نہیں کرتے، اس میں ان کے دل کی کوئی دھڑکن اور ان کے ضمیر کی کوئی آواز نہیں سنی جاسکتی، چنانچہ اگر کتاب کے سرورق پر ان کے نام کے بجائے کسی ایسے مصنف کا نام لکھ دیا جائے جس کا اس معاشرہ کے ساتھ نہ ثقافتی کوئی تعلق ہو، نہ عقیدہ اور مذہب اور جذبہ اور وجدان کا کوئی اشتراک ہو تو اس سے صورت حال میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا، ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ اس کو وجہ فضیلت سمجھتے ہوں لیکن بہت سے علمائے ادب اس کو نقص اور عیب قرار دیں گے، اس لئے کہ جس تحریر سے قاری کو مصنف کے زمانے اور ماحول کا بھی پتہ نہ لگ سکے، اور نہ اس کے مصنف کا عقیدہ اور مذہب ومسلک اس کو معلوم ہوسکے اور نہ اس کی محبوب قدروں اور آئیڈیل شخصیتوں کا اسے علم ہو، نہ اس کی گرمجوشی اور قوت مدافعت کا اندازہ ہو، اور نہ اس تحریر سے حزن والم کی تلخ کامی اور مسرت وشادمانی کی حلاوت محسوس ہو تو وہ ایک مصنوعی اور بے جان تحریر ہے، وہ نہ کسی کے دل پر اثر انداز ہوسکتی ہے اور نہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

حضرت مولاناؒ کی نظر میں ادب دعوت (أدب الدعوۃ) کو جملہ ادبی اصناف میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، آپ اگر مولانا کے مطالعہ قرآن وحدیث کا گہرائی سے

جائزہ لیں تو اس میں ادب دعوت کا عنصر پوری طرح نمایاں نظر آئے گا، ادب کی اس صنف کا اسلوب بھی قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے مستفاد ہے اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں آپ نے اسی کو اپنایا بھی ہے لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مولاناؒ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے ادب کی اس صنف کے دروازے کھول کر اسے ایک مستقل ترقی پذیر اعلیٰ ادبی صنف قرار دیا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، اس موضوع سے متعلق آپ کے آٹھ محاضرات بھی ہیں جن میں اس ادب کی رعنائی اور حسن وجمال بھرپور طریقہ سے نمایاں ہے۔ آج مفکرین اور داعیوں کو، اس اسلوب کو اپنے دعوتی سفر میں ضرور اختیار کرنا چاہئے، ان محاضرات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ادب دعوت کے مقصود اسلوب اور اس کے مطلوبہ طریقہ کار کی رہنمائی ملتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) دعوت کی حکمت اور زمان ومکان کے ساتھ اس کی ہم آہنگی۔

(۲) سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دو نمونے۔

(۳) سیدنا یوسف علیہ السلام کی دعوت کا ایک اعلیٰ نمونہ۔

(۴) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی چند مثالیں اور اس کی نبوی حکمت۔

(۵) سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کے ساتھ۔

(۶) آل فرعون کے مرد مومن کی دعوت جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔

(۷) خاتم الرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے دو شاندار نمونے اور اس کی حکمت۔

(۸) حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی۔

مندرجہ بالا عناوین کی روشنی میں قاری اس نتیجہ تک پہونچ سکتا ہے کہ ادب دعوت جو کہ جملہ ادبی اصناف میں سب سے نازک اور مشکل صنف ہے، نفسیات وماحول، افکار ورجحانات اور اپنے حکیمانہ اسلوب کی رعایت کی وجہ سے وہ ایک ترقی پذیر ادبی صنف ہے، حضرت مولاناؒ سب سے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے اس ادب کی تعیین کے مطابق اسے ایک

زندہ اور پائندہ صنف کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس کے چار بنیادی عناصر کی تعیین کی ہے، وہ چار اہم عناصر یہ ہیں!

(۱) عقیدہ

(۲) عاطفہ

(۳) اخلاص

(۴) صدق

اگر داعی اپنے کلام میں ان عناصر کو اختیار کرلے تو وہ لوگوں کے نہاں خانۂ دل تک پہنچ کر ان پر اثر انداز ہوسکتا ہے اور اس کا بھی شمار ان ادباء میں ہوسکتا ہے جنہوں نے دعوت اسلامی کو دنیا میں عام کرنے کے لئے ادب الدعوۃ استعمال کیا ہے۔

حضرت مولانا مرحوم نے مذکورہ بالا اصناف کے علاوہ عربی زبان وادب کے دیگر اصناف کی جانب بھی اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ مثلاً شاعری، بچوں کا ادب، افسانے اور ناول وغیرہ، یہ وہ اصناف ہیں جن سے کوئی بھی جو زبان وادب کو اپنے فنی وادبی ذوق کے ساتھ حق وباطل کے معرکہ میں ایک عظیم ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہو، کسی حال میں استغناء نہیں برت سکتا۔

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

بچوں کے ادب میں
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اسلوب

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات گرامی ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی جبیں کا نور، اس کے تابناک چہرہ کا ہالہ اور اس کے آسمان کا درخشندہ ستارہ ہے، آپ کی شخصیت ہندوستان کے لئے باعث صد افتخار اور سرمایہ صد عز و وقار ہے، آپ کی شخصیت کے پہلو اتنے بے شمار اور آپ کے عظیم الشان متنوع کام اتنے زیادہ ہیں جن کا حیطۂ تحریر میں لانا بے حد دشوار ہے، آپ کو ممتاز عالمی شخصیتوں کے درمیان اپنے وسیع علم و مطالعہ، فکری گہرائی و گیرائی، اصابت رائے، انسان اور کائنات کے بارے میں اپنے عالمگیر نظریہ، اور اسلام کے کامل اور صحیح و متوازن فہم کی وجہ سے صدارت اور قافلہ سالاری کا مقام حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حیرت انگیز قبولیت عام اور گہرائی تاثیر سے نوازا تھا، دین حنیف کے تئیں بے پناہ خلوص اور اسلام کی راہ میں مر مٹنے اور تن، من، دھن اور سب کچھ لٹا دینے کا وافر جذبہ عطا فرمایا تھا، آپؒ نے اپنی خداداد ساری صلاحیتیں، دعوت اسلامی کی خدمت، عقیدہ و ایمان کی تقویت، اعلیٰ فکر سلیم کی پختگی اور اسلام کے آفاقی ادبی پیغام، نیز اسے مکمل اطمینان قلب، و شرح صدر کے ساتھ زندگی میں ڈھالنے کی دعوت دینے میں صرف کیں، ان میں سے ہر میدان میں آپ کی وقیع تالیفات، عظیم الشان کام اور بیش قیمت خدمات ہیں، اس طرح آپ پوری دنیا میں فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کے قائد و رہبر تھے، عالمی پیمانہ پر تربیت اسلامی اور ہمہ گیر ثقافت اسلامی کے میر کارواں، ہر جگہ اور ہر مقام میں علم نافع اور ایمان واسع

کے داعی اورزبان وقلم دونوں کے ذریعہ جہاد اسلامی کے (اس کی افضل واعلیٰ ترین شکل میں) مردمیدان اوراس کے غازی تھے۔

آپؒ اسلامی ادب کے قائد وداعی، عالمگیر سطح پر اس کے علمبردار تھے، آپؒ ہی کی مخلصانہ رہنمائی میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے اسلامی ادب کی ''آفاقیت'' کا تصور عام کیا اور عالم اسلام کے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے ہر گوشہ کے تمام ادبی اور علمی حلقوں میں اس کا تعارف کرایا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان ادباء نے اسلامی ادب کی آفاقیت کے اس تصور کو قبول کیا، اوران کو اپنے ادب، اپنی کاوشوں اور بامقصد تحریروں کے لئے ایک وسیع میدان ملا، اور زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنا ادبی پیغام پہنچانے اور زندگی کا تعلق عقیدہ وایمان کے مرکز سے جوڑنے میں ان کی کوششیں تیز ہوگئیں۔

اس وقت میرا موضوع سخن ہے ''بچوں کے ادب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اسلوب'' آپ نے عربی زبان کے اپنے ممتاز ومخصوص اسلوب کے ذریعہ بچوں کے ادب کو مالا مال کیا، اور مسلمان نسل کو قرآن کریم کی روشنی میں مستند اسلامی تاریخ کے آئینہ میں انبیاء کرام کے قصوں اور رسولوں کی حکایا سے صحت بخش غذا بہم پہنچائی۔ آپ نے آسان اور خوبصورت عربی زبان اور پختہ ادبی اسلوب میں انبیائے کرام کے قصوں اوران کی حکایات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس میں بچوں کی ابتدائی، درمیانی اور اخیر زندگی کے مختلف مراحل میں ان کی ذہنی سطح اوران کے تقاضوں اور ضروریات کی مکمل رعایت کی، چنانچہ اس سلسلہ کے پہلے جزء میں آپؒ نے ان نوخیز کلیوں کو دعوت دی کہ وہ ان کے پاس جمع ہوں تاکہ آپؒ انھیں ایک پرلطف اور دلچسپ قصہ سنائیں، گویا آپؒ کہہ رہے ہوں۔

''میرے بچو آؤ، میں تمہیں ایک بڑے آدمی کا قصہ سناؤں،

بہت زمانہ پہلے..........

چنانچہ بچے قصہ سننے اوراس سے لطف اندوز ہونے کے شوق میں آپ کے گرد جمع ہوگئے، اور پھر آپؒ نے مزید خوبصورت اسلوب میں انھیں قصہ سنانا شروع کیا، جس میں

بچوں کے ساتھ آپ کی محبت، ان کے ساتھ شفقت اور انھیں کوئی مفید درس دینے کی خواہش پوری طرح نمایاں ہے، بچے آپ کی طرف پوری طرح متوجہ اور ہمہ تن گوش ہیں، اور پھر آپؒ اپنے دلکش اور جادوئی اسلوب میں قصہ شروع کرتے ہیں:

"بہت دنوں پہلے کی بات ہے، ایک گاؤں میں ایک بہت ہی مشہور آدمی تھا، اس آدمی کا نام آزر تھا، آزر بت فروش تھا، اور اس گاؤں میں ایک گھر تھا، بہت بڑا گھر، اس گھر میں بت تھے، بیشمار بت، لوگ ان بتوں کو سجدہ کرتے تھے، اور آزر بھی ان بتوں کو سجدہ کرتا تھا، اور آزر بتوں کی عبادت کرتا تھا"۔

آپؒ چاہتے ہیں کہ بچوں کو عقیدۂ توحید کے عظیم داعی اور دعوت توحید کے علمبردار ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی طرف واپس لے جائیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے بت فروش، بت گر، اور بت پرستی کے داعی آزر کے گھر میں پیدا کیا تھا، اور ایک ایسے خاندان میں جو گلے گلے بت پرستی میں غرق تھا، ایسے معاشرہ میں جو بتوں کے علاوہ اور کچھ جانتا ہی نہ تھا، ایک ایسے ماحول میں جو شجر و حجر کے سامنے جھکنے کے علاوہ اور کسی چیز سے واقف ہی نہیں تھا، وہاں ایک معبود و قہار کا سرے سے کوئی تصور ہی نہ تھا، ایسے معاشرے، ماحول اور شرک و بت پرستی کی دلدل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو مبعوث فرمایا تا کہ آپ نئے سرے سے خدا پرستی کی دعوت دیں، اور انسانوں کو ان کا عقیدۂ توحید واپس دلائیں،، اور یہ آزر کے وہی نیک اور ہدایت یاب فرزند تھے جن کے بارے میں حضرت مولانا فرماتے ہیں:

"اور آزر کا ایک نیک لڑکا تھا، بہت ہی نیک، اس لڑکے کا نام ابراہیم تھا، ابراہیم دیکھتے تھے کہ لوگ بتوں کو پوجتے ہیں اور ابراہیم جانتے تھے کہ بت پتھر ہیں، اور جانتے تھے کہ بت نہ بولتے ہیں اور نہ سنتے ہیں، اور جانتے تھے کہ بت نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ نفع پہنچاتے ہیں، اور وہ دیکھتے تھے کہ مکھیاں بتوں پر بیٹھتی ہیں اور وہ انھیں ہنکاتے نہیں، اور دیکھتے

تھے کہ چوہا بتوں کا کھانا کھا جاتا ہے اور وہ روکتے نہیں، اور ابراہیم اپنے جی
میں کہتے تھے: لوگ بتوں کو سجدہ کیوں کرتے ہیں؟ اور ابراہیم اپنے آپ
سے پوچھتے تھے: لوگ بتوں سے کیوں مانگتے ہیں؟''۔

یہ شوق انگیز اسلوب جسے بچوں کا ذہن ہضم کر لیتا ہے ان کے دلوں میں عقیدۂ توحید کا بیج بوتا ہے، اور ایک خدائے واحد پر جس نے ساری کائنات اور مخلوق پیدا کی، ایمان لانے کا شوق پیدا کرتا ہے، اور خدائے واحد کی عبادت کی جڑیں مضبوط کرنے اور بت پرستی سے دلوں کو متنفر بنانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ آزر سے پوچھتے ہیں کہ:

''جب یہ بت نفع وضرر کے مالک نہیں اور نہ بولنے اور سننے کی قوت
رکھتے ہیں تو پھر ان کی اس بت پرستی اور بت گری کا سبب کیا ہے؟''

انھوں نے یہ سارے سوالات اپنے باپ کے سامنے تہذیب وشرافت اور ادب واخلاق کے دائرہ میں رہتے ہوئے اور نہایت مؤدبانہ اسلوب میں رکھے جیسا کہ ایسے نازک موقع پر کوئی لڑکا اپنے باپ کے ساتھ کر سکتا تھا، لیکن ابراہیمؑ کو باپ کے غصہ اور غضب کا شکار ہونا پڑتا ہے، پھر بھی وہ خاموش رہتے ہیں اور اپنے جی میں یہ ٹھان لیتے ہیں کہ ان بتوں کو توڑ کر رہیں گے، اور انھوں نے یہی کیا، جب لوگوں کو بتوں کے ٹوٹنے کا پتہ چلا تو ان کے پاس گئے اور پوچھا:

''ابراہیمؑ! ہمارے معبودوں کے ساتھ کیا تم نے یہ حرکت کی ہے؟
انھوں نے جواب دیا: بلکہ ان کے بڑے نے کی ہے، اگر یہ بولتے ہوں تو
انھیں سے پوچھ لو''۔

توحید کی دعوت اور بت پرستی سے نفرت دلانے والا موضوع عام موضوعات کی طرح نہیں ہے، بلکہ اسے بچوں کے ذہن سے قریب کرنے اور اس بات پر زور دینے کے لئے یہی وہ ٹھوس اور مستحکم بنیاد ہے جس پر زندگی کا عالیشان محل تعمیر ہوتا اور اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اور کسی انسان کا اسلام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ کی وحدانیت پر اس

کا ایمان اس کے رگ و پے میں سرایت نہ کر جائے اور گوشت وخون میں پیوست نہ ہو جائے، اس کے لئے ادبی مہارت اور فنی کمال کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کا ذہن موضوع کا ساتھ اسی وقت دیتا ہے جب قصہ کا اسلوب ایسا ہی آسان اور تکرار والا ہو، ملاحظہ ہو کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو بت توڑنے کے پاداش میں ان کی قوم نے آگ میں جلانے کی سزا دی تو حضرت مولاناؒ اس واقعہ کو کس طرح بیان کرتے ہیں:

''لوگ اکٹھا ہوئے اور کہا: ہم کیا کریں؟ ابراہیمؑ نے بت توڑے ہیں اور معبودوں کی توہین کی ہے، اور پھر لوگوں نے پوچھا: ابراہیمؑ کی سزا کیا ہے؟ ابراہیمؑ کا بدلہ کیا ہے؟ جواب تھا: اسے جلادو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو، اور ایسا ہی ہوا، انھوں نے آگ جلائی اور ابراہیمؑ کو اس میں ڈال دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی مدد فرمائی اور آگ کو حکم دیا: اے آگ! تو ابراہیمؑ کے حق میں ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا، اور پھر ایسا ہی ہوا، آگ ابراہیمؑ کے حق میں ٹھنڈی اور بے گزند ہوگئی، اور لوگوں نے دیکھا کہ آگ ابراہیمؑ کو نقصان نہیں پہنچا رہی ہے، اور لوگوں نے دیکھا کہ ابراہیمؑ خوش ہیں، اور ابراہیمؑ صحیح سالم ہیں، لوگ دہشت زدہ ہوگئے اور حیرت میں پڑ گئے''۔

اور پھر اس مقصد سے کہ ابراہیمؑ کے ذہن میں معبود کے ایک ہونے کا مضمون خوب راسخ ہو جائے اور ان کے ذہن میں عقیدۂ توحید ہر طرح کے شائبہ اور آمیزش سے پاک ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ایک شب انہیں آسمان میں ایک تارہ دکھلایا تا کہ اس موضوع پر ان کا امتحان لے، اور ان کے تصور معبود اور ان کی توحیدی عقلیت و ذہنیت کی جانچ کرے، چنانچہ تارہ دیکھ کر ابراہیمؑ بولے کہ یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ آسمان کے پردہ سے غائب ہو گیا تو ابراہیمؑ کو اس پر حیرت ہوئی اور پھر اس کی معبودیت کا انکار کرتے ہوئے فرمایا:

''نہیں، یہ میرا رب نہیں ہے، کیونکہ معبود کی شان نہیں کہ وہ غروب

ہو یا اس پر زوال آئے''۔

اور اسی طرح انھوں نے چاند دیکھ کر فرمایا:

''یہ میرا رب ہے'' لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس کو بھی رد کر دیا'' اور پھر سورج طلوع ہوا تو فرمایا:

''یہ میرا رب ہے، اور یہ ان سب سے بڑا ہے'' لیکن رات آنے پر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو ابراہیمؑ کو یقین ہو گیا کہ یہ بھی رب نہیں ہے''۔

بچوں کے اسلامی ادب کے قافلہ سالار نے اس مضمون کو ایسی پختہ، ایمانی رنگ کی حامل خوبصورت زبان میں ادا کیا ہے جسے بچے پسند کرتے ہیں اور اس سے معبود کی اولین صفات کا علم حاصل کرتے ہیں، اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ معبود کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ وسلامت اور باقی رہے، نہ غائب ہو اور نہ زائل ہو، نہ کمزور ہو نہ سست پڑے، جیسا کہ یہ عقیدہ ابراہیمؑ کے ذہن وفکر میں خوب اچھی طرح بیٹھ گیا تھا اور وہ جان گئے تھے کہ اللہ ہی ان کا رب ہے، کیونکہ اللہ زندہ ہے اسے موت نہیں آئے گی، اور اللہ باقی رہنے والا ہے کبھی غائب نہیں ہوگا، اور اللہ طاقتور ہے کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا، اور اللہ تعالیٰ ستاروں، چاند اور سورج کا رب ہے، اور وہی دنیا جہاں کا رب ہے۔

حضرت مولانا اسی طرح بچوں سے جو ہمہ تن گوش بنے ہوئے ہیں، توحید کے علمبردار حضرت ابراہیمؑ کی زندگی سے متعلق واقعات بیان کرتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے اپنی قوم کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی، اور کس طرح عقیدۂ توحید کو ذہنوں سے قریب کیا، اور خدائی کے دعویدار ظالم ومشرک بادشاہ کے ساتھ جب ان کا واقعہ پیش آیا؟ تو انھوں نے کس طرح ایمان وعقیدہ کی بہادری اور پوری طاقت سے، بغیر کسی سزا اور عتاب کے ڈر کے، اس بادشاہ کا مقابلہ کیا؟ پھر کس طرح اپنے والد کو اللہ کی بندگی کرنے اور بتوں کو چھوڑنے کی دعوت دی، اور یہ سوچ کر ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئے کہ اگر ان کے باپ ان کو اپنے گھر اور شہر سے نکال دیں گے تو انجام کیا ہوگا؟ بلکہ انھوں نے خود کو گھر والوں، والد اور وطن وقوم سب

کو چھوڑ دینے کے لئے تیار کرلیا، اور وادی غیر ذی زرع مکہ چلے گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو وہاں قیام کرنے کی تاکید فرمائی اور ان کے لئے زمزم کا چشمہ جاری فرمایا اور انھیں کے ہاتھوں خانہ کعبہ کی تعمیر کروائی۔

اسی اسلوب میں بچوں کے سامنے ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں اللہ تعالیٰ کے برکت دینے اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک نور نظر لخت جگر اسماعیل نامی بیٹا عطا فرمانے کا قصہ بھی بیان کرتے ہیں جوان کے لاڈلے اور ان کی زندگی میں ان کی امیدوں کا مرکز تھے۔ آپ ان کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے وہ آپ کی آخری اور انتہائی عزیز امیدوں کا مرکز ہوں، ان پر اپنی جان نچھاور کرتے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو اپنے سے جدا نہ کرتے، ایسے فرزند دل بند کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا اور نھیں خواب میں حکم دیا کہ وہ اسماعیل کو ذبح کریں، ابراہیمؑ نے اس خواب کو سچ کر دکھایا اور فرمایا:

> ”بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو غور کرو
> تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے عرض کیا: ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے
> آپ اس کی تعمیل کر گزریئے، انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

اس کے ذریعہ حضرت مولاناؒ نے بچوں کے دل میں یہ بات بٹھائی کہ حضرت ابراہیمؑ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ عام لوگوں جیسے نہیں تھے۔ بلکہ عام محبین اور اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے والے عام لوگوں جیسے بھی نہیں تھے، بلکہ آپؑ اللہ کے بہت ہی اطاعت گزار اور وفا شعار بندے تھے۔ اس کی مدد پر آپ کو پورا یقین واعتماد تھا، اور اس کی ذات سے آپ کا گہرا اور والہانہ تعلق تھا، اور آپ عبادت وعاجزی وانکساری اور توحید ومحبت خالص میں پوری دنیا کے امام اور ان کے لئے ایک دائمی نمونہ تھے۔

اسی طرح جو بندہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے، اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کی محبت میں مرمٹتا ہے تو اس کا رشتہ ذات خداوندی، اور خدائے وحدہ لاشریک سے استوار

ہو جاتا ہے۔اس کا تعلق اپنے اللہ سے ایک مخلص، سچے اور متواضع بندہ کا تعلق ہوتا ہے، اور بندوں سے اس کا ربط ایک نبی مبعوث جیسا ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت ورہنمائی اور اللہ سے ان کا تعلق قوی کرنے اور ان کی زندگی کی سیدھی ڈگر اور صراط مستقیم پر چلانے کے لئے منتخب کرلیا ہے، جو ان کی سعادت و بخت آوری، عافیت اور امن وسلامتی اور آرام وراحت کے زیر سایہ زندگی گزارنے کا ضامن ہوتا ہے۔

بچوں کے اسلامی ادب کے میر کارواں اور قافلہ سالار نے اپنے بلیغ قلم سے اس مثالی انسان کا نقشہ پیش کیا ہے جس کا مقام بہت اونچا اور اللہ سے اس کا تعلق نہایت قوی اور مستحکم ہوتا ہے، یہ وہ پیارا انسان ہے جو جانتا ہے کہ اسے اپنے رب کے ساتھ کیسے رہنا چاہئے؟ اور لوگوں کے ساتھ اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہونی چاہئے؟ اور بحیثیت ایک نبی کے، بحیثیت ایک بندہ کے، بحیثیت ایک باپ اور بیٹے کے اس سے کیا مطلوب ہے؟ حالات خواہ جیسے بھی ہوں وہ زندگی بھر حق کا سودا نہیں کرتا، اور دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حق سے دستبردار نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے جان ومال، اہل وعیال اور وطن اور اپنے مستقبل کی قربانی دینا اس کے لئے آسان اور ہیچ ہوتا ہے۔

اس طرح حضرت مولاناؒ بچوں کے لئے مرد کامل حضرت ابراہیمؑ کا نقشہ پیش کرتے ہیں جن کی اور جن کے اہل وعیال اور اولاد کی زندگی سے حج کی پوری شریعت اور پورے مناسک حج وابستہ ہیں، آپ کی ذات گرامی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے لئے منتخب کیا اور اپنی شریعت کے لئے پسند فرمایا، اس طرح آپؑ تمام نوع انسانی کے لئے ان کی زندگی اور اللہ کے ساتھ ان کے روحانی اور معنوی تعلق میں ایک نادر مثال تھے۔

حکایتی اسلوب اور بچوں کی زبان میں حضرت ابراہیمؑ کا قصہ پڑھ کر بچوں پر ایسا ایجابی اور مثبت اثر پڑتا ہے جو ان کے دل کی تختی پر آئندہ کے مراحل کے ایسے نقوش مرتسم کرتا ہے جن سے انسان کو زندگی کی تعمیر، سیرت کی تشکیل اور اخلاق کی تکمیل میں گزرنا

پڑتا ہے، اور بچہ کے بڑے ہونے پر طاعت وامتثال اور نیکی وخیر خواہی کے جذبات والے یہ اسباق اور مثالیں، اور ایسے صالح انسان کی تشکیل کے یہ ضروری عناصر جس کا تعلق بیک وقت اللہ اور اس کے بندوں دونوں سے ہوتا ہے، اور جو اپنی دنیا وآخرت کی ذمہ داری اسی شعور اور اسی معیار سے ادا کرتا ہے، اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی یہ خصوصیت ان کی ذریت اور اولاد میں بھی منتقل ہوتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنے کلمہ کی سربلندی اور دین دنیا دونوں میں امن وسعادت کا پرچم بلند کرنے کے لئے پسند فرماتا ہے، اور جن کے اندر اللہ تعالیٰ محنت وابتلاء اور جہد ومشقت کی ایسی واضح نشانیاں دکھلاتا ہے جن سے ہر اس شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لئے منتخب کرتا ہے۔ حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام والتسلیم کی مثال ہمارے سامنے ہے جنھیں دشوار گذار گھاٹیوں اور جان لیوا امتحانات وآزمائشوں سے گذرنے کے بعد نبوت ملی، اور ان کی زندگی میں ایسے خارق عادت امور اور ایسے بہت سارے معجزے جمع ہو گئے تھے جو سب کے سب اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ یوسفؑ کی آگے چل کر بڑی شان ہوگی اور انھیں امتیازی حیثیت حاصل ہوگی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے بھائیوں پر امتیاز بخشا اور انھیں امتحان وآزمائش سے سرخ رو اور کامیاب نکالا، اور ان میں اپنی قدرت کی واضح نشانیاں رکھیں، چنانچہ ان کا قصہ اپنی آخری کتاب میں بیان فرمایا اور ایک پوری سورت کا نام ان کے نام نامی پر رکھا، اور ان کے قصہ کو علی الاطلاق اُحسن القصص بتایا۔ یہ قصہ تمام فنی محاسن اور قصصی عناصر سے مملو ہے: نحن نقص عليك أحسن القصص بما أوحينا اليك هذا القرآن وان كنت من قبله لمن الغافلين۔

یہ بھی ایک شوق انگیز اور رقت خیز قصہ ہے جو لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالیتا ہے اور جذبات وشعور کو غذا بہم پہنچاتا ہے، اور بچوں کو اپنے پڑھنے کی دعوت دیتا ہے

تاکہ وہ اس کے ذریعہ مثبت نتائج تک پہنچ سکیں، اور اپنی زندگی کے لئے ان سے عبرت اور سبق حاصل کریں، بچے ہوں، بھائی ہوں، بیٹے ہوں، چھوٹے اور بڑے، مصیبت کے مارے اور امن وعافیت والے، قائدین وحکام، داعی اور مربی سب کے لئے اس میں سبق موجود ہے، دیکھئے حضرت مولانا کس طرح اس بہترین قصہ کی ابتداء فرماتے ہیں۔

''یوسفؑ ایک چھوٹے بچے تھے، ان کے گیارہ بھائی تھے، اور یوسفؑ ایک خوبصورت بچے تھے، یوسفؑ ایک ذہین بچے تھے، ان کے والد حضرت یعقوبؑ انھیں ان کے تمام بھائیوں سے زیادہ چاہتے تھے، ایک رات یوسفؑ نے ایک عجیب خواب دیکھا، انھوں نے گیارہ ستارے دیکھے، اور سورج اور چاند دیکھا، سب ان کو سجدہ کر رہے تھے، ننھے یوسف کو بہت تعجب ہوا، ان کی سمجھ میں یہ خواب نہیں آیا کہ ستارے اور سورج اور چاند کسی آدمی کو کیسے سجدہ کر سکتے ہیں؟ ننھے یوسفؑ اپنے والد یعقوب کے پاس گئے اور ان سے یہ عجیب خواب بیان کیا: عرض کیا: ابا جان! میں نے گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ یعقوبؑ نبی تھے، یعقوبؑ اس خواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا: یوسف! اللہ تمہیں برکت دے، تمہاری بڑی اعلیٰ شان ہوگی، یہ خواب علم نبوت کی بشارت ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے دادا اسحاقؑ پر یہ انعام کر چکا ہے، اور وہ تم پر بھی یہ انعام کرے گا، اور خاندان یعقوب پر بھی یہ انعام کرے گا، اور یعقوبؑ بوڑھے آدمی تھے، اور لوگوں کی طبائع اور فطرت سے واقف تھے، اور جانتے تھے کہ شیطان کس طرح لوگوں پر غالب آتا ہے؟ اور شیطان کس طرح انسانوں سے کھیلتا ہے؟ چنانچہ انھوں نے فرمایا: میرے بیٹے! تم اپنے بھائیوں میں سے کسی کو یہ خواب مت بتلانا، ورنہ وہ تم سے حسد کرنے لگیں گے اور تمہارے دشمن ہو جائیں گے''۔

حضرت مولاناؒ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کی ان کے بھائیوں کے حسد کی روشنی میں تشریح کرتے ہیں اور اس کی پوری تفصیل بیان کرتے ہیں۔

اس بڑے حسد نے انھیں یوسفؑ کی زندگی کنویں میں ڈال کر ختم کرنے کی کوشش پر آمادہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ مختلف حکمتیں اور الگ الگ معاملات ہیں، چنانچہ وہی یوسفؑ جنھیں کنویں کی گہرائیوں میں ڈال دیا گیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے بادشاہ مصر کے دربار میں جا پہنچتے ہیں، اور اس کا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں جب کہ پہلے اس کے نزدیک آپ متہم تھے، اور پھر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ آپ مصر کے خزانوں کے محافظ بنیں، اور زمام اقتدار آپ کے ہاتھوں میں آئے، اور پھر تاریخ اپنے کو دہراتی ہے اور برادران یوسف ان کے پاس غلہ اور مدد لینے کے لئے آتے ہیں، اور اپنی ضرورت اور فاقہ کا اظہار ان سے کرتے ہیں، اور تب جا کر ان پر یہ راز فاش ہوتا ہے اور انھیں پتہ چلتا ہے کہ یہ وہی یوسف ہیں جن سے وہ حسد کرتے تھے اور جن کو انھوں نے کنویں کی گہرائی میں پھینک دیا تھا، اور پھر اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے، اور جان گئے کہ حسد کا انجام ذلت و رسوائی ہے، اور حسد کا نتیجہ حسرت و افسوس، اور اپنی غلطی کے اعتراف اور اس پر ندامت و شرمندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ انھوں نے اقرار کیا:

"خدا کی قسم اللہ نے تمہیں ہم پر ترجیح دی اور یقیناً ہم ہی خطا کار تھے"۔

اس حسین قصہ میں کئی ایسے پہلو ہیں جو بچوں کے لئے درس عبرت کے حامل ہیں، اور ان کے دل میں یہ بات بٹھاتے ہیں کہ انجام کار کامیابی، تقویٰ اور صبر سے ہی ملتی ہے، اور مظلوم کی اللہ کی طرف سے مدد ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں فرماتا ہے، اور یہ سب بچوں کی زبان اور قصہ کے اسٹائل میں بیان کیا گیا ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کو وہی مصنف، قصہ نگار یا ادیب بیان کر سکتا ہے جس کی نظر بچوں کی نفسیات، ان کے مزاج، ذہنی فضا اور عقلی تبدیلیوں پر نہایت گہری اور عمیق ہو، اور جو ان عوامل و محرکات

سے واقف ہو جو بچوں کی راہ میں آتے ہیں اور ان کے مستقبل کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، چنانچہ حضرت مولاناؒ ''قصص النبیین'' جزء اول کے مقدمہ میں مسلمان بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''میری رائے ہوئی کہ میں تمہارے اور تم جیسے مسلمان بچوں کے لئے نبیوں اور رسولوں کے قصے ایسے آسان اسلوب میں لکھوں جو تمہاری عمر اور ذوق کے مناسب ہو، چنانچہ میں نے لکھا، اور یہ ''قصص النبیین للأطفال'' کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے جو میں تمہیں ہدیہ کر رہا ہوں، اور اس میں میں نے بچوں کے اسلوب اور ان کے مزاج کی پوری رعایت کی ہے، چنانچہ اس میں کلمات اور جملوں کی تکرار، الفاظ کی سہولت اور قصہ کی تفصیل اور شرح سبھی کچھ ہے''۔

پھر اس دلچسپ کہانی والی کتاب کا دوسرا جزء شائع ہوا، جو حضرت نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کے قصوں پر مشتمل ہے، بچوں نے پہلا حصہ پڑھ لیا، اس کے اسلوب کو ہضم کرلیا، کتاب کے معانی سے استفادہ کرلیا، اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کی زندگیوں سے واقف ہوگئے، اس طرح پہلا حصہ ختم کرنے کے ساتھ ہی بچوں کا عقلی معیار کسی قدر بلند ہوا ، اور وہ اس لائق ہوگئے کہ پہلے سے کچھ بلند اسلوب میں قصہ کو سمجھ سکیں اور نئ معلومات اور نئ تاریخ حاصل کرسکیں، اور یہ جان سکیں کہ شیطان لعین کس طرح تدریجا لوگوں کو بت پرستی اور اللہ کو ناراض کرنے والے اعمال کی طرف لے جاتا ہے، مؤلفؒ دوسرے جزء کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اب ہم چھوٹے بچوں اور ان کے بڑے سرپرستوں کو ''قصص النبیین للأطفال'' کے سلسلہ کا دوسرا جزء تحفہ میں پیش کرتے ہیں، جو حضرت نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کے قصوں پر مشتمل ہے، اور انھیں قصوں کے ضمن میں بہت سے تفسیری اور تاریخی فوائد اور مخفی سوالوں کے جواب بھی آگئے ہیں، جو دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور اساتذہ کو چاہئے کہ وہ بچوں سے ان

قصوں کو بیان کرنے کا مطالبہ کریں، اور انھیں ان قصوں کو پڑھنے، ان کو مستحضر رکھنے اور انھیں دہرانے کا مکلف بنائیں، کیونکہ اس میں بہت سے فوائد کا ہم نے خود تجربہ کیا ہے“۔

یہاں ضروری ہے کہ ہم ڈاکٹر شیخ احمد شرباصی کے رائے بھی معلوم کریں جو انھوں نے دوسرے جزء پر اپنے مقدمہ میں لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

”مجھے ایک بار پھر اس مفید اسلامی سلسلہ کے دوسرے جزء پر مقدمہ لکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بھائی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو کس عمیق ایمان، مضبوط یقین، سچی دینی غیرت اور لوگوں کو اللہ کی ہدایت اور قرآنی ادب کی طرف واپس لے جانے کی زبردست خواہش سے نوازا ہے۔

اگرچہ انبیاء کے قصوں کا سلسلہ ابتداء ہندوستانی مسلمان بچوں کے لئے لکھا گیا تھا تاکہ بچپن سے ہی ان کا رشتہ ان کے دین اور ان کے قرآن کی زبان سے قائم ہو جائے، لیکن اسی طرح یہ تمام عرب ممالک میں بھی مسلمان بچوں کے سامنے رکھے جانے کے لائق ہے، تاکہ انھیں ایسی روحانی اور جذباتی غذا فراہم کرے، جو ان کو تہذیب و تربیت کا سبق سکھائے، ، ان کے اخلاق درست کرے، اور انھیں پاکیزہ ترین متاع کا توشہ دے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (اور توشہ حاصل کرو کیونکہ بہترین توشہ تقویٰ ہے، اور اے عقل والو! مجھ سے ڈرو)۔

اسلامی اور عربی ممالک کے ارباب حل وعقد اور اصحاب اقتدار کو چاہئے کہ وہ اس پاک اور خالص کاوش کی قدر کریں اور اس کی حوصلہ افزائی اور اس کی تائید اس طرح کریں کہ اسے اپنے بچوں کے لئے مطالعہ اور تہذیب وادب سکھانے والی کتابوں کے ساتھ رکھیں کیونکہ یہ کتاب مسلمان نوجوانوں کو ایک اسلامی ثقافت کے سرچشمہ پر جمع کرتی ہے، اور ان کے معاشروں اور ان کی خواہشات کو ایک دوسرے سے قریب کرتی ہے، اور ان کو اسلامی وحدت کو عملی جامہ پہناتی ہے، وہ وحدت جس کی قرآن نے دعوت دی ہے، اور رحمٰن کے ہاتھوں نے اس میں برکت رکھی ہے: مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور فرمایا: اللہ کی رسی

کوسب مضبوطی سے تھام لو، اور آپس میں پھوٹ مت پیدا کرو، اور اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم اس کے انعام سے بھائی بھائی ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے فاضل اور برادر محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو جو خوبیاں اور صلاحیتیں بخشی ہیں، جن پر شرفاء کو رشک اور اشرار کو حسد ہوتا ہے انھیں تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے لئے یہی فخر کافی ہے کہ اللہ نے انھیں ایسی کتابیں لکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے جو اعلیٰ پایہ کی، اور وسیع و عمیق ہیں، اور اکثر قارئین میں مشہور و متداول ہیں، اور مشرق و مغرب ہر جگہ پہنچی ہوئی ہیں، وہ فکر سلیم سے مزین اور بلند اسلوب اور اعلیٰ معیار کی حامل ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں توفیق مزید اس بات کی بخشی کہ اپنی آسان عبارت اور مؤثر اسلوب بیان میں قرآنی قصوں کے مقاصد کو مسلمان نئی نسل کے ذہنوں سے قریب کریں، اور یہ فضل خداوندی ہے، اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے“:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس کا تیسرا حصہ فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے قصہ پر مشتمل ہے، اور اس تاریخی قصہ میں ایمان باللہ، اس کے وعدہ پر یقین، اور فرعون کے لئے حضرت موسیٰؑ کے دست حق پر ظاہر ہونے والے معجزے اور بنو اسرائیل اور قوم فرعون کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات، ظلم و جور اور قتل و سفاکی کی شکلیں، اور ان کے برعکس نصر مبین اور مدد الٰہی جو موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے ہر لمحہ میں ان کے ساتھ رہی، اور ایسی صورتیں جس کے ذریعہ نہتے لیکن صاحب ایمان موسیٰؑ زبردست مادی طاقت اور لشکر و سپاہ رکھنے والے اور ہتھیاروں سے لیس فرعون پر غالب آئے، ان سب کی متعدد شاندار مثالیں موجود ہیں۔

یہ قصہ پرسکون، فطری، آسان، دلچسپ اور مؤثر اسلوب میں شروع ہوتا ہے، جس میں مافی الضمیر کی واضح ادائیگی، حسن و جمال اور واقعات وحادثات بیان کرنے میں بچوں کے ذہن کی رعایت اور سبھی کچھ ہے، اور بلاشبہ یہ اللہ کی طرف سے بچوں کے ذہن کو ایمان ویقین، صبر وتوکل اور قناعت وایثار کا توشہ دینے کے لئے ایک غیبی انتظام ہے، اسی کے ساتھ ساتھ زبان وبیان، تعبیر اور ادب کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

اس حصہ سے متعلق ڈاکٹر احمد شرباصیؒ کے تأثرات بہت تفصیلی تھے، جو کتاب کے ادبی، تاریخی، لغوی اور تعبیری فوائد پر مشتمل تھے، ساتھ میں اس کے مذہبی اور فکری فوائد بھی تھے، مجھے آپ اجازت دیں کہ میں اس حصہ پر ان کی آراء اور تأثرات نقل کروں جو انھوں نے مقدمہ میں بیان کئے ہیں:

''بچوں کو صحیح اور درست تعلیم دینا بڑوں اور جوانوں کو تعلیم دینے سے زیادہ مشکل اور دقت طلب کام ہے، کیونکہ جس مرحلہ میں بچہ کے اولین سبق کی تعلیم شروع ہوتی ہے وہ مرحلہ اس کی آئندہ پیش آنے والی زندگی میں اس کے ذہن، نشاط اور رجحان پر بہت دوررس اور گہرے اثرات چھوڑتا ہے، اسی لئے ماہرین تعلیم وتربیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مرحلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کریں، تاکہ اس مرحلہ میں ان کی سرگرمیاں بہتر ہوں، اس سے بھی بڑھ کر کچھ ایسے اسباب وعوامل ہیں جو ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم بچوں کی تعلیم اور انھیں عقلی اور روحانی غذا پہونچانے میں پوری طرح باخبر اور ہوشیار ہوں، ان اسباب وعوامل میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) بچہ اپنے نگرانوں اور سرپرستوں کے بارے میں سچائی، وسیع علم، وسیع معلومات اور وسیع تجربہ کا عقیدہ رکھتا ہے، چنانچہ بغیر کسی لیت ولعل اور بحث وحجت کے ان کی باتیں قبول کرلیتا اور ان کی باتوں کو نقل کرتا ہے۔

(۲) اس عمر میں بچہ جو پہلا سبق پڑھتا ہے وہ اس کے ذہن میں راسخ ہوجاتا ہے

اوراس کی ذات میں پیوست ہوجاتا ہے، اسی لئے مشہور مقولہ ہے: ''بچپن کا پڑھا ہوا پتھر کی لکیر ہوتا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بچہ کو جو کچھ سکھائیں گے وہ باقی رہے گا اور دیرپا ہوگا، اگر وہ خیر ہوا تو اس کا فائدہ باقی رہے اور اس کی منفعت دائمی ہوگی، اور اگر شر ہوا تو اس کی برائی باقی رہے اور اس کی نحوست دائمی ہوگی، اس مرحلہ میں بچہ کا سینہ خالی صندوق کی طرح ہوتا ہے بالکل رسیور جیسا جس کا باہر سے بھیجے جانے والے پیغام سے گہرا تعلق ہوتا ہے، جب باہر سے کچھ آتا ہے تو اس میں اچھی طرح پیوست ہوجاتا ہے اور پوری طرح اس میں مستحکم ہوجاتا ہے۔

اور جب صورتحال یہ ہے تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مسلم بچوں کے سامنے اس کی عقلی اور قلبی جو غذا پیش کریں اس میں انتہائی باریک بینی سے کام لیں، اور خاص طور پر اس لئے بھی کہ بچہ معلومات حاصل کرنے اور نئی نئی چیزوں سے واقفیت حاصل کرنے کا انتہائی شوقین اور حریص ہوتا ہے، تو اگر اس مرحلہ میں اس کے سامنے حق و باطل مخلوط ہوکر آئیں گے تو اس کی خواہش اور شوق کے لئے سوچنے اور غور وفکر کرنے اور انتخاب و امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑیں گے۔

یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس جرم کی اہمیت اور اس کی وسعت کا اندازہ لگائیں جو وہ لوگ کرتے ہیں جو ان بچوں کے لئے ان کی عقلی غذا نقصان دہ مواد سے بھر کر پیش کرتے ہیں، اور ان شرانگیز قصوں اور کہانیوں اور خرافاتی داستانوں سے ان کے دلوں اور فکروں کو بوجھل بنادیتے ہیں جو انھیں فکری استقامت اور ذہنی اعتدال سے نکال کر فکری بے راہ روی اور ذوقی سرکشی کی طرف لے جاتے ہیں، شائد بعض لوگ یہ تاویل کریں کہ یہ افسانے اور ناولیں خیال کو جلا بخشتے اور فطرت کو مہمیز لگاتے ہیں، لیکن یہ جو نقصان بچہ کو پہنچاتے ہیں وہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اسی کا ادنیٰ سے ادنیٰ صورت میں بھی کوئی موازنہ کیا ہی نہیں جاسکتا ہے۔

اس بات کے بہتر اور افضل ہونے میں کوئی شک نہیں کہ ہم بچہ کے سامنے ایسی عقلی اور ذہنی غذا پیش کریں جو دو خوبیوں یعنی سچائی اور جمال کی جامع ہو، تا کہ اس کی سچائی کا عنصر

ثقافت ومعرفت کا ایک عامل بنے، اوراس کے حسن وجمال والاعنصر ذہنی ترقی اور وجدان وشعور کی بلندی کا دروازہ ثابت ہو، اوراس کے لئے قرآن مجید کی پوری مدداوراس کا عظیم توشہ موجود ہے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ قرآنی قصے راہنمائی کرتے ہیں، اوریقینی خبر بہم پہونچاتے ہیں، اس کے ساتھ قرآن میں شاندار، شیریں اورشوق کو مہمیز کرنے والے قصے کے عناصر مکمل طور پر پائے جاتے ہیں، ہمارے لئے قرآنی قصوں کی صداقت، باریک بینی، پند وموعظت اور احکام وبلاغت ہی کافی ہے، اورکیا اللہ تعالیٰ کے قول کے بعد بھی کوئی قول معتبر ہوسکتا ہے؟

چند آیات ملاحظہ ہوں جن میں اللہ تعالیٰ قرآنی قصوں کی اہمیت اوران کی خصوصیت بیان فرماتے ہیں:

١۔نحن نقص عليك أحسن القصص۔

٢۔نحن نقص عليك نبأهم بالحق۔

٣۔ نقص عليهم بعلم وماكنا غائبين۔

٤۔إن الحكم إلا لله، يقص الحق وهو خير الفاصلين۔

٥۔تلك القرىٰ نقص عليك من أنبائها۔

٦۔ وكلا نقص عليك من أنبائها۔

٧۔وكلا نقص عليك من أنباء الرسل مانثبت به فؤادك۔

٨۔ كذلك نقص عليك منها قائم وحصيد۔

٩۔ ان هذا القرآن يقص عليك منها قائم وحصيد۔

١٠۔ ان هذاالقرآن يقص على بنى اسرائيل أكثر الذى هم فيه مختلفون۔

١١۔ فاقصص القصص لعلهم يتفكرون۔

١٢۔ ان هذالهو القصص الحق۔

۱۳۔لقد كان في قصصهم عبرة لأولي الألباب، ماكان حديثا يفترى، ولكن تصديق الذي بين يديه، وتفصيل كل شئي، وهدى ورحمة لقوم يؤمنون۔

ہمارے برادر محترم فاضل داعی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس حقیقت کا اچھی طرح ادراک رکھتے ہیں، اور ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مسلمان بچوں کے لئے ''قصص النبیین'' کا یہ سلسلہ جاری فرماتے ہیں، اور اس طرح اپنے دین کی خدمت کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان قصوں کے ذریعہ اپنے بہت سے اصول ومبادی اور تعلیمات کو پیش کرتے ہیں جن کا تذکرہ قصہ کے ضمن میں مناسب اور موزوں ہوتا ہے، یا جن کی روشنی قصہ کے پس منظر سے پیدا ہوتی ہے، اور اس طرح وہ مسلمان بچوں کی خدمت کرتے ہیں، کیونکہ ان کے سامنے بہترین قصہ، سچی تاریخ، خوبصورت گفتگو اور شاندار واقعات پیش کرتے ہیں، اور معلومات حاصل کرنے کے شوقین بچوں کے دل کی خواہشات پوری کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ اپنے ادبی مقام کی خدمت کرتے ہیں اگر چہ اس کا قصد نہیں کرتے، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جس طرح بڑوں کے لئے ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' اور ''الی الاسلام من جدید'' وغیرہ جیسی کتابیں اچھے اور عمدہ اسلوب میں لکھی ہیں اسی طرح انھوں نے سہل اور آسان ودلکش اسلوب میں بچوں کے لئے ''قصص النبیین'' لکھی ہے، اور بچوں کے لئے اچھا لکھنے کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لئے بھی اچھا لکھنے کی قدرت کا سامان پیش کیا ہے، یہ ایسا بلند مقام ہے جہاں تک بہت کم مؤلفین اور مصنفین پہنچ سکتے ہیں۔

مثلاً مولانا حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصہ میں بہت سی باتیں اور واقعات وحوادث بیان کرتے ہیں، جو سب کے سب بڑے دلچسپ اور مؤثر ہیں، اور سبھی مفید اور نافع ہیں، اور سبھی سچے اور حق ہیں، اپنی آسان اور صاف زبان میں سرکش فرعون کے پیدا کئے ہوئے سخت فتنہ کے دوران حضرت موسیٰ کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بیان کرتے ہیں، اور اس بلیغ

درس کو بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بے پناہ اور غیر محدود قدرت کے بہت سے پہلو سامنے لاتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی والدہ کو حکم دیا کہ وہ اپنے بچے کو سمندر میں ڈال دیں اور ان پر ذرا بھی خوف نہ کریں اور نہ غمگین ہوں، کیونکہ وہ انھیں کو لوٹا دے گا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انھیں رسول بنائے گا، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جو فرعون کے سامنے رکھا حالانکہ وہ ان کا دشمن نمبر ایک تھا، لیکن (جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے)، ان سب میں بتاتے ہیں کہ کس طرح خدائے قادر مطلق موسیٰ کو ان کی ماں کے پاس لوٹا دیتے ہیں جن کا دل موسیٰ کے سوی ہر غم سے خالی تھا، اور قریب تھا کہ وہ اس راز کو فاش کر دیتیں، اگر اللہ نے ان کا دل مضبوط نہ کر دیا ہوتا تا کہ وہ مؤمنین میں سے ہوں۔

اسی طرح موسیٰ کی قوت وطاقت کے بارے میں بھی بتلاتے ہیں کہ کس طرح وہ کنویں کا بھاری پتھر تنہا ہٹا دیتے ہیں، اور وہ کس قدر عفیف تھے کہ حضرت شعیبؑ کی لڑکی کے پیچھے چلنا اس قدر پسند نہیں فرمایا کہ کہیں ہوا سے اس کے کپڑے اڑیں اور اس کا بدن موسیٰ پر نمایاں ہو، ان میں سے ایک نے کہا: ابا جان آپ انھیں مزدور رکھ لیجئے، کیونکہ مزدوروں میں سب سے بہتر طاقتور اور امانت دار مزدور ہوتا ہے۔

اور بیان کرتے ہیں کہ کس طرح موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس گئے، اور کس طرح فرعون نے دنیا میں تکبر وسرکشی اور ظلم وجور کا بازار گرم کر رکھا تھا، اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی مدد فرمائی اور فرعون کو مغلوب ومقہور کیا، اور پھر اس جیسے سب سے بڑے سرکش اور ظالم انسان کو سیال پانی کے ذریعہ ہلاک کر دیا، اور جب آپ کا رب کسی متکبر اور ظالم وسرکش انسان کو پکڑنے پر آتا ہے تو اس کی پکڑ ایسی ہی سخت ہوتی ہے، اس کے علاوہ اور بھی دوسرے بہت سے پہلو بیان کرتے ہیں جو سب کے سب پند وموعظت اور نصیحت وعبرت پر مشتمل ہیں''۔

چوتھا حصہ حضرت شعیب، حضرت داؤد، حضرت ایوب، حضرت یونس اور حضرت زکریا

علیہم السلام کے قصے سے شروع ہو کر حضرت عیسیٰؑ کے قصہ پر ختم ہوتا ہے۔ اور یہ سارے قصے خوبصورت، سہل اور دلکش و دلچسپ اسلوب میں بیان ہوئے ہیں، اگر چہ اس حصہ کا معیار سابقہ حصوں سے کسی قدر اونچا ہے، لیکن بچے کتاب کے مضامین سمجھنے اور لغت، تعبیر اور ادب و بیان سے استفادہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں محسوس کرتے، اسی چوتھے حصہ نے بچوں کے لئے خاتم الانبیاء اور سب سے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک پہنچنے اور آپ کی پاک اور عطر بیز سیرت آسان و سہل اور دلچسپ اسلوب میں پڑھنے کا راستہ ہموار کیا، اس عظیم الشان کام کی اہمیت اور قصہ کی کتابوں میں جنھیں بچوں کے لئے لکھنے والوں نے اپنے ادیبانہ قلم سے لکھا ہے، اس کی نافعیت اور بچوں کی دینی اور ایمانی غذا بہم پہنچانے میں اس کے مفید ہونے کی گواہی مشہور اسلامی محقق اور عظیم داعی جناب سید قطب شہید نے تیسرے جزء پر اپنے مقدمہ میں دی ہے، کیونکہ یہ کتابیں نبیوں کے قصے اور اسلامی تاریخی حکایات کے میدان میں اعلیٰ مقام کی حامل ہیں، اور ایسی ادبی اور تربیتی خصوصیات میں ممتاز ہیں جو آپ کے علاوہ اور کسی کے یہاں اتنی عمومیت اور ہمہ گیری کے ساتھ نہیں پائی جاتیں، سید قطب شہید لکھتے ہیں۔

''قصص النبیین للأطفال حجم میں چھوٹے ہونے کے باوجود ایک عظیم الشان کام ہے، جو دعوت اسلامی کے میدان میں سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے فاضل دوستوں کے کام میں اضافہ کرتا ہے، کیونکہ اسلام کا اپنی اصلی اور صاف صورت میں صرف بڑوں تک ہی پہنچنا ضروری نہیں بلکہ بچوں کے قلوب اس غذا کے زیادہ محتاج ہیں، تا کہ جب وہ بڑے ہوں تو ایمان کا مزہ ان کے اندر ہو، اور اس کا نور ان کے قلوب میں ہو، اور اس کی بشاشت ان کی روح میں ہو اور قصے ہی وہ اولین بنیاد ہیں جن کے لئے یہ معصوم اور ننھے قلوب کھلتے ہیں۔

یہ چھوٹی سی کتاب اگر چہ چھوٹوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ بہت سے بڑوں کو بھی اس کے پڑھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں کو ان کی تعلیم نے جس پر استعماری غلبہ اور مشینری کا قبضہ ہے، اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ قرآنی قصوں،

ان کے عمیق مقاصد اور مؤثر تہذیبی اور ایمانی فضا کے بارے میں کچھ جانیں، جیسا کہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

میں نے کثرت سے وہ کتابیں پڑھیں ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئیں اور جن میں انبیاء کرام کی حکایات وقصص بھی شامل ہیں خود ایک سلسلہ کتب کی ترتیب میں میں نے شرکت کی جو ''القصص الدینی للأطفال'' کے نام مصر میں مرتب ہوا اور جس کے لئے مواد قرآن مجید سے اخذ کیا گیا تھا لیکن میں کسی تکلف اور تملق کے بغیر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ''قصص النبیین للأطفال'' کے مصنف کا کام (جس کا ایک نمونہ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں نظر آتا ہے) ہمارے وضع کئے ہوئے سلسلہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل ہے اس لئے کہ اس میں ایسی لطیف رہنمائیاں، قصے کے مقاصد پر روشنی ڈالنے والی تشریحات اور بین السطور میں ایسے اشارات آگئے ہیں جو بیش قیمت ایمانی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں''۔

اب ہم ''قصص النبیین للأطفال'' کے پانچویں حصہ پر گفتگو کرتے ہیں جو خاص سید الأنبیاء امام المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ہے، اور اسی زریں سلسلہ پر اپنی معلومات کو ختم کر لیتے ہیں، اور اس کے ذریعہ ان کے لئے غلط راستوں کے درمیان سے صراط مستقیم ظاہر ہوتا ہے، ان کی ذہنیت پختہ اور معلومات وسیع ہو جاتی ہیں، اور ان کے پاس عربی کلمات کا ایک قیمتی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے جو ان کے آفاق کو وسیع کرتا اور عربی زبان اور ادبی اسلوب میں اپنے افکار وخیالات بیان کرنے کے لئے ان کی فطرت کو جلا بخشتا ہے، اسی لئے اس پانچویں حصہ کا لغوی اور ادبی معیار ابتدائی حصوں سے اونچا ہے، اور ادیب کی یہی شان ہوتی ہے کہ جو بچوں کی فطرت اور مراہقین کی ذہنیت سے واقف ہو، چنانچہ اس کا اولین پیمانہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتا جس سے وہ بچوں کی ذہنی سطح کا اندازہ لگاتا ہے، اور نہ اس کے بے شمار تجربات اس کا ساتھ چھوڑتے ہیں جن سے وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے دوران گذرتا ہے۔

اسی بنیاد پر یہ پانچواں حصہ اس سلسلہ کا خاتم اور طفولت کے مرحلہ سے گذر کر مراہقت اور جوانی کے مرحلہ کی طرف منتقل ہونے والے بچوں کو انبیاء اور رسولوں کی تاریخ سے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں عقلی، ادبی، لغوی، اور تاریخی غذا فراہم کرنے والا ثابت ہوا، اور پھر نتیجہ کے طور پر یہ ان کے اخلاقی ڈھانچہ کو محبت اور ایمان کے عناصر سے مضبوط کرتا ہے، اور انھیں اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے روشن مستقبل کی تعمیر پر آمادہ کرتا ہے، یہ وہ اثرات ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ اپنے پڑھنے والوں اور استفادہ کرنے والوں کے دلوں پر اپنا نقش چھوڑتا ہے، خود مؤلف اس حصہ کی ادبی، تاریخی اور تربیتی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے اس کتاب کی تالیف میں سیرت ابن ہشام کی تلخیص پر اعتماد کیا ہے۔ جو اس وقت موجود سیرت کی مطبوعہ اور متداول کتابوں میں قدیم ترین اور دلوں پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی کتاب ہے۔ ساتھ میں بعض قدیم مراجع اور صحاح ستہ سے بھی مدد لی گئی ہے، اور مؤلف نے قاری کے لئے صفحہ نمبر اور اڈیشن کی تعین کے ساتھ ان مراجع کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ یہ کتاب نوخیز بچوں کے لئے لکھی گئی ہے نہ کہ تحقیقی کام کرنے والوں اور ریسرچ اسکالروں کے لئے۔ نیز اس میں صرف نصوص اور روایات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ علمی تحقیقات، فلسفیانہ موشگایوں اور اجنبی شہادتوں سے احتراز کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے قاری کے لئے سیرت کی روح اپنے اندر اتارنے اور اس کے جمال سے لطف اندوز ہونے میں خلل پڑے گا، اور اس لئے بھی کہ یہ مباحث سیرت نبوی پر بڑی کتاب کا موضوع ہیں، جو وسیع ثقافت والوں اور عقلی وعلمی صلاحیت میں فائق لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے، جنھیں عصری کلامی سوالات اور تقابلی مطالعہ سے سابقہ پڑ رہا ہے۔

اور میں نے اس کتاب میں بچوں کے اسلوب اور ان کے مزاج کی رعایت، کلمات اور جملوں کی تکرار، آسان الفاظ کا انتخاب اور قصہ کو پھیلا کر بیان کرنے کی پابندی نہیں کی

ہے، جس کی پابندی ''قصص النبیین للأ طفال'' کے اولین حصوں میں کی ہے کیونکہ اب یہ ننھے منے قاری جوان ہو چکے ہیں اور اپنی لغوی ثقافتی اور عقلی مدارج میں ترقی کر چکے ہیں، اس طرح اس علمی اور عقلی غذا کو ہضم کرنے اور سب سے معزز نبی اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی زندگی سے متعلق اس شاندار قصہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ان کے اندر پیدا ہو چکی ہے۔

اس طرح یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید سے بڑوں اور چھوٹوں کے لئے لکھی گئی اور سیرت کی کتابوں کے درمیان بیچ کی کڑی ثابت ہوئی، اب یہ اس لائق ہے کہ اسے مراہقت کی عمر کے چھوٹے بچے بھی اپنے مدرسوں میں اور متوسط صلاحیت کے بڑے حضرات بھی اپنی لائبریریوں اور گھروں میں پڑھ سکتے ہیں، اور اسے غیر مسلم حضرات کی خدمت میں پیش کیا جاسکتا ہے، دوسری زبانوں میں بھی اسے منتقل کیا جاسکتا ہے، اس میں سیرت کا خلاصہ اور اس کا نچوڑ آ گیا ہے، اسی طرح سیرت کے شاندار واقعات وحوادثات، اولین اسلامی دعوت کی تاریخ، اس کی فتوحات اور کامیابیاں، نبوی تربیت کے عجیب وعمدہ نمونے اور معجزے سب اس میں آگئے ہیں، اب یہ کتاب ایک مکمل مدرسہ ہے جس میں طالب علم ایمان وحنان کی فضا میں جیتا اور پروان چڑھتا اور عطر بیز اور سدا بہار پھولوں کی خوشبو سے مشام جان کو معطر کرتا ہے، اور اس سے وہ توشہ اور زادراہ حاصل کرتا ہے جو زندگی بھر اس کے ساتھ رہتا ہے اور جس کی روشنی میں جیتا ہے اور وہ ہتھیار حاصل کرتا ہے جس سے اپنا اور اپنے ایمان کا دفاع کرتا ہے، اور وہ پیغام لیتا ہے جسے لے کے دنیا اور اقوام دنیا کے پاس جاتا ہے''۔

اسلامی ادب کے قافلہ سالار کی کاوشیں بچوں کے اس مفید سلسلہ پر ہی آکر ختم نہیں ہوگئیں بلکہ آپ نے اس کے بعد بچوں کی تربیتی ادب اور ایمانی واخلاقی فتوحات وحوصلہ مندی پران کی نشوونما کرنے میں اور زیادہ اہتمام اور توجہ کا اظہار کیا، اور اگلے مرحلہ کے لئے ان بچوں کے واسطے جواب مراہقت کی عمر میں داخل ہو چکے تھے، دوسرا سلسلہ شروع فرمایا، اورانھیں

دوسری مرغن ادبی غذا کی ضرورت بھی تھی، تا کہ ان کے لئے ترقی کرنا اور ادب اسلامی کے مواد اور اس کے پختہ وخوبصورت اسلوب سے اپنے ادبی ذوق کو تسکین دینا ممکن ہو، کیونکہ ایسا اسلوب ان ادبی کاوشوں میں نہیں ملتا تھا جو بعض اسلامی عرب ممالک میں بچوں کی تربیت کے واسطے کی گئی تھیں، اس لئے انھوں نے ان تمام تربیتی اور توجیہی پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا تھا جن کی ایک نوخیز بچہ کو اپنی عائلی، مدرسی، تمدنی اور معاشرتی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، اور جو جاننا چاہتا ہے کہ مذہب نے اس کی زندگی کے تمام امور میں کیا رہنمائی کی ہے؟

یہ خاص طور سے بچوں کے ادب میں ایک خلا تھا کیونکہ بچہ کی ادبی اور لغوی تربیت میں دین کا حصہ بہت کم تھا، حالانکہ عربی زبان ہی دین کی زبان ہے، لیکن وہ دینی تعلیمات سے الگ تھلگ تھی، اور دنیاوی معاملات اور تمدنی معلومات میں سمٹ کر رہ گئی تھی، اس بدنما عیب اور معیوب نقص کو اس سلسلہ کے مؤلف نے محسوس کیا، چنانچہ انھوں نے اسلامی مدراس میں عربی زبان کی تعلیم کے لئے ''القرأة الراشدہ'' کا سلسلہ شروع کیا، اور اس کتاب کے تین حصوں میں اس سلسلہ کو مکمل کیا، اور ہر حصہ اپنے لغوی اور ادبی معیار میں بچوں کی ادبی ترقی اور ان کی مذہبی ثقافت میں وسعت کو دیکھتے ہوئے پہلے سے فائق ہے۔

کتاب کے پہلے حصہ کے مقدمہ میں اس سلسلہ کی تالیف کے اسباب اور اس میں جن نقاط کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مؤلف کتاب فرماتے ہیں:

> ''اس زمانہ کا اہم ترین فرض یہ تھا کہ علماء اور دینی تعلیم کے ماہرین ایک ایسے حکیمانہ اور صحیح نصاب تعلیم وضع کرنے پر توجہ دیں جو اپنی سہولت وآسانی، وقت کی بچت اور بچوں کے ذہن کی رعایت کرنے میں غیر دینی نصاب ہائے تعلیم سے ممتاز ہو، اور دینی واخلاقی تربیت اور تہذیب نفس میں بھی ان سے ممتاز ہو، نیز طالب علم کو عالمی، تاریخی اور عام معلومات سے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم کرتا ہو، اور جو تعلیم کے جدید ترین اصول ومبادی اور انتخاب پر مبنی ہو۔

یہ اہم علمی اور دینی کام جس کی اہمیت مسلمانوں کی زندگی اور دینی تعلیم کے مستقبل میں مسلم ہے۔ اس کا مستحق تھا کہ اس کے لئے علماء، بڑے اساتذہ اور بڑے اداروں کے ذمہ داروں کی کمیٹیاں بنائی جاتیں، اور وہ اس سلسلہ میں اپنے اوقات اور اپنی کوششوں کا بڑا حصہ صرف کرتے، اور اپنی بہت سی تعلیمی اور سیاسی مشغولیات پر اس کو مقدم رکھتے، کیونکہ یہ اہم اور پیچیدہ کام افراد کے بس کا نہیں ہے، اس کے لئے تو بڑی طاقتور جماعت چاہئے لیکن افسوس کہ علماء نے اس سنجیدہ کام پر توجہ نہیں دی جو طویل صبر، شدید محنت، وسیع انتخاب اور قوی مدد کا متقاضی ہے، پھر اس میں خطرات زیادہ، نتیجہ کی رفتار بہت سست اور شہرت بہت کم ہے۔

اس کام کی اہمیت اور اس کی عظمت، اور مذہبی تعلیم کے نظام کو محیط خطرات جو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں، اور پھر باصلاحیت لوگوں کی دوسرے کاموں میں مشغولیت جو ان کے نزدیک اس سے بھی زیادہ اہم ہیں، ان سب نے مل کر ان کتابوں کے مؤلف کو آمادہ کیا کہ وہ اس جہاد کے راستہ کا ایک جانباز سپاہی بنے، اور دینی تعلیم کی مشینری کا ایک چھوٹا سا پرزہ ثابت ہو، اور وہ اس محبوب زبان اور جن اساتذہ نے اس زبان کی محبت اس کے اندر پیدا کی اور اس کے لئے اس زبان کو آسان بنایا، ان کے کچھ حقوق ادا کرے، اور اپنی صحت کی کمزوری، افکار و خیالات کے ہجوم، مشغولیات اور اسفار کی کثرت کے باوجود اس عظیم کام کا کوئی جزء اللہ کی توفیق واعانت سے پورا کر سکے"۔

اس سلسلہ میں مؤلف نے سب سے پہلے مختارات کا مجموعہ تیار کیا، جو اسلامی عربی ادب کے نمونے اپنے تمام مظاہر، حسن و جمال اور پہلے اسلامی دور سے لے کر چودہویں صدی ہجری تک مختلف ادبی، تاریخی، اور تہذیبی شکلوں میں پیش کرتا ہے، اس میں عربی ادب کے مختلف رنگ و آہنگ بھی ہیں، آسمانی وحی اور نبوی بلاغت کے شاہکار بھی ہیں، عربی

کے سب سے ترقی یافتہ دور کے مشاہیر عرب خطباء کے خطبات کے نمونے بھی ہیں، روایات، قصص اور رسائل بھی ہیں، کتابیں، مناقشے، محاورات، اسفار اور عام گھریلو باتیں بھی ہیں، متانت سنجیدگی، حکمت ودانائی بھی، اور مزاحیہ ادب کے نمونے اور تفریحی چیزیں بھی ہیں، اس مجموعہ کو بعض علمی حلقوں اور اداروں نے تاخیر سے سہی- لیکن قبول کیا اور اپنے یہاں کے نصاب تعلیم میں داخل کیا۔

پھر مؤلف نے دیکھا کہ یہ سب قرأت راشدۃ کے سلسلہ کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتے جو لغوی اور ادبی مواد پر مشتمل ہیں، اور ہندوستانی مسلمان بچوں کے ذوق سے خصوصا اور اسلامی ممالک کے بچوں کے ذوق سے عموماً ہم آہنگ تدریجی اسلوب میں متنوع ہیں، چنانچہ مؤلف نے انھیں کئی اجزاء میں تقسیم کردیا، اور اس بات کی کوشش کی کہ:

(۱) زبان دینی اور ادبی ہو، اور اس پر کتاب وسنت کے ادبی جمال کی چھاپ ہو۔

(۲) عصری موضوعات کے لئے جدید کلمات کا استعمال ہو جن کی اصل عربی اور صحیح اشتقاق موجود ہو، اس سلسلہ میں مؤلف نے اکثر و بیشتر فواد اول اکیڈمی برائے عربی زبان کی تجاویز اور قراردادوں پر اعتماد کیا ہے، تاکہ طالب علم عجمی یا دخیل کلمات استعمال کرنے پر مجبور نہ ہو، یا عصری تقریبات کے مواقع پر اس کی زبان گنگ نہ ہو۔

(۳) عربی مفردات کی تکرار تاکہ طالب علم کو ان کی مشق ہو جائے۔

(۴) موضوعات اور مواد کا تنوع تاکہ طالب علم کی دلچسپی برقرار رہے اور علمی فائدے سے دلچسپ اور مزیدار گفتگو کی طرف، اور علمی درس سے تاریخی حکایت کی طرف اور نثر سے شاعری یا ترانہ کی طرف منتقل ہوتا رہے۔

(۵) حدیث شریف میں وارد حکایات کو بامقصد قصوں کے اسلوب میں آسان زبان میں تعلیم دیں۔

(٦) تہذیبی، اخلاقی اسباق جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی اخلاق کی تعلیم دیں۔

(۷) اسباق میں ماثور ادعیہ اور دینی آداب کی ایسی آمیزش کہ طالب علم یہ نہ محسوس کرے کہ یہ چیز اوپر سے لادی جارہی ہے، بلکہ وہ ان دعاؤں کو سبق اور قصوں کے ضمن میں ہی از خود یاد کر لے۔

(۸) پوری کتاب میں جاری وساری دینی روح کہ اس کو کتاب سے الگ کرنا ممکن نہ ہو، اور یہ روح اسباق اور کائناتی طبعی، حیوانی، نباتاتی اور جدید اختراعات سے متعلق سبھی اسباق میں عام ہو۔

مزید براں حضرت مولاناؒ نے اولین اسلامی تاریخ کی روشنی میں بہت سے دینی قصے بھی لکھے ہیں، چنانچہ آپؒ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے بارے میں ایسے قصے لکھے ہیں جن کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے قوی تعلق والی ان کی ایمانی زندگی، اللہ کے وعدہ، اس کی مدد ونصرت اور عظیم وبے پناہ قدرت پر مکمل اعتماد سے ہے، اور یہ سب شیریں وآسان زبان اور خوبصورت قصصی اسلوب میں ہے، جو بچوں کو ایمان اور محبت کے گہرے سبق سکھاتا ہے، اور دین کامل سے انھیں قریب کرتا ہے، ان کے اندر زبان اور تعبیر کی مشق ومہارت پیدا کرتا ہے، اور ان سب کے بہت سے ادبی، دینی، ایمانی اور تربیتی فوائد ہیں جو جاننے والے پر مخفی نہیں ہیں۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی ڈاکٹر احمد شرباصیؒ کے اعتراف کا ایک چھوٹا سا اقتباس نقل کروں جس میں انھوں نے اس اسلوب کی پیروی اور تقلید کرنے اور ادب وقلم کا خراج ادا کرنے کی دعوت دی ہے:

”اس سلسلہ پر جو بات صادق آتی ہے وہ یہ کہ یہ ایسے نوادرات ہیں جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مسلمان بچوں کو تحفتاً پیش کررہے ہیں، وہ ان میں عقلوں کی غذا اور دلوں کی روشنی پاتے ہیں اور بڑوں پر اس سلسلہ کا یہ حق ہے کہ وہ بھی انھیں پڑھیں، اور خاص طور سے وہ لوگ جن کو قرآنی قصوں سے کوئی واسطہ نہیں پڑا ہے، یہ قصے انھیں تاریخی واقعات اور انبیاء کرام کے حالات سے متعلق روشن، صاف واضح اور مؤثر نمونے عطا کریں گے، اور

اس سلسلہ کا حق یہ ہے کہ یہاں وہاں تمام اسلامی ممالک کے ماہرین تعلیم وتربیت اس میں غور وفکر کریں، اس میں انھیں ایسی چیزیں ملیں گی جنھیں وہ ان بچوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جو اپنی بنیادی تعلیم میں ایسے قصصی ادبی توشہ پر اعتماد کرتے ہیں جس میں عموماً اسلامی رنگ نہیں ملتا، اور فکری اور بیانی ماہرین پر اس سلسلہ کا مزید حق یہ ہے کہ ان کے اندر اقتداء اور تقلیدی روح بیدار ہو، اور وہ بھی مسلمان بچوں کے لئے مختلف رنگ کے شوق انگیز، سچے ایمانی قصے لکھیں، حضرت مولاناؒ نے ان کے لئے راستہ کھول دیا ہے، انھیں اس کا اور اس پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا، اور ہر عمل کرنے والے کو اس کا حصہ الگ پورا پورا اجر وثواب ملے گا، اس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوگی'' ان الله لا يضيع أجر من أحسن عملا"۔

میرے خیال میں اب وہ وقت آ گیا ہے کہ دعوت وفکر اسلامی اور ادب وبیان کی فوجیں اسلام کا وہ ٹیکس ادا کریں جو ان کی گردن اور ان کی صلاحیتوں پر قرض ہے، اور وہ فرزندان ملت اسلامیہ کے لئے مختلف رنگ کے دلکش دینی اور صحیح ادب تخلیق کریں، اور مؤمن قصے، مؤمن ادب اور مؤمن فن کے ذریعہ بچوں اور جوانوں کے سینوں میں مؤمنانہ ثقافت کے چشمے جاری کریں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انھیں یہ ٹیکس ادا کرنے کی (بغیر اس کے کہ ان کے اور جمال فنی کے مختلف شکلوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو) قدرت حاصل ہے، کیونکہ جن چیزوں سے برے لطف اندوز ہوتے ہیں ان سے اچھے لوگ بھی متمتع ہو سکتے ہیں، مزید برآں اللہ کی رضا بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بہ میدان درنمی آید سواراں راچہ شد

☆☆☆

اردو زبان کے سوانحی ادب کی تشکیل میں

''پرانے چراغ مؤلفہ حضرت مفکر اسلام'' کا حصہ

سیر و تواریخ اور تراجم رجال کی کتابوں میں عام طور سے جو طرز تحریر رائج ہے وہ ایک خشک تاریخی مضمون کی حیثیت سے معروف اور مقبول ہے، اس طرز تحریر میں بڑی یکسانیت ہوتی ہے، اس لئے کہ کسی بھی شخصیت کے حالات بیان کرنے کے لئے چند مشترک اصطلاحات ہیں اور ان کو ہم بلا تکلف استعمال کرتے ہیں، مثلاً تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم و تربیت، خاندان اور ماحول، خاندانی روایات، اعلیٰ تعلیم، مشغلہ، زندگی کے حالات، عقائد و افکار، مسائل و معاملات، اسفار و مشاہدات، اولاد و اسفار، اہل تعلق، میدان عمل، کارہائے نمایاں، تاریخ وفات، اور وفات کے بعد کے اثرات وغیرہ۔

ان مشترک احوال کی بنا پر مختلف شخصیات کے لئے تقریباً ایک ہی زبان اور یکساں اسلوب بیان اختیار کیا جاتا ہے، اور سوائے تاریخوں اور زندگی کے بعض معاملات اور اعداد و شمار میں کچھ فرق ظاہر کرنے کے سب کے لئے ایک ہی طرز اور زبان استعمال کرنا کچھ معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے، گویا ایک ہی ٹوپی تھوڑے فرق کے ساتھ سب کے سروں پر فٹ کردی جاتی ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں عربی زبان کے مشہور سوانح نگار علامہ شمس الدین اُحمد بن خلکان اس موضوع کے امام تسلیم کئے جانے کے قابل ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''وفیات الأعیان و أبناء الزمان'' میں جن شخصیات کا تذکرہ کیا ہے، ان کی امتیازی حیثیت اور ان کے مراتب کمال کو اپنے سنجیدہ قلم سے اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ ہر شخصیت کی امتیازی

خصوصیت کوحقیقت پسندی کے دائرہ میں رکھتے ہوئے اس کواس کا صحیح مقام عطا کیا ہے، اور نہایت باریک بینی کے ساتھ اس کے مقام کو واضح کیا ہے: یہ سیرت نگاری کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو بہت کم سیر وسوانح کے موضوع میں اس فنی مہارت کے ساتھ پائی جاتی ہے، اس کتاب میں مؤلف کا حسنِ ذوق اور ممتاز طرز بیان ظاہر ہوتا ہے بلکہ ان کی وسیع واقفیت اور باریک بینی کا پتہ چلتا ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سیر وسوانح کی تدوین کے موضوع پر اپنی بیش قیمت رائے کا اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بہت سے ادباء اور انشاء پرداز کسی شخصیت کی ترجمانی اور اس کی زندگی اور کاموں کے تعارف کرانے کے طرز نگارش کو نہایت آسان تصور کرتے ہیں، چنانچہ وہ معروف شخصیتوں کے تذکرہ میں بڑی سخاوت کے ساتھ ان کے القاب وآداب کے ساتھ ان خصوصیات وامتیازات کا ڈھیر لگادیتے ہیں، اور تمام شخصیتوں کے لئے قدر مشترک کے طور پر ایسے تعریفی کلمات اور عقیدت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہر عالم وادیب اور ہر صاحب نظر ودانشور، ہر بزرگ اور عالی مرتبت، ہر حاکم وقائد کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شخصیتیں بہت تھوڑے فرق کے ساتھ ایک ہی قالب سے ڈھل کر نکلی ہیں، اور ان شخصیتوں کے الگ الگ اوصاف اور خصوصیات نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کا تعارف یا کسی انسان کے حالات زندگی کا بیان کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس موضوع کو اختیار کرنے والے اور سیر وسوانح کی کتابوں کی تصنیف میں مشغول ہونے والے شخص کے لئے چند اہم نقاط (POINT) کو پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے:۔

(۱) جس شخصیت کا تعارف کرایا جارہا ہے یا تو اس سے ذاتی اور قریبی تعلقات ہوں اور اس کے ساتھ وقت گذارنے کا کچھ موقع ملا ہو، اگر ایسا نہ ہو تو کم ازکم اس شخصیت

کے جملہ حالات غیر جانبدار مطالعہ اور مختلف ذرائع سے تلاش وجستجو کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہوں۔

(۲) طرز ادا و نگارش پر پوری طاقت حاصل ہو، اور ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کا قابل لحاظ ذخیرہ صاحب نگارش کے پاس موجود ہو۔

(۳) نہایت باریکی، امانت داری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس شخصیت کو وہی لباس پہنایا جائے جو اس کے قد و قامت کے عین مطابق ہو۔

(۴) کسی شخص کی زندگی کے حالات لکھتے وقت نہایت بے لوث جذبہ، اور مخلصانہ نیت کارفرما ہو، اور فکر و ضمیر کے ساتھ وہ پوری طرح ہم آہنگ ہو، اس لئے کہ کوئی تعارفی تحریر اگر ان عناصر سے خالی ہو تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی تصویر یا نقش و نگار محض تجارتی جذبہ سے تیار کیا جائے اور اس کا تیار کرنے والا کرایہ پر حاصل کیا ہوا انسان معلوم ہوتا ہو"۔

(۵) اہل ادب و دانش کو اچھی طرح معلوم ہے کہ الفاظ کا ایک درجہ حرارت و برودت ہوتا ہے جسے الفاظ کا (Temperature) کہنا زیادہ صحیح ہوگا، چنانچہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے الفاظ کے استعمال میں اور تعارفی کلمات میں اس کا لحاظ رکھنا بہت زیادہ اہم اور ضروری ہے، اسی لئے (High Temperature) والے الفاظ کو (Normal Temperatue) والے الفاظ کی جگہ پر استعمال کرنا کسی طرح صحیح نہیں، چہ جائیکہ (High Temperature) والے الفاظ کو (Temperature less) کی جگہ استعمال کیا جائے، اسی طرح نہایت ہی بھاری بھرکم الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہوں، اس سلسلہ میں اشکال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تعارفی شخصیت جامعیت اور کمال کا درجہ رکھتی ہو، اور اس کے سب سے اہم پہلو اور مرتبہ کو پیش کرنے میں دشواری پیش آرہی ہو، لیکن یہ مسئلہ اس سوانح نگار کے لئے ذرا بھی دشوار نہیں ہوتا جو زیر تعارف شخصیت کے تمام پہلوؤں سے اس کی تصنیفات سے اور اس کے بارے میں اس کے معاصرین کی رائے سے پورے طور پر واقف ہو"۔

حضرت مولاناؒ نے ''پرانے چراغ'' کو مرتب کرتے وقت ان تمام مذکورہ گوشوں اور نزاکتوں کو پیش نظر رکھا ہے اور مختلف سطح اور مرتبہ کی شخصیتوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ ان کی شخصیت کا پورا سراپا اس کے حقیقی نقوش اور اپنے ذاتی تأثرات کا ذکر ایسے مؤثر اور خوبصورت انداز میں کرتے ہیں جس کا صحیح اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جو سوانح نگاری کی روح اور شخصیت کی سچی تصویر پیش کرنے کا ذوق رکھتے ہوں۔

''پرانے چراغ'' اگرچہ معاصر شخصیوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے لیکن اس میں مشاہیر علماء ومصنفین، اساتذہ اور شیوخ وقت، احباب اور رفقائے کار اور شہرۂ آفاق شخصیات کے ساتھ ایسے باکمال اور اہل قلوب جو بڑی حد تک پردۂ خفا میں مستور تھے کا تذکرہ واقعاتی انداز میں اس طرح کیا گیا ہے کہ اس میں ادب وانشاء کی لذت وچاشنی ہر جہت سے نمایاں ہے۔

اس صورت حال کا ذکر مصنف علیہ الرحمہ نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''یہ درحقیقت نقوش وتأثرات کا مجموعہ ہے جو اپنی یاد، ذاتی تجربات وواقعات اور خطوط اور ذاتی تحریروں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے، اس کی خوبی کہئے یا عیب کہ اس میں اپنی زندگی کے واقعات وتجربات، اور اپنے دل کے احساسات وتأثرات اور ان شخصیتوں کی زندگی کے واقعات اور ان کے قلبی تأثرات واحساسات ایسا گھل مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا اور ایک کی مدد کے بغیر دوسرے سے آشنا ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن اس سے ان شخصیتوں کے بہت سے ایسے خط وخال نمایاں ہو گئے ہیں، جو روایتی سوانح عمریوں اور رسمی تاریخوں میں عام طور پر نمایاں نہیں ہوئے، اس لئے سوانح نگاروں اور تاریخ نویسوں کو بھی ان میں زندگی کی بہت سی گمشدہ کڑیاں، چہرہ کا اتار چڑھاؤ، زندگی کے نشیب وفراز، دل کی دھڑکنیں اور اقبال کے الفاظ میں ''دلوں کی تپش اور شبوں کا گداز'' ملے گا جو بڑے ضخیم تذکروں اور پُر جلال تاریخوں میں نہیں ملتا،

اور یہی ان مضامین کی اصل قدر و قیمت ہے۔(۱)

اگر یہ کتاب اپنے تذکروں میں اس امتیازی صفت کی حامل نہ ہوتی اور اس کے عظیم مصنف کا واقعاتی تجزیہ پورے ادبی جلال و کمال کے ساتھ اس میں نمایاں نہ ہوتا تو اردو زبان کے سوانحی ادب کی تشکیل میں اس کا یہ نمایاں حصہ نہ ہوتا، اور ہمیں اس کتاب کو سوانح اور تذکرہ نگاری کے موضوع پر ایک بڑا اضافہ قرار دینے کی جرأت نہ ہوتی، لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کتاب کے ذریعہ سوانح نگاری کے نئے راستے کھلتے ہیں اور تاریخ کو ادب کے پیرایۂ بیان میں پیش کرنے اور کتاب سے استفادہ کرنے والے قارئین کے لئے ان کے ذوق کی تسکین ان کی دلچسپی کا سامان فراہم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی معلومات میں ایک وقیع اضافہ ہوتا ہے اور سادگی و پُرکاری کا جامع طرز تعبیر اور اسلوب بیان قاری کے دل و دماغ کو زندگی اور تازگی بخشتا ہے، اور اس کے اندر زندگی کی ایک روح بیدار ہوتی ہے۔

ان خیالات کی تائید مصنف علیہ الرحمہ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''یوں تو اس مجموعہ میں مختلف ذوق و رجحان رکھنے والے قارئین کو اپنے ذوق کی تسکین اور دلچسپی کا سامان ملے گا، کہ اس میں عالم و مصنف بھی ہیں، شاعر و ادیب بھی، فقیر و درویش بھی، سیاست و خدمت ملی کے میدان کے شہسوار بھی، بزرگ بھی، دوست بھی، نامور بھی، گمنام بھی، لیکن اشخاص کے انتخاب میں بھی اور ان کے حالات و کمالات، پسند و ناپسند کے تذکرے میں بھی مصنف کا ذوق و رجحان اس کی اپنی زندگی اور ماحول اور اس کی پسند و ناپسند ضرور کارفرما نظر آئے گی، اور یہ زندگی کی ایک علامت بھی ہے، اور صاف گوئی اور راست بیانی، سادگی اور بے تکلفی کی نشانی بھی کہ زندہ انسان جب کسی انسان کے متعلق کبھی کچھ لکھتا ہے یا کہتا ہے تو وہ اپنی ذات سے الگ نہیں ہوتا، اگر وہ ایسا کرے گا تو تصنیف کسی قلم

---

(۱) پرانے چراغ: ۹-۱۰

اور قلب کی سچی ترجمانی اور کارفرمائی نہیں، ایک بے جان کیمرہ کا مصنوعی عمل ہے، مصنف کو زندگی میں قدرتاً انہیں لوگوں سے زیادہ دلچسپی ہوگی جو اس کا ذوق اور تجربہ رکھتے ہیں اگر یہ کوئی عیب اور نقص ہے تو میں تواضع سے کام لینے ضرورت نہیں سمجھتا۔ (۱)

اس کتاب کی جلد سوم کے مقدمہ میں کتاب کے ناشر کی طرف سے مصنف کی تاریخ نگاری و سیرت نویسی کے نقطۂ نظر کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''مصنف کا نقطۂ نظر تاریخ نگاری اور سیرت نویس کے متعلق یہ ہے کہ کسی نسل وقوم کی تاریخ اور کسی دعوت وتحریک اور دین ومذہب کی تعلیمات کو کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین وآرائش کے بغیر سامنے رکھ دینا چاہئے کہ جمال فطرت اور حسنِ حقیقت کو ظاہری رنگ وروغن اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کو مصنوعی رنگ وبو کی ضرورت نہیں ہوتی، دوسری صفت ''پرانے چراغ'' کے مصنف'' کو دوسرے مؤرخین اور سیرت نگاروں اور تذکرہ نویسوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ فن تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے عام مزاج وانداز اور لگے بندھے ڈگر سے ہٹ کر انہوں نے اپنی کتابوں میں ان تاریخی دستاویزوں اور مصادر ومراجع سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جو بظاہر اس موضوع پر نہیں تھین، مگر ان میں وہ قیمتی لعل وجواہر موجود تھے جو براہ راست خاص اس موضوع پر لکھنے والوں کو ملنے دشوار تھے، اگرچہ اس نازک علمی وتاریخی سفر میں بڑے نازک موڑ اور سخت وہمت شکن گھاٹیاں بھی آئیں جن سے گزرنا آسان نہ تھا کہ یہ موضوع (تاریخ نویسی اور سیرت نگاری) بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے''، لیکن محض توفیق الٰہی کی خاص دستگیری، وسیع قلب، متوازن فکر، وسیع وطویل اور عمیق مطالعہ کی قوت وہمت اور مشق شناوری کی بدولت وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکے''۔ (۲)

---

(۱) پرانے چراغ: ۱۲۔۱۳ (۲) پرانے چراغ: ج ۲/۶۔۷

اب آیئے ذرا جائزہ لیتے ہیں ''پرانے چراغ'' کے سوانحی ادب کا، اور اس میں مذکورہ شخصیات کے ساتھ ان کے درجے اور مقام کے لحاظ سے پیرایۂ بیان کے مختصر اشارے کا، تاکہ سوانحی ادب کی تشکیل میں اس کتاب اور اس کے مصنف کی منفرد ادبی خصوصیات سامنے آسکیں، اور اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی تردد یا پس وپیش نہ باقی رہ جائے کہ اردو زبان کے سوانحی ادب کی تشکیل میں ''پرانے چراغ'' کا حصہ کتنا اہم اور تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔

سب سے پہلی جلد کے ابواب پر ایک سرسری نظر ڈالئے تو چند بلند پایہ عالم ورہنما کا تذکرہ اپنے پورے ادبی جاہ وجلال اور عقیدت کی روح کے امتزاج کے ساتھ آپ کے لئے نہ صرف سامانِ عبرت پیش کرنے کے لئے کافی ہے، بلکہ آپ کے ادبی ذوق اور اس کی تسکین کے لئے ایک نئے اسلوبِ نگارش اور زور بیان سے مالا مال ادب وبلاغت کا ایک خزانہ آپ کے ہاتھ میں آئے گا۔

مثال کے طور پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کا تذکرہ یوں شروع ہوتا ہے۔

''مولانا سید سلیمان ندوی سے ہمارے خاندان کے ایسے گوناگوں تعلقات اور ایسے عزیزانہ روابط تھے کہ وہ کسی دور میں بھی ہم لوگوں کے لئے اجنبی اور ناموس نہیں تھے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نہ صرف تعلیم یافتہ اور فاضل بلکہ اس کے لئے سرمایۂ افتخار ونازش تھے، وہ میرے والد کے عزیز شاگرد اور بھائی صاحب کے ایسے دوست تھے جو عمر میں بڑے اور فضیلت وشہرت میں بڑھے ہوئے تھے، ہماری درسگاہ کے ایک طرح کے مربی وسرپرست بھی تھے، میرے استاد مولانا خلیل عرب صاحب کے ساتھ بھی ان کا تعلق کچھ ایسا ہی تھا کہ عرب صاحب کی طرف سے احترام کا معاملہ بھی تھا اور بے تکلفی ومزاح وظرافت کا معمول بھی، عرب صاحب نے اس دور میں ندوۃ میں تعلیم پائی تھی، جب سید صاحب وہاں کے اساتذہ میں شامل تھے، اگر عرب صاحب کو ان سے پڑھنے کی نوبت آئی بھی ہوگی تو برائے نام، اس کے

بعد جب دیکھا دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ خوش طبعی، بے تکلفی کا دیکھا، سید صاحب اپنے بے تکلف احباب میں بڑے ظریف، نکتہ سنج، سبک روح اور خوش مذاق تھے، لیکن ان کے مذاق میں بھی ایک علمی وادبی شان ہوتی تھی، عرب صاحب باوجود اس کے کہ ان کا زیادہ تر سابقہ عربی سے تھا، اردو کا اچھا ذوق رکھتے تھے، اور لکھنؤ میں طویل مدت گزارنے کی وجہ سے زبان کی باریکیوں اور مزاح وظرافت کی نزاکتوں سے واقف تھے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے مذاق کس طرح ابتذال اور خوش طبعی کس طرح اشتعال کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے"۔(۱)

ان ہی بلند علماء ورہنما میں سید مناظر احسن گیلانی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا تذکرہ پورے ادبی آب وتاب کے ساتھ موجود ہے، اس کے بعد چند مشائخ کبار اور مصلحین کا تذکرہ شروع ہوتا ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پُرکشش تذکرہ اور اس کے ضمن میں مولانا احمد علی لاہوری، مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری کے عطر بیز حالات کا تذکرہ نہ صرف یہ کہ قلب وروح کے لئے غذا اور دوا کا سامان فراہم کرتا ہے، بلکہ ہر ایک کے روحانی اور تربیتی کمالات کا ایک ادبی جائزہ اپنی الگ الگ خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔

اسی طرح چند اساتذۂ کرام کا تذکرہ شروع ہوتا ہے، شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی اور مولانا خلیل عرب، مولانا سید طلحہ حسنی کے تذکرے باصرہ نواز ہوتے ہیں، پھر "چند ہستیاں بلند مقام لیکن گمنام" کے عنوان سے چار شخصیتوں کے نام کا تذکرہ ہے، مولانا شاہ حلیم عطا سلونی، مولانا سید حسن مثنی ندوی امروہی، سید صدیق حسن آئی۔سی۔ایس، الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری پھر "کچھ دوست اور کچھ بزرگ" کے عنوان سے پانچ شخصیتوں کا نام نامی جملہ تفصیلات کے ساتھ نہایت دلآویز پیرایۂ بیان میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں مولانا مسعود عالم ندوی، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر محمد عبدالجلیل فریدی، مولانا معین الدین ندوی شریک بزم ہیں۔

---

(۱) پرانے چراغ: ج ۱/ ۱۷

اب آتے ہیں ''پرانے چراغ'' کی دوسری جلد مع تکملہ سینے کے داغ کی طرف، اور پھراس پرنظرڈالتے ہیں تو سب سے پہلے ہندوستان کے چند اہل کمال اور مشاہیر رجال کی فہرست نظرآتی ہے، نمبرایک پر مولانا محمد علی جوہر پھرنواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکرذاکرحسین ہیں۔

حضرت مولانا محمد علی جوہر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ ان جیسا مخلص، جری اور نڈر بہادر اور خدا پرست، عاشق اسلام قائد اس ملت کو اس صدی میں نہیں ملا، لیکن بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اس کو اپنی سحر انگیز شخصیت کی توانائیوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا محور بنایا تھا، جس کی زمام کاران کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ملک کے باہر سات سمندر پار ایک جماعت وفرد کے ہاتھ میں تھی جوان کے مشوروں کا تابع اور ان کی ہدایتوں کا پابند نہ تھا، بلکہ اپنے مصالح اور مغربی طاقتوں کے چشم وابرو کا غلام تھا، یعنی مسئلہ خلافت جسے کمال اتاترک نے اتحادیوں کے اشارہ اور خاص طور پر برطانیہ کے مشورہ اور ہدایت پر بیک جنبش لب یا گردش قلم ختم کردیا، اور سارا عالم اسلام خاص طور پر ہندوستان کا مجروح وستم رسیدہ مسلمان دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

پھر جب ہندوستان کے مسائل میں ان کی رہنمائی اور قیادت کا وقت آیا تو وہ اپنی بہترین توانائیاں صرف کر چکے تھے، ان کا دل زخموں سے چور چور تھا، اور ان کا جسم بیماریوں سے زار ونزار، ملت کی خوردہ گیری، حساب طلبی، تنقید وملامت، اندرونی انتشار، بیرونی مخالفت اور ساتھیوں کی بے وفائی سے ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا، وہ اپنی جوانی، طاقت، ہمت کے زمانہ میں جن لوگوں کے ساتھ اور جنہوں نے اس ملک کو آزاد کرانے کے لئے ان کے ساتھ قربانیاں دی تھیں، ان کو بعض تلخ تجربوں اور واقعات کی بنا پر چھوڑ چکے تھے، اور اب جن لوگوں کی انہوں نے رفاقت اختیار کی تھی یا جو ان کے گرد جمع ہو گئے تھے وہ ان کے خلوص، جذبۂ قربانی، قابلیت اور بلند عزائم میں ان کی کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ''یوسف بے کارواں'' ہوکر رہ گئے۔

آخر میں پھر ان کی مضطرب روح اور بے چین طبیعت نے اپنا جوہر دکھایا اور اس نے اپنے مرکز اصلی کی طرف پرواز کی، ۳۱۔۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرس لندن میں وہ شیر کی طرح گرجے اور بلبل کی طرح چہکے، انہوں نے اس وقت تک ہندوستان جانے سے انکار کردیا جب تک ان کو اس ملک کی آزادی کا مکمل پروانہ نہ مل جائے، وہیں (۴رجنوری ۱۹۳۱ء کو) ان کے طائر روح نے قفس عنصری سے پرواز کی۔ مفتی اعظم فسلطین الحاج سید الحسینی کی دعوت وتحریک پر ان کی نعش فلسطین لے جائی گی، اور ان کے جسد خاکی کو سرزمین انبیاء اور معراج نبوی کی پہلی منزل بیت المقدس کے ایک گوشہ میں جگہ ملی۔ اقبال نے خوب کہا ہے:۔

خاک قدس اُورا بآغوش تمنامی گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

اور ان کا یہ کہنا بھی صحیح نکلا:۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے(۱)

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے علمی وادبی مرتبہ اور ان کی سیاسی بصیرت وذہانت پر تحریر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:۔

''ان کا حیرت انگیز حافظہ، ان کی غیر معمولی ذہانت، ان کی حاضر دماغی اور بیدار مغزی، ان کی ادبیت اور ان کی انشا پردازی جو کسی وقت اور کسی جگہ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی، ان کی اپنے مطالعہ اور معلومات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی عجیب وغریب صلاحیت، ان کی سیاسی بصیرت اور دور بینی، ان کی اپنے خیالات میں پختگی اور اپنے مسلک پر ثابت قدمی واستقامت اور لوگوں کی مدد وتنقید سے بے پرواہی، ان کی خودداری اور عزت نفس ہر شبہ سے بالاتر اور ہر اختلاف سے بے نیاز ہے۔(۲)

(۱) پرانے چراغ: ج ۲/۱۷۔۱۸ (۲) پرانے چراغ: ۲/۶۰۔۶۱

دوسرا باب ''چند بزرگ شخصیتوں'' کے عنوان سے الحاج مفتی امین الحسینی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا محمد سلیم مکی پر مشتمل ہے، اور جس طرح بزرگ شخصیتوں کے بارے میں ہر طرح کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے حالات کا تذکرہ ہونا چاہیے وہی آپ کو اس باب میں پورے ادب واحترام کے لحاظ کے ساتھ نظر آئے گا۔

تیسرے باب میں نامور ادیب وانشاء پرداز میں مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، چودھری غلام رسول مہر، مولانا ماہر القادری کی باکمال شخصیتیں نظر آئیں گی اور آپ ان کے سوانحی تذکرہ کو عزتِ ادب سے معمور پائیں گے، اور چوتھے باب میں ''چند علمائے کبار'' کے عنوان سے مولانا عبدالشکور فاروقی، علامہ بہجۃ البیطار، مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی کا تذکرہ پڑھ کر آپ روحانی بالیدگی کو محسوس کریں گے، اور پانچواں باب ''چند محترم احباب ومعاصرین'' کے عنوان سے چار اہم شخصیتوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے، ان میں صوفی عبدالرب ایم اے، مولانا سید ابوبکر غزنوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سوانحی خاکے اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں، اور چند عزیز اور محبوب شخصیتوں کے داغ مفارقت دینے کے بعد ''سینے کے داغ'' کے عنوان سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ نہ صرف تاثر اور تصویر غم کا آئینہ ہے بلکہ یہاں بھی شہسوار ادب کے تعزیتی مضامین لکھنے کی ایک نئی سمت متعین ہوتی ہے، اور نیا اسلوب عطا ہوتا ہے، یہ آخری باب ان محبوب شخصیتوں پر مشمل ہے، مولانا سید ابوالخیر برق، مولانا کی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ، مولانا کے محبوب بھتیجے مولانا محمد الحسنی عرف محمد میاں اور مولانا اسحٰق جلیس ندوی۔

اب ہمارے سامنے ہے ''پرانے چراغ'' کی تیسری جلد، اس کا پہلا باب عالم عربی کے چند نامور اور دینی احباب کے تذکروں سے مزین ہے، اس میں پہلا نام شیخ حسن البنا، دوسرا سید قطب، تیسرا صالح قزاز اور چوتھا شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کا ہے، دوسرے باب کا عنوان ہے ''ممتاز دینی داعی اور روحانی مربی'' اس میں ذکر ہے رئیس التبلیغ مولانا محمد یوسف

کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد احمد پھولپوری، تیسرا باب ''چند نامور معاصرین وقائدین وملت'' کے تذکرے پر مشتمل ہے، اس باب میں آپ پڑھیں گے مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، سید منت اللہ رحمانی کے ساتھ شہید صدر جنرل ضیاءالحق کا تذکرہ، اور چوتھے باب میں ''چند جلیل القدر علماء وخادم دین'' کے عنوان سے تذکرہ ہوا ہے مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کا، پانچواں باب دس شخصیتوں کے تذکرے پر مشتمل ہے، اس میں آپ مطالعہ کریں گے چند خادمانِ دین، کارکنان ملت، احباب ورفقاء کے عنوان سے سید محمد جمیل صاحب، ڈاکٹر آصف قدوائی، صباح الدین، عبدالرحمٰن صاحب، مولانا عبیداللہ بلیاوی، مولانا ابواللیث اصلاحی، حکیم عبدالقوی دریابادی، مولانا محب اللہ لاری ندوی، اور مولانا عبدالرحیم مجددی کا، چھٹے اور آخری باب کا عنوان ہے ''چند خورد سال لیکن باکمال رفیق وعزیز'' اس میں تذکرہ ہے سید احمد الحسنی، مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا محمد ثانی حسنی، اور مولانا نورعظیم ندوی، اور انہی عزیزوں کے ذکر پر ''پرانے چراغ'' کا تیسرا حصہ بھی اختتام پذیر ہوتا ہے، اور سوانحی ادب کا وہ عظیم الشان خزانہ ہاتھ آتا ہے جو تجربات، مطالعات، مشاہدات اور تربیت وپرداخت کا ایک عظیم ادبی اور تاریخی مرقع ہے، اردو زبان میں سوانحی ادب کی تشکیل میں اس کتاب کا جس قدر حصہ ہے، اس کا اندازہ کرنا کتاب کی تمام جلدوں کا مطالعہ کئے بغیر مشکل ہوگا۔

مؤلفؒ نے اپنے بارے میں خود یہ تحریر فرمایا ہے کہ سیر وسوانح کا ادب میری نظروں میں سب سے زیادہ محبوب اور میرے لئے بہت آسان ہے، اور ادب کی اس صفت کے ساتھ بچپن ہی سے مجھے بہت زیادہ شغف تھا، تذکرے اور ان کی سوانح حیات عربی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتا رہا، یہاں تک کہ اس موضوع پر میری کتابوں کا ایک مکتبہ تیار ہوگیا۔

بلاشبہ مؤلف (رحمۃ اللہ علیہ) کی اردو اور عربی دونوں زبانوں میں سیر وسوانح کے موضوع پر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جو اسلامی کتب خانہ کی زینت ہونے کے ساتھ ساتھ اہل علم وادب اور اصحاب فکر ونظر کے لئے ایک بڑے تاریخی مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔

باب سوم

چند اسلامی ادباء و شعراء

اردو زبان کے چند زعماء

ایک عمومی جائزہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں آسمان وزمین کی خلقت کا ذکر کیا ہے، وہیں بنی آدم کی زبانوں اوران کے رنگ وروپ کا فرق واضح کرتے ہوئے نہایت تاکید کے ساتھ کہا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور زبانوں اور رنگ وروپ کے فرق میں دنیا میں بسنے والے انسانوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں، ان نشانیوں سے سرسری طور پر گزر جانا کسی باشعور انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔

اگر ہم صرف لسانیات کا موضوع لیں اوراس میں باہمی فرق واختلاف کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ تک پہنچنا آسان ہوگا کہ ہر خطہ، منطقہ اور قبیلہ کے لوگ اپنی اپنی زبانیں استعمال کرتے ہیں، اوران کی تعداد حد شمار سے متجاوز ہے، یہ ضرور ہے کہ قدیم زبانوں کا اثر دوسری زبانوں پر جو بعد میں منصۂ وجود پر رونما ہوئیں اپنی ماسبق زبانوں کے اثر سے خالی نہیں ہے، اس سلسلہ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی زبان ایک دوسرے سے کسی نہ کسی حد تک استفادہ کے دائرے میں آتی ہے، اور فلسفۂ لسانیات کے مطابق تمام زبانیں انسانی مزاج اور ماحول سے مربوط ہیں، اور وہ فطرت کی راہ سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی ماحول وطبقات کے عظیم اور وسیع تنوع وتعدد کے باوجود کوئی انسان اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے اور اپنی زندگی کی ضرورتوں کو انجام دینے سے قاصر نہیں تصور کیا جاتا۔

لسانیات کے قدیم ورثہ کو حقیقت کے آئینہ میں دیکھا جائے تو سب سے زیادہ صاف

ستھری اور فصاحت و بلاغت کے معیار پر پوری طرح کھری اترنے والی عربی زبان ہے، اس کا مولد و مسکن جزیرۃ العرب کے ریگستانوں اور وادیوں میں پایا جاتا ہے، اور ظہور اسلام سے تقریبا دو سو قبل کی تاریخ اس سے وابستہ ہے، اس کا امکان بھی ہے کہ وہ اس زمانہ سے بہت پہلے سے وہاں کے انسانی معاشرہ میں رائج ہو، اور جاہلیت اولیٰ کے دور سے تاریخ کی سلوٹوں میں چھپ کر اپنا کردار انجام دے رہی ہو، اس لئے کہ دور جاہلیت میں عربی زبان وادب کی تدوین وترقی کا کام جاری تھا، اس کی سب سے بڑی دلیل جاہلی ادب اور شاعری ہے، جاہلی ادب میں فصاحت و بلاغت کا معیار بہت بلند تھا، اس زمانہ کے ادباء اور شعراء اپنی زبان دانی اور بلاغت لسانی میں آخری درجہ تک پہونچ چکے تھے، یہاں تک کہ وہ ساری دنیا کو عجمیت کا لقب دیتے تھے، اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، حالانکہ اس وقت بھی یونانی تہذیب کے اثر سے مشرق و مغرب کا تمدن، اس کا ادب اور اس کی شاعری سبھی کچھ، اہل عالم کے لئے ایک قابل رشک صفت سمجھی جاتی تھی، لیکن جزیرۃ العرب کے ادب و شاعری نے اس کو لائق اعتناء نہیں سمجھا اور اپنی خداداد عربی زبان کی صلاحیت کو اپنا سب سے بڑا امتیاز اور اپنی متاع گرانمایہ قرار دیا، جاہلی شعر وادب کے اولین علمبرداروں میں امرء القیس، مہلہل بن ربیعہ المرقش الاکبر نمایاں طور پر تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں، ان کی قدرت بیان اور مافی الضمیر کی ادائیگی میں برجستگی الفاظ کو ان کے صحیح محل پر استعمال کرنا اور شاعری کے صحیح مفہوم اور اس کی نزاکتوں سے پوری طرح واقفیت ہے، یہ سارے اوصاف عرب شاعری میں خاص طور سے جاہلی شعر وادب میں بلاغت کے آخری درجہ تک پہونچے ہوئے نظر آتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن کریم کی بلاغت اور اس کے اعجاز کو سمجھنا ناممکن ہوتا، اس لئے کہ یہ مدعیان بلاغت اپنی زبان آوری کے جوش میں کسی کلام کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ابتداء قرآن کریم کے ساتھ بھی ان کا یہ رجحان قائم رہا، لیکن قرآن کریم نے جب ان کو چیلنج کیا کہ اس جیسا کوئی کلام خواہ کسی شکل میں ہو بنا کر پیش کریں تو بلاغت کے ان دعویداروں نے اس کی کوشش کی اور از

سرنو قرآن کریم کی آیات میں غور کرنا شروع کیا تو ہر اعتبار سے اپنے آپ کو بے بس اور عاجز پایا، اور قرآن کریم کے اس چیلنج کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

"ان كنتم في ريب ممانزلنا على عبدنا فأتوا بسورة من مثله وادعوا شهداء كم من دون الله ان كنتم صادقين"

(ترجمہ: ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اتارا ہے اس میں اگر تمہیں شک ہے اور تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت تو بنالاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ تم اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلالو۔ (بقرۃ:۲۳)

اگر ہم سنجیدگی سے عربی زبان وادب کا مطالعہ کریں وراس کے مفرادات اور جملوں پر اپنی فکر ونظر کو مرکوز کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ عربی زبان نے دیگر انسانی زبانوں کو اپنے الفاظ مفردہ، جملوں اور ترکیبوں اور بلاغت کے اسلوب سے مالامال کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مختلف زبانوں میں عربی کے مفرد الفاظ، اس کی تعبیرات بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کئے گئے ہیں، خاص طور سے اردو زبان کی نشو ونما اور اس کی توسیع وترقی میں اور اس کو ایک مستقل زبان کی حیثیت سے عطا کرنے میں عربی زبان وادب کا کردار نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔

اگر آپ اس کی تصدیق چاہیں تو کسی بھی اردو زبان کی عبارت کو پیش نظر رکھیئے، اور گہرائی سے جائزہ لیجئے تو اس میں عربی کے مفردات بعینہ یا کسی قدر حروف وحرکات کے تغیر کے ساتھ بکثرت نظر آئیں گے اور بسا اوقات عربی زبان کے محاورے، تعبیرات اور جملے بھی اردو زبان کا جزء لاینفک بن گئے ہیں، ذیل میں اردو کی ایک عبارت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم سے پیش کی جاتی ہے، اس مختصر سی عبارت میں کھلی ہوئی شہادت پائی جاتی ہے کہ اردو زبان اگر چہ عجمی الوطن ہے، لیکن اس کے عربی النسل ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، مندرجہ ذیل عبارت اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی راہ پوری طرح ہموار کرتی ہے:

"اسلام جو ایک مکمل دین اور دائمی وعالمگیر مذہب ہے، اس کی تعلیمات کا سرچشمہ یہی لازوال، بے نظیر اور زندگی آموز کتاب ہے، اس

سے اب تا قیام قیامت نوع انسانی کی قسمت وابستہ ہے، اور اس پر اس کی کامیابی اور نجات موقوف ومنحصر ہے، یہ کتاب تاریخی حقیقت ہے کہ یہ ابدی کتاب جو چودہ سو سال سے انسانیت کی تعمیر وتشکیل، ایک صالح اور صحت مند معاشرہ اور تہذیب وثقافت کے قیام کے سلسلہ میں اپنا مؤثر کردار ادا کرتی رہی ہے، اس نے بین الاقوامی طور پر انسانوں کو جس طرح اور جس قدر متاثر کیا ہے اس کا دنیا کی کوئی کتاب بلکہ کتب خانۂ عالم بھی مقابلہ نہیں کرسکتا"۔

اس عبارت کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ عربی کے مفرد الفاظ، جملے، ترکیبیں اور تعبیرات سے مالا مال ہے، مثلاً لفظ اسلام، مکمل دین، دائمی وعالمگیر مذہب (الدین العالمی الخالد) تعلیمات کا سرچشمہ، زندگی آموز کتاب، بے نظیر لازوال، تا قیام قیامت، نوع انسانی، نجات، موقوف، منحصر، یہ کتاب تاریخی حقیقت ہے، انسانیت کی تعمیر وتشکیل، صالح اور صحت مند معاشرہ، تہذیب وثقافت کا قیام، مؤثر کردار، بین الاقوامی طور پر، انسانوں کو جس طرح اور جس قدر متاثر کیا، دنیا کی کوئی کتاب، کتب خانۂ عالم، مقابلہ نہیں کرسکتا۔

اسی طرح بعض الفاظ کسی قدر بعض حروف اور حرکات کی تبدیلی کے ساتھ بھی اردو زبان میں داخل ہو چکے ہیں اور اب عصر جدید میں زبان وادب کی ترقی اور وسعت کے ساتھ عربی الفاظ کے مفردات، نئی ترکیبیں اور جملے، نئی تعبیرات کے جزء زبان بننے کا سلسلہ جاری وساری ہے، اس موقع پر ہم اردو زبان وادب کے قدیم مکاتب فکر کے نمونے پیش کرنے کی ایک مختصر کوشش کرتے ہیں، محض اس لئے کہ ہم اردو زبان وادب پر عربی زبان کے اثرات کا کسی حد تک اندازہ لگا سکیں، اور بغیر کسی دشواری کے اردو زبان کی تعمیر میں عربی زبان کے فیض کا مشاہدہ کرسکیں۔

سب سے پہلے ہم علامہ شبلی نعمانی کی اردو زبان کا ایک نمونہ پیش کرنے کی جرأت کررہے ہیں، تاکہ اس میں عربی زبان کے الفاظ اور ترکیبات کا مشاہدہ کرسکیں، وہ اپنے

ایک مضمون میں جس کا عنوان ''قضاء وقدر اور قرآن مجید'' ہے، لکھتے ہیں:

''ہر چیز کی فطرت خدایا قدرت نے جس خاص طرح کی پیدا کی ہے، اس کے خلاف اس سے کوئی فعل سرزد نہیں ہوسکتا، جماد حرکت نہیں کرسکتا، نباتات بات نہیں کرسکتے، جانور فلسفہ ومنطق نہیں سیکھ سکتے، آدمی روح مجرد نہیں بن سکتا، انسان کے افراد کی بھی مختلف فطرتیں ہیں، جو شخص فطرتاً شریر ہے، نیک نہیں ہوسکتا، کند ذہن ذہین نہیں ہوسکتا، احمق عاقل نہیں کہا جاسکتا، شاید تم کو یہ خیال ہو کہ تعلیم وتربیت سے اکثر لوگوں کی حالتیں بدل جاتی ہیں، شریر لڑکا نیک چلن ہو جاتا ہے، مسرف کفایت شعار بن جاتا ہے، بدمزاج حلیم ہو جاتے ہیں لیکن یہ بھی ان کی فطرت ہی کا اثر ہے، یعنی ان کی فطرت ہی میں اصلاح اور ترقی کا مادہ ہوتا ہے، جس نسبت سے یہ مادہ ہوتا ہے، اسی قدر وہ اصلاح پذیر ہوسکتے ہیں، لیکن جس کی فطرت میں اصلاح کا مادہ نہیں یا ہے، لیکن ایک خاص درجہ تک ہے، وہ اصلاح پذیر نہیں ہوسکتے، یا اس درجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے''۔(۱)

اس اقتباس کو غائر نظر دیکھیں تو اس میں عربی کے الفاظ وتراکیب پوری مذکور عبارت کے اندر جلوہ گر ہیں، جیسے فطرت، قدرت، خاص، خلاف، فعل، جماعت، حرکت، نباتات، فلسفہ ومنطق، روح مجرد، انسان کے افراد، مختلف فطرتیں، فطرتاً شریر ہے، ذہین، احمق، عاقل، تعلیم وتربیت، حالتیں بدل جاتی ہیں، شریر، مسرف کفایت شعار بن جاتے ہیں، حلیم ہو جاتے ہیں، فطرت ہی کا اثر، اصلاح اور ترقی، نسبت، مادہ، فطرت میں اصلاح کا مادہ، خاص درجہ تک۔'' یہ نثری کلام کا ایک بہت مختصر نمونہ ہے۔

علامہ کی شاعری میں عربی زبان کے اثرات ملاحظہ ہوں، جو اسلام کے عروج وزوال کی تصویر پر مشتمل ہے، یہاں مندرجہ ذیل منظوم کلام کو نمونہ کے طور پر پیش کرنا شاید مناسب ہو۔

---

(۱) مقالات شبلی: ج ۱/۴۶

اسلام کا وہ عروج شاہی — وہ اوج، وہ شانِ کج کلاہی
ایوانِ علوم کی وہ تزئین — تحصیل کمال کے وہ آئین
تکمیل فنون میں توغل — اک بار پھر ان کا وہ تنزل
اس طرح غرض کہ جزرومد کا — کھینچا تھا وہ ٹھیک ٹھیک نقشہ
تصویر سی پھر گئی نظر میں — جان آگئی قالب اثر میں
اسباب وعلل سے بحث کی پھر — یعنی کہ یہ انقلاب نادر
کس بات سے ہے؟ سبب ہوا کیا؟ — وہ باعث اوج اب ہوا کیا؟
پھر اصل سخن پہ کی جو تقریر — یعنی روش علاج وتدبیر
تحقیق کے طے کئے مراحل — وا کردیئے عقدہائے مشکل
تدبیر کی صورتیں بتائیں — جو جو تھیں ضرورتیں بتائیں
القصہ یہ بات کی تھی تسلیم — یعنی کہ علومِ نو کی تعلیم
تدبیر شفا جو ہے، تو یہ ہے — اس دکھ کی دوا جو ہے، تو یہ ہے
سہتے ہیں جو یوں غم وتعب ہم — تدبیر یہی ہے بس کہ ''بس ہم''
تقویمِ کہن سے ہاتھ اٹھائیں — تہذیب کے دائرے میں آئیں (۱)

مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب ''حیات جاوید'' میں سرسید کے حالات بیان کرتے ہوئے ان کی اصلاحی کوششوں میں ''تہذیب الاخلاق'' نام سے رسالہ جاری کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس کے اصلاحی مقاصد بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی سمجھے جاتے ہیں اور در حقیقت مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے، ان کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے، اور اسلام پر جو عیسائیوں کا اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے اس غلطی کا اصل منشا

(۱) کلیات شبلی: ص ۱۱

ظاہر کیا جائے، اس کے سوا یورپ کے سویلائزیشن (civilization) کے اصول وفروع سے اور ان اسباب سے جو یوروپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے، بیہودہ اور مضر رسموں سے ان کو نفرت دلائی جائے، اخلاق وعادات میں جو بسبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، وہ بیان کی جائیں، علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے بیٹھی ہوئی ہے، جہاں تک اس میں غلطی ہو اس کو ظاہر کیا جائے، علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے ان میں اصل اور واقعی کو بیاں کئے جائیں اور جو بدیہی نتائج دنیا میں ان سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے ان کی طرف رغبت دلائی جائے، اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں، ان کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے، ان کی قدیم علمی اور عملی ترقیات ان کو یاد دلائی جائیں، اور اس طرح قوم کے مردہ دلوں کو از سر نو زندہ کرنے میں کوشش کی جائے، ان تمام اغراض ومقاصد کے پورا کرنے کے لئے سرسید اور ان کے دوستوں نے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ قوم کے محققین کی تصنیفات سے استناد کر کے لکھا اور اخلاق ومعاشرت وترقی وتمدن کے متعلق یورپ کے منصفین کے خیالات بھی جہاں تک ہو سکا اپنی زبان میں بیان کئے''۔(۱)

یہ تھا حالی کا نثری نمونہ، اس میں عربی الفاظ وترکیب کی آمیزش کچھ اس طرح ہے جیسے کسی عربی عبارت کا ترجمہ ہو، ہر جملہ میں عربی زبان وادب کا اثر پوری طرح نمایاں ہے، اور اس کو نشان زد کرنے کی بظاہر کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، اب ذرا ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں جو جناب سرور کائنات کی خدمت میں عرض حال کے نام سے پیش کئے گئے ہیں:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے　　امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

---

(۱) حیات جاوید: ۱۶۴

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے | پردیس وہ آج غریب الغرباء ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ | خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں | اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہبان | اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے | اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے | اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدرد بنی نوع بشر تھا | اب جنگ وجدل چار طرف اس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی | اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی | وہ عرضۂ تیغ جہلا وسفہا ہے
جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب | اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ سرا ہے
ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی | دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے
عالم ہے سو بے عقل جاہل ہے سو وحشی | منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے(۱)

ان اشعار میں عربی زبان کے الفاظ اور جملے پوری طرح نمایاں ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی کے الفاظ اردو زبان میں بھی آکر اکثر اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ الفاظ عربی کے ہوتے ہوئے اپنے مجازی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، اور زبان وادب کی تعمیر میں ان کا نہایت خوبصورت کردار ہوتا ہے۔

اب آتے ہیں محمد حسین آزاد کی طرف، اردو زبان وادب میں اپنے طرز کے خاص نمائندے اور شبلی اسکول کے بعد آزاد اسکول کے موسس وبانی جو علامہ شبلی کے فیض آشنا اور ان کے بنائے ہوئے ادبی راستہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے والے اور انہی کی طرح شمس العلماء کے لقب سے نوازے جانے والے حسین آزاد، انہوں نے ''اردو کہاں سے نکلی اور کیوں نکلی'' کے موضوع کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

(۱) مسدس حالی: ۱۲۱

''بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے، مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہوجاتا ہے یا زبان ایسی مشکل ہوجاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں بھی نہیں آتی، مثلاً دلال، فراش، مزدور، وکیل، جلاد، صراف، مسخر، نصیحت، لحاف، توشک، چادر، صورت، شکل، چہرہ، طبیعت، مزاج، برف، فاختہ، قمری، کبوتر، طاطا، پر، دوات، قلم، سیاہی، جلاب، رقعہ، عینک، صندوق، کرسی، تخت، لگا، رکات، زین، تنگ، پوزی، نعل، کوتل، عقیدہ، وفا، جہاز، مستول، بادبان، تہمت، در پردہ، دالان، تہ خانہ، تنخواہ، ملاح تازہ، غلط، صحیح، رسید، سرباری، کاریگر، ترازو، شطرنج کے باب میں تعجب ہے کہ خاص ہند کی ایجاد ہے، مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی تو سب اجزاء کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی''۔ (۱)

اسی طرح محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ''آب حیات'' میں نظم اردو کی تاریخ بیان کرتے ہوئے قدیم اردو شاعری کے اساتذہ شاعروں کا نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ان کی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں، جن میں بیشتر عربی وفارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور وہ اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ اردو شاعری پر عربی زبان وادب کا اثر کسی اور زبان کے اثر سے کم نہیں ہے، اور عربی کے الفاظ یا تو اپنی اصل شکل اور مفہوم کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں یا شکل اور مفہوم میں کسی قدر تبدیلی کے ساتھ، اس کا اندازہ ان اساتذۂ فن کے کلام سے اچھی طرح کیا جاسکتا ہے، جنہوں نے اپنی کتاب میں ولی دکنی سے لے کر غالب اور انیس تک کے تمام ادوار شاعری کا نمونۂ کلام پیش کیا ہے، اور سخن فہمی کے ساتھ قدیم اردو شاعری کی تاریخ منضبط طریقہ سے پیش کرنے میں اپنی مہارت اور معلومات کا ثبوت دیا ہے، اسی کے ساتھ ان سے اس موضوع کی ہمہ جہت نمائندگی میں کچھ بے

---

(۱) آب حیات: ۲۸

اعتدالیاں اور فروگذاشتیں بھی ہوئی ہیں، جن کا مختصر طریقہ سے ذکر آگے آ رہا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی بھی اردو زبان وادب کے قائدین میں شمار ہوتے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنے ادبی اسکول کے نمائندۂ خاص تصور کئے جاتے ہیں، کلاسیکی زبان نہایت آسان بنا کر پیش کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں، ان کی نگارشات روزمرہ کی بول چال اور قدیم ٹکسالی زبان کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہیں، خاص طور سے مسلم خاندانوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم وتربیت ان کی اصلاح اور ان کی سیرت کی تعمیر اور ادب وتہذیب کو سکھانے اور عام کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، انہوں نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک نئے طرز تحریر کو ایجاد کیا، اور وہی دراصل اس کے بانی اور موجد ہیں، ان کی کتاب ''مرآۃ العروس'' مقصدیت کی روح سے بھرپور ہے، اور خاندانی تربیت کے میدان میں اس کا ایک اہم کردار ہے، اس کتاب کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میں بھی دہلی کے ایک ایسے ہی خاندان کا آدمی ہوں، خاندان کے دستور کے مطابق میری لڑکیوں نے بھی قرآن شریف، اس کے معنی اور اردو کے چھوٹے چھوٹے رسالے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے پڑھے، گھر میں رات دن پڑھنے لکھنے کا چرچا تو رہتا ہی تھا، میں دیکھتا تھا کہ ہم مردوں کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو بھی علم کی طرف ایک طرح کی خاص رغبت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ نرے مذہبی خیالات بچوں کی حالت کے مناسب نہیں اور جو مضامین ان کے پیش نظر رہتے ہیں، ان سے ان کے دل افسردہ، ان کی طبیعتیں منقبض اور ان کے ذہن کند ہوتے ہیں، تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق ونصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں، اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کج رائی کی وجہ سے ہمیشہ ان میں مبتلائے رنج ومصیبت رہا کرتی ہیں، ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور کسی قدر دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا

دل نہ اکتائے، طبیعت نہ گھبرائے، مگر تمام کتاب خانہ چھان مارا، ایسی کتاب کا پتا نہ ملا، تب میں نے اس قصہ کا منصوبہ بنایا، تین برس ہوئے جب میں جھانسی میں تھا کہ اکبری کا حال قلمبند کیا"۔(۱)

ان الفاظ اور جملوں پر غور کریں تو وہ عربی زبان وادب کے اثرات سے بھرپور نظر آئیں گے، اور صاف محسوس ہوگا کہ اردو زبان کی تشکیل وتعمیر میں بنیادی حصہ عربی زبان ہی کا ہے، اس کتاب "مرآۃ العروس" کے اندر اگرچہ مصنف نے خاندانی ماحول، عورتوں اور لڑکیوں کی زندگی اور ان کے رجحانات کے بارے میں نہایت قابل قدر تربیتی مواد جمع کر دیا ہے، لیکن خاص طور سے افراد خاندان اور بچیوں کی تعلیم وتربیت اور سیرت سازی اور دیندارانہ ذہن کو پابند کرنے اور سیرت وکردار اور اسلامی طرز حیات کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں کہانی کی شکل میں انتہائی دلچسپ طرز نگارش اپنا کر اردو زبان وادب کو زندہ جاوید بنانے میں ایک عظیم کردار پیش کیا ہے، اس کتاب کے کسی حصہ کا اس موقع پر کوئی نمونہ پیش کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا، اس لئے کہ یہ کتاب مکمل نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ آج بھی اسی طرح زندہ وتابندہ ہے جس طرح وہ اپنی اشاعت کے پہلے دور میں تھی، اور اس نے اردو زبان کے اہل قلم اور ادباء کا خراج تحسین حاصل کیا تھا، غالباً کسی زبان وتحریر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ زندگی کا ساتھ دے اور ہر دور میں زندہ اور مقبول ہو۔

اب تھوڑی دیر ہم اردو کے عظیم شعراء کے کلام کے ساتھ رہتے ہوئے اور علامہ سید حکیم عبدالحی حسنی کی کتاب "گل رعنا" سے استفادہ کرتے ہوئے، اردو زبان کی قدیم شاعری اور اس کے باکمال شاعروں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جن کو اساتذہ کا درجہ حاصل تھا اور علامہ نے ان کے منتخب کلام کا نمونہ اپنی کتاب "گل رعنا" میں پیش کیا ہے، اس سے علامہ کے پاکیزہ ادبی ذوق اور اردو زبان وادب کی تاریخ سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے، دور اول میں محمد علی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ان شاعروں کا

(۱) مرآۃ العروس: ۳۰-۴۔ یہ نام ہی خالص عربی زبان وترکیب کا ایک نمونہ ہے۔

انداز بیان بے تکلف اور سیدھا سادا ہے، اس دور کے شعراء کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زبان کی صفائی اور صحت کی پوری کوشش کی، اور یہ ان کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔

دوسرے دور میں میر، حسرت، راسخ، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، رنگین وغیرہ شمار کئے جاتے ہیں، انہوں نے زبان کو پہلے دور سے زیادہ بہتر اور صاف کرنے کی کوشش کی اور طرز بیان میں بھی نیا انداز لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

تیسرے دور میں نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین، اور شیفتہ کا ذکر آتا ہے، عربی زبان وادب کے فیض سے ان شاعروں نے نہ صرف یہ کہ زبان کو زیادہ سے زیادہ جلا بخشی بلکہ صفائی اور سادگی کے ساتھ اپنے کلام کو گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ کر دیا ہے۔(۱)

چند اساتذہ کے کلام کا نمونہ

ذوق کے چند اشعار سنئے اور داد دیجئے:

سینۂ دل پہ میرے زخمِ جگر ہنستے ہیں ہنسنے دو چارہ گرو، ہنستے ہی گھر بستے ہیں
عبث تم اپنا رکاوٹ سے منھ بناتے ہو وہ لب پہ آئی ہنسی، دیکھو مسکراتے ہو

....

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ ایمان کی کہیں گے، ایمان ہے تو سب کچھ

اور ظفر کے یہ اشعار

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد اب تو اس کوچہ میں اے باد سحر خاک نہیں
جنوں میں کیا مرے پیوند پیرہن کو لگے یہ ایک تار بھی چھوڑا ہو تو کفن کو لگے
نعل شکل مہہ نو جب تیرے توسن کو لگے چار چاند اور فلک پر مہہ روشن کو لگے

ممنون کہتے ہیں:

اس مرگ پہ سو جان مری صدقے دم نزع گھبرا کے کہے تو کہ بس اب دیکھئے کیا ہو

---

(۱) گل رعنا ص:۴۲

نصیر کا یہ شعر:

سر مژگاں سے وقت نالہ آنسو کو ترستے ہیں　　یہ سچ ہے جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

مومن کا یہ شعر:

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غالب کا یہ شعر:

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دارِ رازِ عشق　　پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے

محبت کی تعریف کرتے ہوئے شیفتہ کہتے ہیں:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

اور مرزا رفیع کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

چھیڑ مت باد بہاری کہ میں چوں نگہت گل　　پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا
ساقی ہے یک تبسم گل، فرصت بہار　　ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

اور میر تقی میر کہتے ہیں:

صیاد دل ہے داغ، جدائی سے رشک باغ
تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا
فلک کو منھ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا
ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا

علامہ سید عبدالحی حسنیؒ کی کتاب ”گل رعنا“ دراصل ان فروگزاشتوں اور زعمائے ادب وشاعری کے درجات کا تعین کرنے اور کچھ ان بے اعتدالیوں کو دور کرنے کی اور تاریخی حقائق کو صحیح رنگ وروغن کے ساتھ پیش کرنے کی ایک مستند کوشش ہے، جو محمد حسین آزاد کی کتاب ”آب حیات“ میں پائی جاتی ہے، اور جو اردو زبان وادب اور شاعری کے میدان میں

تاریخی حیثیت سے تشنہ اور ناقص ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ''گل رعنا'' صحیح سمت میں ایک مستند ادبی اور تاریخی کارنامہ ہے، اور اس کا درجہ اردو ادب وشاعری کے موضوع پر تحریر کردہ بعض کتابوں سے بلند تصور کرنا ایک ادبی حقیقت کو تسلیم کرنے کے مرادف ہے، ''گل رعنا'' کے مصنفؒ کے فرزند باکمال حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''گل رعنا'' لکھنے کی ضرورت کے عنوان سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ مختصراً پیش کیا جارہا ہے:

''لیکن کوئی موضوع کسی بڑے سے بڑے مصنف پر ختم اور اس کے لئے وقف نہیں ہوتا، اور کوئی کتاب بھی خواہ کتنے ہی عظیم مصنف کے قلم سے نکلی ہو اپنے فن وموضوع کی آخری کتاب قرار نہیں دی جاسکتی، علم وفن، فلسفہ وحکمت، شعروادب، صناعی ومعماری، مصوری ونقاشی، اختراع وایجاد سب کی وسعت وترقی کا راز اسی نکتہ میں ہے کہ ان کے کسی نقش کو نقش ودوام اور ان کی تحقیق کو حرف آخر قرار نہیں دیا گیا، اور حوصلہ مند مصنفین اور نیک نیت ماہرین فن اور علم وتحقیق کی سچی لگن رکھنے والے اہل قلم نے اپنے پیش رووں کے فضل وکمال اور ان کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا علمی محاسبہ بھی کیا اور تحقیق کا ایک قدم آگے بڑھانے اور ان کے معلومات کے اندوختہ میں اضافہ کرنے کی جرأت کی، یہ دنیا کی کسی زبان اور کسی علم وفن کی تاریخ میں کبھی بھی گناہ یا شوخی نہیں قرار دی گئی، بلکہ ہر نئی نسل کے بساط علم وتحقیق کے تازہ واردوں کے کان میں ہمیشہ غیبی آواز آتی اور ان کا دل بڑھاتی رہی:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ دررگ تاک است'' (۱)

---

(۱) گل رعنا:۹۔۱۰

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال

شاعر اصلاح وانقلاب

اقبال کی شاعری میں جرس بیداری

ناموس ازل را تو امینی تو امینی دارائے جہاں راتو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی صہبائے یقین درکش واز دیر گماں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

فریاد زافرنگ ودلآویزیٔ افرنگ فریاد زشیرینی وپرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز!
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے اس فارسی قصیدے میں بڑے درد وغم کے ساتھ امت اسلامیہ کی غفلت اور بے حیثیتی کا تذکرہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ امت اپنی عظمت رفتہ پر مطمئن ہے، اور اسلاف کے کارناموں پر فخر کے محل تعمیر کررہی ہے، وہ ذرا بھی جہد پیہم کی ضرورت محسوس نہیں کرتی، گمنامی کی زندگی پر راضی، اور جمود پر خوش ہے۔

اس منظر کو دیکھ کر علامہ اقبال کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے، وہ امت مسلمہ کو نوع بنوع فتنوں اور ہمہ گیر سازشوں کے نرغے میں پاکر بے چین ہو جاتے ہیں، وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کررہے ہیں کہ ان فتنوں کے شعلے دیار مقدسہ کو بھی اپنی زد میں لینا چاہتے ہیں، اور قرون اولی کے عقائدی اور تہذیبی ڈھانچے کو یکلخت ختم کرنے کے درپے ہیں۔ لیکن موجودہ

مسلمان ان حقائق سے غافل، لذت کوشی میں منہمک، اپنی ذات تک محدود، دشمنان اسلام کی تخریبی کارروائیوں سے بے بہرہ، اور خطرات کے منڈلاتے بادل سے بے گانہ ہے۔

علامہ اقبال اس دلگداز منظر سے سخت کبیدہ خاطر تھے، اور شمع محفل کی طرح پگھلتے تھے، ان کا شعری قریحہ (ذوق) بیدار ہوتا ہے، امید وبیم میں ڈوبی ہوئی پکار ان کے اندرون سے بلند ہوتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ غفلت کے شکار مسلمان کو بیدار کریں، اور اس کے خلاف گہری سازشوں کے جال سے اس کو واقف کرائیں، وہ موجودہ مسلمان کو تعمیر جہاں اور قیادت دنیا کی طرف متوجہ کرر ہے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے قائدانہ مقام کی طرف آئے گا، اور تعمیر نو کا کام کرے گا۔

ان اشعار سے علامہ اقبال کی فکری بلندی، ذہنی وسعت، اور امت مسلمہ اور عالم اسلامی کے لئے وہ جو دائمی پیغام رکھتے ہیں اس کا اندازہ ہوتا ہے، علامہ اقبال زمانہ کی رو میں بہنے والے اور حالات وواقعات سے شکست کھانے والے نہیں تھے کہ وہ اسی سمت رختِ سفر باندھ لیں جدھر ہوا کا رخ ہو، اور مصلحت کوشی اور نفع اندوزی کو اپنا وطیرہ بنالیں، ان کی شخصیت کے تشکیلی عناصر میں ایمان وعقیدہ کی پختگی کو خاص دخل ہے، الہامی افکار کے سمندر میں اتر کر ایسے یاقوت وجواہر لے آئے جس سے ان کی شاعری دعوت فکر وعمل بن گئی ، اور زندگی، انسان اور کائنات کا ترجمان ہوگئی۔

اقبال کی شاعری نکتۂ ایماں کی تفسیر

علامہ اقبال اپنے زمانے کے علوم وافکار اور تہذیب وتمدن سے پوری طرح باخبر تھے، انہوں نے اپنی روشن دماغی، وسیع المشربی اور کمیاب ونادر ذہانت سے امت مسلمہ کو درپیش مسائل کو بھانپ لیا تھا، اور پردے کے پیچھے سے اسلامی نقوش کو مٹانے، اور عقائدی ڈھانچے کو منہدم کرنے والی کوششیں ان کی نگاہوں کے سامنے تھیں، چنانچہ متنوع رنگ وآہنگ، اور متعدد ناموں اور عناوین سے ان کے شعری چشمے پھوٹے، کبھی انہوں نے مغربی

تہذیب اس کے نظام تعلیم کو نشانہ بنایا، اور کبھی اس کے تمدنی، اخلاقی اور سیاسی فلسفے کے تار پود کو بکھیرا، تو کبھی کمیونزم، سوشلزم، ڈیموکریسی، مارکسزم اور مادی نقطہ نظر کی کھل کر مذمت کی۔ یہ انداز بیاں ایسا مبصرانہ، مدبرانہ اور دانشمندانہ ہے کہ اس میں صدیوں کی تاریخ کا خلاصہ آ گیا، پھر اس تاریخ کو شعری قالب میں ڈھالا، جس سے انہوں نے تارِ نفس کو چھیڑا، غفلت کا پردہ چاک کیا، سوتوں کو جگایا، بجھے ہوئے ارادوں کو استحکام عطا کیا، ہمتوں کو حیاتِ نو دی، اور شاعری میں ایسے حکیمانہ حقائق بیان کئے، جن تک رسائی طویل بحث و تحقیق کے بعد ہی ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری معاصر دنیا کے حالات کی سچی تصویر اور نکتۂ ایماں کی واضح تفسیر ہے، انہوں نے جہاں ایک طرف انسان کامل کا مفہوم بتایا ہے، وہیں دوسری طرف اس کی نافعیت، میدان عمل، اور ہمہ وقت اس پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا ہے، وہ گھر اور گھر کے باہر کس طرح رہے، اس کا معاش و معاد کیسا ہونا چاہئے، خلوت و جلوت کی زندگی کیسی ہونی چاہئے، اللہ اور لوگوں کے ساتھ کیسا تعلق ہونا چاہئے، یہ وہ باتیں ہیں جن کی تفسیر کچھ دانشوروں نے غیر منصفانہ کی ہے، اس فکری انحراف سے بہت سے لوگوں کی زندگیاں صراطِ مستقیم سے دور ہو گئی ہیں۔

دیارِ غیر میں اقبال کی اسلامیت

حیرت کا مقام ہے کہ علامہ اقبال کی یہ اصابت رائے، اور اسلام کی گہری بصیرت، اور اس کے پیغام و دعوت کے لئے روشن ضمیری عصری تعلیم، اور یورپین اداروں میں اعلی تعلیم سے متاثر نہیں ہوئی، جب کہ قرین قیاس یہ بات تھی کہ وہ مغربی تہذیب کے دھارے میں بہہ جاتے، مادی فلسفے کی ترجمانی ان کا مشغلہ ہوتا، ان کی ساری توانائیاں اور علمی استعدادیں اسی ''آقا'' کی خدمت گاری میں صرف ہوتیں، اور وہ اسلام کے حق میں تیغ بے نیام ہوتے، لیکن اللہ رب العزت کا یہ خاص انعام ہے کہ گہوارۂ کفر و ضلالت میں رہتے

ہوئے اس کے اثر سے مکمل طور سے محفوظ ہوئے، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نارِ نمرود سے سلامت نکلے تھے، وہ کہتے ہیں:

عذاب دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

علامہ اقبال نے جیسے جیسے علوم وفنون میں ترقی کی، اور مادی نظامہائے زندگی، اور فلسفوں اور ازموں کا مطالعہ کیا، اور ان کی تہہ تک پہونچے اسلام کی حقانیت اور اس کے دائمی پیغام پر ان کا ایمان مضبوط ہوتا گیا، اور اسلامی عقیدہ اور ایمانیات پر ان کا دل مضبوط ہوا، اور اللہ تعالی سے ان کا رابطہ قوی سے قوی تر ہوا، چنانچہ انہوں نے راتوں کو آہ وزاری میں گذارا، پورے اعضاء وجوارح کو ہر حال میں ذاکر وشاکر بنایا، مغربی تہذیب کے مراکز میں رہتے ہوئے ان کا دامن اس کی آلائشوں سے گندہ نہیں ہوا، کون ایسا مرد مجاہد ہے؟ جو اس میں اپنے لئے تحفظ کا سامان فراہم کرے؟ لیکن علامہ اقبال نے اس تصور کو عملی شکل دی، خاروں کے درمیان رہ کر ان سے الجھے نہیں، وہ ان دلفریبیوں اور آزاد خیالیوں میں ایک سچے موحد، پکے مؤمن، مثالی عاشق اور انسان کامل کی طرح رہے، اس ماحول میں کبھی ان کی قیام اللیل فوت نہیں ہوئی۔ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

علامہ اقبال اور عشق نبی

علامہ اقبال کا عشق نبی ﷺ مثالی تھا، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ پر ہمہ وقت اپنے جسم و جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے تیار تھے، وہ انہیں کے ذکر میں کھوئے رہتے تھے، ان کے نام سے برکت حاصل کرتے تھے، اور اپنی سرگرمیوں اور مسائل زندگی میں نورانیت پیدا کرتے تھے، انہوں نے ذات رسول ﷺ سے جس قدر وارفتگی اور محبت کا اظہار اپنے اشعار

میں کیا ہے، وہ لائق تقلید ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے قلب و روح کو محبت نبوی سے آباد کیا تھا، مغربی ماحول میں محبت نبوی ہی ان کی اصل پونجی تھی، چنانچہ تہذیبوں کی چمک دمک نے ان کو ذرا بھی نقصان نہیں پہونچایا، انہوں نے اسی سرمایہ سے باطل کے صنم کدوں کو زیر کیا۔ وہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

ایک دوسرے قصیدے میں کہتے ہیں:

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہ

یہی پاکیزہ محبت ان کی تمام سرگرمیوں کو اوجِ ثریا پر پہونچانے والی تھی، اسی سے وہ شاعرانہ افکار اور معنوی قوت حاصل کرتے تھے، اسی وجہ سے اس راہ کا غبار بننا پسند کرتے تھے۔

ایک فارسی قصیدے میں کہتے ہیں:

دردلِ مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروئے ما زنام مصطفیٰ است
بوریا ممنون خواب راحتش
تاج کسری زیر پائے امتش
در شبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

عصر حاضر کے مشکلات کی اصل وجہ اقبال کی نظر میں

علامہ اقبال کے عصری تعلیم اور مغربی فلسفے، اور معاشرت سے متعلق بیش قیمت آراء ہیں، انہوں نے پوری دیانتداری کے ساتھ اقوام وملل کی تاریخ کا مطالعہ کیا، فلسفیوں اور متکلمین کی تحقیقات کو بغور دیکھا، لیکن ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، ان کی اپنی مستقل آراء وافکار ہیں، جو طویل مطالعہ کا نچوڑ اور نتیجہ ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ عصر حاضر میں مسائل ومشکلات کی جو کثرت ہے، اس کی اصل وجہ فاسد خیالات کا اسلامی معاشرے میں سرایت کرنا ہے، نئے ازموں اور فلسفوں نے معاشرے کو ایسی جکڑ بندیوں میں گھیر رکھا ہے کہ کبھی رنگ ونسل پر فتنے کھڑے ہوتے ہیں، تو کبھی قوم وملت پر، لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے شعور ولاشعور میں صنم تراش لئے ہیں، ان تمام رجحانات کا علامہ اقبال نے قلع قمع کیا ہے اور یورپ جو اپنے آپ کو علوم وفنون کا قائد اور تہذیبوں کا سرخیل تصور کرتا ہے اس کی تہذیب کی قلعی کھولی ہے وہ کہتے ہیں:

فسادِ قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب ‏ کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ‏ ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اقبال کا انسان کامل

اقبال کا خیال ہے کہ آج دنیا کو انسان کامل کی ضرورت ہے، وہ جب دنیا کا نظام سنبھالے گا تو عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا، شر وفساد کا خاتمہ ہوگا، اور انسانیت امن وسکون کی زندگی گذارے گی، اقبال کی نگاہ میں انسان کامل سے مراد حقیقی مسلمان ہے، وہ مسلمان جو مکمل اسلام کی ترجمانی کرتا ہے، وہی زمین میں خلافت کا حامل ہے۔ انسان کامل ہی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنے والا، اور دنیا میں امن وامان کو پھیلانے والا ہے۔

اقبال نے ایک نظم لکھی ہے، جس کا عنوان ہے: فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں۔ اس میں کہتے ہیں :

عطا ہوئی ہے تجھے روز وشب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری شرست میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

ایک دوسری نظم کا عنوان ہے :روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، اس میں انہوں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلافت ارضی کیلئے دنیا پر بھیجا، اور ان کو غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا، تا کہ وہ اس کائنات میں پنہاں خوبیوں کو دریافت کرسکیں، پھر کائنات کو انسان سے جوڑا، اور انسان کو کائنات سے وابستہ کیا، وہ کہتے ہیں:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جوانی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ ، یہ صحراء ، یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
نا پید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر ، اثر آہ رسا دیکھ
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ، ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ
نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آمیز ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

اقبال ان اشعار کے ذریعہ انسان کو مخاطب کرر ہے ہیں، اس کو اس کا مقام یاد دلا رہے ہیں، ذمہ داریوں سے واقف کرار ہے ہیں، اور عالمی قیادت کا جو منصب اس کے سپرد کیا گیا ہے، اور اس کو خیرامت کا جو ایک فرد بنایا گیا اس سے آگاہ کرر ہے ہیں، کیونکہ انسان

اگر اس کو فراموش کر دے گا تو فکری زیغ وضلال کا شکار ہوگا، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے مرتبہ سے قرآن کریم میں جا بجا واقف کرایا ہے، سورۂ انفطار میں ہے:

يأيها الانسان ما غرك بربك الكريم ، الذي خلقك فسواك فعدلك ، في أي صورة ما شاء ركبك ، كلا ، بل تكذبون بالدين ، وان عليكم لحافظين كراما كاتبين يعلمون ما تفعلون (۶۔۱۲) ایک دوسری جگہ ہے: واذا أنعمنا على الانسان أعرض ونآى بجانبه ، واذا مسه الشر كان يؤوسا (الاسراء:۸۳) مزید فرمایا: أولم ير الانسان أنا خلقناه ولم يك شيئا (مریم:۶۸) ایک دوسری جگہ ہے: ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس به نفسه ونحن أقرب اليه من حبل الوريد ، (ق:۱۶) ایک دوسری جگہ ہے : وأن ليس للانسان الا ما سعى ، وأن سعيه سوف يرى ، ثم يجزاه الجزاء الأوفى (نجم:۳۹۔۴۱)

علامہ اقبال کائنات میں انسان کے مرتبہ کی طرف اشارہ کررہے ہیں، اور حقیقی انسان کے فقدان کا شکوہ بھی کررہے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ''رجال الفکر والدعوۃ'' میں مولانا رومی کے تذکرہ میں اس موضوع کو تفصیل سے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

حقیقی انسان کا وجود آج ویسے ہی مفقود ہے، جیسے پہلے تھا، یہاں تک کہ وہ عنقا ہو گیا ہے، محققین اور تلاش کرنے والے دیو جانس کے چراغ سے اس کو تلاش کررہے ہیں، مولانا رومی نے اپنے دیوان میں اس سے متعلق ایک واقعہ ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں: کل رات میں نے شہر میں ایک سن رسیدہ درویش کو دیکھا، وہ ہاتھ میں چراغ لئے کچھ تلاش کر رہا تھا، میں نے کہا: جناب! کیا تلاش کر رہے ہیں، فرمانے لگے کہ درندوں اور چوپایوں کی بستی میں

رہتے ہوئے طبیعت عاجز ہوگئی ہے، اب انسان کو تلاش کرنے نکلا ہوں، میں ایسے لوگوں کو اپنے اردگرد پاتا ہوں جو انسان نہیں ہیں، میں نے کہا کہ جس انسان کو آپ تلاش کررہے ہیں، اس کا ملنا آسان نہیں، میں نے ایک زمانے تک اس کو تلاش کیا، لیکن نہیں پایا، انہوں نے جواب دیا: جب میں کسی چیز کو نہیں پاتا ہوں تو میری تلاش بڑھ جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ اپنے نظریۂ انسان کامل میں مولانا رومیؒ کے تلاش انسان سے متأثر ہوئے، کیونکہ جو زمانہ علامہ اقبال نے پایا، وہ حقیقی انسان کے فقدان میں مولانا رومیؒ کے زمانہ سے زیادہ مشابہ تھا، اس وقت انسان صراط مستقیم سے بے گانہ ہو کر دیگر راستوں پر چل رہا تھا، خودغرضی، شخصی منفعت، قساوت قلبی کا غلبہ تھا، دنیا پرستی لوگوں کے ذہن ودماغ پر چھائی ہوئی تھی، طاعت سے جی چرانے اور عبادت سے دور رہنے کا دور دورہ تھا، تعمیر آخرت کے لئے کام کرنا مفقود ہو چکا تھا، جب کہ آخرت کا مسئلہ ایسا لرزہ خیز ہوگا کہ اس دن مال ومنال، اور اولاد و اسباب کچھ بھی کام نہیں آئیں گے، اسی مفہوم کو علامہ اقبال نے اپنے کلام میں واضح کیا ہے:۔

عربوں کی حالت اسلام سے پہلے

اقبال عربوں کے دور جاہلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعثت محمدی سے پہلے عربوں کا کوئی نظام نہ تھا، اور وہ فوضویت اور انارکی کے شکار تھے، ان کی زندگی جانوروں کی زندگی تھی اور کھانے پینے سے آگے ان کے سامنے زندگی کا کوئی اور مقصد نہ تھا، ان کی تلوار چمک دار ضرور تھی، لیکن جوہر سے خالی اور کند تھی، وہ اسلام سے پہلے اونٹوں کو چراتے تھے، لیکن اسلام کے بعد دنیا کی جہاں بانی ان کے حصے میں آگئی، اور ان کی تکبیر جہاد سے شرق وغرب گونج اٹھے:

حق ترا براں تر از شمشیر کرد　　سارباں را راکب تقدیر کرد
کار خود را امتاں برد ند پیش　　تو ندانی قیمت صحرائے خویش!
امتے بودی امم گر دیدۂ !　　بزم خود را خود زہم پوشیدۂ
ہر کہ از بند خودی وارست مرد !　　ہر کہ بابیگاں نگاں پیوست ، مرد

اقبال کا مضراب اصلاح

عربوں کی شجاعت اسلامی اور للّٰہیت کی مدح کے بعد انھیں یہ منظر غمناک کر دیتا ہے ،جب وہ دیکھتے ہیں کہ عربوں میں اب نشاط کے بعد جمود و بے حسی ، وحدت کی جگہ تفرقہ ، قیادت کے بجائے تقلید و پسماندگی پیدا ہوگئی ہے ،تو وہ انھیں دوستانہ عتاب کے ساتھ مخاطب کرتے اور کہتے ہیں:

تمہارے جمود وخمود پر ایک عالم افسوس کر رہا ہے کہ دوسری قومیں کس طرح تم سے آگے نکل گئیں ،تم نے اپنے صحراء کی قدر نہیں کی ، اور اس کے پیغام کو بھلا دیا ہے ،تم پہلے ایک ملت ،ملت مسلمہ تھے ،لیکن آج ٹکڑیوں اور گروہوں میں بٹ گئے ، پہلے حزب اللہ ہی تمہاری جماعت تھی ،لیکن اب تمہاری جماعتیں بے شمار ہیں ،عربوں کو معلوم نہیں کہ جو اپنی شخصیت اور حیثیت پر ظلم کرتا ہے ،اور اعتماد نفس کھو دیتا ہے ، وہ عالم وجود ہی سے مٹ جاتا ہے ، اور جو اپنی چھاؤنی سے نکل کر دشمن کی پناہ ڈھونڈتا ہے ، وہ ذلت و بدبختی اور محرومی و ناکامی کا منہ دیکھتا ہے ،اور عربوں کا دشمن ان سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ،انہوں نے خود اپنے ساتھ ناانصافی کی ،اور روح رسول ﷺ کو تکلیف دی ہے ، نبی ﷺ کی روح آج امت عربیہ سے شکوہ سنج اور گلہ گذار ہے :-

آنچہ تو باخویش کردی کس نکرد　　　روح پاک مصطفیٰ آمد بدرد!
اے ز افسون فرنگی بے خبر　　　فتنہ ہا در آستین او نگر !
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد　　　وحدت اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقہ دامش فتاد　　　آسماں یک دم اماں اورا نداد

شاعر ،افرنگ کے مکر وفریب ،اس کے خطرناک منصوبوں اور ارادوں کو خوب سمجھتا ہے ،اس لئے کہ اسے اس نے قریب سے رہ کر دیکھا ہے ، یہی وجہ ہے کہ وہ عربوں کو خوش گمانی میں مبتلا دیکھ کر قدرتی طور پر تکلیف محسوس کرتا ہے ، اور ان کی اس سادہ لوحی اور زود

اعتمادی پر فریاد کرتا ہے، کہ وہ انھیں اپنا نجات دہندہ اور مشکل کشا سمجھتے ہیں وہ انھیں مخاطب کر کے کہتے ہیں:

نادانو! عقل کے ناخن لو! تم فرنگ پر اعتماد کر رہے ہو، لیکن اس کے پوشیدہ عزائم کی تمہیں خبر نہیں، تمہیں معلوم نہیں کہ سحر فرنگ نے کتنوں کو مرد بیمار اور مجبور و گرفتار بنا کر رکھ دیا ہے، تمہیں نظر نہیں آتا کہ سحر فرنگ نے تمہاری وحدت ختم کر کے بیسیوں حکومتیں بنا دیں، اور جنگوں میں ان کا کُل سرمایہ لوٹ کر ایسا غارت کیا کہ کوئی غم خوار بھی نہیں ملا۔

اس کے بعد عربوں کو نشأۃ ثانیہ کے لئے ابھارتے ہوئے کہتے ہیں:

تمہیں اللہ نے جو بصیرت دی ہے، اس سے کام لو، اور دبی ہوئی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنا دو، اور اپنے اندر روح عرب پیدا کرو، اور اس راز کو سمجھ لو کہ قوت کا سرچشمہ دین وایمان ہی ہے، جو مومن کا سرمایہ ہے۔

اے صحراء نشینو! جب تک تمہارے دل اسرار الٰہیہ کے امین ہیں، تمہیں دین کے نگہبان اور دنیا کے پاسبان ہو، تمہاری فطرت خیر وشر کی میزان ہے، اور تم روئے زمین کے وارث ازلی ہو، جب تمہارا کوکب اقبال مطلع مشرق سے نمایاں ہوگا تو ہر روشنی ماند پڑ جائے گی۔

عصر خود را بنگر اے صاحب نظر — در بدن باز آفریں روح عمرؓ!
قوت از جمعیت دین مبین — دین ہمہ عزم است و اخلاص و یقین
تا ضمیرش راز دان فطرت ست — مرد صحرا پاسبان فطرت ست
سادہ طبعش عیار زشت و خوب — از طلوعش صد ہزار انجم غروب
عصر حاضر زادۂ ایام تست — مستی او از مئے گلفام تست!
شارح اسرار اُو تو بودۂ — اولیں معمار اُو تو بودۂ!
تا بہ فرزندی گرفت اورا فرنگ — شاہدے گردید بے ناموس و ننگ
گرچہ شیرین ست و نوشین ست او — کج خرام و شوخ و بے دین ست او

مرد صحرا پختہ ترکن خام را ــ بر عیار خود بزن ایام را

صحرا کی فضائیں تمہارے لئے تنگ ہوسکتی ہیں، لیکن اگر تم اپنی خودی کی تعمیر کرتے ہوتو تمہارے وجود کے آفاق بے کراں ہوجائیں گے، اور تم آندھی سے زیادہ تند اور سیلاب سے زیادہ بڑھ کر تیز ہوجاؤ گے اور بازی گاہ حیات میں تمہارا کوئی مقابل نہ ہوگا۔

آخر کس نے تمہیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے کر دیا ہے، حالانکہ عصر حاضر تمہاری ہی محنتوں کا پھل اور تمہاری دعوت وجہاد کا نتیجہ ہے، زمانے کی باگ جس دن سے تمہارے ہاتھوں سے نکل کر مغرب کے ہاتھوں میں آئی ہے اسی دن سے انسانیت نے اپنا وقار واعتبار، شرف وعزت اور کرامت وافتخار کھودیا ہے، اور منافقت ودین بیزاری اس کا شعار بن گیا ہے۔

اے بادیہ نشیں! اور اے صحرا نورد! اپنا مقام دیکھ اور رفتار زمانہ کو روک لے، تاریخ کا رخ موڑ دے، اور قافلۂ بشریت کی اس مقصد اعلی اور منزل آخر کی طرف رہنمائی کر:

بگذر از دشت ودرکوہ ودمن ــ خیمہ را اندر وجود خویش زن
طبع از باد بیاناں کردہ تیز ــ ناقہ را سردہ بمیدان ستیز
دامنش افرنگیاں تیغے بدوش ــ در ہلاک نوع انسان سخت کوش
رشتۂ سود وزیاں در دست تست ــ آبروئے خاوراں در دست تست
اے امین دولت تہذیب و دیں ــ آں ید بیضا بر آر از آستیں

(پس چہ باید کرد)

اقبال کی فریاد روح رسول عربی سے

علامہ اقبال روح رسول ﷺ سے مخاطب ہوتے ہیں، اور امت کی زبوں حالی کا رونا روتے ہیں، اور ایمان کی حرارت اور زندگی کے شعلے کے بجھنے پر آنسو بہاتے ہیں، اور اسلامی معاشرہ میں اسلام کے اجنبی ہونے کا شکوہ کرتے ہیں، اور روح محمد ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ وبے راحلہ و زاد
اس کوہ وبیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اقبال کو سخت تکلیف ہوتی ہے کہ عرب مغربی طاقتوں، یورپین اقوام کو اپنا دوست بنائیں، اوران سے اپنے مسائل ومشکلات حل کرائیں، اورخاص طور سے فلسطین کے مسئلہ کوان کے حوالہ کریں، اوراس حقیقت کونظر انداز کردیں کہ مغربی طاقتوں پر یہودی بری طرح مسلط ہیں، اوران کی سیاسی، اقتصادی اور صحافتی مشنری یہود کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جوشعلہ حیات تاریخ میں کبھی بڑی تب وتاب سے سامنے آیا تھا، وہ آج بھی عربوں کے اندر موجود ہے، اورکسی وقت بھی بھڑک سکتا ہے، مجھے امید ہے کہ عربوں کی مشکلات کاحل جنیوااورلندن میں نہیں ہے۔

اختتامیہ:

یہ چنداشعار تھے، جن کودیوان اقبال سے اس موقع کے لئے منتخب کیا گیا، استیعاب کا نہ ارادہ تھا، اورنہ اس کادعوی، بس میری خوش نصیبی ہے کہ یہ انتخاب من جانب اللہ آسان ہوا۔ اقبال عام شعراء کی طرح نہیں ہیں، بلکہ وہ پیغام، عقیدہ، ایمان اور حساس ضمیر رکھنے والے شاعر ہیں، ان کی وفات پراگرچہ ایک عرصہ گذر چکا ہے، لیکن ان کی شاعری کل کی طرح آج بھی زندہ وتابندہ ہے۔

جگر مرادآبادی کا کلام

اوران کا مقام ومرتبہ

رئیس المتغزلین جناب جگر مرادآبادی بیسوی صدی عیسوی کے ممتاز شاعرغزل شمار کئے جاتے تھے،ان کے کلام کی شیرینی اورتغزل کی چاشنی اور بلیغ انداز،فن شعرگوئی کی جملہ صفات وخصوصیات سے مزین ہے،اللہ تعالیٰ نے ان کوشاعرانہ قدرت اورشاعری کے سانچے میں ڈھلاڈھلایا کلام پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیت عطافرمائی تھی۔اگرچہ جگر صاحب نے اپنے آپ کوغزل کی حدتک شاعرقرار دیا ہے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے۔اس کے باوجود وہ ہر صنف سخن میں تغزل کی تلمیحات اوراشارات سے مبرانہیں تھے۔وہ کائنات اورزندگی کی حقیقتوں اورانسانی نفسیات کی وسعتوں،اپنے احساسات اورفنی تقاضوں کی پوری رعایت کرتے ہوئے ایسے مؤثر شاعرانہ طرزادا سے کلام کومزین کرتے تھے،جوسامعین کے قلب ودماغ کوعشق ومحبت کی روح سے معمورکردیتے تھے۔

صنف تغزل میں جگر کی شان امتیازی

وہ عشق کی وسعت بے پایاں سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے،بلکہ وہ اسی کوحوصلہ مندزندگی کے لئے ضروری قراردیتے تھے۔اوراس کی کسی حدتک نمائندگی بھی کرتے تھے، دیکھئے کس طرح وہ عشق وشوق کی وسعتوں کا ذکر کرتے ہیں اورمحبوب کومحبت وتعظیم کی عظیم ترین بلندیوں پر بٹھا کر کچھ اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ اپنے کلام کے ذریعہ عشق ومحبت

کے اسرار ورموز کا ایک سمندر نظروں کے سامنے متمثل ہو جاتا ہے۔وہ ہرگز روا نہیں رکھتے کہ محبوب کو ذرا بھی کوئی موردالزام قرار دے، اور اس کی کسی ادا پر تنقید کرنے کی جرأت کرے اور اس کے حسن ظاہر و باطن میں کسی قسم کا کوئی عیب نکالنے کی کوشش میں مصروف ہو، ان کے یہ دوشعر معنوی گہرائیوں کے ساتھ فنی حسن اور ادبی جمال وکمال کی ترجمانی کچھ اس طرح کررہے ہیں کہ جیسے نظروں کے سامنے عشق ومحبت اور حسن وجمال کا کوئی سمندر موج زن ہو:

عشق کی وسعتیں خدا کی پناہ! حوصلہ چاہئے وفا کے لئے
مجھ کو جو چاہو، ناصحو! کہہ لو کچھ نہ کہنا اسے خدا کے لئے

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۸ء کی بالکل ابتدائی تاریخوں میں لکھنو کی بارہ دری میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔اس میں اس وقت ملک کے بڑے بڑے شعراء ڈائس پر جلوہ افروز تھے۔سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔اخیر میں شہنشاہ تغزل جگر کی باری تھی، اور انہیں کے کلام پر مشاعرے کا مسک الختام تھا۔جگر نے غزل پڑھنا شروع کی اور ہر طرف سے تحسین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔اور جب یہ دوشعر جگر صاحب نے گوش گزار کیے تو دادو تحسین کا ایک شور برپا ہوگیا۔ہر طرف سے مکرر ارشاد کی آوازیں آنے لگیں۔اور جگر صاحب نے اپنے خاص ترنم میں پھر یہ شعر پڑھے اور یہی دراصل حاصل مشاعرہ تھا۔

جگر پر فکر آخرت کا غلبہ

اسی طرح یاد پڑتا ہے کہ بارہ دری میں دار فانی کو الوداع کہنے سے پہلے جگر صاحب مشاعرے میں مدعو ہوئے، اور ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ زندگی کے آخری مشاعرے میں شریک ہورہے ہیں اور دنیا چھوڑ کر دار آخرت کے سفر کی تیاری میں مشغول ہیں۔انہوں نے اپنی زندگی میں دنیا کی رعنائیوں ومستی کا بڑی گہرائی و گیرائی سے تجربہ کیا تھا اور وہ اب دوسری دنیا کی تعمیر میں مصروف تھے۔زندگی کے پہلے دور کی خطاؤں کو یاد کرکے رورہے

تھے،اورآنے والی دنیامیں جزاوسزاکا یقین لیکرکسی ایسے عمل کی تلاش میں تھے،جس سے دوراول کی خطاؤں اور گناہوں کی تلافی ہوسکے، اور آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے روبرونظریں جھکائے ہوئے جب حاضرہوں تواللہ تعالیٰ خودفرمادیں کہ میرے اس بندے کو جنت کی نعمتوں اوراس کی وسعتوں میں لے جاؤ۔

یہی تصورغالب تھا۔اس مشاعرے کی حاضری میں،غالبادارآخرت کے سفرکی تیاریوں کی فکرمیں منہمک تھے،جیسے وہ یہ اپنے شعرگنگنارہے ہوں:

جزذوق طلب، جزذوق سفر، کچھ اورہمیں منظورنہیں
اے عشق بتا،اب کیاہوگا،کہتے ہیں کہ منزل دورنہیں

اس نفع وضررکی دنیاسے،میں نے یہ لیاہے درس جنون
خود اپنا زیاں تسلیم مگر، اوروں کا زیاں منظورنہیں

اسی فکرکی عکاسی ان کے اس مشہورشعرسے بھی ہوتی ہے:

اللہ اگرتوفیق نہ دے ،انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی،عرفان محبت عام نہیں

اس مشاعرے میں انہوں نے خاص طورسے جواشعارگوش گزارکیے وہ پیش کیے جارہے ہیں،اس میں دنیاسے بےزاری اورآنے والی دنیاکے سفرکی تیاری کامفہوم جھلکتاہے:

جان کرمن جملہ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویاکریں گے، جام وپیمانہ مجھے

ننگ مے خانہ تھا میں ، ساقی نے یہ کیا کردیا
پینے والے کہہ اٹھے ''یاپیرمیخانہ!'' مجھے

سبزہ وگل ، موج ودریا، انجم و خورشید و ماہ
اک تعلق سب سے ہے، لیکن رقیبانہ مجھے

زندگی میں آگیا، جب کوئی وقت امتحان
اس نے دیکھا ہے جگر! بے اختیارانہ مجھے

مجھے خیال ہے کہ جگر صاحب کی زندگی کا پہلا دور وہ ہے، جو بزم مے سجانے اور میکدے کے جلوؤں کے درمیان گزرا۔ اس کی مثال اس کھاد کی ہے جو زمین کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت اور غذائیت سے بھرپور بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ جگر صاحب کے مزرعہ حیات میں زراعتی کھاد کا ایک بڑا حصہ پہلے ہی سے پہنچ چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایمان ویقین کی پیدوار کا دور شروع ہوا۔ وہ اس لہلہاتے ہوئے سبزے سے عقیدۂ توحید ورسالت کی جڑوں کو برابر مضبوط کرتے رہے، اور وہ ساقی کی کسی ادا پر بل کھا کر پینے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے۔ جب کہ وہ اپنے عہد میں پینے سے توبہ کرنے کے باوجود اپنی توبہ پر قائم نہ رہ سکے، اور انتہائی صراحت سے کہہ گئے:

توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا
لہروں پہ کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

لیکن اب جگر صاحب ایک سچے اور مسلمان شاعر تھے اور پینے پلانے کے ذکر سے بھی ان کو وحشت ہونے لگی۔ اب ان کا تعلق زیادہ تر اہل علم ودین سے بڑھنے لگا، انہوں نے اپنے عصر کے مشہور علمائے دین سے تعلق رکھنے کے ساتھ شعر وسخن کے سلسلے کو جاری رکھا اور اس سے اخیر تک دست بردار نہیں ہوئے، یہی وجہ ہے کہ اب ان کی شاعری میں غم جاناں سے بڑھ کر فکر آخرت کا سودا سوار تھا، اور اب اپنے کلام میں اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے لگے۔ اور انسان دوستی کی پستی وبلندی کا نہایت خوبصورت انداز میں ذکر کر کے انسانیت کی بلندی کو آواز دینے لگے۔ ذرا ان کے یہ اشعار سماعت کیجئے:

باہمہ ذوق آگہی، ہائے رے پستی بشر
سارے جہاں کا جائزہ، اپنے جہاں سے بے خبر

شورش درد الاماں، گردش دہر الحذر
بہکے ہوئے سے قافلے، سہمی ہوئی سی رہ گزر

جگراور حضرت حسان بن ثابت (رضی اللہ عنہ) میں یک گونہ مماثلت

جگر صاحب کی دونوں مرحلے کی زندگی کو ہم جاہلیت اور اسلام کی زندگی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور شاعر اسلام سیدنا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی زندگی سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ ان کو قبل از اسلام جاہلیت کا ماحول ملا اور انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو جاہلیت کا دفاع، اور خاندانی شرافت کے اظہار اور آل غسان کی مدح وستایش اور انکی داد ودہش اور محبوب کے حسن وزیبائش کے تذکرے میں گزاردی اور فخر ومباہات میں دوسرے شاعروں سے سبقت لے گئے، ان کا قصیدۂ مخضرمہ جوان کی زندگی کے دونوں ادوار کے کلام پر مشتمل ہے، ان کی شاعرانہ قدرت وعظمت اور ندرت وجدت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے۔

عفت ذات الأصابع فالجواء   الى عذراء منزلها خلاء

اسی قصیدے کو ابھی وہ پورا نہ کر سکے تھے کہ اسلام کی دولت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مالا مال کیا اور قصیدے کی انتہا رسول اللہ ؐ کی مدحت وتعظیم پر ہوئی۔ مکے کے شاعر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ہاشم جو اس وقت تک دولت اسلام سے مشرف نہیں ہوئے تھے، اور دین اسلام کو اپنی خاندانی روایات سے الگ ایک مذہب تصور کرتے تھے، ان کو بھی مخاطب کیا۔ ابوسفیان بن حارث حضور اکرم ؐ کے چچازاد اور رضاعی بھائی تھے۔ انہوں نے دورِ جاہلیت میں حضور اکرم ؐ کے خلاف اپنی شاعرانہ طاقت کو استعمال کیا تھا، اس کے جواب میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اسی قصیدے کے آخر میں یہ اشعار کہے:

ألا أبلغ أباسفيان عني   فأنت مجوف نخب هواء
بأن سيوفنا تركتك عبداً   وعبدالدار سادتها الاماء
هجوت محمداً فأجبت عنه   وعندالله في ذاك الجزاء
أتهجوه ولست له بكفؤ   فشركما لخيركما الفداء

هجوت مباركاً براً حنيفاً أمين الله شيمته الوفاء
فمن يهجو رسول الله منكم ويمدحه وينصره سواء
فان أبي ووالده وعرضي لعرض محمد منكم وقاء

(سنو! ابوسفیان کو میری طرف سے یہ پیغام پہونچا دو (اور تم کھوکھلے اور بے وزن ہو) کہ ہماری تلواروں نے تم کو غلام بنا کر چھوڑا ہے، اور عبدالدار کے سردار باندیاں ہیں، تم محمد (ﷺ) کی ہجو کی ہے، تو میں نے ان کی طرف سے جواب دیا، اور اللہ تعالی کے نزدیک مجھے اس پر ثواب کی امید ہے، کیا تم ان کی برائی کرتے ہو، جب کہ تم ان کے ہمسر نہیں، جب کہ تمہارا برا اپنے بھلے پر قربان ہے، تم نے ایک بابرکت، نیک اور موحد شخص کی برائی کی ہے، اور اللہ کے نزدیک امانت دار شخص کی، جن کی صفت وفاداری ہے، تو جو رسول اللہ ﷺ کی مذمت کرے، اور جو ان کی تعریف کرے اور مدد کرے، وہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں، میرے والد، میرے دادا اور میری آبرو محمد (ﷺ) کی عزت کے تحفظ کے لئے قربان ہے)

حیات جگر کا دور اول اور اس کے کچھ نمونے

اب ذرا جگر صاحب کی زندگی میں عہد اول اور اس کے عہد ثانی کے نمونے گوش گزار کرنے کی اجازت دیجئے۔ وہ اپنے پچھلے دور میں شراب و کباب اور میخانے و میکدے کے سوا کچھ اور نہیں سوچتے تھے۔ حسن و عشق کا مضمون بھی اس سے خالی نہیں رہتا تھا۔ چند اشعار ہیں:۔

کام آخر کر گئی وہ نرگسِ مستانہ آج
بھر گیا بے منتِ ساقی میرا پیمانہ آج
جھک گیا ایک ایک میکش اس نگاہ مست سے
تم ادھر دیکھا کئے اور لٹ گیا مے خانہ آج
جرعۂ مے کی ادائیں نگہِ ناز میں ہیں
چشمِ مخمور میں کل رازِ ہے مے خانے کا

☆☆☆

یہی صہبا، یہی ساغر، یہی پیمانہ ہے

☆☆☆

کہیں ساغر بکف گل ہیں، کہیں خم در بغل غنچے
چمن ہی میکدہ بھی بن گیا، جب سے بہار آئی

ساقیا توبہ کئے لیتے ہیں
لے گنہگار ہوئے جاتے ہیں

مشروط نگاہِ ساقی کی تحریک پہ جس کا پینا ہے
بس اس کا ساغر ساغر ہے، بس اس کا مینا مینا ہے

☆☆☆☆

تو ساقی میخانہ ہے، میں رندِ بلانوش
میرے لئے میخانے کو میخانہ بنادے
اللہ نے تجھ کو مے و مے خانہ بنایا
تو ساری فضا کو مے و مے خانہ بنادے

☆☆☆

مے و مینا کے پردے ان کو دھوکا دے نہیں سکتے
ازل کے دن سے جو راز مے و مینا سمجھتے ہیں

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

یہ مے کشی ہے تو شانِ مے کشی کیا ہے
بہک نہ جائے جو پی کر، وہ رند ہی کیا ہے
بس ایک سمت اڑا جا رہا ہوں وحشت میں
خبر نہیں کہ خودی کیا ہے، بے خودی کیا ہے
میں زہرِ مرگ گوارا کروں کہ تلخیِ زیست
میری خوشی تو ہے سب کچھ، تری خوشی کیا ہے

لبوں پہ موجِ تبسم ، نگہ میں برق غضب
کوئی بتائے، یہ اندازِ برہمی کیا ہے؟
کسے مجال کہ افشائے رازِ یار کرے
یہ زندگی ہی سے سمجھو کہ زندگی کیا ہے؟
ستم کشانِ محبت سے کوئی پوچھے تو
امید پر ہے بھروسہ، امید ہی کیا ہے؟(۱)

اصغر اور جگر میں یکسانیت

۱۹۲۰ء میں جگر صاحب نے اصغر گونڈوی سے اپنے تعلقات استوار کیے۔ شاعری کی دنیا میں اصغر گونڈوی کی شہرت بھی کم نہ تھی۔ دونوں شاعروں کی ایک دوسرے سے مناسبت ہونا ایک طبعی بات ہے، وہ بھی عشق و محبت کے شاعر ہونے کی وجہ سے جگر صاحب سے زیادہ مانوس ہوئے۔ اصغر گونڈوی صاحب نے عشق کی ناکامیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جب یہ کہا:

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے، وہی رائیگاں نہیں

تو جگر نے عشق کی وسعتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

کس کو رہا ہے پاسِ عشق
کس کو رہے گا پاسِ حسن
حسن میں گم ہوا ہے عشق
عشق میں گم ہوا ہے حسن

اور سوزشِ عشق کی تعبیر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

کوچۂ عشق سے باہر وہ نکل جائے جگر
جیتے جی خاک میں ملنا، جسے منظور نہ ہو

عشق کا مذاق اڑانے والوں کو دیکھ کر یوں گویا ہوئے:

ہنسی پھراڑنے لگی، عشق کے فسانے کی
نقاب اٹھاؤ، بدل دو فضازمانے کی
چلی کچھ ایسی مخالف ہوازمانے کی
پناہ برق نے لی ، میرے آشیانے کی
یہ شرح ہے دلِ عشاق کے فسانے کی
کہ گردشیں اسی محور پہ ہیں زمانے کی

اور عشق میں بے خودی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ گئے

بے خودی حد سے زیادہ بڑھ چلی جب عشق میں
بے حسی کو پردہ وارِ رازِ پنہاں کردیا
عشق نے دردِ زلیخا بھردیا کونین میں
حسن نے ساری فضا کو یوسفستاں کردیا(۱)

جگر کا دوسرا دور حضرت مولانا علی میاں ندوی کی نظر میں

پھر وہ دن آہی گیا، جب جگر صاحب نے مے و مے خانے سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور اب ان کے کلام میں پہلے سے زیادہ طاقت، جوش اور عشق حقیقی کے مفہوم کو شعر وادب کے ماہرین اور قلب ونظر کے راز آشنا حضرات نے نہ صرف یہ کہ محسوس کیا، بلکہ اس کو دریافت کر کے اس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے اس عہد زریں کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان کے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان کا کلام اور ان کی زندگی اس کی پوری طرح تصدیق کرتے ہیں کہ اس ''آبِ نشاط انگیز'' کے چھوڑ دینے کے بعد دل کے شعلے سرد

(۱) کلیاتِ جگر، ص: ۲۵۳۔۲۵۴

ہو جاتے ہیں اور کلام پھیکا اور بے نمک ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن جگر کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ جگر کا کلام اس تعمیرِ حال کے بعد کہیں بلند، زیادہ پرجوش، زیادہ نشاط انگیز اور ولولہ خیز ہے، اور اس میں کہیں زیادہ زندگی اور تابندگی ہے۔ جس کا جی چاہے ''شعلۂ طور'' اور ''آتشِ گل'' کا مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ حرارت و جوش بادۂ عینی سے حاصل کرتے تھے، اب وہ حرارت و جوش پیمانۂ دل اور میخانۂ وطن سے حاصل کرنے لگے، جس کا جوش کبھی سرد نہیں ہوتا۔ اور ان کو حق ہوا کہ وہ خواجہ میر درد کے الفاظ میں یہ کہہ سکیں:

جائیے کس واسطے اے درد! مے خانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے، اپنے دل کے پیمانے کے بیچ''(۱)

جگر مرادآبادی ایک جرأت مند شاعر

تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے واقعے سے جگر صاحب بہت متاثر ہوئے اور ان کے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ ان کا شعور دینی اب بیدار ہو چکا تھا اور اسلامی غیرت و حمیت نے ان کے شاعرانہ تخیل میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ حضرت مولانا اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تقسیم ہند نے جگر صاحب کے قلب و جگر پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ ملک میں انقلاب رونما ہوا تھا اور آئندہ جو خطرے نظر آ رہے تھے، انہوں نے ان کی شاعری پر بھی گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ وہ بڑے حساس اور دردمند دل اور بڑی غیور طبیعت کے آدمی تھے۔ تقسیم کے بعد حکومت کے انتظام و سرپرستی میں یا حکومت کے اشارے و تحریک سے جو مشاعرے قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں یا جشن آزادی کے موقعہ پر ہوئے تھے۔ ان کی غزلوں میں اس کی طرف صاف اشارے اور ان کی روح کا کرب بالکل عیاں تھا۔ یہ ان کی شاعری کا اقبال اور ان کے زورِ کلام کا جادو تھا کہ چمن میں ان کی یہ تلخ نوائی اور آشفتہ بیانی گوارا کر لی جاتی تھی، ورنہ

---

(۱) پرانے چراغ، ج۱، ص: ۳۲۱-۳۲۲

دوسرے کا یہ کام نہ تھا کہ حکومت کے بڑے ذمہ داروں اور اعلیٰ افسروں کے سامنے موجودہ نظام پر ایسی کھلی ہوئی تنقید، اس سے بے اطمینانی و مایوسی کا صاف اظہار، اور آزادی کے چشمۂ رواں کے سراب ہونے کا اعلان نہ صرف سن لیا جائے، بلکہ اس کی ایسی داد دی جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنی جائے۔ یہاں صرف دو شعر لکھے جاتے ہیں، جن کے اندر ایک پوری کتاب کا مضمون اور ایک دور کی بولتی ہوئی تصویر ہے:

بے خودی حد سے زیادہ بڑھ چلی جب عشق میں
بے حسی کو پردہ دار راز پنہاں کر دیا
عشق نے دردِ زلیخا بھردیا کونین میں
حسن نے ساری فضا کو یوسفستان کردیا

جگر صاحب کی حضرت مولانا علی میاںؒ کی خدمت میں حاضری

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سابق قیام گاہ مرکز تبلیغ ودعوت کچہری روڈ پر جگر صاحب تشریف لاتے اور حضرت مولانا ان سے غزل سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ مجھے بھی دو مرتبہ اس مجلس میں شریک رہ کر حضرت مولانا کے سامنے ان کو اپنی غزل سناتے ہوئے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ ان کا ترنم بھی بہت پرکشش تھا۔ ان کی شاعری کا حسن تو عالم آشکار تھا۔ حضرت مولانا کو ان کے کلام پر داد دیتے ہوئے دیکھ کر جگر صاحب کی عظمت اور ان کے کلام کی معنویت کا احساس دل میں پیدا ہوا۔ ان کے چند اشعار وردِ زباں ہو گئے:

وہ سبزہ تنگِ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے
وہ پھول زخمِ بہاراں، جو مسکرا نہ سکے
یہ مہر وماہ مرے ہم سفر رہے برسوں
پر آج تک وہ میری گرد کو بھی پا نہ سکے
یہ آدمی ہے، وہ پروانہ شمع حکمت کا

جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے
گھٹے اگر تو بس، اک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

جگر صاحب پر میرا پہلا مضمون

اسی زمانے میں میں نے ان اشعار کو عربی لباس میں منتقل کرنے کی کوشش کی، اور البعث الاسلامی جلد دوم کے پانچویں شمارے میں اپنے تاثرات کو چند سطروں میں پیش کیا:

''جگر مرادآبادی اپنے عہد کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں ان کے معاصرین میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں۔ ان کے جملے اور تعبیرات، مختصر اور فصیح و بلیغ اشارات، سنجیدہ اور عام فہم اسلوب، مزید براں ان کی نرم خرام آواز سامعین کے دلوں میں اثر انداز ہوتی اور ایسا نقش قائم کردیتی کہ وہ بھی انہیں کے ساتھ نغمہ سرا ہوجاتے۔ نوجوان شعراء ان کے اسلوب کلام کی نقالی کرتے اور ان کے لے میں پڑھنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ جگر ایک اسلام پسند شاعر تھے۔ ان کا دورِ اول شراب و کباب میں گزرا۔ لیکن جب انہوں نے توبہ کی تو اپنی زندگی کو فرشتہ صفت بنالیا۔ ان کی یہ خوبیاں ان کے اشعار سے پوری طرح ہویدا ہیں۔ وہ اپنے دونوں دور کے اعتبار سے شاعر اسلام حضرت حسان بن ثابتؓ کے مماثل ہیں۔ ناقدینِ اردو ادب نے ان کی شاعری کے دو دور بیان کئے ہیں: ایک دورِ اول (شراب نوشی کا دور) دوسرا دورِ ثانی (اسلام پسندی کا دور)۔ کچھ شعراء ان کے دورِ اول کے حامی اور کچھ ان کے دورِ ثانی کے مؤید ہیں۔ غرض ان کی شاعری ہر اعتبار سے اپنی ایک شان رکھتی ہے۔''

گجرات کی چند شخصیات
ماضی اور حال کے آئینہ میں

گجرات کا جائے وقوع:

ریاست گجرات ہندوستان کے جنوب مغرب میں واقع ہے، اس کے مشہور شہروں میں سورت، کاٹھیاوار، احمد آباد، پٹن، پور بندر، جعفر آباد، بھاؤنگر، راندیر، راجکوٹ ہندوستان کی تاریخ میں معروف ومشہور ہیں، صوبۂ گجرات کے دو حصے کہے جاسکتے ہیں، ایک حصہ اس کے چاروں طرف بڑی آبادیاں ہیں، دوسرا حصہ جس کا تعلق سمندری راستوں سے ہے، اس میں تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی کا راستہ ہے، اس لئے اس کو جزیرۂ نما سے تعبیر کرتے ہیں، وہاں کا سب سے بڑا مشہور دریا جو بحر عرب سے جاملتا ہے، وہ نربدا کے نام سے مشہور ہے، نربدا کے ساحل سے شمالی حصے تک پہاڑوں کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو گجرات کے شمال مشرق سے ملتا ہے، خلیج ''کچھ'' اس صوبہ کے شمال مغرب میں واقع ہے، اس کا مشہور ساحل جام نگر اور پور بندر ہے، یہاں کے جزیرے بھی مختلف ناموں سے مشہور ہیں، اور پہاڑوں کے بھی الگ الگ نام ہیں، صوبۂ گجرات سمندری پانی کی کثرت سے نمک کی پیداوار میں مشہور ہے، گجرات کا مغربی حصہ بحر عرب کے سامنے واقع ہے، اس کے سامنے سلطنت عمان ہے، اور دائیں طرف خلیج فارس، اور بائیں طرف خلیج عرب ہے، عدن یمن کی پرانی بندرگاہ ہے، اور وہاں کا مشہور شہر حضر موت صوبۂ گجرات کے سامنے واقع ہے۔

مسلمانوں کا صوبۂ گجرات میں داخلہ

قرن اول میں انہیں راستوں سے عرب مسلمان صوبۂ گجرات میں داخل ہوئے، اور متعدد صحابۂ کرام اور اصحاب علم ودعوت بھی اسلام کی دعوت لے کر وہاں پہنچے، طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ ہندوستان جہالت اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑ ہوا تھا، کفر اور وثنیت کی تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی، اچانک عرب مسلمانوں کے آنے سے یہ صوبہ نور اسلام سے روشن ہوا، حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانے ۱۴ھ میں مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا اور ۱۵ھ میں عثمان بن ابوالعاص ثقفی کو طائف سے منتقل کر کے بحرین اور سلطنت عمان کا والی بنایا، چنانچہ انہوں نے اور ان کے بھائی حکم اور مغیرہ نے ہندوستان میں داخل ہو کر تھانہ، بھروچ، اور دَیبل میں دین اسلام کی روشنی پھیلائی۔

ہندوستان کے حکمرانوں میں سب سے پہلے غیاث الدین بلبن کا عہد ۱۲۶۴ء کو اس صوبہ میں شروع ہوا، پھر جلال الدین خلجی ۱۲۷۵ء اور علاء الدین ۱۲۹۷ء، اور ۱۳۰۶ء مطابق ۷۰۶ھ میں خلجی سلطنت کا مکمل دور دورہ ہو گیا، یوں تو دعوت اسلام کے سلسلہ میں حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بہت سے صحابہ وتابعین دعوت اسلام لے کر صوبۂ گجرات میں آئے تھے، نربدا اور اس کے بڑے دریاؤں سے بحر عرب کے اتصال ہونے کی بنا پر عربوں کا اس صوبہ میں آنا بنسبت دوسرے صوبوں کے زیادہ آسان تھا، یہی وجہ ہے کہ صوبۂ گجرات میں عربوں کی آمد ورفت کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا، اس کے نتیجہ میں گجرات میں عرب مسلمانوں کی آمد سے بہت سے علوم وفنون رائج ہوئے، جیسا کہ حضرت مولانا سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الہند فی العہد الاسلامی'' میں تحریر فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں بہت سے ایسے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن اور فرمانروائی کے طریقے رواج پذیر ہوئے، جو ماضی کی تاریخ میں کبھی نہیں پائے گئے، اسی طرح سے تجارت اور زراعت کو بھی پھیلنے کا موقع ملا،

اور عہد اسلامی کی برکت سے اس ملک کو ایک نئی زندگی حاصل ہوئی“۔

سلطان احمد شاہ گجراتی

سلطان احمد شاہ گجراتی آٹھویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے، انہوں نے صوبۂ گجرات کو جنت نشان بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، اور اہل علم کی قدر افزائی کی، اور ان کو علوم وفنون کے رقبہ کو وسعت دینے پر آمادہ کیا۔

سلطان مظفر حلیم گجراتی

سلطان مظفر حلیم گجراتی نویں صدی ۸۷۵ھ میں گجرات میں پیدا ہوئے، اور گہوارۂ سلطنت میں انہوں نے نشو ونما پائی، جنگی فنون میں اپنے اسلاف سے بہت آگے بڑھے، بلکہ علم وادب اور عمل صالح میں بھی ان کا کوئی نظیر نہ ہوا، ان کے ایام سلطنت میں عدل وانصاف، سخاوت وعالی ظرفی اور سرحدوں کی حفاظت کرنے کے ساتھ اہل علم کی تعظیم بھی داخل تھی، تقویٰ اور عزیمت میں وہ اونچے درجہ پر فائز تھے، اور قول وفعل میں رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کے عاشق تھے، اور ان پر پوری طرح عمل پیرا تھے، ہمیشہ باوضو رہتے اور جماعت سے نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کے دور میں نہ صرف صوبۂ گجرات بلکہ ہندوستان کے دیگر حصے بھی خوشحال وشاداب اور انصاف کی لذتوں سے سرفراز تھے، انہوں نے اہل حجاز کی تکریم وتعظیم، اور ان کے ساتھ نیک سلوک اور سخاوت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔

شیخ محمد طاہر پٹنی اور علم حدیث

اس مختصر گفتگو کے بعد گجرات کی ایک عظیم شخصیت شیخ محمد طاہر پٹنی کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

دسویں صدی ہجری میں صوبۂ گجرات علوم وفنون کا گہوارہ تھا، خاص طور سے اس صدی میں گجرات میں بہت سے علمائے حدیث پیدا ہوئے، اور حدیث شریف کی خدمت میں انہوں نے اپنی توانائیاں صرف کیں، علامہ سیوطی کی جامع کبیر کی تحقیق وتبویب میں شیخ

علی متقی (متوفی ۹۷۵ھ) نے زندگی کا بیش قیمت حصہ صرف کیا، اور ''الجامع الکبیر'' کو ایک نئی زندگی عطا کی، چنانچہ یہ کتاب بڑی تقطیع کی آٹھ جلدوں میں تیار ہوئی، علامہ محمد طاہر پٹنی شیخ متقی کے اہم ترین شاگردوں میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کا شمار ہندوستان کے باکمال علماء اور محدثین میں ہوتا ہے، انہوں نے اپنی ساری توانائی علم حدیث کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش میں صرف کی، اس کے نتیجہ میں محدثین کی ایک جماعت پیدا ہوئی، انہوں نے علم حدیث کی خدمت اور اس سے اشتغال کے زمانہ میں محسوس کیا کہ حدیث شریف کے متن اور اسکے مجموعہ میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں، جو لغوی اعتبار سے تشریح طلب ہیں، قرآن کریم کے بھی تشریح طلب الفاظ کو جمع کر کے مندرجہ ذیل خصوصیات کا پورا لحاظ رکھا:

کتاب کا اصل نام ہے "مجمع بحار الأنوار فی غرائب التنزیل ولطائف الأخبار" ۔اس طرح یہ کتاب اپنی جامعیت کے لحاظ سے حدیث کے الفاظ کی نہ صرف لغوی تشریح ہے، بلکہ انہوں نے اعراب کی خصوصیات اور اس کی باریکیوں کو بھی بیان کیا ہے، اور الفاظ کے تشریح کے وجوہ کو بھی زیر تحریر لائے ہیں، اگر الفاظ کی تشریح کے بعد بھی کوئی اشکال باقی رہ جائے تو اس کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، تا کہ مطالعہ کرنے والے کو مزید شروح وحواشی کا سہارا نہ لینا پڑے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر کتاب کی طبع جدید کے مقدمہ میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی (رحمۃ اللہ علیہ) کے قلم سے جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جائے:

۱۔بسا اوقات لفظوں کے معنی مشہور ہوتے ہیں تو اصحاب معاجم حدیث اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن صاحب کتاب نے ان کے بھی معنی سیاق وسباق کے لحاظ سے ذکر کئے ہیں، اور مستند کتابوں کے حوالہ سے اسکے صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے۔

۲۔محدث ابن اثیر نے الفاظ حدیث پر اعراب کا اہتمام نہیں کیا ہے، لیکن صاحب کتاب نے اس کی طرف بھی توجہ دی ہے۔

۳۔حدیث میں جو الفاظ جس طرح آئے ہیں، اسی طرح انہوں نے طلباء کی آسانی کی

خاطر ذکر کیا ہے مثلاً اثمد و أجادب۔

۴۔ الفاظ کے جن مشتقات کے معانی ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے نہیں ذکر کئے ہیں، مصنف نے اس کا اہتمام کیا ہے، مثلاً برأ کے ذیل میں استبرأ لدینه، أبرأ الی الله، فتبرئکم الیهود کا تذکرہ نہیں کیا ہے، صاحب کتاب نے اس کمی کی تلافی کی ہے"۔

شیخ علی متقی جوان کے استاد تھے، انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ وہ شیخ محمد طاہر پٹنی کی خوبیوں کی طرف اشارہ کررہے ہیں، یہ ان کے لئے بڑے فخر کی بات اور عند اللہ ان کی قبولیت کی علامت ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علم حدیث میں ایک عظیم مقام حاصل کیا، اور صلاح وتقوی میں اپنی مثال آپ تھے۔

شیخ محمد طاہر پٹنی جو ملک المحدثین کے لقب سے مشہور ہیں، ۹۱۳ھ میں پٹن میں پیدا ہوئے، قبل البلوغ انہوں نے قرآن کریم حفظ کیا، اور حصول علم میں انہوں نے تقریباً ۱۵ رسال گذارے، اس اثناء میں متعدد علوم وفنون میں انہوں نے مہارت وبراعت حاصل کی، اور اپنے تمام ہم درس ساتھیوں سے فوقیت لے گئے، کہا جاتا ہے کہ وہ فن حدیث میں اتنے اونچے درجہ تک پہنچے، جہاں کسی کی رسائی نہیں ہوئی، بلاد ہند میں ان کے اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی حیثیت سے بلند ہونے اور اپنی کتاب " مجمع بحار الأنوار" لکھنے کے بعد سفر حج کی سعادت عطا فرمائی، حرمین شریفین میں پہونچ کر انہوں نے برابر طلب علم اور وہاں کے علماء سے استفادہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا، اور بہت سے علمائے حرمین سے استفادہ کیا، اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، وہاں کے مشہور علماء میں جن سے استفادہ کی صورت پیدا ہوئی: شیخ حسن البکری، شیخ ابن حجرا لهیثمی ،شیخ علی بن العراق، شیخ علی المتقی ،(اس وقت وہ مکہ میں قیام پذیر تھے) شیخ جار اللہ بن فہد اور عدن جاکر شیخ عبد اللہ العیدروس سے تصوف میں استفادہ کیا۔

شیخ محی الدین عبد القادر بن شیخ عبد العیدروس نے اپنی کتاب "النور السافر عن

أخبار القرن العاشر" میں تحریر کیا ہے کہ شیخ محمد بن طاہر نے اپنے والد شیخ طاہر سے وراثت میں بہت زیادہ مال حاصل کیا تھا، اور اس کو وہ حدیث شریف کے طلباء پر خرچ کیا کرتے تھے، وہ مدرسوں کے ذمہ داروں سے ایسے طلباء کے بارے میں معلومات حاصل کرتے، جو طلب علم کا شوق رکھتے ہیں، اور ذہین ومحنتی ہیں، ان کو بلوا کر جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی دیتے تھے، اور ازراہ شفقت یہ فرماتے تھے کہ عزیز طلباء! تم خوب محنت کر کے علم حدیث میں مہارت حاصل کرو، اور میں تمہارے اور تمہارے خاندان کے بقدر کفایت معاش کا پورا ذمہ لیتا ہوں، لہٰذا پوری فارغ البالی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہو جاؤ، اہل حاجت عوام کی بھی پوری خبر گیری کرتے تھے، اور ان کے لئے اور کمزور طبقہ کے لوگوں کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اور اسے برابر ان میں تقسیم کرتے تھے، طالب علمی کا زمانہ ان پر بہت سخت گذرا، تو انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالی علم کی دولت عطا فرمائیں گے، تو صرف اللہ کی رضا جوئی کے لئے لوگوں تک پہونچاؤں گا، بلاشبہ ایسا ہی ہوا، اخلاص واحتساب اور تعلق باللہ ان کا اصل امتیاز تھا۔

ان کی وفات شہادت کے طور پر ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرق باطلہ سے مناظرہ کرتے تھے، جیسے مہدویت اور رافضی فرقے سے، اور ان کو باطل چھوڑ کر حق کی طرف لانے کی پوری کوشش میں مصروف تھے، ان کی یہ کوششیں برابر جاری رہیں، اور باطل چھوڑ کر حق کی طرف لوٹانے کے لئے پوری طرح مستعد تھے، وہ مختلف مجلسوں میں باطل پرستوں اور گم کردہ راہ فرقوں کے کمزور پہلوؤں کو بیان کرتے تھے، اور وقتاً فوقتاً ان سے مناظرہ بھی کرتے تھے، بڑی کوششوں اور علمی اور عقلی دلائل سے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی اور وہ راہ راست پر آنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو انہوں نے ان کے کفر اور گمراہی کا فتویٰ صادر کیا،، وہ چاہتے تھے کہ یہ باطل فرقے صحیح دین کی طرف لوٹ آئیں، اس ارادہ سے انہوں نے سلطان وقت سے رابطہ قائم کیا، تاکہ سلطان وقت ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں، یہ بات باطل پرستوں کو سخت ناگوار گذری اور انہوں نے سازش کر کے ان کو شہید کر ڈالا، انا للہ وانا الیہ راجعون ،

اور یہ واقعہ ۶ رشوال ۹۸۶ھ میں ان کی جائے قیام پر پیش آیا۔

ان کی کتاب مجمع بحار الأنوار علماء کی نظر میں

چونکہ اللہ تعالی نے شیخ محمد طاہر پٹنی سے علم حدیث کی عظیم ترین خدمت لینے کا فیصلہ فرمایا تھا، اس لئے یہ کتاب علماء اور خاص طور سے علمائے حدیث کی نظر میں بڑا درجہ رکھتی ہے، اس لئے علمائے کرام کی طرف سے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوتے ہی (جو مصنف کے زمانہ میں طبع ہوگیا تھا) اس کو حاصل کرنے کی ہر طرف سے زبردست کوششیں ہوئیں، اور لوگوں نے اس کے نسخہ کو حاصل کرنے کو ایک بڑی عزت وشرف کی بات سمجھی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے لکھا ہے: یہ کتاب صحاح ستہ کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے کے لئے کافی ہے، علامہ سید صدیق حسن خاں قنوجی لکھتے ہیں: ”حاصل کلام یہ ہے کہ یہ عمدہ تصنیف قرآن وحدیث کے الفاظ غریبہ کی تشریح پر مشتمل ہے، جس کے پاس یہ کتاب موجود ہو اس کو فن حدیث میں مزید کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ سمجھنا چاہئے کہ یہ کتاب صحاح ستہ کی ایک عظیم شرح ہے، جب سے یہ کتاب تصنیف ہوئی اسی وقت سے اہل علم میں یہ مقبول ہے، اور سب کو اس پر اتفاق ہے، شیخ محمد طاہر نے اس کو تصنیف کر کے علماء پر بڑا احسان کیا ہے“۔

اس کتاب کی تصحیح وتعلیق محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کے حصہ میں آئی، اس کا مختصر قصہ ان کی زبانی سماعت فرمائیں:

> ”اللہ تعالی نے گجرات کے چند عالی حوصلہ افراد بالخصوص شیخ عبد القادر نورولی وغیرہ کے دل میں اس مہتم بالشان کتاب کی از سر نو طباعت کی بات ڈالی، چنانچہ انہوں نے تصحیح وطباعت کے مصارف کا بیڑہ اٹھایا، اور ہمارے فاضل دوست مولانا علی میاں صاحب سے انہوں نے درخواست کی کہ اس کی طرف توجہ فرمائیں۔ مولانا نے ان کی درخواست قبول کرلی، اور کتاب کے مخطوطہ نسخوں کی تلاش شروع ہوئی، تلاش وجستجو کے بعد دو نسخے ملے، ایک احمد آباد کے مکتبہ

شاہ پیر محمد میں، دوسرا نسخہ پٹن میں، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی استاد ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء نے تصحیح وتعلیق کا کام شروع کیا، اور مجھ سے علمی اشراف کی درخواست کی، اور اصرار کیا کہ جب تک میں اس پر ایک نظر نہ ڈال لوں، طباعت کے لئے اس کو نہ بھیجا جائے، ہم نے حتی الوسع کتاب کی تصحیح وتحقیق میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اس طرح یہ کتاب موجودہ شکل میں سامنے آئی"۔

حضرت مولانا سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد طاہر پٹنی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"علامہ مجدالدین محمد بن طاہر پٹنی ایسے بلند پایہ محدث تھے، جن کے فضل وکمال کی شہرت دنیا بھر میں ہے، اور ان کی تصنیفات سے علمائے حجاز ویمن اس طرح سے فائدہ اٹھاتے ہیں جیسے کہ ہندوستان کے علماء، انہوں نے ملامہتہ، شیخ ناگوری، مولانا یداللہ، اور مولانا برھان الدین سے علم حاصل کرنے کے بعد مکہ معظمہ جا کر شیخ ابوالحسن بکری، علامہ بن حجر مکی، شیخ علی بن العراق، شیخ جاراللہ بن فہد ودیگر محدثین کرام سے حدیث پڑھی، اور عرصہ تک شیخ علی متقیؒ کی صحبت میں رہے، وہاں سے آنے کے بعد بجز تصنیف وتدریس کے اور کوئی شغل اختیار نہیں کیا، اور جو دولت ان کو اپنے پدر بزرگوار سے ملی تھی، اس کو بے دریغ وظائف طلبہ پر صرف کر ڈالا۔

شیخ عبدالقادر "النور السافر" میں لکھتے ہیں:

"حتی لم یعلم أن أحداً من علماء گجرات بلغ مبلغه فی فن الحدیث، کذاقاله بعض مشا یخنا" ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا کہ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ علمائے گجرات میں سے فن حدیث کے اندر کوئی ان سے لگا کھاتا ہو"۔ (یادایام)

ان کی سب سے مشہور تصنیف لغت حدیث میں "مجمع بحار لأنوار" ہے جس کو یہ کہنا چاہئے کہ وہ صحاح ستہ کی شرح ہے، نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم "اتحاف

النبلاء ''میں اسکی نسبت لکھتے ہیں''کتاب متفق علی قبوله بين أهل العلم منذ ظهر فی الوجود، وله منة عظيمة بذلك العمل على أهل العلم، جب سے یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے اس وقت سے اہل علم میں یہ مقبول ہے، اورسب کو اس پر اتفاق ہے، شیخ محمد طاہر نے اس کو تصنیف کر کے علماء پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

علاوہ اس کتاب کے ان کی تصنیفات میں سے ''المغنی فی أسماء الرجال'' اورتذکرۃ الموضوعات بے مثل کتابیں ہیں، ۹۸۶ھ مین ان کو مرتبۂ شہادت حاصل ہوا۔

مفتی قطب الدین نہروالی

نہروالہ کے عالم فاضل مفتی قطب الدین نہروالی جنہوں نے مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، اور شیخ قطب الدین مکی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے، وہ عربی زبان وادب کے نہ صرف ماہر بلکہ ادیب وشاعر بھی تھے مکہ مکرمہ میں قیام کے زمانہ میں انہوں نے افادہ اور استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا، انہوں نے احمد بن محمد العقیلی النویری اور یمن کے محدث عبدالرحمٰن بن علی سے حدیث شریف میں بھرپور استفادہ کیا، اس کے علاوہ شیراز کے محدث علامہ نورالدین أبوالفتوح سے بھی ان کو حدیث کی سند حاصل تھی، ایک عرصہ تک ان کو حرم شریف میں حدیث کا درس دینے کی عزت حاصل ہوئی، قاضی شوکانی نے اپنی کتاب "البدر الطالع" میں لکھا ہے۔ قطب الدین بہت بڑے فصیح وبلیغ تھے، ان کی کتاب "البرق اليمانی فی الفتح العثمانی" ان کی فصاحت وبلاغت کی ایک روشن دلیل ہے، علامہ سید عبدالحئیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''ان کی ایک کتاب کا نام ''البرق الیمانی'' ہے، جس میں دولت عثمانیہ کے تسخیر یمن کی تاریخ لکھی ہے، علاوہ اس کے سب سے زیادہ مشہور تصنیف ان کی ''الاعلام بأعلام بیت اللہ الحرام'' ہے، ان دو کتابوں کے سوا اور بھی ان کی تصنیفات ہیں، جن کا ذکر جرجی زیدان نے ''آداب اللغۃ العربیۃ'' میں کیا ہے، انہوں نے ۹۹۰ھ میں وفات پائی''(۱)

(۱) یاد ایام: ۹۹

مناسب ہوگا کہ اس موقع پر عربی کے ان کے کچھ منتخب اشعار پیش کردیئے جائیں، ان کی بلند ہمتی اور عزیمت کو مندرجہ ذیل اشعار یں ملاحظہ فرمائیے:

ولی همة أسمو بصارم عزمها
اذاالسیف قد أعیا صدور الکتائب

''اپنی ہمت وعزم کی تلوار بلند کرتا ہوں، جب تلوار ناکام ہوجائیں، لشکر کے دستوں کو واپس کرنے سے''۔

ومافاتنی فضل أردت اقتناء ہ
وماغربت عنی صعاب المطالب

''کسی بھی علم وفضل کو حاصل کرنے کا میں نے ارادہ کیا تو اس کو حاصل کرلیا، اور مشکل سے مشکل مقصد حاصل کرنا مجھ سے دور نہیں ہوا''۔

وکم خطب العلیا غیری ولم ینل
ونلت لأننی کنت أکرم خاطب

''دوسروں نے بلندیوں کو پالینے کی کتنی ہی کوشش کی مگر وہ وہاں تک نہیں پہونچ سکے، اس لئے کہ میں ان کو تلاش کرنے والوں میں بہت مخلص تھا''۔

مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد وہاں کے زمانہ قیام میں اپنے بعض ساتھیوں کو عربی میں منظوم خط لکھا:

بعد اهداء أطیب السلام — وأبلغ التمجید والاکرام
وبث شوق لایزال زائداً — وذکر مجد مفرط متزایداً
من کبد الی اللقاء ظامئة — ومقلة الی الفراق دامیة
ومن غلیل مهجته علیل — الی خلیل سید جلیل

سلام مسنون کا ہدیہ پیش کرنے کے اور زیادہ سے زیادہ تعظیم واکرام کے بعد اور عشق ومحبت کا پھیلاؤ اور انتہائی شوق کا پیمانہ برابر بڑھتا جارہا ہے، محبوب سے ملنے کے لئے ایک پیاسا جگر ہے اور فراق کی وجہ سے میری آنکھیں خونبار ہیں، اور اپنے روح محبت کی پیاس سے اپنے آقا سید جلیل سے ملنے کے لئے بے قرار ہے۔

اور غزل کے یہ اشعار:

اذا قتلتني عيون الظباء　　فيا فرحتي قد بلغت الأمل
رعى الله ليلة زار الحبيب　　وغاب الرقيب الى حيث أل
فأجلسته في سواد الحبيب　　وقد غسل الدمع ذاك المحل
فألصقت خدى بأقدامه　　وأذبل أخمصه بالقبل

(حسیناؤں کی آنکھوں نے مجھے قتل کردیا، تو سمجھئے کہ میرا مقصد حاصل ہو گیا، اور فرحت وانبساط کا تحفہ مل گیا، جس رات میں مرے محبوب نے میری زیارت کی اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے، اس وقت رقیب بھی غائب تھا جہاں میرے محبوب نے روشنی کی، تو میں اس کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں بیٹھالیا، اور اس کے بیٹھنے کی جگہ کو میں نے آنسوؤں سے دھویا تھا، میں نے اپنے رخساروں کو اس کے قدموں سے لگا دیا، اور اس کے پیر کے تلوؤں کی کھال کو مسلسل بوسوں سے رقیق اور چکنا کردیا)۔

مفتی قطب الدین کی خدمت میں ادیب فاضل جمال الدین بن ملا زادہ نے ماہ رمضان شروع ہونے کی مبارک باد کے طور پر یہ دو اشعار لکھ بھیجا:

يا قطب أهل العلم في أم القرى
رمضان حل ببهجة لم توصف
فتهنىٔ وحدك ا ن ذاتك أصبحت
هي أشرف في أشرف في أشرف

اس کے جواب میں انہوں نے دو شعر اور سونے کی ایک اشرفی بھیجی:

یـا أوحـد الـفـضـلاء أنـت جـمـالـنـا
فتهـنـئ بـأشعر الشريف الأشـرف
شـعـر بشـعـر لا ربـا فيـه ، وان
زاد الـعـيـار بـوزن هـذ الأشـرف

(یہ اشعار" النور السافر فی رجال القرن العاشر "سے لئے گئے ہیں)۔

علامہ عبدالعزیز میمنی راجکوٹی

علامہ عبدالعزیز میمنی علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں پہلے استاد پھر بعد میں اس شعبہ کے صدر مقرر ہوئے، اور ۳۰/سال تک اس عہدہ پر فائز رہے، اس عرصہ میں انہوں نے اہم علمی، تحقیقی اور ادبی کام کئے، ان کا شہرہ ہندوستان کی وسعتوں سے باہر عالم عربی تک پہونچا۔

ان کے زمانے میں علی گڑھ نے عربی زبان وادب کے سلسلہ میں شہرت حاصل کیا، وہ ۱۹۲۸ء سے لیکر ۱۹۷۷ء تک دمشق کی مجمع اللغۃ العربیۃ کے ممبر رہے، ان کے علمی تعلقات عالم عربی کے مشہور اور نامور علماء وادباء اور مشہور مستشرقین سے قائم ہوئے، مثلاً علامہ محبّ الدین خطیب، علامہ خلیل مردم بک، ادیب فاضل عز الدین التنوخی، مشہور ادیب احمد امین، یوسف العش، اور دکتور فواد، سید عمارۃ، فواد سزکین، احمد محمد شاکر، علامہ سعید الأفغانی، استاد فار آرندونک، جوزیف فیوک، ہیلمٹ ریتھر، روڈلف غایر، البرتھ ریتھ، ان تعلقات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی انہاک میں کس درجہ مشغول اور منہمک تھے، انہوں نے اپنی علمی اور تحقیقاتی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور علم وتحقیق اور عربی زبان وادب کے میدان میں بہت سے ادباء اور محققین سے آگے بڑھ گئے۔

اور مشرق ومغرب ہر جگہ لوگوں نے ان کی اہمیت کو تسلیم کیا، یہ اس زمانہ میں جبکہ علم وتحقیق کے وسائل مہیا نہیں تھے، اور موجودہ دور کے حساب سے کئی گنا محنت کرنی پڑتی تھی،

ہندوستان میں اکیڈمک ریسرچ کا سلسلہ جو پہلے غیر معروف تھا، انہوں نے شروع کیا اور وہ اس معاملہ میں فرد فرید سمجھے جاتے تھے۔

تاریخ اور جائے ولادت:

ان کے والد گرامی شیخ عبدالکریم اور ان کی والدہ کا نام مریم تھا، ان کی ولادت ان کی نانیہال گونڈل میں ۱۸۸۸ء کے اواخر میں ہوئی، ان کا بچپن راجکوٹ اور جوناگڑھ میں گزرا، اور ان کی نشو ونما وہیں پر ہوئی، سترہ برس کی عمر میں ان کے والد عبدالکریم نے ان کو دہلی دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا، وہاں جا کر سبزی منڈی میں حافظ عبدالرزاق کے یہاں قیام کیا، اس عہد کی دہلی اور وہاں کے علمی ماحول کے بارے میں علامہ عبدالعزیز نے لکھا ہے:

> ’’میں نے دہلی میں ۱۹۰۱ء کے آخر میں جو رنگ دیکھا اس کا اب کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا، ان دنوں دہلی کے ہر مطبع پر لکھا ہوتا ’’مطبع بدر العلوم دہلی‘‘ مگر آج کون دہلی کو اسلامی علوم کا گڑھ یا گھر کہہ سکتا ہے؟ اس زمانہ میں ہر دس بیس قدم پر ایک نہ ایک عربی مدرسہ ہوتا تھا، اور ان مدارس میں بنگال، پنجاب، افغانستان، لداخ، عرب اور کاشغر تک کے طلبہ آتے تھے، دہلی کے نیک دل باشندے ان مدارس کی ہر طرح سے امداد کرتے، بعض غریب بیبیاں طلبہ کے کپڑے بلا معاوضہ سی دینا بڑی سعادت سمجھتی تھیں، فتح پوری سے گھنٹہ گھر تک، صدر سے قرول باغ تک، فراش خانے سے چاوڑی بازار کی طرف تک ہر دس پندرہ قدم پر کوئی نہ کوئی طالب علم آتا جاتا، ضروری دکھائی دیتا تھا، جس کے ہاتھ میں مشکوٰۃ شریف، ابوداؤد اور صحیح بخاری کی چوڑی چکلی جلدیں ہوتی تھیں یا کبھی کبھی، ان طلبہ کے پاس لمبی تقطیع کی صحیح مسلم شریف ہوتی، دہلی کے صاحب ثروت باشندے طلبہ کو دعوتیں دینا فخر کی بات سمجھتے

تھے، کھانے کی ان پر تکلف دعوتوں کو بنگالی طلبہ ''جاگیر'' کہتے تھے''۔

دہلی میں تعلیم کے دوران جن اساتذہ سے استفادہ کیا

علامہ عبدالعزیز میمن نے دہلی کے نامور اساتذہ اور وہاں کی عظیم شخصیات سے استفادہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، اس کے باوجود انہوں نے مطالعہ اور کتب بینی کا سلسلہ شروع کیا، جن اساتذہ سے خاص طور سے فیض اٹھایا، اسکی مختصر کہانی خود ان کی زبانی پیش ہے:

> ''مشکوٰۃ شریف میں نے مولوی عبدالوہاب کے درس میں بیٹھ کر سنی، ترمذی شریف میں نے مولوی عبدالجبار عمر پوری سے پڑھی، وہ ادیب تھے، اور بہت اچھے ادیب تھے، اور یہ بڑی غنیمت بات ہے، دہلی میں میرے زمانے میں ڈپٹی نذیر احمد کے بعد جو ادیب آپ کو ملیں گے ان میں یہ بہت ممتاز تھے، وہ فن قرأت میں بھی بہت اچھے تھے،، بہت نیک آدمی تھے، مگر آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے، ان سے میں نے غالبا عربی کی ایک آدھ کتاب پڑھی یاد نہیں، مولانا بشیر سہسوانی بڑے اونچے درجے کے محدث اور فلسفی تھے، ان سے حدیث وتفسیر کی تعلیم حاصل کی''۔ (علامہ عبدالعزیز میمن: سوانح اور علمی خدمات: ۳۵)

ان کے اساتذہ میں جن کا انہوں نے بارہا تذکرہ اپنے دوستوں سے کیا ہے مولوی عبدالرحمٰن پنجابی، ملتانی، مولوی عبدالرحمٰن حاجی علی جان، اور اردو کے مشہور مکتب فکر کے ادیب ڈپٹی نذیر احمد صاحب، انہوں نے حدیث کی کتابیں بھی انہیں اساتذہ سے پڑھیں، ڈپٹی نذیر احمد اردو کے مکاتب فکر میں صرف اپنے مکتب فکر کے نمائندہ نہ تھے، بلکہ عربی زبان میں بھی ان کو مہارت حاصل تھی۔ علامہ عبدالعزیز میمن نے ڈپٹی صاحب کی عربی دانی کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

> ''ڈپٹی صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ عربی سے ترجمہ

نہایت اعلیٰ کرتے تھے، تعریف سے بالاتر، دوسری خوبی یہ کہ ڈپٹی صاحب عربی میں شعرا تنے اعلیٰ درجہ کے کہتے تھے کہ تعریف نہیں کی جاسکتی، میں جانتا ہوں کہ اتنے اچھے مذاق کا کوئی آدمی ہندوستان میں میں نے تو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ غلام علی آزاد بلگرامی جن کی عربی شاعری کا بڑا شور ہے، ان کا کلام بھی میں نے دیکھا، مگر مجھے ڈپٹی صاحب کا زیادہ پسند آیا، ڈپٹی صاحب گلی بتاشوں والی جو پھاٹک حبش خان کے بالمقابل تھی، اس میں ایک گلی میں رہتے تھے، بالاخانے کے اوپر اور نیچے ان کی مطبوعات کا ڈھیر لگا ہوتا تھا، ایک ملازم تھا جو ان کے لئے ہمیشہ حقہ تیار کرتا تھا، وہ اوپلے کا حقہ پیا کرتا تھے، دن بھران کا حقہ چلتا رہتا تھا، ایک چلم ختم ہونے سے پہلے دوسری چلم تیار ہو جاتی تھی، اس (ملازم) کی ڈیوٹی ہی یہی تھی، ان کا یہ معمول تھا کہ اگر کوئی آدمی آیا جو حقے سے دلچسپی رکھتا ہو اور وہ ان کے حقے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو وہ حقے کے بجائے سگار کا ڈبہ اس کے آگے کر دیتے کہ لیجئے یہ آپ کے لئے ہے، وہ کسی کو حقہ نہیں پینے دیتے تھے، الا مجھے، جو ان کی بڑی مہربانی اور عنایت تھی، کوئی اور آدمی اس دور کے دہلی کا میں نہیں جانتا، جو اتنی زیادہ عربی زبان میں مہارت رکھتا ہو۔

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کی عربی نظم پر قدرت کا یہ واقعہ انہوں نے متعدد مرتبہ بیان کیا:

> ”ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کو عربی نظم پر جو قدرت حاصل تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں امیر حبیب اللہ خاں تشریف لانے والے تھے، ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ایک صاحبزادے ایف اے میں پڑھتے تھے، اس وقت

منتخب دیوان ابی العتاہیہ نصاب میں داخل تھا، جس میں سے وہ قصیدہ امیر صاحب کے سامنے پڑھنے کے لئے انتخاب کیا گیا، جس کا مطلع ہے"۔

لا یــــذهبــــن بك الامــــل

حتــى تــقصــر فــى الاجـل

طالب علم نے کہا: میں یہ ابیات تین منٹ میں ختم کرلوں گا، آپ کچھ اشعار کا اضافہ فرمادیجئے، چنانچہ ڈپٹی صاحب نے یہ گرہ لگائی اور حق یہ ہے کہ خوب لگائی:

الــلـــــه قــدر فــى الأزل ألا انــجـلـة بـلا عــمـل

الــنـصــح لـيــس بـنـافـع والسيف قد سبق العزل

والــمــرء لـيــس بـخــالــد والـعـيش أمـر محتمل

كـن حيث شئت من السهول وفـي البـروج وفـى القلل

يـدركك مـوت فــى الـزمـان ولا يــزيــدك فـى الأجـل

لــذات دنيــا كــلهــا سـم مشـوب بـالـعسل

الـعــمـر فــان فــالـنجـاء والـمـوت آت فــالـعجل

حتــام تــقـليـد الهـوى وإلام تـجـديـد الـحيـل

الــمبتـلــى بـعـلائـق الـد نيـا حـمـار فـى الوحل"

ندوۃ العلماء میں علامہ عبدالعزیز میمن کی آمد

اسی طرح علامہ میمنی نے تلاشِ علم میں پوری جدوجہد کی اور مختلف شہروں میں قیام کیا، کبھی امروہہ میں طالب علم بن کر پہونچے، تو کبھی رامپور کے مدرسہ عالیہ میں علم حاصل کیا، اور کبھی پشاور تشریف لے گئے، کبھی لاہور کے اورنیٹل کالج میں ملازمت کی غرض سے، انہوں نے لکھنؤ میں بھی ندوۃ العلماء میں کچھ وقت گذارا، اس زمانہ میں وہ لکھنؤ تشریف لائے تو ان کی عربی دانی، تحقیق ومہارت اور زبان وادب پر قدرت کی کہانی بہت مشہور ہوچکی تھی، علامہ

سید سلیمان ندویؒ کی دعوت پر ۱۸-۱۹ جون ۱۹۲۵ کو ندوۃ العلماء میں علمی خطبات دینے کے لئے آئے، ان کے ان خطبات کے تعارف کے سلسلہ میں حضرت سید صاحبؒ فرماتے ہیں:

''ہمارے ہاں قدماء کے درس کا عام طریقہ یہ تھا کہ مدرس خود مسئلہ پر زبانی تقریر کرتا تھا، طلبہ سنتے تھے اور یادداشت لکھتے جاتے تھے، اس طریقہ درس کا نام املا تھا، آج کل یورپ کا طرز بھی یہی ہے، اور عموماً ہندوستانی کالجوں میں بھی اسکی تقلید ہوتی ہے، اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ کم سے کم وقت میں الفاظ اور کسی خاص کتاب کی پابندی کے بغیر نفسِ مسئلہ حاضرین کے سامنے آجاتا ہے، طلبہ کا ذہن، عبارت، الفاظ اور ضمیروں کی الجھن میں نہیں پڑتا۔

''ہم نے چاہا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جدید نصاب میں اس طریقہ درس کو دوبارہ زندہ کریں، ہم نے اپنے چند لائق دوستوں کو اس سلسلہ کے آغاز کے لئے خطوط لکھے تو سب سے پہلے ہمارے فاضل دوست مولانا میمن عبدالعزیز صاحب راجکوٹ ادیب اورینٹل کالج لاہور نے اس کے لئے سب سے پہلے آمادگی ظاہر کی اور ۱۸ر جون ۱۹۲۵ء کو لکھنؤ آکر انہوں نے ہمارے عزیز طلبہ کے سامنے دو دن، دو دو گھنٹے عنوانِ بالا پر املا کیا، اثنائے سخن اور آغاز کلام میں انہوں نے طلبہ کو یورپ کی اس علمی جدو جہد سے مطلع کیا جو وہ ہمارے علوم وفنون کی حفاظت اور اشاعت میں کر رہا ہے، اس کے ساتھ عربی خواں کو غیرت دلائی کہ وہ بلند ہمتی کے ساتھ ان خدمات کو ادا کرنے کے لئے کیوں اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتے''۔

خطیب ممدوح عربی ادب وتاریخ میں ید طولی رکھتے تھے، اور اسی کے ساتھ قلمی کتابوں، یورپین مطبوعات اور علمائے یورپ کی کوششوں سے پوری طرح آگاہ تھے، اس لئے اس مضمون میں وہ پوری کامیابی حاصل کر سکے تھے''۔

یاد رہے کہ علامہ میمن کی علمی فضیلت کا یہ اعتراف مولانا سید سلیمان ندوی نے

۱۹۲۵ء میں کیا جب علامہ کی عمر تقریباً ۳۷ ؍ برس تھی، علامہ میمن نے ان خطبات میں مشہور مستشرق مارگولیوتھ اور نکلسن کی ابوالعلاء معری سے متعلق تحریروں میں اغلاط کی نشاندھی کی اور اپنی رائے پیش کی، اس بارے میں فرماتے ہیں:

"میں یہاں خصوصیت کے ساتھ مارگولیتھ اور نکلسن صاحبان کے مشترک اور مخصوص اغلاط ہی سے بحث کروں گا، اور ناظرین اپنے طور پر یقین کرلیں کہ یورپ کم وبیش انہیں اغلاط میں مبتلا ہے، مارگولیوتھ نے "رسائل معری مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۹۸ء کے شروع میں ایک زبردست پرمغز اور پرمواد مقدمہ نہایت متین لہجہ میں لکھا ہے، جسکی صدائے بازگشت نکلسن کی ہسٹری آف عربک لٹریچر، آرٹیکل انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور اسٹڈیز ان اسلام پوئٹری میں ہے"۔(۱)

علامہ میمنی پر خاص نمبر

پروفیسر مختار الدین آرزو جب شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھے تو "مجلۃ المجمع العلمی الھندی" کے نام سے عربی رسالہ نکالتے تھے، علامہ میمنی سے عقیدت کی بنا پر، اور اس لئے بھی کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے ہیڈ رہ چکے تھے، اور وہاں رہ کر انہوں نے بہت سے تحقیقی کام کئے تھے، ان کی ولادت کے سو سال پورے ہونے پر اس رسالہ کا ایک خاص نمبر عربی میں شائع کیا، اس کا مقدمہ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلم گہربار سے تحریر کیا گیا ہے، مولانا نے اپنے مقالہ میں علامہ میمنی کے علمی، ادبی اور تحقیقاتی کردار پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، عربی زبان وادب کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ کیا عوامل تھے کہ انہوں نے ایک ایسی زبان پر اپنی پوری طاقت صرف کی، جو ان کی مادری زبان نہیں تھی، اور اپنے قیمتی وقت، اپنی ذہانت اور اپنی علمی صلاحیتوں کو عربی زبان اور اس کے ادب اور اسکے علوم کی

---

(۱) (علامہ عبدالعزیز میمن ۷۷-۷۹)

بحث وتحقیق میں لگایا، اور اپنی تحقیقات سے اس زبان کے دفینوں کو اور اس کے چھپے ہوئے موتیوں کو نمایاں کیا، حضرت مولانا نے علامہ میمنی سے اپنے علمی اور ادبی تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے، اور عربی زبان وادب میں ان کے بلند مرتبے، ان کی تصنیفات اور انکی تحقیقی خدمتوں کا اور ادب وبیان کی حلاوت سے بہرہ ور ہونے کا ذکر فرمایا ہے، علامہ میمنی کے حالات معلوم کرنے کے لئے جوان کے عظیم کارناموں اور زبردست علمی اور تحقیقی خدمات سے معمور ہیں، حضرت مولانا کے اس مقالہ کو پڑھنے کی میں عربی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے دستوں کو مشورہ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

ایک دفعہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں علامہ میمنی کا تذکرہ ہوا، تو اس وقت بھی میمنی صاحب کے مراتب علم وفضل اور عربی زبان وادب میں ان کی مہارت کا ذکر آیا، فرمانے لگے کہ میں نے میمن صاحب سے پوچھا کہ آپ کو عربی کے کتنے اشعار یاد ہوں گے؟ تو انہوں نے بے تکلف کہا کہ ۷۵۰۰۰/پچھتر ہزار سے ایک لاکھ تک عربی کے اشعار یاد ہیں۔

ان کی قابل ذکر تصانیف وآثار

۱- النسخة الفريدة من نقائض جريرو الأخطل لأبی تمام
۲- تصحيحات على لسان العرب
۳- بشار والخالد يان والشارح ومعاصروه
٤- أبوالعلاء المعري وما اليه
٥- سمط اللآلی فی شرح أمالی القالی
٦- ديوان حميد بن نور الهلالی
۷- بحوث وتحقيقات از میمن مرتبه مولانا عزیز شمس
۸- الزهر الجنی من رياض الميمنی وغيره
۹- مناقب بغداد

شیخ محمد بن یوسف سورتی

ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور نام محمد، والد صاحب کا نام یوسف، سلسلہ نسب یہ ہے، محمد بن یوسف بن محمد بن احمد بن ابراہیم بن احمد بن علی اللونتی السامرودی۔

مولانا محمد سورتی نحو ولغت اور ادب میں کافی مہارت کے مالک تھے، ان کی ولادت شعبان کے مہینہ میں ۱۳۰۷ھ میں سامرود میں ہوئی، وہ انتہائی درجہ کے وسیع المطالعہ تھے اور ان کی وفات کے موقع پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے تحریر فرمایا تھا:

> ''میری اطلاع کے مطابق اس وقت اتنا وسیع النظر، وسیع المطالعہ، کثیر الحافظہ عالم موجود نہیں، صرف ونحو، لغت وادب، اخبار و انساب ورجال کے اس زمانہ میں درحقیقت وہ امام تھے، وہ چند ماہ سے مرض استسقاء میں مبتلا تھے، علی گڑھ میں ان دنوں قیام تھا اور وہیں ۷/اگست کو بروز جمعہ وفات پائی۔

مرحوم کا اصلی وطن سورت (گجرات) تھا، وطن میں ابتدائی تعلیم پاکر یہ دلی آئے اور رامپور میں مولانا محمد طیب صاحب مکی کا تلمذ حاصل کیا، میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۰۸ء میں ہوئی، جب مولانا طیب مکی رامپور چھوڑ کر دارالعلوم لکھنؤ میں ادیب اول کے عہدہ پر فائز تھے، فاضل استاد کے ساتھ یہ لائق شاگرد بھی لکھنؤ وارد ہوا، اور اس زمانہ سے لے کر اخیر تک ان کے ساتھ میری علمی رفاقت اور ذاتی دوستی کا سلسلہ قائم رہا، معارف بھی ان کے رشحات قلم سے کبھی کبھی مستفید ہوتا رہا ہے''۔

مولانا محمد سورتی نحوی مسائل اور صرفی قواعد کو سہل بنا کر طلباء کے سامنے پیش کرتے تھے، ہزاروں مسائل ان کو یاد تھے، ان تمام فضل وکمال کے باوجود مستقل مزاجی کی کسی حد تک کمی تھی، اس لئے وہ مختلف شہروں اور مدارس میں منتقل ہوتے رہے، اور کماحقہ طالبین علوم کو ان سے استفادہ کا موقع نہیں مل سکا، کبھی وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد کی حیثیت

سے تشریف لے گئے پھر کبھی جامعہ رحمانیہ بنارس منتقل ہوگئے، وہاں سے بمبئی چلے گئے۔ ایک مدرسہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، اکثر وہ راجستھان کے مشہور شہر ٹونک جایا کرتے تھے، وہیں انہوں نے اپنی شادی بھی کی، نوادر کو جمع کرنے اور نقل کرنے اور ان کو فروخت کرنے کا شوق تھا، وہ مسلک اہل حدیث کے مطابق اپنی زندگی گزارتے تھے، سخاوت میں اپنی مثال آپ تھے، ٹونک کا کتب خانہ ان کے لئے باعث کشش تھا، وہ اکثر کتابوں کے نوادر کی تلاش میں ہندوستان کے مشہور کتب خانوں کی سیر کرتے تھے، ٹونک سے پٹنہ، رامپور، کلکتہ، حیدر آباد کا سفر کرتے رہتے، ان کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اکثر حصہ ان کے حافظہ میں آجایا کرتا تھا، ۱۰ رجب ۱۳۶۱ھ میں انتقال ہوا، اللہ تعالی ان کو غریق رحمت فرمائیں، اور ان کے شوق علم نوازی کا ان کو بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائیں۔

ان کی کچھ تصنیفات اور عربی اشعار

صرف میں انہوں نے ''مقدمۃ الصرف'' کے نام سے اور نحو میں ''مقرب فی النحو'' کے نام سے کتابیں لکھیں، اسی طرح انہوں نے کافیہ اور شافیہ کے حواشی میں اضافہ کیا، دیوان حسان کی شرح تصنیف کی، وہ زندگی کے مسائل میں مسلک اہل حدیث کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے، ان کے چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں۔

انہوں نے ٹونک کے کھیرے کی مذمت اور وہاں کے خربوزہ کی تعریف میں عربی کے اشعار کہے ہیں:

لا تأكلن اما مررت التوكا　　قثاء ه فان فيه التوكا

أقبح به من منظر يدهوكا　　يظل فى الاعياء منه فوكا

واخضم من البطيخ ما يزهيك　　فانه السردى الذى يدعوك

للأكل والتطراب قد يندوكا

انہوں نے چند نوجوانوں کی شکایت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اشعار کہے ہیں:

أقول لنفسي في الخلا ألومها — لك الويل ما هذا التخشع والذكر
ومن أجل ان خانت عهودك عصبة — يهمهم الدنيا وما آن لهم عذر
هم بسطوا تلك الأماني حقبة — فلما اطمأن الأمر واستحصد الأمر
وبانت بنات الشوق يحنن نزعا — وضم الحشا منها الحباب فلا صبر
و كانوا طويلا يأملون خيانتي — فما خنت يوما لا ولا غالهم مكر
على غير شئي قلبوا لي مجنهم — وضحوا بقلبي ضحية ما لها نكر
ولم يرقبوا ولا الدين راعهم — ولا سطوة الله العزيز ولا العذر
ولا رحموني اذ منيت بشقوة — ولا حفظوا في الوداد فما دروا
أتشكو فما الشكوى تفيد ولا البكا — بمغن فتيلا لا ولا شأنك الختر
ولا أنت ممن يكثر القيل في الخنى — ولا دأبك التملاق يوما، ولا الهجر
أم السلو والهجران من غير بغضة — أحب بلى ان السلو له أصر
وكم قد منيت من زمان بغصة — وفجع ونقض فاصطبرت لها صخر
فلا تشمتي الأعداء يا نفس ا نني — صبور على العسراء ان غرني دهر

یہ اشعار" الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام" سے لئے گئے ہیں)، یہ مشہور زمانہ عالم وداعی اور ادیب کبیر مرشد وشیخ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے والد معظم حضرت العلام مولانا سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب نزھۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر کا دوسرا نام ہے، جو حضرت مفکر اسلام علامہ ندویؒ نے تحقیق و تعلیق کے بعد اس جدید نام سے شائع فرمایا۔

یوں تو گجرات کے علماء، محدثین اور بڑی شخصیات کی تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن انہیں چند شخصیتوں کا ذکر اس وقت ممکن ہوسکا۔

مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ کا سوانحی ادب: چند جھلکیاں

(''سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ'' کے آئینہ میں)

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ اور دعوت دین

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے دین کو پھیلانے اور تبلیغ ودعوت کا ایسا جذبہ عطا فرمایا، جس کے نتیجہ میں جماعت دعوت وتبلیغ کا آغاز ہوا اور میوات کی سنگلاخ وادی میں سب سے پہلے دعوت دین کا کام شروع ہوا، میوات دہلی کے جنوب میں ایک بڑے علاقے کا نام ہے، یہاں کے رہنے والے نہ صرف یہ کہ دین ودعوت سے ناواقف تھے، بلکہ وہ مہذب دنیا سے بھی الگ تھلگ اپنی ایک خاص پہچان رکھتے تھے، ان کو اپنی روش سے باز رکھنے میں اس وقت کی سلطنت دہلی بھی ناکام ہو چکی تھی، اور ان کو راہ راست پر لانے کا مسئلہ ایک بہت ہی پیچیدہ عمل تھا، لیکن حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو ان میں تبدیلی پیدا کرنے اور اسلام سے قریب کرنے کی زبردست فکر پیدا ہوئی، سب سے پہلے مولانا نے وہاں ایک دینی مکتب قائم کرایا، جس کے نتیجہ میں اور بھی بہت سے مکاتب قائم ہو گئے، اور ان میں قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام ہوا، ان مکاتب کے ذریعہ میواتی قوم کی اصلاح کا سلسلہ سست رفتاری کے ساتھ شروع ہوا، اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی طبیعت کی بے چینی کو قرار نصیب ہوا، لیکن قوم کی مکمل اصلاح کا مسئلہ اسی طرح قائم رہا اور اندازہ ہوا کہ صرف مکاتب قائم کر دینے سے میواتی قوم کی مکمل اصلاح مشکل ہے، اس کے لئے دعوتی تحریک کی شدید ضرورت ہے، تاکہ اسلامی اخلاق واعمال زندگیوں میں ظاہر ہوں، نماز کا احترام اور اس کی پابندی شروع ہو، اس کام کے لئے مولانا برابر میوات کا

سفر کرتے اور وہاں قیام فرماتے تھے۔

میوات میں کام کا آغاز اور بنیادی تعلیمات

حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے میوات کے حالات کا پوری طرح اندازہ لگانے کے بعد وہاں کے سر برآوردہ لوگوں کی ایک پنچایت منعقد کی، ان کے سامنے سب سے پہلے اسلام کی اہمیت اور ضرورت بیان فرمائی، مولانا محمد ثانی حسنیؒ نے اپنی کتاب ''سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی'' میں اس پنچایت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

''۲/ اگست ۱۹۳۴ء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی صدارت میں ایک پنچایت کی گئی، جس میں سارے میوات کے چودھری صاحبان، میاں جی، ذیل داران، وانعام داران، نمبرداران، صوبہ داران، منشی حضرات وسفید پوشاں ودیگر سر برآوردگان علاقہ میوات میں جمع ہوئے، جن کی تعداد تقریباً ۱۰۷ تھی، اس پنچایت میں سب سے پہلے اسلام کی اہمیت بیان کی گئی اور پھر اسلام کی ساری باتوں کی پابندی اور اس کی اجتماعی طور پر اشاعت اور دین کی دعوت کا کام کرنے اس کے لئے پنچایتیں کرنے اور اس کام سے زندگی میں کسی وقت بھی نہ ہٹنے کا عہد کیا، خصوصاً (۱) کلمہ (۲) نماز (۳) تعلیم حاصل کرنا اور اس کی اشاعت (۴) اسلامی شکل وصورت (۵) اسلامی رسوم کا اختیار کرنا اور رسوم شرکیہ کا مٹانا (۶) عورتوں کا پردہ (۷) اسلامی طریقہ کا نکاح کرنا (۸) عورتوں کا اسلامی لباس زیب تن کرنا (۹) اسلامی عقیدہ سے نہ ہٹنا اور کسی غیر مذہب کو قبول نہ کرنا (۱۰) باہمی حقوق کی نگہداشت وحفاظت (۱۱) ہر اجتماع وجلسہ میں ذمہ دار حضرات کا شریک ہونا (۱۲) بغیر دینی تعلیم کے دنیوی تعلیم بچوں کو نہ دینا (۱۳) دین کی تبلیغ کے لئے محنت اور کوشش کرنا (۱۴) پاکی کا خیال رکھنا (۱۵) ایک دوسرے کی عزت وآبرو کی حفاظت کرنا۔ اس کے علاوہ

اس پنچایت نامہ میں طے کیا گیا تھا کہ تبلیغ صرف علماء کا کام نہیں، بلکہ ہم سب کا فریضہ ہے، اس کو انجام دیں گے، یہ ساری طے شدہ چیزیں لکھی گئیں، اور پنچایت نامہ مرتب کیا گیا اور ان پر شرکاء کے دستخط ہوئے"۔(۱)

دعوتی کام کا عربوں میں تعارف

حضرت مولانا الیاس صاحب کا کام میوات کے حدود سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بھی شروع ہو گیا، یہاں تک کہ عربوں میں اس کام کے پھیلنے کی امیدیں پیدا ہوئیں، اور حضرت مولانا کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ وہ اپنی جماعت کے ساتھ سفر حج کے لئے نکلیں، اور حج اور مناسک حج کے ساتھ اللہ کے دین کی طرف بھی دعوت دینے کا کام جاری ہو، جنوری ۱۹۳۸ء ماہ ذی قعدہ کو حج کا سفر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شروع ہوا۔

۴؍فروری ۱۹۳۸ء جمعہ کو مکہ مکرمہ پہونچے، اور وہاں مناسک حج کی ادائیگی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ دوران قیام تبلیغی کام بھی شروع ہوا، اس وقت عربوں کے ایک اجتماع میں مولانا محمد یوسف صاحب نے عربی میں تقریر فرمائی، اور یہ ان کی پہلی عربی تقریر تھی، جس میں اللہ تعالیٰ کی مدد خاص شامل تھی، عرب سامعین پر اس کا بہتر اثر پڑا، اسی وقت سے عربوں میں دعوت و تبلیغ کی بنیاد پڑ گئی، اہل عرب نے اس کی ترحیب کی، اور اس میدان میں اپنے آپ کو پیش کیا۔

مولانا محمد یوسف صاحب اپنے والد کے جانشین

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی وفات کے بعد عارف باللہ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے مشورے سے مولانا محمد یوسف صاحب کو اس کام کی جانشینی عطا ہوئی، باوجود اس کے کہ مولانا محمد یوسف صاحب اپنے علمی اور تصنیفی انہماک کی بنا پر اس کے لئے تیار نہ تھے، لیکن حضرت رائے پوری کے مشورے اور تاکید کی بنا پر مولانا محمد یوسف صاحب کو اس کام کے لئے اپنے والد مکرم کی خلافت و اجازت عطا ہوئی۔

(۱) سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص ۱۴۱

اس جانشینی اور اپنے والد کی خلافت سے ہر طبقہ میں مقبول ہوئے، تمام اہل تعلق نے اس کی پوری تائید کی، اور طمانیت کی ایک فضا چھاگئی، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے مولانا محمد یوسف صاحب کو اپنے پاس بلایا، اور فرمایا: یوسف! آؤ، مجھ سے مل لو، ہم تو چلے۔

سوانح نگار مولانا محمد ثانی حسنیؒ نے اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

''انتقال سے کچھ ہی دیر پہلے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے اپنے فرزند مولانا محمد یوسف کو پاس بلایا، محبت بھری نگاہ ڈالی اور فرمایا: یوسف آمل لے، ہم تو چلے، خدا جانے اس پُر محبت نگاہ میں کیا جادو تھا، اور اس شفقت بھرے جملے میں کیا مقناطیسیت تھی، جس نے دردوفکر، فیضان الٰہی، یقین وایمان کی ایک نہ بجھنے والی آگ بجلی کے کرنٹ کی طرح ایک دوسرے کے اندر منتقل کردی، اور وہ خلا جو ایک عظیم شیخ وداعی الی اللہ کے جانے سے پیدا ہورہا تھا وہ اسی انتقالی نسبت سے اور خدا کی شان عطائی اور فضل سرمدی سے پر ہوا، اور ایسا پر ہوا جس کو ہر آنکھ دیکھتی ہے اور ہر کان سنتا ہے، غالباً اسی موقع پر کسی شاعر نے کہا ہوگا۔

ایں سعادت بزور باز ونیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا محمد یوسف صاحب کی نمایاں خصوصیات

اس کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب کے اندر زبردست تبدیلی آئی، اور وہ تمام امتیازات اور خوبیاں جو حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے اندر دعوت دین کی نسبت سے پائی جاتی تھیں، اللہ کے فضل وکرم سے مولانا محمد یوسف صاحب کے اندر منتقل ہوگئیں، حضرت مولانا منظور صاحب نعمانیؒ اس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اس عاجز نے اور غالباً ہر دیکھنے والے نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی زندگی میں تین باتیں بہت ہی غیر معمولی درجہ میں دیکھیں: (۱) دین کا درد وفکر (۲) اللہ تعالیٰ پر اعتماد ویقین (۴) معارف وحقائق کا فیضان۔

دین کے درد وفکر کے لحاظ سے ان کا حال بلا مبالغہ اس باپ کا سا تھا، جس کا اکلوتا باکمال بیٹا جس سے اس کی بڑی امیدیں اور آرزوئیں وابستہ ہوں، سخت بیمار اور موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہو۔ اور اس کی زندگی اور صحت کی فکر نے تمام دوسری فکروں اور ذاتی مسئلوں کو بالکل دبا دیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اور اس کی مدد پر ان کو ایسا اعتقاد ویقین تھا، گویا قضا وقدر کے فیصلوں کو انہوں نے آنکھ سے دیکھ لیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں، آخرت کے بارے میں، دین کے بارے میں جب باتیں فرماتے تو اہل علم اور اصحاب درس بھی محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلب پر حکمت کا فیضان ہو رہا ہے اور "ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا" کی تفسیر سامنے آجاتی۔

پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ہر دیکھنے والے نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ یہ تینوں باتیں دفعتاً حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ میں آگئیں، اور ان تینوں میدانوں میں وہ بہت تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری سے بڑھتے رہے''۔(۱)

والد کے وفات کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب کا پہلا بیان

مولانا محمد الیاس صاحب کی تجہیز وتکفین کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب نے حزن وملال کی حالت میں تقریر کی، سب سے پہلے انہوں نے آیت قرآنی: وما محمد الا رسول، قد خلت من قبله الرسل۔ پڑھ کر نہایت ہی مؤثر تقریر کی، سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، لیکن مولانا یوسف صاحب کی تقریر سے زندگی کی ایک نئی لہر

---

(۱) سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی: ۱۹۹۔۲۰۰

پیدا ہوگئی، مولانا محمد ثانی صاحبؒ نے اس تقریر کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

''مولانا محمد یوسف صاحب نے حمد وثنا کے بعد تقریر شروع کی، اور فیضان الٰہی کا نزول شروع ہوا، مضامین کی روانی اور جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ چوٹ کھایا ہوا انسان ہے، جو اپنا دل نکال کر رکھے دے رہا ہے، مجمع پر بڑا اثر پڑ رہا تھا، آنکھوں کے سامنے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کا زمانہ پھرنے لگا، معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب حجرہ میں موجود ہیں، اور یہ مضامین کہلوا رہے ہیں، ہر سننے والے میں نئی امنگ، نیا جذبہ اور کام کرنے کی نئی صلاحیت پیدا ہوگئی۔

مولانا نے اس تقریر میں سب سے پہلے کلمہ کی تشریح فرمائی، اس کے بعد صحابہ کرام کے مؤثر اور دلپذیر حالات وواقعات سنائے، چونکہ سامنے ان حضرات کا مجمع زیادہ تھا، جو مدتوں سے حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے پاس آتے جاتے تھے، اس میں ایسے بھی تھے، جن کے ہاتھوں میوات وغیر میوات میں تبلیغی کام شروع ہوا، اور جن پر حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو مکمل اعتماد تھا۔ اور ایسے بھی تھے جنہوں نے اخلاص ومحبت سے حضرت مولانا کا تقرب حاصل کر لیا تھا، اور اب وہ اپنے کو بے سہارا پا رہے تھے، اس لئے وقت کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے مولانا محمد یوسف صاحب نے فرمایا:

حضرت جی کے سامنے جو بھی جس طرح کام کرتا تھا کرتا رہے، اور جیسا معاملہ حضرت جی کے ساتھ کرتے تھے، ویسا ہی معاملہ میں بھی اس کے ساتھ کروں گا، اور کرتا رہوں گا'' (۱)

گرانقدر دعوتی مکتوب

حضرت مولانا محمد یوسف نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی جانشینی کا حق ادا کرنے میں جملہ توانائیوں اور وسائل وامکانات کو صرف کرنے میں کوئی کمی نہیں کی، ان کو صرف یہی فکر تھی کہ دعوت وتبلیغ کا جو کام جاری تھا اس میں کسی کمی کی گنجائش نہیں ہوسکتی

(۱) سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی: ۲۰۷

، بلکہ اس کو اور زیادہ مضبوط اور طاقتور بنانے کے لئے جملہ اہل تعلق کو مل کر فنائیت کے جذبہ کے ساتھ انجام دینا ضروری ہے، اسی میں سعادت و کامیابی ہے، اسی میں تحریک دعوت و تبلیغ کے بانی اور روح رواں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی روح کے لئے تسکین کا سامان ہے، یہی کام ان کے لئے سب سے بڑا اخراج عقیدت ہے، مولانا نے جس صبر و عزیمت اور عالی ہمتی سے اپنے والد صاحب کے لگائے ہوئے درخت کو زیادہ سے زیادہ سایہ دار اور پھلدار بنانے کے لئے دعوت و تبلیغ کی راہ میں اپنے آپ کو وقف کر دیا، اس کام سے تعلق رکھنے والے حضرات کی تعزیت کرتے ہوئے اپنے تعزیتی خط کو تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان سطور کے ذریعہ حضرت قدس سرہ کے محبین و مخلصین کو خصوصاً اور جملہ اہل ایمان کو عموماً یہ پیغام پہونچانا ہے کہ حضرت کا ظاہری وجود اب ہماری آنکھوں سے اگر چہ اوجھل ہو گیا ہے، لیکن جس کام کو آپ نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے زندہ کیا۔ اور اللہ کے بندوں کو نصرت و خدمتِ دین کے جس سلسلے میں لگایا وہ بحمد اللہ حضرت کی ہدایت و وصیت کے مطابق انھیں اصولوں کے ساتھ جاری ہے، اور انشاء اللہ جاری رہے گا، حضرت مرحوم کی اس دینی دعوت کا پیغام جہاں جہاں اور جن جن حضرات تک پہونچ چکا ہے بالخصوص جن حضرات کو کچھ عملی حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، اور ان میں خاص کر وہ حضرات جو اپنے یہاں جماعتیں قائم کر چکے ہیں ان کی خدمت میں خصوصیت کے ساتھ گزارش ہے کہ حضرت کے وصال کو معاذ اللہ ان کے کام کے اختتام کے مرادف ہرگز نہ سمجھ لیں، اور اٹھے ہوئے قدم کو ہرگز نہ روکیں، حضرت مرحوم کا اصل کام ہی غافلوں کو بیدار کرنا اور کام پر لگا دینا تھا، سو حضرت اس کو کر کے تشریف لے گئے، اس وقت ہم میں سے ہر ایک کے سامنے سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وہ خطبہ ہونا چاہئے جو آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسجد

نبوی میں صحابہ کرام کے سامنے دیا تھا، اللہ کی حمد وثناء کے بعد آپ نے فرمایا تھا: لوگو! جو تم میں سے حضرت محمدؐ کی عبادت کرتا ہوا سے مایوس ہو جانا چاہئے کہ حضرت کی وفات ہو چکی، اور جس نے حضور کی رہنمائی سے اللہ کی بندگی کا رشتہ جوڑا ہوا اور وہ اللہ کی عبادت کرتا ہو وہ مطمئن رہے کہ اللہ زندہ ہے اور اسی طرح ہمیشہ زندہ رہے گا"۔(۱)

مولانا محمد یوسف کی دعوتی سرگرمیاں

دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری کے لئے مولانا محمد یوسف صاحب کی اپنے والد مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی جانشینی منجانب اللہ تھی، اور دعوت کے اس کام کو اور زیادہ وسعت دینے اور عالم کے گوشے گوشے میں پھیلانے کے لئے ایک ربانی فیصلہ تھا، اس فیصلہ کے مطابق مولانا محمد یوسفؒ نے تبلیغ ودعوت کے کام کو اپنی زندگی کا جزءِ اعظم بنالیا تھا، اور اب وہ اسی کے لئے اپنی تمام علمی اور عملی صلاحیتوں کو صرف کرنے لگے تھے، اس کے نتیجہ میں ہر جگہ یہ کام مقبول ہوا، اقصائے مغرب سے لے کر اقصائے مشرق تک کی جماعتیں اس کام سے وابستہ ہو گئیں، اور دعوت وتبلیغ کو اپنی زندگیوں کا مشن بنالیا، اور یہ جماعتیں دنیا کے تمام مما لک میں پہونچ کر اور دنیا کی چمک دمک سے منھ موڑ کر صرف اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے ہر طرف پھیل گئیں، اور اللہ تعالیٰ نے اس کام کو زبردست قبولیت نصیب فرمائی۔

حضرت مولانا الیاس صاحب کی وفات رجب ۱۳۶۳ھ میں ہوئی، اس کے بعد سے مولانا محمد یوسف صاحب اس امانت کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، اور کچھ ہی وقفہ کے بعد رمضان کا مہینہ شروع ہوا، اس ماہ مبارک میں مولانا کی مشغولیات میں اور زیادہ اضافہ ہوا، اور جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرات اپنے مربی کے جانشین مولانا محمد یوسف صاحب سے حسب معمول مزید تأثر اور قوت عمل کے ساتھ ملتے رہے اور ان کی

---

(۱) سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی ۲۰۹۔۲۱۰

مجلسوں میں حاضر ہوتے رہے، اور دعوت وتبلیغ کے کام میں اپنی خدمات کو پیش کرنے میں مزید سرگرم ہوئے، حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے رمضان سے چند دن پہلے بعض اہل تعلق کے نام ایک خط لکھا، اور دعوت کے طریقہ کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا، خط کا ایک حصہ اس موقع پر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"تبلیغ کا مقصد کسی خاص چیز کی اشاعت نہیں، بلکہ اس کے ذریعہ ہمیں اس چیز کو زندہ کرنا ہے، جس کو حضور اکرم ﷺ ہم مسلمانوں کی فلاح کے لئے لے آئے، اور تدریجی طور پر ہم مسلمانوں کی استعداد کے مطابق عمل پر ڈالتے رہے، اس سب کی بنیاد اللہ کی رضا کے لئے گھر بار چھوڑنے کی عادت کو عمومیت دینا ہے، جتنی یہ چیز عام ہو جائے گی، حق تعالیٰ کی رحمت کی بارشیں عام طور پر نازل ہونی شروع ہو جائیں گی، ان رحمتوں اور نعمتوں کا اندازہ قائم کرنا جو اس سنت کے زندہ ہونے پر حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کے لئے بہت مشکل ہو گیا ہے، مشکل اس لئے ہے کہ ہم نے ابھی تک ان تبلیغی اسفار کی اہمیت کو محسوس نہیں رکھا، ہم اس کو تصحیح کلمہ یا تصحیح نماز کی تحریک سمجھتے ہیں، لہذا زیادہ اہمیت نہیں دیتے، حالانکہ اس کا مقصد ان سب کو جلا دینا اور منور کرنا ہے، جن کے ذریعہ ہمارے اعمال دنیاوی دینی بن جائیں، اور دینی اعمال سطحیت کے بجائے حقیقت اختیار کر لیں، ایک اور اس کے ذریعہ جو اسلام کا مقصد ہے بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ وتعلق قوی اور مضبوط ہونا اور دن بدن اس میں اضافہ ہوتے رہنا، اور اس کی ترقی کے لئے ایک تڑپ اور بے قراری کی کیفیت پیدا ہو جانا، یہ کیفیت پیدا ہو کر استقامت کی صورت اختیار کر لے، چونکہ یہ مقصد ایک نورانی وروحانی مقصد ہ لہٰذا اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں رمضان کا مہینہ ہے"۔(۱)

مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے لگائے ہوئے چمن کو جو میوات کا علاقہ تھا، دیکھنے اور اس کی آبیاری کرنے کے لئے میوات کا سفر کیا، سب سے پہلے اس سفر کے دو دورہوئے، اور اس کے نتائج بہت ہی حوصلہ افزا نکلے، وہاں کے لوگوں نے مولانا محمد یوسف صاحب کا استقبال اسی انداز سے کیا، جس طرح حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ کا والہانہ استقبال کیا کرتے تھے، اور اب مولانا محمد یوسف صاحب کے دورے سے میوات کے لوگوں کو بہت زیادہ خوشی ہوئی، اور انہوں نے اپنے لئے اور اس علاقے کے لئے اس کو ایک نیک فال قرار دیا، اور بانی جماعت تبلیغ ودعوت کی وفات سے ان کو جو آزردگی اور ملال ہوا تھا، اور وہ یہ ڈر رہے تھے کہ کہیں دعوت الی اللہ کی یہ سرسبز وشاداب کھیتی بے نتیجہ بن کر نہ رہ جائے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ذریعہ اس کو اور زیادہ رونق بخشی اور لوگوں کو ایک عظیم حوصلہ ملا، اور دعوت کے کام میں پوری طرح مشغول ہوگئے، بہت سے لوگ خوشی سے رونے لگے، اور دور دور سے آکر مولانا کا استقبال کرتے تھے، اس دورے کے موقع پر علماء اور جماعت سے تعلق رکھنے والا ایک بڑا مجمع اکٹھا ہوا، اور بیعت کی درخواست کی، اکثر یہ ہوتا تھا کہ چادر جیسا لمبا کپڑا مولانا اپنے ہاتھ میں پکڑتے اور ایک بڑی تعداد اس کپڑے کو پکڑ کر بیعت ہوتی، جس میں نوجوان بھی، ادھیڑ، بوڑھے اور بچے بھی شامل ہوتے تھے۔

اس کے بعد میوات کے علاقے میں دعوت وتبلیغ کی ایک نئی روح بیدار ہوئی، اخلاص وتقویٰ کی روح نہ صرف یہ کہ بڑوں میں، بلکہ بچوں تک میں سرایت کرگئی، اس کے بعد مسلسل حضرت مولانا کے دورے ہوتے رہے اور سرزمین میوات میں اللہ کا کلمہ بلند ہوتا رہا، لوگ اللہ کے دین کی راہ میں قربانیاں دینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے، جماعت کے ذمہ داران جو بانی جماعت کے تربیت یافتہ تھے وہ دل وجان سے اس کام میں لگ گئے، اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے سرشار ہوکر، اپنی زندگیوں کو اعلائے کلمہ اللہ کے لئے وقف کردیا،

(۱) سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی ۲۱۵۔۲۱۶

اور شب وروز جماعت کے کاموں میں مشغول ہوگئے۔

حضرت مولانا محمد یوسف کے اسفار اور دورے شروع ہوگئے، اور ہر جگہ جہاں بھی کوئی اجتماع یا دینی جلسہ یا علماء کے مراکز یا مدارس ہوتے وہاں تشریف لے جاتے اور اپنی تمام تر توجہ اور طاقت کو جماعت کے کاموں کے لئے اللہ کے راستے میں نکلنے اور دعوت دینے کے لئے وقف کردی، اور اب سوائے دعوت وتبلیغ اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی کوششوں کے اور کوئی مقصد باقی نہیں رہ گیا، اور ہر لحظہ دین کی دعوت، لوگوں کو اللہ کے راستے میں نکلنے اور دنیا میں پھیلے ہوئے مسائل وحالات کا علاج بتانے اور امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے علاوہ کوئی اور تمنا باقی نہیں رہ گئی۔

تقسیم ہند کا سانحہ اور تبلیغی کوششیں

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد دہلی، پنجاب اور تقریبا تمام حساس شہروں میں زبردست فسادات کی لہر چلی، جس میں مسلمانوں کو ہندو تنظیموں نے شہید کیا، اس تمام متاثرہ علاقوں کا دورہ خاص طور سے دہلی اور اس کے اطراف میں ہوا، اور فساد کی وجہ سے جو لوگ پناہ گزیں ہوگئے تھے، اس میں جماعت کے لوگوں کو کام کرنے کا مشورہ دیا اور خود بھی اس میں زبردست حصہ لیا، مولانا محمد ثانی حسنیؒ اپنی کتاب سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولانا کے حکم پر تبلیغی جماعتوں نے ان پناہ گزینوں میں پہونچ کر کام کرنا شروع کردیا، اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ان میں پہونچے، کرفیو لگا ہوا تھا اور فورس کا سخت پہرہ تھا، تبلیغی جماعت مچھلی والوں کی مسجد میں جو جامع مسجد کے سامنے والے میدان کے جنوبی جانب ہے، پڑاؤ ڈالا، میدان میں جانا دشوار تھا، لیکن موقع پا کر تیزی سے میدان میں پہونچ جاتے اور پناہ گزینوں میں کام کرتے، پہلے پہل یہ پناہ گزیں مچھلی والوں کی

مسجد میں پڑے تھے، ان کی کثرت اور مصیبت کی وجہ سے مسجد کی صفائی اور انتظام میں دقت ہوتی تھی، مسجد میں آنے جانے والوں میں بہت سے ایسی طبیعت کے لوگ تھے۔ جو ان پناہ گزینوں کی بے ترتیب زندگی اور اس کی وجہ سے گندگی سے ناک بھوں چڑھاتے اور ان کو اس طرح رہنے اور گھریلو انداز سے سونے جاگنے سے منع کرتے، مگر وہ کہاں اس پر عمل کرتے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد کے منتظمین نے ان کو خدا کے گھر سے بھی نکال دیا، اور وہ سامنے والے میدان میں آسمان کے نیچے بارش اور دھوپ میں زندگی گذارنے لگے ،ان کی حالت انتہائی ناگفتہ تھی، اخلاقی پستی، دینی بدحالی، دنیاوی مصیبت کا طوفان آ گیا، جس نے ہر دردمند دل کو رونے پر مجبور کر دیا، تبلیغی جماعتوں نے موت سے بے پروا ہو کر سر پر کفن باندھا، اور بے خطر شب و روز ان میں کام کرنا شروع کر دیا" (۱)۔

مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے بارے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا بیان

رئیس المبلغین حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے حضرت مولانا کا قلبی، روحانی اور دعوتی تعلق بالکل اسی طرح تھا جیسے ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے تھا، مولانا محمد یوسف صاحب علم وعمل کے جامع تھے، اور اپنے والد صاحب کے نقش ثانی تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا نے ان کی زندگی کے تین نمایاں اوصاف کا تذکرہ کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

"(۱) غیبی حقائق: اللہ کے وعدوں اور انبیاءؑ کی دی ہوئی اطلاعات پر ایمان لانے اور ان کے اعتماد و یقین پر اپنی زندگی کی کشتی کو چھوڑ دینے کی ایسی واشگاف، طاقتور اور بے لاگ دعوت کسی دوسری جگہ نہیں دیکھی، مادیت کے اس وبائے عام میں مولانا محمد یوسف

---

(۱) سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی ۲۷۰۔۲۷۱

صاحب کی ایمان بالغیب کی اس دعوت سے بعض اوقات سیکڑوں سامعین کے دل ایمان کے جذبہ سے معمور اور قربانی کی لذت سے مخمور ہو جاتے ہیں۔

(۲) اپنی دعوت کے ساتھ ان کا ایسا شغف وانہماک تھا، جس کی اہمیت نہ صرف یہ کہ دینی دعوتوں اور تحریکوں کے میدان میں نظر آئیں، بلکہ جہاں تک اس کوتاہ نظر کی نظر وواقفیت کا تعلق ہے کسی مادی وسیاسی تحریک کے داعیوں میں بھی وہ استغراق، خودفراموشی وللہیت اور جذب کی کیفیت نظر نہیں آتی۔

(۳) ان کی تقریروں اور محبت کا وہ اثر ہے، جو سامعین وحاضرین پر پڑتا ہے، خاص طور پر ان سلیم طبیعتوں پر جن کا دل ودماغ دوسرے اثرات سے آزاد اور ان کی طبیعتوں میں تسلیم وانقیاد کا مادہ غالب آتا ہے، ان کی کیمیا اثر صحبت اور ان کی انقلاب انگیز تقریروں نے اتنی زندگیوں میں تبدیلیاں پیدا کیں، اور اتنے دلوں اور دماغوں کو متاثر کیا کہ جن کا شمار کرنا ممکن نہیں"(۱)

مولانا کاندھلوی کی تاریخ ولادت ۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۰/ مارچ ۱۹۱۷ء بمقام دہلی ہے، دس سال کی مختصر مدت میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا، اور حدیث شریف کا درس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں لیا، مولانا نے حدیث کے بڑے اساتذہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے لیا، آغاز عمر ہی سے علم کا شوق تھا، اپنے اکثر اوقات علمی اور دینی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔

انہوں نے امام طحاویؒ کی کتاب معانی الآثار کی مفصل شرح تحریر فرمائی، جو شرح معانی الآثار کے نام سے جانی جاتی ہے، آپ کا اصلاحی وارشادی تعلق اپنے والد ماجد ہی سے تھا، حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ کے انتقال کے بعد تحریک دعوت وتبلیغ کی امارت بھی آپ کے حصہ میں آئی، جیسا کہ اوپر تفصیل سے گزر چکا ہے۔

حضرت مولانا کاندھلویؒ کے دور امارت میں ہندوستان کے مختلف بڑے شہروں

---

(۱) پرانے چراغ ج۳/۶۴-۷۱

میں ۵۳/اجتماعات ہوئے، عرب ممالک میں بھی آپ نے اس تحریک کے کام ودعوت کو پہنچایا، اس کے لئے طول طویل اسفار کئے، ۳/مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، اپریل ۱۹۶۵ء میں پاکستان میں آپ نے دارفانی کی طرف رحلت فرمائی، جنازہ ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی لایا گیا، اور وہیں والد محترم کے جوار میں اپنی آخری آرام گاہ میں مدفون ہیں، آپ کی یادگار کتابوں میں حیاۃ الصحابۃ اور شرح معانی الآثار قابل ذکر ہے، اس کے علاوہ آپ کے تبلیغی اجتماعات کے خطابات بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

غیر ملکی دورے اور بیانات اوران کے غیر معمولی اثرات

سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی کے مصنف جناب مولانا محمد ثانی حسنی تحریر فرماتے ہیں:

"یورپین اور مغربی ممالک میں مادہ پرستی اور خدافراموشی اس حدتک پہونچ چکی ہے کہ خودفراموشی میں انسان کھوچکا ہے، ایک مشینی زندگی ہے، جس کو ہرکس وناکس گزاررہا ہے، چاند اور تاروں پرکمندیں ڈالنے والی یورپین قوم حیا اور عفت، غیرت وحمیت، رحمدلی وغمگساری، شفقت ورافت، ایثاروقربانی، اخلاق وتواضع کی صفات سے عاری ہوگئی ہے، جانوروں کی طرح زندگی گزارنا مزاج اور غیرانسانی حرکتیں کرنا قومی اور ملکی شعار اور یورپین تہذیب کا جزء بن گیا ہے، اقبال نے اسی یورپ کے متعلق کہا تھا:

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں ، رونق میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات

ظاہر میں تجارت ہے ، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر ، یہ حکومت

پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق وبخارات

چند بندگان خدا نے جن کی تعداد صرف چار تھی، دعوت وتبلیغ کے اس مشن کو لے کر امریکہ کا سفر کرنے کی کوشش کی۔ سفر کی جملہ کارروائیاں محض اللہ کے فضل وکرم سے پوری ہوگئیں، وہ پانی کے جہاز سے سفر کرنے کے لئے تیار ہوئے، اثنائے سفر اپنے عزم ویقین اور اپنے علم وذہانت سے انہوں نے کام لے کر نہ صرف یہ کہ جہاز کے مسافروں کو متاثر کیا، بلکہ جہاز کے عملے کو بھی ان کی دینی حمیت اور عبادت وانابت میں ان کی گہری دلچسپی اور اخلاص کے ساتھ جہاز کے مسافروں کو اپنی باتوں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، اور ان کا یہ سفر انتہائی کامیاب رہا۔

امریکہ کے ایک سفر کی کارگذاری باکمال سوانح نگار کی زبانی

سوانح مولانا محمد یوسف کے مصنف کی زبان سے آپ اس جماعت کا قصہ سنئے جو ہم سب کے لئے باعث درس وعبرت ہے:

”جب یہ تبلیغی جماعت جو صرف چار افراد پر مشتمل تھی، جہاز پر سوار ہوئی، تو اس کی فکر ہوئی کہ کیسے کام کیا جائے، وہ جہاز کے کپتان کے پاس گئی، اور اذان ونماز کی اجازت چاہی، کپتان نے کہا: آپ بلند آواز سے اذان دیں گے۔ تو لوگوں کو اعتراض ہوگا، اس لئے کہ مسافروں میں ہر مذہب کے لوگ ہیں، مگر جماعت نے اذان دے کر نماز پڑھنی شروع کردی، لوگ گذرنے لگے، اور ٹھہر کر دیکھنے لگے، مگر کسی کو کوئی اعتراض

نہیں ہوا، جماعت والوں نے دیکھا کہ لوگ دلچسپی لینے لگے ہیں تو وہ اپنی تعلیم کرنے لگے، اوران لوگوں کو جو مسلمان تھے اس تعلیم میں شرکت کی دعوت دینے لگے، کپتان بھی آتے جاتے دیکھتا کہ یہ صرف اخلاق، خدا پرستی، آخرت کی یاد، اچھی زندگی گزارنے اور انسان دوستی کی باتیں کہتے ہیں تو وہ بہت متاثر ہوا، جہاز سے امریکہ پہونچتے پہونچتے وہ جماعت والوں سے بہت قریب ہوگیا، اس مرتبہ خدا کے فضل وکرم سے جہاز کسی طوفان سے خلاف معمول نہیں گزرا، جب جہاز صحیح سلامت لنگر انداز ہوا تو کپتان نے کہا کہ خدا نے ہم سب جہاز والوں پر انھیں چند اللہ والوں کی برکت سے فضل کیا ہے، ورنہ طوفان ہم کو پریشان کرتا، اس لئے کہ اب تک جتنے میں نے سفر کئے ان تمام میں طوفان آیا۔

امریکہ پہونچ کر جماعت والے ایک سڑک کے کنارے باہمی مشورہ کررہے تھے کہ ایک کارگزری، کاروالے اترے، جماعت والوں سے ان کی منزل مقصد پوچھی، اور اپنے گھر چلنے کا اظہار کیا، جماعت والوں نے ان کے اس اظہار تعلق کی وجہ پوچھی، تو انہوں نے کہا: میں اسی جہاز سے سفر کررہا تھا، جس سے آپ کررہے تھے، اور میں بار بار آپ کی تعلیم میں بیٹھ چکا ہوں، جماعت والے ان کے گھر گئے، اور ایک ڈائری اٹھا کر ان کے فون نمبر لئے، جو مسلمان تھے، ایک کو فون کیا، اور ملاقات کا وقت مانگا، جو تقریبا دو ہفتے کے بعد مقرر ہوا، وہ حسب وعدہ دو ہفتہ کے بعد ان کے پاس پہونچے، اپنے آنے کی وجہ بتائی کہ ہم صرف اللہ کے لئے ملاقات کرنے آئے ہیں، کوئی مادی غرض نہیں، وہ صاحب مادہ پرستی کے ماحول میں برسوں سے رہ رہے تھے، سمجھ نہ سکے کہ کچھ لوگ ہزاروں میل دور سے صرف اللہ کے لئے ملنے آسکتے ہیں، جب ان کو یقین آیا تو آبدیدہ ہوکر پوچھا کہ یہ محبت کی دولت کیسے حاصل ہوگی؟ جماعت والوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ کچھ وقت لگائیے، تو اس کی حقیقت کو پالیں گے، باتوں باتوں میں تین دن کا ایک سفر طے ہوگیا، اسی طرح جماعت والوں نے

تقریباً ساٹھ ستر آدمیوں کو اس سفر پر تیار کرلیا، سفر ہوا اور سبھی شرکائے سفر جماعت والوں کی خدمت، محبت اور رقت انگیز اور درد واثر میں ڈوبی ہوئی اللہ ورسول ﷺ کی باتوں سے انتہائی متاثر ہوئے اور لوٹتے ہوئے سب نے کہا کہ یہ تین روزہ سفر زندگی بھر ہم کو نہ بھولے گا۔ ہزاروں روپئے حاصل کر کے بھی حاصل نہیں کر سکتے، جماعت والوں نے کہا کہ اس محبت اور اس کی لذت وذوق کو دائمی بنانے کے لئے آپ لوگ ہمارے وطن ہندوپاک تشریف لے چلیں، اور چار چار ماہ اس کام میں لگائیں، آپ کو ایسا سکون، ایسی راحت اور لذت وذوق کی ایسی کیفیت ملے گی، جو آپ یہاں رہ کر کسی طرح حاصل نہیں کر سکتے، اس دعوت پر سبھی لوگ وقت دینے پر آمادہ ہوگئے اور اپنے نام لکھا دیئے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ اہل یورپ وامریکہ اپنی پرشور اور کیف وسرور اور روحانی مسرت سے خالی زندگی سے اتنے عاجز ہو چکے ہیں کہ ان کو اگر ایک لمحہ بھی پرسکون اور روحانی لذت سے معمور میسر آجاتا ہے تو وہ فرنگی تہذیب کے بند وسلاسل سے چھٹکارا حاصل کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں'' (۱)

مولانا محمد ثانی سوانح نگاری میں لاثانی:

یوں تو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی دعوت اور اصلاح وتبلیغ کے میدان میں اتنے باعث فخر کارنامے ہیں، جن کو حد شمار میں لانا مشکل ہے، اس کام میں ان کے لئے اللہ کی نصرت، توفیق و بے قراری کی فراوانی اس قدر تھی کہ اس کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں، مولانا پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور ان کے سوانحی ادب سے سوانح نگاروں کو ایک خاص انداز تعبیر حاصل ہوا ہے، اور نہ صرف یہ کہ اہل قلوب ومعرفت کے کارہائے نمایاں سے، اور ان کی زندگی کے حالات سے دین کے لئے بے قراری کا ایک اسلوب اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے ایک خاص انداز اخذ کیا ہے، بلکہ ادیبوں، شاعروں اور

---

(۱) سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی: ۵۰۱-۵۰۲

دانشوروں نے بھی اس جذبۂ فدائیت وفنائیت کی ایک پاکیزہ روح سے مستفید ہوئے ہیں، کیونکہ یہی دراصل کامیاب زندگی کا وہ چشمہ ہے، جو کبھی خشک نہیں ہوتا ہے، اور جو آبشار کی طرح دل ودماغ کی فضاؤں کو سیراب کرتا رہتا ہے۔

سوانح مولانا محمد یوسف کے مؤلف حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ سوانح نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، وہ سوانحی عناصر میں شیرازہ بندی کا فن جانتے ہیں، ان کی یہ کتاب جہاں ایک طرف حالات زندگی کا تجزیہ پیش کرتی ہے وہیں سوانحی ادب کا ایک عظیم نمونہ نظروں کے سامنے آتا ہے، وہ جس طرح ایک بے مثال عالم وداعی تھے، اسی طرح وہ فنون ادب کے علمبردار اور تصویر زندگی کو ادب کے سانچے میں ڈھالنے کا فن بھی خوب ہی جانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کا سوانحی ادب ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے، اور ڈھونڈنے والوں کے لئے اس میں قلب وروح کی توانائی کا سامان موجود ہے۔

مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی شاعری اور قرآن کریم سے استفادہ

(میزاب رحمت کے حوالے سے)

برصغیر کے جن مسلم شعراء کے کلام میں عربی زبان وادب کا اثر پایا جاتا ہے اور جنہوں نے اپنی شاعری میں قرآن کریم سے کافی استفادہ کیا ہے ان میں ایک ایسا نام جن کا مقام شاعر حمد ونعت کی حیثیت سے بہت بلند اور قابل رشک ہے، آج کی اس مجلس میں، میں اسی شاعر عشق ومحبت کے بارے میں کچھ گفتگو کرنے اور حمد ونعت اور منقبت ومناجات کے کچھ نمونے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

مولانا محمد ثانی حسنی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بھانجے اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے حقیقی بڑے بھائی تھے، اور حسنی خاندان میں وہ ایک بہت ہی موقر اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے، وہ تقویٰ ودین داری، علم وعمل اور دعوت الی اللہ اور معرفت وربانیت کے ساتھ شعروادب کے جامع تھے، ان کا تعلق ملک کی مؤثر وعظیم اور اہل علم وورع ہستیوں سے بہت گہرا تھا، وہ محدث اعظم حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کے نہ صرف یہ کہ عقیدت مند تھے، اور علوم اسلامیہ میں ان کے مایہ ناز شاگرد تھے، بلکہ ان سے قلبی وروحانی فیض حاصل کرنے والوں میں سرفہرست شمار کئے جاتے تھے، انہوں نے حضرت شیخ الحدیثؒ کی شان میں اپنی وفات سے کچھ دن پہلے قصیدۂ منقبت لکھا۔ یہاں پر اس کے دو شعر عرض کر رہا ہوں۔

اے کہ تو شیخ الحدیث آقائے من عالی مقام
درنگاہم تو امام ملت خیرالانام

سرگروہ اولیاء ، سرخیل مردان خدا
سربراہ اہل دین ، منجملہ خاصان کرام

مجھ کو شاعر علم و معرفت مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کے خیالات اور باتوں کو قریب سے سننے اور سمجھنے کا موقع ملا، ان کی بلند خیالی، انکی نرم دلی، ان کی عالی ظرفی، ان کی محبت وشفقت نے ان کے بارے میں ایک بلند تصور عطا کیا، ان کی دلآویز شخصیت کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو عام طور سے اہل علم و دانش کے طبقے میں کم ہی نظر آتی ہیں، مولانا کی قلبی کیفیات کا احساس اکثر ان کے قریب رہنے والوں کو ہو جایا کرتا تھا، کبھی کبھی وہ اپنے خاص خیالات میں اس طرح ڈوب جایا کرتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے گرد و پیش سے منقطع ہو کر کسی غیر مرئی طاقت سے متعلق ہو جاتے ،مولانا ایک مومن کامل کا نمونہ تھے، مشکلات وحالات کا نہایت خندہ پیشانی سے سامنا کرتے تھے ،وہ اللہ کی نصرتوں پر پورا توکل رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی خصوصیت کا حامل تھا، ان کی دعاؤں سے بڑے بڑے مسائل حل ہوا کرتے تھے ،وہ نگاہ مرد مومن رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و عمل کی دولت کے ساتھ تواضع سے نوازا تھا، ان کو نظم ونثر پر یکساں قدرت تھی، ان کی نثر کے نمونے ماہنامہ رضوان کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، نظم کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو ترانۂ ندوہ پڑھیے، کیسی روانی اور برجستگی ہے۔

ہم نازش ملک وملت ہیں، ہم سے ہے درخشاں صبح وطن
ہم تابش دین ہم نور یقین، ہم حسن عمل ، ہم خلق حسن

آج بھی ندوہ کے در و دیوار اس پر کیف ترانے کے نغموں سے گونج رہے ہیں، وہ تابش دین، نور یقین، حسن عمل اور خلق حسن کا اعلیٰ نمونہ تھے، ان کا شعری مجموعہ "میزاب رحمت" کو سید احمد شہید اکیڈمی رائے بریلی نے شائع کیا ہے۔ اس میزاب رحمت میں حمد، مناجات، نعت ، درود وسلام کے اعلیٰ ترین بیش قیمت نمونوں کے ساتھ، نغمات سحر کے عنوان سے حمد

ودعاء کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے سبحان اللہ کے عنوان سے یہ اشعار کس قدر دلوں پر اثر ڈالنے والے اور آنکھوں سے شوق کے موتی برسانے والے ہو سکتے ہیں۔

حمد سرا ہیں سنبل و ریحاں　　انجم و ماہ و مہرِ تاباں
شمعِ شبستاں صبح درخشاں　　جن و ملائک انساں حیواں
اللہ اللہ ، سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ

صحنِ گلستاں کی ہر یالی　　پتّہ پتّہ، ڈالی ڈالی
قُمری و بلبل گلچیں مالی　　سب کے لبوں پر ذکرِ جمالی
اللہ اللہ، سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ

ذکر یہی ہے مرغ چمن کا　　لالہ وگل کا سرو و سمن کا
نیل وفرات اور گنگ وجمن کا　　ساحل و طوفاں کوہ و دمن کا
اللہ اللہ، سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ

آندھی بارش، بجلی بادل　　دریا، صحرا گلشن جنگل
پھول، کلی، پھل، غنچہ، کونپل　　نغمہ سرا ہیں ہر دم ہر پل
اللہ اللہ، سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ

محوِ ثنا، فقر سلطانی　　حاضر و غائب باقی و فانی
قولِ و عمل الفاظ و معانی　　آگ، ہوا اور مٹی پانی
اللہ اللہ، سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ

حَمد سرا اور مست و غزل خواں　　توراۃ انجیل اور یہ قرآں
حور و غلماں مالک و رضواں　　ہر دل شاداں ہر لب خنداں

اللہ اللہ، سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ

شبلیؔ و رازیؔ، حافظؔ و جامیؔ　　ہندی و ترکی مصری و شامی
بے کس و عاجز نامی گرامی　　سب کے لبوں پر ذکرِ دوامی

اللہ اللہ، سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ

بَزم ہے اس کی بزمِ ہستی　　اس کی بلندی اس کی پستی
دَین ہے اس کی کیف و مستی　　ذکر ہے اس کا بستی بستی

اللہ اللہ، سبحان اللہ
سبحان اللہ سبحان اللہ

سبحان اللہ کس قدر بے ساختگی ہے، اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی آواز ہے، کسی شاعر ایمان ویقین سے اس قدر روح پرور اور بے تکلف حمد کے اشعار قرطاس وقلم کی زینت بن سکتے ہیں!

دوسرا حمد یہ قصیدہ بعنوان ''الحمدللہ'' سماعت فرمائیں وہی جذبہ شکر، وہی بے ساختگی، وہی دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی آواز، اور وہی حمد وشکر کی موجیں اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، اور اپنے اسلام وایمان پر فخر واعتزاز:

ہم ہیں مسلماں الحمد للہ　　ہم اہل ایماں الحمد للہ
ہم اہل قرآں الحمدللہ　　ہم اہل عرفاں الحمدللہ

ہم ہیں مسلماں الحمدللہ

الحمد للہ، الحمد للہ

ہے رب ہمارا صرف ایک اللہ زیبا اسی کو ہے حشمت و جاہ
الـمـلـکُ للہ الـحـکـمُ للہ اس کی حکومت ہر لحظہ ہر گاہ
ہم ہیں مسلماں الحمدللہ
الحمد للہ الحمد للہ

حضرت محمدؐ سچے پیمبر سب سے مکرم سب سے مؤقر
سب کچھ ہمارا ان پر نچھاور رحمت خدا کی ہر لمحہ اُن پر
ہم ہیں مسلماں الحمدللہ
الحمد للہ الحمد للہ

ہم حاملان شرع متیں ہیں ہم اہل دِل ہیں اہل یقیں ہیں
پاکیزہ رو ہیں روشن جبیں ہیں ہم صاحبان دنیا و دیں ہیں
ہم ہیں مسلماں الحمد للہ
الحمد للہ الحمد للہ

قلب ونظر کے ہم ہیں حجازی زاہد مجاہد، غازی نمازی
رومی غزالی، شبلی و رازی شیوہ ہمارا ہے پاکبازی
ہم ہیں مسلماں الحمد للہ
الحمد للہ الحمد للہ

رہبر ہمارا عشق بلالی عزم مجدد روح غزالی
مقصد مبارک منزل ہے عالی اللہ مالک اللہ والی
ہم ہیں مسلماں الحمد للہ
الحمد للہ الحمد للہ

ہم ظالموں سے ڈرتے نہیں ہیں ان کا کبھی دم بھرتے نہیں ہیں
عیش وطرب پر مرتے نہیں ہیں باطل کی عزت کرتے نہیں ہیں
ہم ہیں مسلماں الحمد للہ
الحمد للہ الحمد للہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب وسنت کی تعلیمات جو اسلام اور ایمان پر شکر ومسرت کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں، وہ ان اشعار کے اندر پوری طرح موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ومن أحسن قولاً ممن دعا الی الله وعمل صالحاً وقال: انني من المسلمين)

"لا اله الا الله "والے قصیدہ میں بھی یہی روح کام کررہی ہے، اس کے بھی چند بند سماعت کریں۔

ہے نشان لافانی نسخۂ جہاں بانی
ہے شکوہ سلطانی شمع بزم نورانی
لآ الٰہ الّا اللہ
لآ الٰہ الّا اللہ

جامِ بادۂ عرفاں زیب و زینت قرآں
ذکر خاصۂ خاصاں نقش پرچم ایماں
لآ الٰہ الّا اللہ
لآ الٰہ الّا اللہ

کلمہ ہر مسلماں کا نیک فطرت انساں کا
ہر رگِ دل و جاں کا ہر گلِ گلستاں کا
لآ الٰہ الّا اللہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

ضربتِ ید اللّٰہی نغمۂ سحر گاہی
کلمۂ حق آگاہی نکتۂ شہنشاہی

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

لوح عرش اعظم ہے سوز و ساز آدم ہے
برگ گل ہے شبنم ہے زخم دل کا مرہم ہے

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

آب و گوہر تاباں نغمۂ دلِ شاداں
نکہت گل خنداں مشکبار ونور افشاں

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

رمزِ پاکبازی ہے دستِ مرد غازی ہے
تاجِ سرفرازی ہے خوئے دل نوازی ہے

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

کلمہ یہ ہے لاثانی ذکر فقر و سلطانی
ذکر باد بستانی ذکر بر لب ثانی

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: هو الله الذى لا اله الا هو ، عالم الغيب والشهادة ،هوالرحمٰن الرحيم،هو الله الذى لا اله الا هو ، الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن العزيزالجبار المتكبر ، سبحان الله عما يشركون، هوالله الخالق البارئ المصور،له الأسماء الحسنى ، يسبح له مافى السموات والأرض وهوالعزيز الحكيم ۔(الحشر)

اورافضل الذکر''لا الٰہ الا اللہ'' کی تفسیر''اللہ اکبر اللہ اکبر'' کے عنوان سے ملاحظہ فرمائیے:

ہے ذکرِ بہتر اللہ اکبر ہے ذکرِ انور اللہ اکبر
ہے ذکرِ بر تر اللہ اکبر ہے ذکرِ اطہر اللہ اکبر
ذکر معنبر اللہ اکبر
اللہ اکبر اللہ اکبر

اللہ تعالیٰ ہے پاک و برتر ہے سب کا خالق، ہے بندہ پرور
حضرت محمدؐ اس کے پیمبر جسم منوّر روح مطہر
عزت تصدق دولت نچھاور
اللہ اکبر اللہ اکبر

ہم اہلِ ایماں ہم ہیں مسلماں حق کے پیامی حق کے حدی خواں
تھامے ہوئے ہیں ہم شمعِ ایماں رکھیں گے ہر دم اس کو فروزاں
یہ ذکر کتنا ہے روح پرور
اللہ اکبر اللہ اکبر

اسلام ہم کو ہے دل سے پیارا راحت ہے دل کی آنکھوں کا تارا
اس کے ہیں ہم سب وہ ہے ہمارا چمکے گا اس کا ہر سو ستارا
پھیلے گا انشاءاللہ گھر گھر
اللہ اکبر اللہ اکبر

مردانِ حق ہم اور خیر امت　　دستور اپنا قرآن و سنت
ہم کو خدا نے بخشی ہے عزت　　کیا خوب دولت کیا خوب نعمت
کتنا ہے رب کا احسان ہم پر
اللہ اکبر　　اللہ اکبر

دبستان دیں کے گلہائے تر ہم　　ابر بہاری باد سحر ہم
حق کے لئے ہیں گرم سفر ہم　　منزل بہ منزل ہیں تیز تر ہم
ہم کو ملی ہے پرواز شہپر
اللہ اکبر　　اللہ اکبر

ہم ہوں مجاہد اللہ والے　　ہم شیر دل ہوں ہم ہوں جیالے
کیا سنگِ خارا کیا تیغ و بھالے　　ہوں ٹھوکروں پر لاکھوں ہمالے
ہم ہوں نشانِ بو بکرؓ و حیدرؓ
اللہ اکبر　　اللہ اکبر

ہم کو خدا دے وصف حجازی　　ہوں شب کے زاہد ہوں دن کے غازی
دے ہوش مندی دے پاکبازی　　دنیا و دیں کی دے سرفرازی
دنیا بھی بہتر عقبیٰ بھی بہتر
اللہ اکبر ا للہ اکبر

اور ماہ مبارک رمضان کا استقبال فرمان باری: "شهر رمضان الذی أنزل فيه القرآن ، هدی للناس وبينات من الهدی والفرقان" کی روشنی میں کچھ اس طرح ہورہا ہے:

زہے قسمت مسلمانو! کہ پھر ماہ صیام آیا
گنہگاروں کے حق میں بن کے رحمت کا پیام آیا

ادھر سے اک ہوائے رحمتِ پروردگار آئی
ادھر ابر کرم چھاتا برستا صبح و شام آیا
چلے پیمانے لے لے کر مئے عرفاں کے متوالے
نگہ ڈالی جو ساقی نے تو پھر گردش میں جام آیا

ایک دوسری بحر میں:

مرحبا اے ماہِ نور مرحبا ماہِ سرور
ماہ رمضاں مرحبا مرحبا خیر الشہور
مرحبا صد مرحبا ماہ افطار و سحور
نو بہار جان و دل تجھ سے تابندہ شعور

اب شب قدر کے بارے میں:

ہے شب قدر آج جو ہے لیلۃِ عفو و کرم
سایہ فگن ہے سروں پر رحمت پروردگار
یہ ہے شب جس میں ہوا نازل کلام اللہ کا
جس کی عظمت پر ہوا کون و مکاں سارا نثار
اس مقدس شب پہ قرباں ہیں ہزاروں روز و شب
اس مبارک رات پر صدقے مہینے یک ہزار
نور پر اس رات کے قربان ہے نور قمر
اور اس شب کی مہک پر ہے فدا مشک تتار
صبح صادق تک، فرشتے اور جبرئیل امیں
آسماں سے سب اترتے ہیں قطار اندر قطار
رات ساری خیر و برکت اور امن و عافیت

تا طلوع فجر ان کی ہے بہار اندر بہار
اللہ اللہ کتنی قدرومنزلت کی رات ہے
کون کرسکتا ہے اس کی خیر و برکت کا شمار

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:انا أنزلناه في ليلة القدر .وما أدراك ما ليلة القدر ، ليلة القدر خيرمن ألف شهر ۔ تنزل الملائكة والروح فيها باذن ربهم من كل أمر سلام ، هي حتى مطلع الفجر ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء کرام اوراہل قلب ومعرفت بزرگوں کا ذکر فرمایا ہے اوران کے فضائل کی طرف اشارہ کیا ہے، اس آیت کی روشنی میں شاعر مدح ومنقبت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ نے اہم علمائے ربانیین اور صلحائے امت پران کی منقبت میں مدحیہ قصیدے لکھے ہیں۔:"ألاان أولياء الله لاخوف عليهم ولا هم يحزنون، الذين آمنواوكانوا يتقون ،لهم البشرىٰ فى الحياة الدنيا وفى الآخرة ،لاتبديل لكلمات الله، ذلك هوالفوز العظيم (یونس۶۲۔۶۳۔۶۴) کے مفہوم ومعانی کوان پر منطبق کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے حکیم الامت حضرت تھانوی (متوفی ۱۷؍رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹؍جولائی ۱۹۴۳ء) کی منقبت میں ان کا قصیدۂ مدحیہ۔اس کا مطلع یہ ہے۔

خدا نے اپنی قدرت سے کیے شمس و قمر پیدا
کیے لعل وگہر تھانہ بھون کی خاک پر پیدا
انہیں میں ایک تھا لعل بدخشاں لُولُوِ لالا
دعا ہے لعل، ایسا ہو ہر اک مومن کے گھر پیدا
مبارک ہے وہ گھر جس میں ہوا ایسا بشر پیدا
مبارک ہے شجر جس میں ہوا ایسا ثمر پیدا
مبارک نام تھا اشرف علی اس مردِ حق بیں کا

محبت دل میں ہوجاتی تھی جس کو دیکھ کر پیدا
متانت بھی سخاوت بھی، کمال وفضل وصورت بھی
خدا نے ہر صفت کی، پاک سے پاکیزہ تر پیدا
ہوئی جس کے قدم سے دور ظلمت شرک و بدعت کی
کیا اللہ نے توحید و سنت کی سحر پیدا
تصوّف کے گلستاں میں بہارِ بے خزاں لایا
ہر اک شاخ نشیمن پر کیے گلہائے تر پیدا
بکھیرے جس نے موتی معرفت کے اور حکمت کے
خس و خاشاک سے جس نے کیے لعل و گہر پیدا
نہ جانے کتنے لوگوں نے بدل دی زندگی اپنی
کیا جس کے مواعظ نے دلوں میں وہ اثر پیدا
کیا سیراب جس نے تشنگانِ علم و عرفاں کو
ہوئے جس کی نظر سے بے شمار اہل نظر پیدا
زہے قسمت ہزاروں راہ رو منزل پہ جا پہونچے
کیا ہم میں خدا نے ایک ایسا راہبر پیدا
خدا کے ایسے بندوں کی محبت عین ایماں ہے
انہیں کے غم میں رونے کو ہوئی ہے چشم تر پیدا
زمانہ سر جھکا دیتا ہے جس کے پاک قدموں پر
نہیں ہوتا جہاں میں روز روز ایسا بشر پیدا
یہ برکت ہے فقط حضرت محمدؐ فخر عالم کی
کہ ان کے ہی غلاموں میں ہوئے اہل نظر پیدا

جو اشرف نام تھا ان کا تو اشرف کام کرتے تھے
ہوئے اشرف وہ بن کر نائب خیر البشر پیدا
جہانِ اہل دل ان کو ہمیشہ یاد رکھے گا
کہ کم ہوتا ہے ایسا عشق کا پیغامبر پیدا
"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

اب بانی جماعت دعوت وتبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ (متوفی ۱۱ر رجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۳ر جولائی ۱۹۴۴ء) کے بارے میں:

خاندانِ کاندھلہ ہے کیا مبارک خاندان
حکمت و دانائی و علم و عمل کا کہکشاں
حضرتِ مولانا الیاسؒ اک حکیم نکتہ داں
ہیں اسی پاکیزہ خصلت خانداں کے جانِ جاں
جسم نازک ناتواں تھا عزم تھا لیکن جواں
تھی زباں لکنت زدہ ہر دم مگر گوہر فشاں
عابد و زاہد مجاہد دین حق کے پاسباں
نازش اہلِ یقیں اصحاب دل اہلِ زباں
ایک عالم ایک مرشد راہ حق کے راہ داں
جن کے دم سے کھل اٹھا دین خدا کا گلستاں
وہ سراپا کیف ومستی درد و سوز و جذب و شوق
صاحب درد نہاں سوز عیاں عشق تپاں
دین کی خاطر تڑپنا مرغ بسمل کی طرح

آہ دل میں آہ لب پر اشک آنکھوں سے رواں
دعوت وتبلیغ کی تحریک کے بانی تھے وہ
شرق سے تا غرب جس کا آج ہے سکہ رواں
کردیا پیدا وہ جذبہ دعوت و تبلیغ کا
دین حق کے واسطے پھرنے لگے خورد و کلاں
بدلے دل بدلی نگاہیں اور بدلیں صورتیں
بن گئے بد نیک دل اور بد زباں شیریں زباں
جو خدا نا آشنا تھے ہوگئے شب زندہ دار
نور چہروں سے عیاں ماتھوں پہ سجدوں کے نشاں
لاالٰہ کی صدا سے گونج اٹھے دشت و جبل
سر جھکا باطل کا جبکہ اس نے دی حق کی اذاں
مسجدیں ہر ہر جگہ بھرنے لگیں بہر نماز
دیکھنے والوں نے علم و ذکر کا دیکھا سماں
اختیار اکرام مسلم جو کیا لوگوں نے جو
حسنِ نیت سے مجلّٰی ہوگئیں سب نیکیاں
چھوڑ کر اپنے گھروں کے راحت و آرام کو
ہوگئے گرم سفر تبلیغ دیں کے کارواں
ترک لا یعنی سے ہر ہر داعیِ دین مبین
مستحق رحمت داور ہوا دونوں جہاں
اے خدا اس مردحق پر کھول دے رحمت کے در
کیوں کہ تھا یہ جانشینِ خاتم پیغمبراں

اور اب باری آتی ہے سید الطائفہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سنئے اور داد دیجئے:

شاد باش اے ندوۂ اصحاب فکر ارجمند
شاد باش اے ندوۂ اہلِ زبان ہوشمند

شاد باش اے ندوۂ اصحاب دل اہلِ قلم
شاد باش اے ندوۂ اہل کمال اہل کرم

ہے ترا دار العلوم اک مرکز علم و ادب
معترف جس کے ہیں سب اہلِ عجم اہلِ عرب

درسگاہ علم ایسی غالباً کمیاب ہے
وہ جہانِ علم میں اک گوہر نایاب ہے

اس کا اک فرزند ہے سیّد سلیماں نام کا
سارے عالم میں ہے شہرہ جس کے علمی کام کا

وہ سلیماں فخر ندوہ نازش دار العلوم
وہ سلیماں عالم ہندو حجاز ومصر و روم

وہ سلیماں جن کے چہرہ سے عیاں نورِ یقیں
وہ سلیماں صاحبِ دل، خندہ رُو، روشن جبیں

وہ سلیماں جو کہ تھا علمِ نبوّت کا امیں
وہ سلیماں سرگروہ اہلِ عقل دوربیں

وہ سلیماں نیک دل، شیریں زبان، وخوب رُو
وہ سلیماں خوش خصال و پاک رُو، آہستہ خو

وہ سلیماں قلب میں رکھتا تھا جو عزم جواں
وہ سلیماں جو کہ تھا علم وفضیلت کا نشاں

وہ سلیماں قصر علم و فضل کا معمار تھا
وہ سلیماں جو عمل کے حسن کا شہ کار تھا

وہ سلیماں بے مثال و بے بدل سیرت نگار
وہ سلیماں اہل دل کا قافلہ سالار تھا

وہ سلیماں جو کہ تھا اسرار دیں کا راز داں
وہ سلیماں پاک داماں وہ خطیب دُرفشاں

وہ سلیماں صاحب علم وقلم سیرت نگار
وہ سلیماں جس کا ہر نقش قلم تھا شاہکار

وہ سلیماں جانشین شبلی مرحوم تھا
وہ سلیماں اہل علم وفضل کا مخدوم تھا

وہ سلیماں جو کہ تھا استاذ مسعود وعلی
وہ سلیماں کارنامے جن کے روشن اور جلی

وہ سلیماں دور حاضر کا جہاندیدہ ولی
وہ سلیماں معرفت میں نائب اشرف علی

وہ سلیماں صاحب ذہن رسا قلب کشاد
وہ سلیماں جن پہ اہل فضل کو تھا اعتماد

وہ سلیماں مرد حق مرد خدا مرد غیور
وہ سلیماں صاحب علم وعمل عرفانِ دیں عقل وشعور

وہ سلیماں جن پہ رحمت ہو خدا کی بیشمار
وہ سلیماں علم کی جن سے چلی باد بہار

وہ ادائے دلکش اس کی وہ زبانِ گلفشاں وہ لبِ خنداں بلا کا نور چہرے سے عیاں
وہ سلیماںِ جس کو مالک نے دیا ذوقِ جمال وہ سلیماں جس کو خالق نے دیا حسنِ خیال
وہ سلیماںِ جس کو مالک نے دیا حُسن وجمال وہ سلیماں جس کو مالک نے دیا فضل وکمال
وہ سلیماں علم میں انجم کی ہم قسمت بنا اہلِ ندوہ کے لئے سرمایۂ عزت بنا
ناز کرتے ہیں ہم اہلِ علم اس کی ذات پر اس کے ہر دینی عمل پر علم کی ہر بات پر
آہ وہ سید سلیماں آج ہم میں ہے نہیں ہوگیا وہ چھوڑ کر دنیا کو جنت میں مکیں
اس پہ مالک شفقتوں کی اپنی ارزانی کرے مغفرت کی اور رحمت کی فراوانی کرے

"آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اور اب منقبت بیان ہورہی ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی، ان کی تربیت ان کی معرفت اور ان کی قیادت قوم وملت کا ذکر کس تاثر اور عقیدت سے ہورہا ہے۔ آیئے آپ بھی اس عظیم شخصیت اور ان کے درد وسوز کی کیفیت کا اندازہ لگایئے:

یاد آتا ہے مجھے رہ رہ کے وہ عہد کہن ہند میں جب عام تھا رشد وہدایت کا چلن
کیا سہارنپور، دہلی، رائے پور و دیوبند کاندھلہ، گنگوہ، منگلور اور کیا تھانہ بھون
رونق افروزان سبھی خطوں میں تھے مردانِ حق چپّہ چپّہ پر مہکتا تھا ولایت کا چمن
ہر بزرگ اپنی جگہ تھا آفتاب و ماہتاب ظلمتوں کو کردیا تھا دور رہ کر ضوفگن
ان میں مولانا حسین احمد فرید عصر تھے جن کو مالک نے دیا تھا مردحق کا بانکپن
راحت قلب رشید احمد امام الأتقیاء مسند آرائے جہان دل امیر انجمن
بے غرض، بیباک وحق گو، خندہ رُو، روشن جبیں جانشینِ خاص شیخ الہند محمود الحسن
صاحب جذب درون وعشق ومستی دردوسوز خوش مزاج و پاکباز نیک خو، شیریں سخن
سرگروہ اہل دل اہل یقیں اہل نظر صاحب صدق وصفا حلم وحیا خلق حسن
جن کے فیض تربیت سے سینکڑوں کامل بنے جن کے دامن سے ہیں وابستہ ہزاروں مردوزن

عمر بھر دیتے رہے درسِ حدیث مصطفیٰ — علم دیں کے ہر طرف جاری کیے گنگ وجمن
جن سے حاصل تھا ہزاروں کو تلمذ کا شرف — جا بجا پھیلے ہوئے ہیں از مراکش تا ختن
سرور اہل طریقت خاصۂ خاصان حق — جامع دین و سیاست، نازش ملک و وطن

”در کفے جام شریعت بر کفِ سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں با ختن“

اور یہ ہیں ولی کامل، مفسر قرآن اور شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری، (متوفی ۱۸ رمضان ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے استاذ و مربی، عقیدۂ توحید کے علم بردار اور عشق نبیؐ میں سرشار، اور اتباع سنت میں بے قرار، اس جامع شخصیت کی تصویر اور دریا کو کوزے میں بھرنے کی مثال ملاحظہ کریں مولانا محمد ثانیؒ کے منفرد اسلوب میں:

میں نے دیکھا ہے خدا کا ایک ایسا بھی ولی — جس کے دم سے خیر و برکت کی ہوا گھر گھر چلی
رشد و عرفاں کی چلی بادِ بہارِ جانفزا — ڈالی ڈالی گلشن اسلام کی پھولی پھلی
اس ولی کی زندگی تھی پاک سے پاکیزہ تر — زندگی وہ نور کے سانچہ میں ہو جیسے ڈھلی
اس کی صحبت میں ہر اک کو یاد آتا تھا خدا — اک نظر میں دور، ہو جاتی تھی دل کی بے کلی
صاحبِ علم و فضیلت، زاہدِ شب زندہ دار — ہر عمل جس کا تھا پیارا ہر ادا جس کی بھلی
تھا جو قرآں کا مفسّر اور حکیمِ نکتہ داں — جس نے بتلایا ہر اک نکتہ خفی ہو یا جلی
مرد خود آگاہ و حق بیں با خدا مردِ غیور — جس نے قصر سلطنت میں ڈال دی تھی کھلبلی
جس کے دم سے شرک و بدعت کا اندھیرا چھٹ گیا — مشعل توحید و سنت ہر قدم ہر دم جلی
انجمن خدام دیں لاہور کا بانی تھا وہ — تھا خدا کا برگزیدہ حق رسیدہ وہ ولی
وہ ولی کیا تھا ولی گر تھا ولایت کا امام — جس سے مہکی تھی ولایت کے چمن کی ہر کلی
تذکرہ ہے جس کے اوصافِ حمیدہ کا یہاں — اس مبارک شخصیت کا نام ہے احمد علی

وہ امیر کاروانِ عشق و مستی درد و سوز
آفتاب رشد و عرفاں حضرت احمد علی

اس کے بعد عارف باللہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری (متوفی ۱۳؍ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۶؍اگست ۱۹۶۲ء) کی وفات حسرت آیات کا ذکر کس انداز سے کرتے ہیں اور ان کی وفات کے بعد جو خلا پیدا ہوا اس کی تصویر ''ان لـلمتقين مفازا'' اور" ولـنبلونكم بشئى من الخوف والجوع ونقص من الأموال والانفس والثـمـرات، وبشـر الـصـابرين الذين اذا أصابتهم مصيبة قالوا: انا لله وانا ليه راجعون ، کے آئینہ میں کس طرح دکھاتے ہیں:

آہ وہ خضر راہ طریقت گیا
جس سے حاصل تھی دل کو سکینت گیا

راہ احسان پر جو چلاتا رہا
آہ! وہ آج ناز مشیخت گیا

دین کے جس سے پائے جہاں نے نشاں
مشعل راہ دین و شریعت گیا

جس سے تقویٰ کا سیکھا تھا سب نے سبق
وہ سراپا یقین و خشیت گیا

جس نے ایثار میں زندگی کی بسر
پیکر صبر و ہمت عزیمت گیا

عمر بھر جس نے کی پیروئ رسول
رہبر راہ قرآن و سنت گیا

ذکر کی مجلسیں جس سے آباد تھیں
مجلس ذکر و تقویٰ کی زینت گیا

جس کی صحبت میں ملتا تھا دل کو جلا
پاکدل خوش زباں نیک طینت گیا

جس کی خدمت میں ہوتا تھا دل کو سکوں
سادہ دل نیک خو خوش طبیعت گیا

فیض پاتے تھے جس ذات سے خاص و عام
جس کی اکسیر تھی نیک صحبت گیا

جس سے شاداب تھا باغ عبد الرحیم
لے کے وہ باغ کی ساری نکہت گیا

عبد قادر جہاں دیدہ و ہوش مند
مسکراتا ہوا آج جنت گیا

جس کو شیخ المشائخ کہیں تو بجا
وہ ہی قطب جہاں قطب ملت گیا

اس کے جانے سے اجڑا دلوں کا چمن
آہ! سرتا بہ پا خیر و برکت گیا

ڈھونڈتی ہیں نگاہیں جسے دم بدم
آج وہ مونس رنج و کلفت گیا

اللہ اللہ ہمیں اب سکھائے گا کون؟
ذکر کی لے کے وہ لذت گیا

اور امام اہل سنت مولانا عبد الشکور فاروقی (متوفی ۱۷/ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳/اپریل ۱۹۶۲ء) کی قربانیاں اتباع سنت رسول اور اہل بیت و اصحاب رسول کے لیے مدح و ثناء کی مجلس سجانے میں کردار اور رفض و منکرات کو مٹانے کے لیے ان کی بے قرار روح

دیکھنا ہو تو سماعت کریں ان کی منقبت کے اشعار:

مرد حق مرد خدا مرد غیور خاصۂ خاصان حق عبد الشکور
نور عین حضرت عین القضاۃ جانجانِ اہل دل اہل حضور
نائب بو احمد و عبد السلام جن سے پھیلا علم کا، عرفاں کا نور
صاحب علم و عمل زہد و ورع صاحب جذب دروں عقل و شعور
ان کی ضرب موسوی نے کر دیا رفض و شیعیت کا کاسہ چور چور
لکھنؤ میں ان سے سر سبز و نہال سنت و توحید کا ہے نخل طور
جس پہ کرتے تھے نگاہ التفات شرک و بدعت سے وہ ہوتا تھا نفور
آج جو ہے مدح اصحاب نبی ہے انہیں کی خیر و برکت کا ظہور
ان کا علم و فضل تھا مانا ہوا شہرت ان کے زہد کی ہے دور دور
ہیں امام اہلسنت بالیقین ان سے ٹوٹا رفض کا کبر و غرور
بے شک ان کی صحبت پاکیزہ بھی باعث تسکین قلب نا صبور
ان کی تقریروں نے تصنیفات نے کردیا ایمان کا پیدا شعور
ان کی عظمت کو نہ سمجھیں گے کبھی بے خدا بے دین و بے عقل و شعور
معترف ہے ان کی عظمت کا وہی جسکے دل میں ہے بسا ایماں کا نور
میں دعا اللہ سے کرتا ہوں یہ ہو منور مرقد عبد الشکور
اپنی رحمت کی فراوانی کرے مالک دنیا و دیں رب غفور

دے جزا ان کو خدا بہتر جزا
سرخرو ان کو کرے یوم النشور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفض و تشیع کی فراوانی اور اہل سنت والجماعت کی بے سروسامانی کا کچھ عجیب نقشہ تھا، شاید یہ نقشہ شاعر منقبت کو اس وقت خوب نظر آیا ہو جب سورۂ غافر کی

تلاوت کے دوران مومن آل فرعون کا آل فرعون کے خلاف سینہ سپر ہونے کا منظران کی نظروں کے سامنے آیااور انھوں نے امام اہل سنت کو مؤمن آل فرعون کی شکل میں دیکھا، اور خاص طور سے ''رجل مؤمن کی زبان سے نکلا ہوااللہ تعالیٰ کا کلام انھوں نے پڑھا:'' ویا قوم انی أخاف علیکم یوم التناد،یوم تولون مدبرین مالکم من الله عاصم۔ ومن یضلل الله فماله من هاد'

اوراب داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کے مقام عالی شان کی تصویر کشی ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو:

حضرتِ مولانا یوسف پاک رو نیکو سیر
داعی تبلیغ دیں راہ یقیں کے راہبر
جلوت ان کی خوب تھی اور خلوت انکی خوب تر
زندگی تھی پاک ان کی پاک سے پاکیزہ تر
تھے کریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم!
اہل دیں اہلِ نظر کے جانِ جاں نورِ نظر
والد ماجد سے ورثہ میں انہیں حاصل ہوا
قلب مضطر، چشم تر، آہِ سحر، سوز جگر
رات کو رونا بلکنا دن کو پیہم بولنا
یوں بسر ہوتے تھے ان کے رات دن شام وسحر
تھی زباں ان کی دل ان کا ذہن ان کا وقفِ دیں
دعوتِ دیں کے لیے رہتے تھے وہ گرم سفر
راہ مولیٰ میں دیا دل کردیا جاں کو نثار
گھر لٹایا کردیا قربان اپنا مال و زر

وصف ان کا خاص تھا محکم یقیں، پیہم عمل
ان کی نظروں میں خس و خاشاک تھے برق و شرر
حق کے کہنے میں کسی سے بھی نہیں ڈرتے تھے وہ
بادشاہ وقت ہو یا صاحب تیغ و تبر
جس سے ہر دل مست ہو ہر آنکھ ہو اشکوں سے تر
وہ یقیں پرور خطابت وہ دعائے پر اثر
ان کی محنت سے ہوا تبلیغ کی گھر گھر چلی
یعنی از ارض مراکش تا بخاک کاشغر
چل کے دیکھو گھوم پھر کر خطۂ میوات میں
ان کی دعوت کا اگر تم دیکھنا چاہو اثر
جو اڑا دیتے تھے گردن اک ذرا سی بات پر
ہوگئے سفاک وہ باہم دگر شیر وشکر
یاد کرتے ہیں انہیں با چشم تر شام وسحر
گلستانِ دعوت و تبلیغ کے گلہائے تر
ہے دعا تجھ سے ہماری ہر نَفَس شام و سحر
رحم کر تو خوب یا رب یوسفِ گم گشتہ پر

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری (متوفی ۲۱ر شعبان ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۴ر نومبر ۱۹۶۷ء) جن کو دیکھ کر سخت سے سخت جان بھی نرم خو اور مومن کامل ہوجاتا تھا، اور عمل صالح اس کی زندگی کا جزء لازم ہوجاتا تھا۔ اور "نحن اولیاء کم فی الحیاۃ الدنیا وفی الآخرۃ" کی تفسیر شاہ صاحبؒ کی زندگی میں نظر آنے لگتی تھی، یقیناً شاعر منقبت بھی جب شاہ صاحب کا نقشہ اپنے اس قصیدہ میں کھینچنا چاہتے ہونگے اس وقت قرآن کریم کی یہ آیت ان کی نظروں کے سامنے ہوگی، اس عظیم تربیتی اور اصلاحی

شخصیت کے بارے میں وہ اس طرح گہر بار ہوئے۔

پوچھنا کیا حضرتِ شاہِ وصی اللہ کا
مرد حق مردِ غیور و مرد خود آگاہ کا

جلوت وخلوت میں دیکھا ان کو میں نے بارہا
میں نے پایا اُن کو رہبر معرفت کی راہ کا

ظلمت دل دور کرتے تھے وہ بن کر نور حق
ظلمت شب میں ہو جیسے نور کامل ماہ کا

جو بھی بیٹھا ان کی صحبت میں ذرا سی دیر بھی
دل کو اپنے کردیا رہرو خدا کی راہ کا

ان کی خدمت میں سکوں پاتا تھا ان کا خیر خواہ
موم ہوجاتا تھا پتھر دل ہر اک بد خواہ کا

ڈال دی اپنی توجہ کی نظر جس پر اگر
حال بہتر ہوگیا اس کے دلِ گمراہ کا

تھی کشش ان کی نظر میں دل میں میٹھے بول میں
موہ لیتے تھے ہر اک دل ہو گدا یا شاہ کا

ہے بجا ان کو کہیں ہم مصلح امت اگر
کردیا اللہ والا دل ہر اک بد راہ کا

ان کے قدموں میں ٹھکانا تھا مقام افتخار
اہل دنیا اہل سطوت اہل مال و جاہ کا

کوئی نسبت ہی نہیں ہے واصف وموصوف میں
وصف شیر نیستاں کا اور قلم روباہ کا

دے جزا بہتر خدا شاہ وصی اللہ کو
ان پہ خاص الخاص ہو فضل و کرم اللہ کا

ہے دعا اللہ سے بخشے انہیں قرب و رضا
تحفۂ انمول بخشے ان کو اپنی چاہ کا

ان کی برکت سے مجھے بھی جادہ منزل ملے
کیونکہ میں بھی ہوں مسافر معرفت کی راہ کا

حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی (متوفی ۱۲؍ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۰؍مئی ۱۹۷۰ء) کی شان دعوت وتربیت دیکھ کر کون نہ ان پر فدا ہو جاتا، جو لوگ بھی اس معرفت کے نور سے مستفید ہونے خانقاہ یعقوب میں جاتے وہ شان یعقوبی کا منظر، یقین وایمان کی شکل میں متمثل پاتے، کیسی نفیس ترجمانی ہے اس حقیقت کی اس قصیدے میں اور ارتجالیت کا کیسا بانکپن ہے، اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

ایک تھی بھوپال میں علم و یقیں کی بارگاہ
سب کو ملتی تھی جہاں سے پاکیِ قلب و نگاہ

بارگاہِ نور تھی وہ ایک عالی خانقاہ
خانقاہِ دیں پناہ و جلوہ گاہ مہر و ماہ

صدر بزم نور کے حضرت شہِ یعقوب تھے
اہل عرفاں و یقیں کو دل سے جو محبوب تھے

خوبرو، خندہ جبیں، شیریں ادا، شیریں مقال
پاک صورت، نیک سیرت، خوش خصال و خوش خیال

خاندان احمد سرہند کے چشم و چراغ
نقشبندی سلسلہ کے پاک دل روشن دماغ

اہلِ دل کے واسطے وہ نقطۂ پرکار تھے
طالبان معرفت پر ابر گوہر بار تھے
اس جہاں سے اف شہ یعقوب بھی رخصت ہوئے
ہوکے پیارے وہ خدا کو داخلِ جنت ہوئے
کیا مبارک حال تھا ان کا بوقت ارتحال
رو بحق تھے اور غرق بادۂ عشق بلال
چھا رہی تھی کیفیت دل پر نیاز و ناز کی
بس اسی عالم میں ان کی روح نے پرواز کی
جن کی صحبت سے تھا حاصل بے قراروں کو قرار
جن کی خدمت سے میسر تھی حیاتِ نو بہار
جن کے ملفوظات سے ملتی تھی سب کو زندگی
بندگی تابندگی فرخندگی رخشندگی
ایسے مردِ حق سے دنیا ہوگئی محروم آہ!
خاک سے بھوپال کی، گوہر ہوا معدوم آہ!
مرد حق رخصت ہوا تو خیر و برکت اٹھ گئی
قدر جس کی کی نہ ہم نے وہ ہی نعمت اٹھ گئی
جان کر منجملۂ خاصان رب العالمیں
مدتوں رویا کریں گے اہل دل اہل یقیں
”آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے“

حضرت شیخ الحدیث علامہ محمد زکریاؒ کی شہرت حضرت شیخ کے نام سے تھی اور آج بھی حضرت شیخ کہئے تو فوراً حضرت شیخ الحدیث علامہ محمد زکریا (متوفی یکم شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ

مطابق ۲۴؍مئی ۱۹۸۲ء) کی طرف ذہن ملتفت ہوجاتا ہے، حضرت شیخ کی خدمت میں مولانا سید محمد ثانیؒ کا بہت قیمتی با مقصد وقت گزرا، شیخ سے عقیدت ومحبت ایسی تھی کہ ان کی منقبت میں لکھے ہوئے قصیدے ایک امتیازی شان رکھتے ہیں، یہاں صرف ایک قصیدۂ عقیدت ومنقبت پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے: ملاحظہ فرمائیں۔

صاحبِ علم و فضیلت، حضرتِ شیخ الحدیث
نازشِ دین و شریعت، حضرتِ شیخ الحدیث
سرگروہِ اہلِ دل، اہلِ صفا، اہلِ وفا
سرورِ اہلِ عزیمت، حضرت شیخ الحدیث
باعثِ فخرِ جہانِ معرفت جن کا وجود
مرجعِ اہلِ مشیخت، حضرت شیخ الحدیث
سب کو دیتے ہیں متاعِ عشق و مستی درد و سوز
بانٹتے ہیں دل کی دولت، حضرتِ شیخ الحدیث
مرجعِ اصحاب درس و فقہ و تفسیر و حدیث
قاسم علم نبوت، حضرت شیخ الحدیث
گلشن عرفان کی بادِ نسیم مُشکبار
نکہت باغ طریقت، حضرت شیخ الحدیث
نقطۂ پرکار حق ان کی مبارک ذات ہے
مرکز اہل خشیت، حضرت شیخ الحدیث
خندہ لب، روشن جبیں، شیریں سخن، شیریں قلم
پاک رو پاکیزہ طینت، حضرت شیخ الحدیث
جن کی صحبت میں رہے تو زاغ بھی شہپر بنے

شیخ ہیں وہ در حقیقت، حضرت شیخ الحدیث
ظلمتوں میں جہل کی کرتے ہیں روشن ہر نفس
مشعل علم و فضیلت، حضرت شیخ الحدیث
شرق سے تا غرب جن کا سلسلہ مقبول ہے
ہیں وہی شیخ طریقت، حضرت شیخ الحدیث
حضرت مفتی الٰہی بخش کے نعم الخلف
دین حق کی شان و شوکت، حضرت شیخ الحدیث

شاعر علم وعرفان نے اپنے بارے میں جو مناجات لکھی ہے جن میں ایک نہایت ہی لطیف امتزاج ہے اردو اور عربی زبان کا، اس کو پڑھ کر شاید ہی کوئی ایسا دل ہو جس پر رقت نہ طاری ہو، اور یہ رقت آنکھوں کی راہ سے مینہ بنکر نہ برستی ہو، عبدیت وتواضع کی ایک عجیب شان ہے، راضی برضا اور فنائیت کی ایک بارگاہ ہے، گناہوں سے معافی کی طلب کا ایک جامع بیان ہے، جو زبان قلم سے نہیں اور دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ نہیں، بلکہ آنکھوں میں سجے ہوئے موتیوں کی ایک لڑی ہے جو ٹوٹ کر ان موتیوں کو برسا رہی ہے۔

خداوندا میں سرتا پا خطا ہوں　　اسیر پنجۂ حرص و ہوا ہوں
حقیر و خاکسار و بے نوا ہوں　　برا ہوں پر ترے در کا گدا ہوں

الٰهی لا تُعذِّبنی فإنی
مقرٌّ بالّذی قد کان مِنّی

الٰہی تو رحیم بے کساں ہے　　الٰہی تیری رحمت بیکراں ہے
الٰہی تو ہی خلّاقِ جہاں ہے　　الٰہی تجھ پہ قرباں دل ہے جاں ہے

الٰهی لا تُعذِّبنی فإنی
مقرٌّ بالّذی قد کان مِنّی

نہیں خواہش مجھے جاہ و حشم کی　　طلب مجھ کو نہیں دام و درم کی
ضرورت ہے ترے عفو و کرم کی　　ترے عفو وکرم بے کیف و کم کی

الٰھــی لا تُــعــذِّبــنــی فــإنــی
مــقــرٌّ بــالّــذی قــد کــان مِنّــی

اسیر دام ہوں جرم و خطا کا　　ہے کیا کہنا ترے لطف و عطا کا
الٰھی عبدک العاصی أتا کا　　مقرٌّ بالذنوب و قد دعا کا

الٰھــی لا تُــعــذِّبــنــی فــإنــی
مــقــرٌّ بــالّــذی قــد کــان مِنّــی

الٰہی مجھ پہ رحمت کی نظر کر　　مرے عیبوں سے یا رب درگزر کر
شب تاریک دل میں تو سحر کر　　کرم گستر ہے تو اور بندہ پرور

الٰھــی لا تُــعــذِّبــنــی فــإنــی
مــقــرٌّ بــالّــذی قــد کــان مِنّــی

سوا تیرے نہیں ہے کوئی میرا　　میری جاں بھی ہے تیری دل بھی تیرا
سیہ بختی نے آکے دل کو گھیرا　　ہے اُف سایہ گناہوں کا گھنیرا

الٰھــی لا تُــعــذِّبــنــی فــإنــی
مــقــرٌّ بــالّــذی قــد کــان مِنّــی

بقا تجھ کو ہے حاصل میں ہوں فانی　　ترے قبضے میں میری زندگانی
ندامت سے ہوں یا رب پانی پانی　　خدا یا میں تیرا بندہ ہوں ثانیؔ

الٰھــی لا تُــعــذِّبــنــی فــإنــی
مــقــرٌّ بــالّــذی قــد کــان مِنّــی

میزاب رحمت کے ماتحت ابھی کتنے چشمے ہیں، جو اس مختصر گفتگو میں آنے سے رہ گئے، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو کسی اور نشست میں ان چشموں سے بھی سیرابی حاصل ہوگی۔

بچوں کے ادب میں
حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ کا حصہ

ادب اطفال: ایک مستقل فن

پورے عالم میں بچوں کی بنیادی اور معلوماتی تعلیم وتربیت کے لئے اہل علم وادب کی خاص توجہ، ادبی تاریخ کا ایک اہم صفحہ قرار دیا گیا ہے، ہر ملک وقوم میں بچوں کو ادب سکھانے کی کوششیں ہوتی رہیں، شہری ماحول ہو، یا دیہاتی سماج، ہر جگہ اپنے اپنے ذوق اور سطح کے مطابق بچوں کو معاشرہ کے زندہ وتابندہ افراد کی شکل میں پیش کرنے کی کوششیں جاری ہیں، ہمارے ملک میں اور خاص طور سے مسلم سماج میں اس بنیادی حقیقت کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول ہوئی ہے۔

اگر چہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ماں کی گود بچے کا بنیادی مدرسہ ہے اور وہ اپنے مستقبل کو تعمیر کرنے کیلئے اسی بنیاد کی طرف رجوع کرتا ہے، لیکن اس تعمیر کے وسائل وذرائع فکر بھی ایک لازمی عنصر ہے، اور اس کے بغیر تعمیر کا کام شروع ہونا ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ بچوں کیلئے انہیں کی زبان میں ایسا لٹریچر اور ادب تیار کیا جاتا ہے جو تعمیری صلاحیتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور زندگی کو صحیح تعمیری رخ پر لے جانے کے لئے اسمیں ہر طرح تعمیری عنصر بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے، اور بچے کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے وہ زبان وادب سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔

بچوں کے ادب میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا مقام

بچوں کے ادب کے سلسلہ میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا نام ہر اعتبار سے قابل اعتناء

اور اہل ادب کی توجہات کو مبذول کرانے میں سرفہرست ہوسکتا ہے، انہوں نے بھی بچوں کے ذہن کو اللہ تعالی کی قدرت اور اسکی عظمت کی طرف مبذول کرانے میں اپنی ادبی حکمت کو بھرپور استعمال کیا ہے، ماضی قریب میں ان کی کتابیں ابتدائی درجات میں داخل کر کے بچوں کو زبان سیکھانے کے لئے ایک بہتر نصاب متصور ہوتا ہے، جس میں زبان کی حلاوت کے ساتھ دین کے ادراک وشعور کا پورا لحاظ رکھا گیا تھا، انہوں نے نظم ونثر کے دونوں اسلوب کو اس مقصد کے لئے اپنی کتابوں میں استعمال کیا ہے، جس کو نہایت آسانی کے ساتھ بچوں کا ذہن قبول کر لیتا ہے، ابتدائی مکتب میں پڑھنے والے بچوں کی زبان پر یہ شعر اکثر جاری رہتا تھا اور وہ بہت ہی شوق کے ساتھ مدرسوں، گھروں اور گلی کوچوں میں پڑھتے ہوئے سنائی دیتے تھے:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

بچوں کے ادب میں ان کی نفسیات کا اور ان کے درجہ عقل وفہم کا لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے، اس کے لئے قصے کی زبان ان کے ذہن کو سب سے زیادہ اپیل کرتی ہے

مفکر اسلامؒ اور بچوں کا ادب

ماضی قریب میں ادباء کی ایک جماعت بچوں کی نفسیات کے مطابق بچوں کا ادب تیار کرنے میں اچھی شہرت کے درجہ پر پہونچی، اور انہوں نے حکایات انبیاء کے ذریعہ سے ان کے ذہنوں کو مخاطب کیا، اور اس میں وہ درجہ کمال تک پہونچے، اور نہ صرف بچوں کے ماحول میں ان کا یہ ادب بہت مقبول ہوا، بلکہ ہر طبقہ میں اسکا استقبال ہوا، اور بہت سے ادیبوں نے اسی اسلوب کی بنیاد پر بچوں کا حکایتی ادب تیار کیا، اگرچہ اس میدان میں اور بہت سے لوگ قابل ذکر ہیں، لیکن بچوں کے ادب کے قاعدہ اول کے طور پر گذشتہ صدی میں علامہ کبیر داعی اسلام، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بچوں کے اسلامی

ادب کو انہیں کی زبان واسلوب میں، اور انہیں کی نفسیات کے مطابق انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے قصوں سے اسکی ابتداء کی، اگر چہ یہ ادب عربی زبان میں شروع ہوا، اور اسکو دین کے ساتھ عربی زبان سیکھانے کے لئے استعمال کیا گیا، اور قصص النبیین کے نام سے یہ سلسلہ بچوں کی نفسیات اور ان کے ذہن کے مطابق پہلے حصے سے شروع ہوکر پانچویں حصے پر منتہی ہوا، اس میں نہایت آسان زبان اور ایک ہی لفظ کو ایک جملے میں کئی بار استعمال کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ بچوں کے ذہن میں حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں عقیدۂ توحید کو اتارنے اور اسکو راسخ کرنے اور شرک وبت پرستی کی نفرت ان کے ذہنوں میں جمانے کی نہایت کامیاب کوشش ہے۔

قصص الانبیاء مرتبہ جناب امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ بچوں کے ادب کا شاہکار

یہی وجہ ہے کہ یہ سلسلہ نہ صرف ہندوستان جیسے ملک میں مقبول ومحبوب ہے، بلکہ ان ممالک میں بھی اس کو اختیار کیا گیا، جہاں کی عوامی اور سرکاری زبان عربی ہے، قصص النبیین کے اس سلسلہ سے یہ بات بھی پوری طرح ذہن نشیں کرائی گئی کہ ہمارے مذہب اسلام کی سرکاری زبان عربی ہے، اسی سلسلہ کے مطابق اردو زبان میں بھی حسنی خاندان کی ایک معزز ہستی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ نے اردو زبان میں تیار کیا، اور انبیاء کے تعارف کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی قادر مطلق ہستی کا تصور بچوں کے ذہن میں پوری طرح اتارنے کی کامیاب کوشش ہوئی۔

بچوں کے ادیب حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ

اور انہیں سلسلوں کے درمیان میں بچوں کے ایک ماہر نفسیات، صاحب زبان وادب جناب حکیم شرافت حسین رحیم آبادی نے دین ودانش کی تعلیم وتربیت بچوں کے ذہن کے مطابق کرنے کے لئے اچھی باتوں کا سلسلہ شروع کیا، جس میں آسان اور دلچسپ اور سلیس زبان میں کلمۂ توحید کو بچوں کے دلوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی، اس حصے کے چند عناوین کو پڑھنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ انہوں نے نہایت ہی

آسان زبان میں عقیدۂ توحید کو بچوں کے رگ وریشے میں سمو دینے کی پوری کوشش کی ہے،آیئے عنوانات پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

پہلا عنوان ہے: سب کو کس نے بنایا؟

اس عنوان کے ماتحت بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ زمین، جس پر ہم تم رہتے، بستے، کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے ہیں، کتنی بڑی زمین، کتنی لمبی اور چوڑی زمین، کس نے بنائی، کتنے آدمی اس زمین پر بستے ہیں، کتنے جانور اس زمین پر چلتے اور پھرتے ہیں، یہ طرح طرح کے آدمی اور یہ طرح طرح کے جانور، نہ آدمیوں کی کوئی حد، نہ جانوروں کا کوئی شمار، کس نے پیدا کیئے،؟ یہ اونچے اونچے پہاڑ، پہاڑوں سے نکلنے والے دریا، کتنے بڑے بڑے دریا، کتنے بڑے بڑے سمندر، سمندر میں بھی طرح طرح کے جانور اور بے جان چیزیں کس نے پیدا کیں؟

یہ آسمان، جسکے نیچے تمہاری اتنی بڑی دنیا بستی ہے، یہ گرم گرم سورج ،جس کی کرنیں ساری دنیا کو روشن کرتی ہیں، یہ رات کی اندھیری میں چاندنی پھیلانے والا، آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرنے والا چاند، چاند کے گرد چمکنے والے یہ چھوٹے چھوٹے تارے کس نے بنائے؟

اچھا، دیکھو تو، آسمان کی طرف آنکھیں اٹھاؤ، زمین کے اوپر نظر دوڑاؤ، دماغ سے سوچو، دل میں خیال کرو، آنکھوں سے جو چیزیں دیکھتے ہو ،کانوں سے جن چیزوں کے نام سنتے ہو، دماغ جن چیزوں کو سوچ سکتا ہے ،دل میں جن چیزوں کا خیال آسکتا ہے، ان سب چیزوں کو کس نے بنایا؟

تمہارے گھر کو معمار نے بنایا ہے، تمہاری کرسی اور میز کو بڑھئی نے بنایا ہے، لیکن معمار کو کس نے بنایا؟ معمار نے جس مٹی سے گھر بنایا، وہ مٹی کس نے بنائی، بڑھئی کو کس نے بنایا،؟ بڑھئی نے جس لکڑی سے میز اور

کرسی بنائی وہ لکڑی کس نے بنائی ،؟ وہ کون ہے، جس نے سب کو بنایا اور اس کو کسی نے نہیں بنایا، تم کہو گے،: اللہ''۔

اسی عقیدۂ توحید کا تکملہ اس کتاب کے دوسرے حصے میں موجود ہے، اس عقیدہ کو پھیلانے میں انبیاء کرام نے جو محنتیں کیں، اور اخیر میں خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے جن حالات کا سامنا فرمایا اور آپ ﷺ نے اور آپ کے اصحاب نے اسکو پھیلانے کے لئے جن تکلیفوں اور مصائب کو برداشت کیا اس کا ذکر اس حصہ میں بچوں کی زبان میں کیا گیا ہے ، انبیاء میں حضرت نوحؑ ، حضرت ابراہیمؑ ، حضرت موسیٰؑ ، حضرت عیسیٰؑ اور اخیر میں ہمارے رسول پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہے، اس عقیدہ کو پھیلانے اور اس کا یقین دلوں میں پیدا کرنے کیلئے جو مصیبتیں اٹھائیں ان کا ذکر آسان اور سلیس زبان میں موجود ہے۔

حضرت مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کی تائید:

اس حصہ کے مقدمہ میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء نے لکھا ہے:

> ''دعوت اسلام کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں اور داعیان اسلام نے ان مشکلات کو جس خندہ پیشانی سے برداشت کیا، یہ واقعات داعیان حق کے لئے ہمیشہ ہمت افزائی کا باعث رہیں گے، سیرت کی بڑی کتابوں میں بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، محبّ کرم، حکیم شرافت حسین صاحب نے بالکل چھوٹے بچوں اور بالغ مبتدیوں کے لئے بہت ہی آسان زبان میں ان واقعات کا خلاصہ بیان کر دیا ہے، تاکہ تعلیم و تربیت کی ابتدائی منزل ہی میں یہ واقعات دلوں میں اس طرح جم جائیں کہ پھر زندگی کے آئندہ دور میں جو مشکلات و مصائب پیش آئیں، ان کے مقابلے کی ہمت ہو، اور حالات کی سخت ناموافقت میں بھی اسلام کے پھیلانے کا حوصلہ ہو''۔

اس رسالہ کے تیسرے حصہ کو ایک اہم سوال سے شروع کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پوری زندگی کو عبادت والی زندگی کیسے بنائی جائے؟

اس سوال کا جواب نہایت تفصیل کے ساتھ بچوں کی آسان زبان میں دیا گیا ہے ،اس سلسلہ کا پہلا عنوان ہے:

''اللہ کی عبادت کیا ہے؟ عبادت والی زندگی کیسے بنے، پھر نماز قائم کرنے کا اور اسکو اللہ کی اہم ترین عبادت کا درجہ دینے کا ذکر ہے، چوتھے حصے کی ابتدا اس عنوان سے ہوتی ہے: نماز کے لئے تیاری، وضو کرنے کا طریقہ، وضو کے فرائض، اسکی سنتیں، اس کے مستحبات، نواقض وضو، تیمم ،نماز پڑھنے کی شرطیں، اسکے اوقات کا بیان، فرض نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جائے، اس کا طریقہ، اسکی اہمیت، نماز شروع کرنے کی ترکیب، اور نماز ادا کرنے کا پورا طریقہ نقش ذہن بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، اس رسالہ کے پانچویں حصہ میں نیکی کرنے، اسکی اہمیت، اور زندگی کے فضائل کو خاص انداز میں ذکر کیا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا بھی اللہ کی عبادت ہے، چھٹے حصہ میں روزہ کی اہمیت اور اسکے فضائل وآداب کو خاص اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، روزہ کے سلسلہ میں جو احادیث ذکر کی گئی ہیں، اسکو نہایت آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے ،ایک حدیث میں ہے: جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو، تو اس کو چاہئے کہ وہ فحش نہ بولے، اور شور نہ کرے اور اگر کوئی اس کو گالی دے تو اس سے کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں، جو شخص جھوٹ بولنا اور فحش بولنا نہ چھوڑے تو اسکو کھانا پینا چھوڑنے کی حاجت نہیں ہے، اسکی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر روزہ کے ظاہری شرائط کے ساتھ ساتھ روزہ کے باطنی شرائط بھی ادا ہونے لگے تو تم متقی ہو جاؤ، اسکے بعد تقوی کیا ہے

اور روزہ کے فوائد کیا ہیں ،روزہ کس طرح رکھا جائے ،ان تمام باتوں پر رسالہ کا یہ حصہ مشتمل ہے۔''

حکیم شرافت حسین رحیم آبادی نے ''ہمارا ایمان'' کے نام سے جو رسالہ تحریر کیا ہے اس میں بچوں کو نہایت آسان اور سلیس زبان میں ایمان کی حقیقت بتائی ہے اور اسکی تشریح کی ہے،اس رسالہ کے چند عناوین پیش کئے جارہے ہیں: اللہ ہی نے سب کو سب کچھ دیا ہے وہ ہماری تعریفوں سے بلند وبالا ہے، لا الا الا اللہ، ہمارے پیارے نبی ﷺ ساری دنیا کیلئے رحمت بن کر آئے ،قرآن سب سے اچھی کتاب ،شرک کیا ہے؟،مشرک کون ہے ؟ایک دن سب کو یہاں سے جانا ہے، قیامت اور آخرت کا دن۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنیؒ کی رائے عالی:

اس کتاب پر حضرت مولانا علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا پیش لفظ ہے،اس مقدمہ کا ایک اقتباس پیش کرنے کی اجازت دی جائے:

''راقم سطور کو تقریباً ۱۹۳۰ء سے مولوی حکیم شرافت حسین صاحب سے نیاز حاصل ہے، میں بھی اس وقت طالب علم تھا اور وہ بھی ہمارے استاذ ڈاکٹر شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء وحال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ کے پاس عربی پڑھنے آئے تھے، ہلالی صاحب ہی نے میرا ان سے تعارف کرایا، یہ ملاقات رفتہ رفتہ رفاقت وعلمی تعاون میں تبدیل ہوگئی ،انہوں نے اس زمانہ میں ایک کتاب ''گردش ایام'' کے نام سے لکھی تھی، مجھے اس پر مقدمہ لکھنے کی عزت حاصل ہوئی، یہ کام ایسی نیک ساعت میں ہوا تھا، کہ کتابوں پر مقدمہ باز ہوگیا، وہ شاید اسی طرح کتابیں لکھنے کا سلسلہ جاری رکھتے ،اور ہندوستان کے ان مصنفین کے زمرے میں شہرت حاصل کر لیتے ،جن سے تصنیفی کوششوں کا میدان بالغین اور پڑھے لکھوں تک محدود ہے ،شاید ان کے ذہن اور ان کے

اشہب قلم کو بچوں کے میدان کی طرف موڑنے میں میرا بھی حصہ ہو، انہوں نے جلد اس کو اپنا مستقل میدان بنایا، اور اللہ کے رسول، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور اچھی باتیں (۱ تا ٦) کے نام سے متعدد کتابیں لکھیں، اور بچوں کا قاعدہ بھی لکھا، یہ سب کتابیں ہندوستان اور پاکستان میں بڑی مقبول ہوئیں، اور بہت سے مکتبوں اور مدرسوں کے نصاب میں داخل ہوگئیں، اور ان کا مکتبہ صحیح معنوں میں ''مکتبہ دین ودانش'' بن گیا، ان کو اس میدان میں اتنی کامیابی وشہرت حاصل ہوئی اور انہوں نے مسلمان بچوں کی ایسی خدمت انجام دی کہ اب ان کو ''مسلمان بچوں کے شرافت'' کے نام سے یا ''مسلمان بچوں کے مصنف'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاسکتا ہے اور یہ ایک بڑا تمغہ امتیاز ہے جس پر ان کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ بڑوں اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے تو کام کرنے والے بہت تھے، خدا نے ان سے نونہالوں کی خدمت لی، جن پر مستقبل کا انحصار اور صحیح معنوں میں اس ملک میں اسلامیات کے بقا کا دارومدار ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا

اس وقت ان کی کتاب ''ہمارا ایمان'' پیش نظر ہے، اس میں انہوں نے بڑے سلیقے سے ایمانی بنیادیں اور امہات عقائد (توحید، رسالت، آخرت اور تقدیر) کو بڑے آسان اور سلجھے انداز میں بچوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کو ہجے کر کے ایک ایک چیز بتائی ہے اور انہیں کی زبان میں ان سے ایمانی باتیں کی ہیں، ہر سبق کے بعد سوالات بھی ہیں، جو مضامین کو ذہن نشین کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ ہے، اگر دلچسپی وہمدردی اور داعیانہ اسپرٹ اور ایک معلم کے ذوق کے ساتھ یہ کتاب پڑھائی جائے، تو امید ہے کہ اس سے نہ صرف بچے ان بنیادی عقائد سے آشنا ہوں گے، جس کے بغیر کوئی مسلمان مسلمان نہیں ہوسکتا، بلکہ ان کی وقعت اور اپنے سن وسال کے مطابق ان کی معقولیت بھی ذہن نشین

ہوگی، اور یہ تخم برگ وبار لائے بغیر نہ رہ سکے گا''۔

حکیم صاحب نے اپنے رسالہ ''اللہ کے رسول ﷺ'' میں حضور پاک ﷺ کی سیرت بچوں کی زبان اور اسلوب میں بیان کر کے ان کے دلوں کو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت سے معمور کر دیا ہے، اس رسالہ میں سب سے پہلے عقیدۂ توحید، انبیاء کرام، اور اللہ کی بھیجی ہوئی آسمانی کتابوں کا ذکر ہے، قرآن کریم کی عظمت ان کے دلوں میں راسخ کرنے کی کوشش، جنت ودوزخ کا ذکر، رسول اکرم ﷺ کے حالات زندگی شروع سے لیکر اخیر تک لکھنے کے بعد بچوں سے سوال کیا ہے:

اس پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد بتاؤ تم کیا بنو گے اور کیا کرو گے؟

اس رسالہ میں ہر سبق کے بعد سوالات دیئے گئے ہیں، تاکہ بچے ان کے سوالات کا جوابات دیکر حضور اکرم ﷺ کی عظیم شخصیت اور ان کے رحمۃ للعالمین ہونے کا یقین اپنے دلوں میں پوری طرح جما سکیں۔

یہ رسالہ بھی مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے قیمتی مقدمہ سے مزین ہے۔

خلفائے راشدین (حضرت ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم)

اور اب خلفاء راشدین کا دور شروع ہوتا ہے، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنھم کی پاکیزہ زندگیوں اور کارناموں پر تفصیل کے ساتھ تاریخ اسلام کی روشنی میں اور بچوں کی زبان واسلوب کے دائرہ میں نہایت دلچسپ ادبی انداز سے سب کی سیرتوں کا جائزہ لیا گیا ہے، حضور اکرم ﷺ سے ان کی محبت، اور ان کے سچے عشق ووفاداری کا تذکرہ ادب اطفال کی زبان میں پیش کیا گیا ہے، خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ سے متعلق رسالہ میں تاریخ اسلام کے جوہر شناس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا ایک بہت اچھا اور مفید ترین مقدمہ ہے، اس مقدمہ میں حکیم صاحب کی شخصیت کا تعارف اور ان رسالوں کا ذکر بھی موجود ہے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے مقدمہ کو اس مختصر

مضمون میں نقل کر دیا جائے تا کہ حکیم صاحب کی شخصیت اور ان کے رسالوں کا بھر پور تعارف قارئین کے سامنے آجائے اور ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کا سبب بنے:

''بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے اہم ترین علمی مسائل میں سے ہے، لیکن اقوام کی صورت گری اور مخصوص مقاصد و اغراض کے لئے ان کی مخصوص ذہنی تعمیر اور اخلاقی تربیت نے زندگی کے موجودہ کشمکش اور سیاسی جدوجہد میں جو اہمیت اختیار کر لی ہے اس کی بنا پر اس مسئلہ کی اہمیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، انسانوں کی ذہانت اور عملی تجربہ کا بہترین حصہ اس موضوع پر صرف ہو رہا ہے، اور اسمیں شبہ نہیں کہ مقاصد و نتائج سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو فنی و علمی حیثیت سے ان میں جدید ماہرین تعلیم کی کامیابی قابل داد اور الحکمۃ ضالۃ المؤمن کی تعلیم کے پیش نظر ان لوگوں کے لئے جو صالح مقاصد اور پاکیزہ و پائدار و بے لوث دینی و تعلیمی اغراض اور اَخلاقی اقدار عالیہ کی دولت سے مالا مال ہیں قابل استفادہ ہے، لیکن انسانی دماغ کی ذکاوت اور زندگی کے عملی تجربہ کی قوت اس لئے نہیں کہ وہ بے مقصد یا پست مقصد سلیقۂ نوشت وخواند کے حصول اور قرآن مجید کی بلیغ اور وسیع الفاظ ''زخرف القول غرورا'' کے دائرہ کو وسیع کرنے میں صرف ہو، بڑے درد و حسرت کی بات ہے کہ آج یہ ساری ذکاوت، قوت اجتہاد و ایجاد اور تجربہ اس نظام تعلیم کو سہل سے سہل تر، وسیع تر اور کامیاب سے کامیاب تر بنانے میں صرف ہو رہا ہے، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے نہ صرف دنیا کا ناکام ترین نظام تعلیم بلکہ اخلاقی حیثیت سے انسانی تعلیم و تربیت کی طویل تاریخ میں سب سے زیادہ مہلک و تباہ کن تجربہ ہے، جو دنیا کے موجودہ عالمگیر اَخلاقی انحطاط، اجتماعی اضطراب، نوعی خودکشی اور سیاسی کشمکش کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہے، صحیح دینی نقطہ نظر سے ہر ذکاوت، ہر لطافت اور ہر طرح کے حسن و جمال کا مستحق دین ہے، اس کا جو حصہ غیر

دین میں صرف ہورہا ہے وہ بے محل ہے اور گویا ایک غاصبانہ فعل ہے جو اہل دین اس پر قانع اور راضی ہیں کہ غیر دینی چیزیں روز بروز قریب سے قریب تر اور آسان سے آسان تر ہوتی چلی جائیں اور ان کے رواج وترقی میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور وہ اللہ کی دی ہوی طاقتوں اور صلاحیتوں کو دینی چیزوں کی ترویج وتقریب وتسہیل میں صرف نہ کریں، وہ ایک بہت بڑی کوتاہی کا ارتکاب کررہے ہیں، جس کا نتیجہ اگر ان کو نہیں تو ان کے بعد کی نسلوں کو برداشت کرنا پڑے گا، حضرت موسیٰ کی دینی حمیت اور پیغمبرانہ غیرت سے فرعون کی وہ مادی ترقی اور دنیاوی عروج نہ دیکھا گیا جو عوام کی ضلالت کا باعث ہورہا تھا اور ان کی زبان مبارک سے بے اختیار نکلا: " ربنا انك آتیت فرعون وملأه زینة واموالا فی الحیاة الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلك ربنا اطمس علی اموالهم واشدد علی قلوبهم فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب الالیم ، حیرت ہے کہ اہل دین مادہ پرستوں کی تعلیمی ترقیاں اور وہ تعلیمی وسائل ٹھنڈے دل سے دیکھتے رہے، جو نئی نسلوں کی گمراہی کا کچھ کم سامان نہیں ہورہے ہیں اور ان کو اس طلسم سامری کو توڑنے کے لئے اعجاز موسوی اور دین کے اس ید بیضا کا خیال نہ پیدا ہو جواب بھی ان کے پاس ہے۔

بچوں کو کم سے کم وقت میں دل چسپ سے دل چسپ اور سہل سے سہل طریقہ پر حرف شناس بنانے اور نوشت وخواند سکھانے کے لئے ہمارے ملک میں اور اس سے بڑھ کر دوسرے ممالک میں کتابوں اور کہانیوں کے جو سلسلے سیلاب کی طرح روزانہ امنڈتے رہتے ہیں وہ اہل نظر سے مخفی نہیں، دین کے حقائق اور واقعات کو اس سے زیادہ سہل زبان، دل چسپ پیرایۂ بیان اور بہترین طریقۂ ترتیب وتالیف کی ضرورت ہے جتنی طوطا مینا اور بے اصل بے سروپا حکایات کو اور روزمرہ معلومات وواقعات کو۔ خدا کا شکر ہے کہ بعض اہل قلم

اب اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور ان کے نتائج قلم مقبولیت حاصل کر رہے ہیں، ہمارے مخلص اور محترم دوست حکیم شرافت حسین صاحب کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا اچھا سلیقہ اور تحریر و تالیف کا اچھا ملکہ عطا فرمایا ہے ان کی کتابیں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں، گزشتہ سال سے انہوں نے مسلمان بچوں کی اس اہم ضرورت اور ان کے لئے ایک صحیح اسلامی کتب خانہ کی تیاری اور ایک نئے ادب کی تالیف کی طرف توجہ کی ہے، ان کی کتاب ''اللہ کے رسول ﷺ'' دو مرتبہ چھپ کر ختم اور تیسری مرتبہ چھپ رہی ہے، پیش نظر کتاب اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جو اس طرز تالیف اور اصول تصنیف پر لکھی گئی ہے، جس سے بہتر اور موٴثر طرز تحریر بچوں کے حق میں تجربہ میں نہیں آیا یعنی کتاب کی تقسیم مختصر اور آسان جملوں میں، مضامین الفاظ کی ایسی تکرار جو ذوق سلیم پر بار نہ ہو، کتاب کے مضمون کے ذہن نشیں ہونے میں اور بچہ میں خود پڑھنے کی استعداد و صلاحیت اور اپنے اوپر اعتماد پیدا کرنے میں مددگار ہو، یہ دونوں حصے ان خصوصیات کا نمونہ اور نہایت کامیاب تجربہ ہیں۔

ضرورت ہے کہ حکیم صاحب اس سلسلہ کو آخر تک پہونچائیں اور خلفاء راشدینؓ، مشاہیر اکابر امت کے سیر و سوانح نیز دوسرے ضروری اسلامی موضوعات و معلومات پر مختلف متعدد رسالے اور چھوٹی چھوٹی کتابیں تالیف کر کے نئی مسلمان نسل کے لئے ایک مفید سلسلہ مطالعہ اور ایک قیمتی ذخیرہ ٔ کتب مہیا فرمادیں، بچوں کی آسان زبان میں شگفتہ و شستہ پیرائے میں لکھنا اور تاریخ و سیر کے سنجیدہ واقعات اور ٹھوس معلومات کو رواں اور دلچسپ طرز بیان میں منتقل کرنا ہر صاحب قلم کے بس کی بات نہیں، یہ وہی کرسکتا ہے جس کے لئے اپنی ذہنی سطح کی بلندی کے باوجود بچوں کی ذہنی سطح پر اترنا اور ان کی زبان میں باتیں کرنا اللہ تعالیٰ نے آسان کر دیا ہو اور جس کے لئے عروج و ترقی کے بعد نزول میسر آئے، جو حضرات صوفیہ کی اصطلاح میں بڑا بلند مقام ہے اور جس کے بغیر نفع عام اور ہدایت تام نہیں ہوتی۔

رسالہ کے مضامین معتبر کتابوں سے ماخوذ ہیں، واقعات کے انتخاب میں ذوق سلیم

سے کام لیا گیا ہے، اللہ تعالی اس حصہ کو بھی پہلے حصہ کی طرح نافع، مقبول اور عام پسند بنائے اور دینی مکاتب و مدارس اور وسیع تعلیم کے حلقوں کو اس کی قدر دانی کی توفیق عطا فرمائے''۔

اب خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے حالات زندگی سے بچوں کو واقف کرانا، اور ان کی غیرت وحمیت اور رسول ﷺ سے وفاداری، اور سچی محبت کا تذکرہ ضروری ہے، اسکے لئے حضرت عمرؓ کا رسالہ مرتب کیا گیا، اسی طرح حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کے حالات پر بچوں کی زبان اور ان کے ذہنی سطح کے مطابق کر کے ایک قابل ستائش کارنامہ انجام دیا گیا ہے، خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ پر مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کا مختصر مقدمہ ہے تو حضرت علی خلیفہ رابع کی سیرت والے رسالہ پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا مقدمہ ہے، اس میں حضرت والا نے ایک ایسی تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام طور سے عوام و مورخین کی نظر سے بھی مخفی رہ جاتی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت علیؓ کے حالات اس امت کے توسط واعتدال کا امتحان ہیں، جس میں صرف اہل سنت کامیاب ہوئے، ان کی عظمت اور ان کے کمالات کو سمجھنے کے لئے بڑی سلیم فطرت، بڑے متوازن دماغ، بڑی دقیق نظر کی ضرورت ہے، اگر نظر ذرا سی چوک جائے اگر جذبات کا عقل پر غلبہ ہو جائے، عقل قلب سلیم کی رفاقت سے محروم ہو جائے تو آدمی صراط مستقیم سے بہت دور جا پڑتا ہے اور جو کچھ ظاہر ہوتا ہے یا وہ خارجیت ہوتی ہے یا رفض۔

لیکن اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہے، عقل و محبت کا توازن برقرار رہے، کامیابی کا معیار صرف اتباع رسول ﷺ اور تعمیل حکم ہو تو حضرت ابو بکرؓ اور علی مرتضیٰؓ ایک ہی رنگ کے حامل اور ایک ہی منزل کے مسافر ہوتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ ایک نے تعمیل حکم کی اور کامیاب ہوا، دوسرے نے تعمیل حکم کی اور بظاہر ناکامیاب رہا، لیکن مومن کے نزدیک تعمیل حکم ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ زمانہ اعتدال کے امام ہیں اور حضرت عثمان و حضرت علیؓ دور فتن

کے امام ہیں، یہ دونوں دور بالکل طبعی اور قدرتی ہیں اور اسلام کی طویل تاریخ میں ان کا پیش آنا ناگزیر ہے اور ہر ایک کے لئے ایک امام برحق کی ضرورت ہے، اگر حضرت عثمانؓ، حضرت علی نہ ہوتے تو دور فتن وحوادث کے لئے ہمیں کہیں سے رہنمائی نہ ملتی۔

حضرت عثمان، حضرت علی کی سیرت لکھنا بڑا مشکل اور نازک کام ہے، بچوں کے لئے جو کتاب لکھی جائے اس میں تفصیل کی زیادہ ضرورت نہیں اا اور اس کی ذمہ داریاں بھی کم ہیں، لیکن واقعات اور تفصیلات کے انتخاب میں بڑے ذوق سلیم اور بصیرت کی ضرورت ہے اور مصنف نے اس چھوٹی سی کتاب میں اس کا ثبوت دیا ہے، اب یہ کتاب بے تکلف ہر بچہ کے ہاتھوں میں دینے کے قابل ہے

امید ہے کہ اسلامی مکاتب اور ادارے اور مسلمان گھرانے اس کتاب کو قبول کر کے بچوں کی دینی وذہنی تربیت اور اردو سکھانے کے کام میں اس سے مدد لیں گے۔

حکیم شرافت حسین صاحب اس سلسلہ کی کامیابی پر مستحق مبارک باد اور اسلامی اداروں کی طرف سے مستحق شکر ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے قلم سے تاریخ اسلام کی دوسری نامور ہستیوں اور مسلمانوں کے لئے قابل اقتداء اشخاص کی سیرت وسوانح کی تکمیل کرادے جو وقت کا بڑا کام اور دین کی بڑی خدمت ہوگی''۔

ازواج مطہرات

اب آتے ہیں ازواج مطہرات میں حضرت خدیجہؓ کی طرف، جن کی سیرت طیبہ ایک منارہ علم وفراست ہے اور زندگی کے ابتدائی زمانہ میں جن کا کردار نہایت بابرکت روشن اور ممتاز ہے، اس رسالہ میں حضرت خدیجہؓ کی پاک زندگی، حظیرۂ نبوت میں آنے سے پہلے کی ان کی زندگی، ان کی تجارت، پھر حضور پاک ﷺ کے ساتھ نکاح، نبوت کا مقام، ورقہ بن نوفل کا پیغام، نبوت کا اعلان، آزمائشوں کی ابتدا اور شعب ابی طالب کی مصیبتیں، اس سے نکلنے کے کچھ مدت کے بعد حضرت خدیجہؓ کی وفات، اور غم واندوہ کا سال، ان کی وفات کا حضور

پاک ﷺ پر شدید اثر، اسی کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کے صفات و اَخلاق، اور حضور ﷺ سے پیار و محبت اور ان کی اولاد کا ذکر مطہر، یہ سارے عناوین ہیں جن سے یہ رسالہ مزین ہے اور جن کو پڑھ کر بچوں کے ذہن میں اَخلاقِ کریمانہ کا شوق پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ کی حیاتِ طیبہ کا بیان، حضور ﷺ سے ان کا علمی، ازدواجی اور اخلاص و محبت کا ایسا تعلق جو ایک نبی کی شان کے مطابق ہو۔

رسالہ کے چند عناوین پر نظر ڈالنے سے شخصیت کی عظمت کھل کر سامنے آجاتی ہے:

ایمان کے نور سے جگمگاتا ہوا گھر، بچپن کے دن اور بچپن کی باتیں، اچھے اچھے نام، حضورؐ سے نکاح کی بات، نکاح کی سادگی، حضرت خدیجہؓ اور حضور ﷺ کے چچا ابو طالب کی وفات کی وجہ سے مصیبتوں اور پریشانیوں کا دور، حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت، حضرت عائشہؓ کے لئے سب سے زیادہ محبوب اور پیار و محبت والی زندگی کے ساتھ فقیرانہ زندگی، قرآن کریم میں حضرت عائشہؓ کی براءت، میں اللہ اور رسول ﷺ کو اپنے لئے پسند کرتی ہوں، حضور پاک ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام حضرت عائشہؓ کے حجرۂ مبارک میں، خلوص و محبت کی زندگی حضور ﷺ کی وفات کے بعد، حضرت عائشہؓ کے اخلاقِ عالیہ اور علومِ اسلامیہ میں ان کا مرتبہ سب سے بلند اور تمام عورتوں میں حضرت عائشہ کی فضیلت۔

ام المومنین حضرت سودہؓ خاندان قریش کے قبیلہ عامر سے تعلق رکھتی ہیں، وہ ان خوش نصیب خواتین میں تھیں، جو دولتِ اسلام سے ابتداء ہی سے سرفراز ہوئیں، ان کے شوہر حضرت سکرانؓ بھی ان کے ساتھ اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے اور اہل مکہ کی اذیتوں اور اسلام قبول کرنے کی سزا میں وہ شریک رہ کر اسلام سے ذرا بھی منحرف نہیں ہوئے، ظلم و ستم کے پہاڑ ان پر توڑے گئے، مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی، اور حبشہ کی دوسری بار

ہجرت کرنے والوں میں ان کا نام نامی بھی سرفہرست رہا، ایک مدت تک قیام کرنے کے بعد جب دونوں میاں بیوی مکہ مکرمہ واپس آئے تو حضرت سکرانؓ کا انتقال ہوگیا اور کچھ دنوں کے بعد حضور ﷺ سے ان کا نکاح ہوگیا اور حرم نبوی میں داخل ہوکر تا قیامت امہات المومنین کی فہرست میں داخل ہوگئیں۔

حکیم صاحب نے بڑی عقیدت و تعلق کے پیرائے میں اس رسالہ میں ان کا مفصل ذکر کیا ہے اور ان کے تعارف میں بچوں کی زبان و اسلوب کی پوری رعایت کی ہے، ادھر مضمون کے بعد سوالات قائم کئے ہیں، تاکہ بچے ان سوالات کے جوابات لکھیں اور حضرت سودہؓ کی تاریخ زندگی ان کو ازبر ہوجائے۔

گردش ایام مؤلفہ حکیم شرافت حسین

حکیم صاحب نے بچوں کی دینی زبان اور اسی کے ادب کی نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھانے سے قبل گردش ایام کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جو ربا (سود) کے موضوع پر ہے، اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ان کے چھوٹے صاحبزادے جناب محمد سلیمان صاحب رحیم آبادی نے شائع کیا ہے اور وہ وقت کی ضرورت سود کے لین دین کی شناعت پر مشتمل ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں ایک افسانوی اسلوب میں سود کی لعنت سے لوگوں کو نجات دلانے کی کوشش کی ہے، اس کتاب پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ۱۱رشعبان ۱۳۵۴ھ میں ایک نظر کشا، ایمان افروز، طویل مقدمہ تحریر فرمایا ہے یعنی آج سے تقریباً ۸۰ سال قبل، اس مقدمہ کا ایک حصہ یہاں نقل کرنے کی مجھے اجازت دی جائے:

> ''اور سب چیزوں کے متعلق تو کچھ کہا جاسکتا ہے، اگر چہ مانا نہیں جاسکتا، مگر سود کے متعلق کیا کہا جائے گا، کیا اس کا بھی دین سے کوئی تعلق نہیں، جس کے متعلق اللہ تعالی نے جتنے سخت اور ڈرنے کے قابل الفاظ فرمائے ہیں، قرآن مجید میں شاید کسی کے متعلق نہیں فرمائے۔ فان لم

تفعلوا فأذنوا بحرب من الله (اگرتم نے نہ کیا (سود نہ چھوڑا) تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان کردو)۔ یاد رکھئے محال ہے اور حرام ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کرکے کوئی کلمہ گو دنیا میں اچھی زندگی بسر کرے، اللہ کی غیرت اس کو گوارا نہیں کر سکتی۔

یاد رکھیے رسول ﷺ جس طرح ہم سب سے زیادہ مقدس و متقی اور اللہ کے مقرب تھے اسی طرح ہم سب سے زیادہ عقل مند و تجربہ کار بھی تھے اور اسی طرح ہمارے سب سے زیادہ خیر خواہ بھی تھے، آپ کا کوئی حکم عقل و خیر خواہی سے خالی نہیں، ہم اپنے ساتھ ہرگز وہ خیر خواہی نہیں کر سکتے، جو آپ نے فرمائی۔

لقد جاءكم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم، حريص عليكم بالمؤمنين روؤف رحيم، فان تولوا فقل حسبى الله لا اله الا هو، عليه توكلت وهو رب العرش العظيم۔

آپ جس طرح دین کی سمجھ رکھتے تھے اسی طرح دنیا کی بھی، کسی مسلمان کو اس میں شک نہیں ہونا چاہئے، اگر کسی کو شک ہو تو دیکھ لے کہ جنہوں نے اپنی دنیاوی زندگی اور معاشرت میں آپ سے بے پرواہی برتی اور آپ کا اور آپ کے ان صحابہ کا نمونہ چھوڑ دیا، جو جس طرح مکمل مسلمان تھے، اسی طرح مکمل انسان بھی تھے اور ایک ہی وقت میں پورے دین دار اور پورے دنیا دار بھی تھے وہ کامیاب ہیں یا ناکام، مطمئن ہیں یا پریشان؟

ہم نے اپنی زندگی، اپنی معاشرت، اپنی رسوم بغیر آپ کے مشورہ کے بنائیں، دنیا دیکھ لے کہ ہم کامیاب و مطمئن ہیں یا دنیا میں سب سے زیادہ ناکام و پریشان،، یاد رکھئے اسلام میں دین و دنیا کی راہ الگ نہیں، مسلمان کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، شادی غمی سب تھوڑی نیت کے فرق سے عبادت میں داخل ہو جاتی ہے، اگر دنیا دین کے مشورہ اور سمجھوتے سے نہ بنائی جائے تو خواہ مخواہ دین سے ٹکرا جاتی ہے اور دین کا نقصان کرتی ہے، چنانچہ بے شمار مسلمان خالص دنیا سمجھ کر اپنے دین کا نقصان کر رہے ہیں۔

اب کتنا بڑا ظلم وگناہ ہے کہ ہزاروں تجربوں اور ٹھوکروں کے بعد بھی اپنی عقل کو ترجیح دیں اور آپ ﷺ کی خیر خواہی چھوڑ کر اپنے بدخواہوں کی رائے پر عمل کریں۔

یاد رکھیے دین ہی ہمیں عقل بھی سکھاتا ہے اور دنیا کی سمجھ بھی دیتا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ کیسے کیسے سمجھدار لوگ کس طرح بچوں کے کام کرتے ہیں۔

ہماری بہنیں اور مائیں، ہمارے بھائی اور بزرگ ایمان سے بتائیں، کیا ہماری عزیز بیٹیاں اور بہنیں، جگر گوشۂ رسول جنت کی بیبیوں کی سردار محمد ﷺ کی محبوب بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراءؓ سے بڑھ کر اور زیادہ قابل قدر ہیں، جن کے متعلق حضرت فرماتے ہیں: ھی بضعة منی یریبنی ما یریبھا ویؤذینی ما یؤذیھا اور کیا وہ رسول ﷺ کو کم پیاری تھیں، کیا وہ اپنے باپ پر بھاری تھیں اور کیا حضرت علی ﷺ کو ان کی قدر نہ تھی، دیکھئے کہ آپ ﷺ نے ان کو کیا جہیز دیا، اور حضرت علیؓ نے ان کا کیا ولیمہ کیا، کیا ہماری بیٹیوں اور بہنوں کے نکاح سیدہ کے نکاح سے زیادہ مبارک ثابت ہوئے، اور کیا کسی کے یہاں بھی حسن وحسین رضی اللہ عنہما جیسی اولاد ہوئی، اور کیا سودی قرضہ لینے کے بعد اتنا بیش قیمت جہیز دے کر آپ اپنی بیٹی کی اور بہنوں کی قسمت بدل دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ سسرال میں خوشی اور مسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔

کیا امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی خوشیوں اور تقریبوں میں عقیقہ اور ختنے میں اس کا دسواں حصہ بھی کیا گیا جو عام طور سے مسلمانوں کے گھر میں رسموں کی قسم سے ہوتا ہے۔

کیا حضرت خدیجہؓ جیسی بیوی اور مونس وغم خوار، حمزہؓ جیسے چچا، اور اسلام کے سپاہی جعفرؓ جیسے بھائی اور حضرت ابراہیمؑ کے انتقال سے بڑھ کر رسول ﷺ کے لئے اور ان سب سے زیادہ رسول ﷺ کی وفات سے بڑھ کر ازواج مطہرات اہل بیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے کوئی صدمہ ہوسکتا تھا، پھر حضرت فاطمہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے کیا کیا، کیا کوئی کسی کے ساتھ اتنی محبت کا دعوی کرسکتا ہے جو عام صحابہ

رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ کے ساتھ تھی، لیکن انہوں نے کوئی رسم نہیں ادا کی، کیا یہ محبت کی دلیل ہے، اور اسلام کی شرط؟!۔

کاش کہ اگر ہم ان بزرگوں کی اتباع نہیں کرتے تو کم سے کم غیروں کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں، کیا دنیا کی کوئی قوم بھی اتنی فضول خرچی کرتی ہے جتنی مسلمان، کیا یہ اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں مسلمانوں کی کتاب میں جتنی اسراف وفضول خرچی اور ہر بیکار وغیرہ مفید چیز کی ممانعت اور دکھاوے، نمود ونمائش کی حرمت آئی ہے، کسی مذہب اور کتاب میں نہیں آئی۔ کیا ہماری شادی بارات کی صحیح تصویر یہ نہیں ہے جو اس آیت نے کھینچی ہے:

ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا وریاء الناس ۔

کیا ہماری زندگی وموت ہماری خوشیوں اور ارمانوں کا خلاصہ یہ نہیں ہے جو ایک شاعر نے بیان کیا ہے۔

تعیش سے جینا، تجمل سے مرنا
یہ ہیں انکی خوشیاں، یہ ہیں ان کے ارماں

میں نے کتاب کے تعارف کی اس تقریب سے فائدہ اٹھایا ہے اور کوشش کی ہے کہ حضرت یوسفؑ کی سنت کے مطابق ''خواب کی تعبیر'' کے سلسلہ میں توحید کا وعظ بھی ہو جائے۔

اللہ تعالی اس کو مقبول فرمائے اور اس سے نفع پہنچائے اور اس عاجز اور مصنف کتاب کے لئے مغفرت اور اپنے بندوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنائے''۔

حکیم صاحب میری نظر میں:

مجھے یاد ہے کہ میرے صدیق باصفا جناب مولانا سید محمد الحسنیؒ نے ایک دفعہ طے کیا کہ تقریر عربی واردو کی مشق کے لئے دار العلوم ندوۃ العلماء کے قریب پاس کسی ایسی مسجد کا انتخاب کیا جائے جو ایک کنارے ہو اور نماز کے اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں خالی رہتی ہو، اسکے لئے حکیم شرافت حسین صاحب کی مسجد واقع مکارم نگر کا انتخاب عمل میں آیا، اس

مسجد میں ہم نے بارہا حکیم صاحب کے ساتھ مغرب کی نماز میں شرکت کی اور ان سے ملاقات کرنے کا موقع ملا، اگرچہ یہ سلسلہ کچھ زیادہ مدت تک نہیں چل سکا، اور ان کے بڑے صاحبزادہ ڈاکٹر محمد ارشد حسین صاحب ندوی کی دعوت پر فصل انبہ کے دوران آم کھانے کی عام دعوت میں شرکت کا موقع ملتا تھا، جہاں حکیم صاحب سے ملاقات ہوتی تھی اوران کے قریب تکلف اور آداب کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔

یہ بھی یاد ہے کہ حکیم صاحب ہمیشہ کئی نماز ادا کرنے کے لئے دارالعلوم کی مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے اور ہر جمعہ کی اذان سے بہت پہلے آ کر تحیۃ المسجد اور نوافل ادا کر کے منبر کے قریب تشریف فرما ہا کرتے تھے، نماز کے بعد سلام ومصافحہ کی سعادت مجھے حاصل ہوا کرتی تھی، اخیر عمر میں بھی حکیم صاحب نے اس سنت کو جاری رکھا، اور بیٹھ کر نماز ادا کرتے تھے، مگر کبھی کسی جمعہ میں تخلف نظر نہیں آیا، یہاں تک کہ عمر اور معذوری دونوں میں اضافہ ہو گیا اور مسجد تک آنا ناممکن ہو گیا۔

حکیم صاحب کی زندگی قابل رشک اور عبرت انگیز ہے، اللہ نے تن تنہا ان سے وہ کام لیا جو ایک بڑی جماعت بھی مل کر نہیں کر سکتی، ان کی زندگی اور زندگی کے جملہ لمحات سراسر عبادت اور سراپا جہاد ہیں، ان کے عزم وہمت کی داد وہی دے سکتا جو اس جہاد زندگی میں قدم رکھ چکا ہو اور وہ اس کے لطف ولذت سے واقف ہو۔

سلام ہو اس مرد عزم وعمل پر جنہوں نے اللہ کے دین کی سربلندی اور قوم مسلم کی نسلوں کی آبیاری میں ہر لذت وطمع سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ کی رضاء کے لئے اپنی توانیاں صرف کیں (آمین)

باب چہارم

عالم اسلام کی جلیل القدر شخصیات

سید قطب شہیدؒ: زندگی کے چند نقوش

مصر کے جدید تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص سید قطب کے نام سے ضرور واقف ہوگا، سید قطبؒ ان چند گنی چنی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اس دور میں نہ صرف مصر بلکہ پوری دنیائے اسلام کی فکری رہنمائی کی، اور اسلامی نظام کی ایسی حکیمانہ تشریح کی جو اہل زمانہ کو براہ راست اپیل کرسکی اور جس کی وجہ سے کتنے ہی دل اسلام کی ابدیت اور اس کی برتری کے قائل ہوکر رہے، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کی فکری رہنمائی سے جو فائدہ حاصل کیا وہ ان کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے معاصرین میں کم لوگوں کو حاصل ہوئی، سید قطب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل کی دولت بیش بہا سے نوازا تھا، اور ان کے قلم کو ایسی روانی اور شعلہ بیانی عطا فرمائی تھی کہ اس سے اسلام کی برتری، اس کی عظمت اور اس کے ابدی پیغام کو دنیا کے سامنے پیش کر کے مخالفین سے بھی خراج تحسین حاصل کرلیا۔

سید قطبؒ ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک قصبہ اسیوط میں ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد ماجد کا نام قطب ابراہیم تھا، ان کے جد سادس فقیر عبید اللہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مصر گئے تھے، اس طرح وہ اپنی چھٹی پشت میں ہندوستان ہی کے ایک خانوادہ سے آملتے ہیں، سید قطبؒ نے اپنے خاندان کی روایتی دینداری کا ایک بڑا حصہ پایا اور بچپن میں ان کے والد نے انہیں قرآن مجید حفظ کرایا، پھر انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی شہر کے ایک مکتب میں حاصل کی اور ۱۹۲۹ء میں وہ قاہرہ آئے جہاں انہوں نے دارالعلوم میں داخلہ لیا، اور سند تدریس حاصل کی۔

دارالعلوم سے فارغ ہونے اور سند تدریس حاصل کرنے کے بعد وزارت تعلیم میں ایک اچھے عہدہ پر فائز ہوگئے، اور ۱۹۴۹ء میں وزارت تعلیم نے ان کو امریکہ بھیجا، جہاں انہوں نے

دنیا کے مختلف نظامہائے تعلیم کا مطالعہ کیا، اور مغربی تمدن کو بہت قریب سے دیکھا، وہ امریکہ میں ۳؍سال مقیم رہے، اس اثناء میں انہوں نے دنیا کے تمام ترقی یافتہ نظاموں کا بغور مطالعہ کیا، اور ان تمام نظریات وافکار کو قریب سے دیکھا جن پر مغربی دنیا کو بڑا ناز ہے، امریکہ میں تین سال زندگی گزارنے اور خالص مغربی تہذیب کو قریب سے دیکھنے کے بعد ان کا ایمان اسلامی نظام کی ابدیت اور اسلامی تہذیب کی آفاقیت اور اس کی ہمہ گیریت پر اور زیادہ پختہ ہو گیا۔

امریکہ سے واپسی کے بعد سید قطبؒ کا آفاق فکر بہت وسیع ہو چکا تھا، وہ مغربی دنیا کے اخلاقی زوال اور ذہنی انحطاط کو بلا واسطہ دیکھ چکے تھے، وہ مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو اچھی طرح پرکھ چکے تھے اور مغرب کے بلند بانگ دعوؤں کی ان کی نظر میں ذرہ برابر بھی کوئی قیمت نہیں رہ گئی تھی، ان کے نزدیک مغربی ممالک اپنی تمام مادی اور علمی ترقیوں کے باوجود فکری غذاء کے شدید محتاج تھے۔ سید قطبؒ کی نظر میں یہ غذا اسلام اور صرف اسلام ہی پیش کر سکتا تھا۔ اور اخلاقی رہنمائی کا خلاء اسی کی تعلیمات سے پر ہو سکتا تھا، انہوں نے اپنی خداداد علمی وادبی صلاحیتوں اور اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے اسلامی نظام کی تشریح اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کرنے اور اسلام کو انسانی دنیا کی ناقابل انکار ضرورت تسلیم کرانے میں اپنی پوری طاقت سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اب وہ وزارت تعلیم سے الگ ہو چکے تھے، اور سارا زور اسی اہم فریضہ کی ادائیگی میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔

سید قطبؒ کی اعلیٰ تصنیفی زندگی کا آغاز دراصل اسی وقت سے ہوا، اسی زمانے میں انہوں نے قرآن کے ادبی اور بلاغی موضوع پر کتابیں لکھی، التصویر الفنی فی القرآن' ان کے فکری اور ادبی رجحان کی آئینہ دار ہیں اور ان کے صحیح دینی ذوق اور قرآن سے گہرے تعلق کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن فہمی اور عربی زبان کا ایسا ذوق عطا فرمایا تھا کہ ان کی تحریریں خالص دینی اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے قرآن کریم کی ایک بہت مبسوط تفسیر "فی ظلال القرآن" کے نام سے ۸؍جلدوں

میں لکھی جو چھپ کر منظر عام پر آئی، اور علمی و دینی طبقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

فن تنقید پر ان کی تحریریں ادبی حلقوں میں خاصا وزن رکھتی تھیں، اس موضوع پر ان کی کتاب ''النقد الادبی'' اور کتب وشخصیات، تنقیدی ادب کا بہترین نمونہ ہے، اسلامی نظام کی تشریح کے موضوع پر ان کی کتاب ''العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام'' اور الاسلام والسلام العالمی'' اپنی مثال آپ ہیں، خاص طور پر ''العدالۃ الاجتماعیۃ'' جدید اسلامی لٹریچر میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے اور دنیا کی متعدد اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، ان دونوں کتابوں کا عالم اسلام میں کافی استقبال ہوا۔ اور اس سے اس کی فکری رہنمائی ہوئی، اسی طرح ''شبھات حول الاسلام'' کے ذریعہ انہوں نے اسلام پر کئے گئے یا کئے جانے والے اعتراضات وشکوک کا نہایت موثر پیرایۂ بیان میں جواب دیا، یہ کتاب مسلم نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی، اسلام اور سرمایہ داری کے موضوع پر ان کی معرکۃ الآراء تصنیف ''معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ'' ہے۔

اسی طرح مصر کے مشہور ہفت روزہ الرسالۃ اور الدعوۃ اور اس کے بعد المسلمون میں سید قطبؒ نے جو مقالات لکھے ہیں وہ ان کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کا نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے دینی فہم، اور اسلامی دعوت سے گہرے تعلق کی دلیل بھی ہیں، ان کے یہ مقالات نوجوانوں اور دعوتی کام سے تعلق رکھنے والوں کے لئے مشعل راہ تھے، وہ ''الدعوۃ'' میں ھذا ھو الطریق'' کے مستقل عنوان کے ماتحت ہمیشہ لکھتے تھے، ان مضامین میں بلا کی طاقت، اور عجیب وغریب اثر ہوتا تھا، اور وہ براہ راست قلب کو اپیل کرتے تھے۔

سید قطبؒ نے عربی شعر گوئی میں بھی کمال پیدا کیا، ان کے عربی قصائد، اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہے، ان کے ایک دیوان کا نام ''قافلۃ الرقیق'' ہے۔

سید قطبؒ مصر کے مشہور ادیب اور انشاء پرداز، عباس محمود العقاد کے اسلوب سے متاثر تھے، ان کی تحریروں میں اکثر یہ رنگ جھلکتا ہے لیکن وہ اس کے باوجود ایک خاص اسلوب تحریر کے موجد تھے ان کے اسلوب میں قوت استدلال اور سہولت وشگفتگی خاص طور سے نمایاں ہے۔

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود

۱۷/اکتوبر ۱۹۷۸ء کی صبح کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اپنے مالک حقیقی سے جاملے، آکاش وانی نے ۱۸/اکتوبر کی رات کو مجمل خبر نشر کی تھی، لیکن بی۔بی۔سی ریڈیو نے تفصیل سے خبر سنائی، یوں تو کسی حادثہ کی خبر غیر متوقع نہیں ہونی چاہئے، لیکن شیخ الازہر کے انتقال کی خبر معلوم کر کے قدرے تعجب ہوا، اس لئے کہ ان کی صحت ان دنوں اچھی تھی، مئی ۱۹۷۸ء میں وہ سخت بیمار ہو گئے تھے اور تقریباً ایک ماہ تک سلسلہ علالت قائم رہا، اسی زمانے میں ندوۃ العلماء کا ایک دورکنی وفد مصر میں موجود تھا اور شیخ الازہر کی دعوت پر ان کے مہمان خاص کی حیثیت سے وہ مصر کے نظام تعلیم، وہاں کی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں، وہاں کی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں رائج نصاب تعلیم کا جائزہ لے رہا تھا، اس وفد کے ایک رکن مولانا محمد واضح رشید ندوی ایڈیٹر پندرہ روزہ ''الرائد'' تھے، راقم الحروف کو بھی اس وفد کی رکنیت کی سعادت حاصل تھی، وفد کا تقریباً چالیس دن قاہرہ میں قیام رہا، اس اثناء میں کئی بار شیخ الازہر سے ملنے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی، اور ہر دفعہ ان کی پر اثر شخصیت نے ہمارے دلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑا، ہم لوگ ان کی خاکساری، ان کی علمی وجاہت اور ان کی دینداری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے بین الاقوامی جشن تعلیمی کی صدارت انھوں نے بڑی خوشی سے قبول کی تھی۔ وہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بہت احترام کرتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اس جشن تعلیمی کی صدارت عالم سلام کی سب سے بڑی علمی اور پر شکوہ شخصیت شیخ الازہر کریں، چنانچہ شیخ الازہر، ازہر

شریف اور مصری حکومت کا ایک ۷؍رکنی وفد لے کر تشریف لائے اور جشن کی کامیابی میں انہوں نے بڑا رول ادا کیا۔

وہ اس سے پہلے بھی ۱۹۷۴ء میں ہندوستان تشریف لا چکے تھے، اس موقع پر وہ بمبئی، علی گڑھ، دہلی اور دیوبند گئے، ندوہ کی طرف سے اس وقت بھی ان کو دعوت دی گئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندوی نے اپنا خاص خط دے کر ہم لوگوں کو دہلی بھیجا، تاکہ ان کو براہ راست وہ دعوت نامہ دیا جاسکے اور لکھنؤ آنے کے لئے وقت لینے میں دشواری نہ ہو، لیکن شیخ الازہر کا پروگرام بہت زیادہ مشغول تھا، وہ دوسرے ہی دن واپس تشریف لے جانے والے تھے، اس لئے معذرت کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا، انہوں نے بڑی معذرت کی اور کسی دوسرے موقع سے خاص طور سے ندوہ آنے کا وعدہ فرمایا، چنانچہ انہوں نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد جشن کی صدارت کر کے اپنا وہ وعدہ پورا کردیا۔

اس صدی کے چھٹے دہے میں جب مصر میں کمیونسٹوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا اور وہ بے تکلف مصر کے مذہبی رنگ کو ختم کرنے کے لئے سارے وسائل استعمال کرنے لگے تھے اور ازہر کو ان کی وجہ سے بڑہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا، اس وقت شیخ الازہر نے جرأت ایمانی سے کام لے کر ان کی سخت مخالفت کی اور نہ صرف ازہر کو بلکہ اپنے ملک کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا، وہ نہ حکومت سے ڈرے اور نہ کوئی بڑی طاقت ان کی غیرت کو چیلنج کرسکی، یہ تنہا انہیں کی بھاری بھرکم شخصیت تھی، جو اس سیلاب پر بند تعمیر کرسکی اور جس نے ازہر کی انفرادیت کو تحلیل ہونے سے بچالیا۔

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود بلبیس کے قریب عتیہ کے مقام پر ۱۲؍مئی ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے، گھریلو تعلیم کے بعد گاؤں کے مکتب میں قرآن حفظ کیا، اور حافظ ہونے کے بعد جامع ازہر میں داخل ہوئے، ۱۹۳۲ء میں انہوں نے عالمیت کی سند حاصل کرنے کے لئے فرانس کا سفر کیا اور پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں داخلہ لیا، وہاں انہوں نے علم النفس اور علم

الاجتماع اور تاریخ مذاہب کے موضوع پر خاص طور سے تیاری کی، اوران سب مضامین میں اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۳۷ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جامع ازہر کے طلبہ کا جو وفد پیرس گیا تھا، اس کے ایک رکن آپ بھی تھے اور اسلامی تصوف میں پی، ایچ، ڈی کیا، ۱۹۴۰ء میں آپ نے ''محاسبی'' کے اوپر ایک شاندار رسالہ تیار کیا اور اس پر آپ کو اعلیٰ امتیاز کے ساتھ دکتوراہ (p.hd) کی ڈگری دی گئی، ڈاکٹر ہونے کے بعد مصر واپس آکر عربی زبان کالج میں نفسیات کے استاد ہوئے، اور ۱۹۵۱ء میں فلسفۂ اسلامی کے استاد کی حیثیت سے آپ ازہر کے شریعت کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء میں آپ اسی کالج کے ڈائریکٹر ہوئے اور مصر کے اسلامیاتی تحقیقی ادارہ مجمع البحوث الاسلامیہ کے رکن قرار پائے، اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ اس ادارہ کے سکریٹری جنرل ہوگئے، ۱۹۷۰ء میں ازہر یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۹۷۱ء میں امور مذہبی اور ازہر کے وزیر ہوئے اور ۱۹۷۳ء میں شیخ ازہر کا منصب آپ کو دیا گیا اور اس کے بعد سے برابر آپ اس اعلیٰ عہدہ پر قائم رہے۔

شیخ الازہر نے اس پوری مدت میں جو ازہر کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر گزاری، سب سے اہم کام جو انجام دیا وہ تھا ازہر کے گرتے ہوئے مقام واعتبار کو واپس لانا، چنانچہ انہوں نے ازہر کے معیار کو اونچا کرنے اور اس کی اہمیت کو اندر اور باہر ہر جگہ از سر نو قائم کرنے کے لئے بہت محنت کی، اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہے، ایک زمانہ میں ازہر کے طلبہ کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی اور باہر کے اسلامی ممالک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی آمد بالکل بند ہوگئی تھی، مگر شیخ الازہر نے حالات کو معمول پر لانے اور ازہر کے دروازے علم کی پیاس بجھانے والوں کے لئے کھلوانے میں بڑی مدد کی، چنانچہ ازہر کا معیار تعلیم بہت اونچا ہوا اور لوگ قاہرہ یونیورسٹی کے مقابل میں ازہر یونیورسٹی میں پڑھنے کو ترجیح دینے لگے۔

شیخ الازہر اپنے تعلیمی اور تبلیغی مشن کو پورا کرنے کے لئے لمبے سے لمبے سفر سے بھی

گھبراتے نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کے اسلامی ممالک کے علاوہ یورپ وامریکہ کا بھی بار بار دورہ کیا، وہ ابھی نومبر ۱۹۷۷ء میں امریکہ گئے تھے، اور واشنگٹن میں ہر طبقۂ فکر کے لوگوں سے ملاقات کی، اور امریکی صدر جیمی کارٹر سے بھی ملے اور اسرائیل اور بیت المقدس کے بارے میں نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ ان سے گفتگو کی اور اپنا موقف ان کے سامنے پیش کیا۔ اسرائیل کے امن معاہدہ کے بارے میں ان کا موقف یہ تھا کہ جب تک فلسطینیوں کے پورے حقوق ان کو واپس نہیں مل جاتے اور اسرائیل عرب سرزمین اور بیت المقدس سے پوری طرح دست بردار نہیں ہوجاتا اس وقت تک اس علاقہ میں امن کا قیام ایک ناممکن سی بات ہے۔

شیخ الازہر نے فکری اور علمی میدان میں بھی بڑا رول ادا کیا ہے، تقریباً ۶۱ ر کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں، جن میں بڑی تعداد مستقل تصنیفات کی ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کو انہوں نے ایڈیٹ کیا ہے۔ بعض کتابوں کے نام یہ ہیں: ''اسلام میں فلسفیانہ نقطۂ نظر''، ''مسلمان فلسفی''، ''یورپ اور اسلام'' ابوالحسن شاذلی'' ''قرآن، قرآن کے مہینہ ہیں'' حج مبرور'' محاسبی اور عطاء اللہ سکندری'' کچھ کتابوں کے فرانسیسی زبان سے ترجمے بھی کئے ہیں جیسے ''محمد رسول اللہ'' اخلاقی مسئلہ'' یونانی فلسفہ'' اخلاق اور فلسفہ جدیدہ'' اور کئی اہم ترین کتابوں کی تحقیق واشاعت ان کی علمی اور فکری رہنمائی ونگرانی میں ہوئی، یہ کتابیں عظیم اسلامی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے سیوطی کی جامع کبیر، اور ذہبی کی تاریخ اسلام، اور بغوی کی مصابیح السنہ۔

۱۱ر اپریل ۱۹۷۶ء کو شیخ الازہر نے لندن میں پاپائے اعظم ''کانٹ بری'' سے ملاقات کرکے ان سے اور برطانیہ کے سبھی پادریوں سے فلسطینی پناہ گزینوں پر ڈھائے جانے والے بے پناہ مظالم کو رکوانے کی درخواست کی تھی اور انہوں نے پاپائے اعظم سے یہ کہا تھا کہ یہ مسئلہ صرف سیاسی نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک اجتماعی مسئلہ کی بھی ہے جو پوری انسانیت کے لئے چیلنج ہے، انہوں نے توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ اس مسئلہ سے نظریں

پھیر لینا اور حق وانصاف کی حمایت نہ کرنا بجائے خود بڑی ناانصافی اور بڑا ظلم ہے۔

عصر حاضر میں جامع ازہر کے لئے جو بنیادی کام انہوں نے تجویز کیا تھا اور جن پر خاص طور سے توجہ دینی تھی وہ یہ تھا کہ:

۱۔ غیر ممالک میں اسلام کی تبلیغ واشاعت

۲۔ اندرون ملک ہر ایسے کردار وعمل کی بھرپور مخالفت، جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔

۳۔ ایسے عقائد وافکار کے خلاف بھرپور لڑائی، جن کا تعلق اسلام سے کسی حال میں نہ ہو، جیسے قادیانیت، کمیونزم وغیرہ۔

ان کا مشہور مقولہ ہے کہ کمیونزم کسی حال میں قابل قبول نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام سے اس کا تعلق کسی طرح نہیں ہے۔

☆☆☆

علامہ عبدالعزیز بن بازؒ
پیکر علم وعمل اور داعی کتاب وسنت

۲۷رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ بمطابق ۱۳رمئی ۱۹۹۹ء کومملکت سعودیہ کے زبردست عالم دین، مفتی اعظم علماء کبار کی سپریم کونسل کے صدرنشیں، دارالافتاءاور مجلس تحقیقات علمیہ کے رئیس عام علامہ شیخ عبدالعزیز ابن باز شہر طائف میں، بعد نماز فجر انتقال فرماگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون، اس خبر سے عالم اسلام کے تمام علمی اور دینی ودعوتی حلقوں میں رنج وغم واندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی، اور جس نے بھی یہ دلخراش خبر سنی وہ تھوڑی دیر کے لئے ''سکتہ میں آگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون''۔

فی الواقع علامہ مرحوم کی وفات عالم اسلام کے سارے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا جانکسل حادثہ ہے، جس نے سارے مسلمانوں پر ایک ہول کی کیفیت طاری کردیا، ان کے دلوں کو یارائے صبر نہ رہا، اوران کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، اوران کی زبانوں پر''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کا کلمہ جاری ہوگیا، کیونکہ سارے مسلمان بلاتفریق مسلک ومشرب ان کوان کی روشن دماغی، عالی ظرفی، دوربینی، علمی وفکری توسع، اوران کی حق گوئی وبیباکی، ان دوعظیم صفات کی بناء پر اپنا مقتدی تسلیم کرچکے تھے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ سارے مسلمان ہر مشکل گھڑی اور ہر سخت آزمائش کے وقت ان کی ذات ستودہ صفات کو مرجع وماوی سمجھتے تھے، اوراپنی دینی، علمی اور دعوتی سرگرمیوں اوراپنے ذاتی معاملات میں ان کو معاون ومددگار پاتے تھے، دوسری طرف شیخ مرحوم ومغفور پوری دنیا کے مسلمانوں کے احوال وکوائف اوران کی دینی علمی اور دعوتی مشاغل اوران کے مسائل ومشاکل سے پوری واقفیت رکھتے تھے، اوران کے پروگراموں

اورمنصوبوں سے پوری طرح باخبر رہتے تھے اور ان منصوبوں میں وہ خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے، اوراپنی تمام توانائیوں اور وسائل کو ان منصوبوں کو پورا کرنے میں صرف کردیتے تھے اوراہل خیر کو بھی ان منصوبوں میں خرچ کرنے کی ترغیب دلاتے تھے۔

پورے سال اسلامی دنیا سے، ان کی خدمت میں وفود اور مہمان آیا کرتے تھے، ان کی قیام گاہ مہمانوں اور وفود سے بھری رہتی تھی، شیخ مرحوم نہایت خندہ پیشانی کیساتھ ان کا استقبال فرمایا کرتے، اور سب کی بے تکلف ضیافت فرماتے، اور ان کے مسائل بڑی توجہ وانہماک سے سنتے اور امکان بھر تعاون سے گریز نہ فرماتے، اور اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری پوری کرتے اور تعاون علی البر والتقویٰ کے زبردست داعی اور اس پر نہایت شدت کیساتھ عامل تھے، مجھے بھی ان سے بارہا ملنے اور قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، ان کی اللہ والی زندگی، ان کی عبادات، ان کی بے نفسی، ان کی تواضع ومہمان نوازی، غریب پروری کے نظارے بارہا دیکھنے کو ملے، ان سب پر مستزاد ان کی دینی محبت واخوت ہے اور ہر ایک سے اس کے مرتبے کے مطابق سلوک کرنے کی بے مثال قوت۔

شیخ مرحوم ومغفور نے اپنی پوری زندگی اسلام کو عملی حیثیت سے پھیلانے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے میں گزاردی، اور ہر اعزاز سے اور ہر قسم کی دولت ولذت سے بے نیاز ہوکر آپ اپنی دینی، علمی اور دعوتی ذمہ داری کو پوری دیانت داری کیساتھ انجام دیتے رہے، اور اس راہ حق میں کسی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں کی، چنانچہ انہوں نے دین کی نصرت وحمایت، اللہ کے واسطے دوستی اور دشمنی، ہر قسم کی برائیوں کی بیخ کنی، اور ہر جگہ حق کے استحکام وثبات کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اسی طرح انھوں نے عقیدہ توحید پر نہایت سختی کے ساتھ قائم رہ کر پوری زندگی گزاردی، یہ عقیدہ ان کے رگ وریشے اور لحم ودم میں سرایت کرگیا تھا، ہر جگہ خواہ مسجد ہو یا مکتب، کورٹ ہو یا گھر، سفر ہو یا حضر، ہر حالت میں اور اپنی تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دوران علامہ مرحوم اس عقیدہ سے لحہ بھر کے لئے بھی کبھی بھی

غافل نہ ہوتے تھے، شیخ بن باز ہر اس نظریہ وعقیدہ کے شدید مخالف تھے، جس میں بدعت وگمراہی کی آمیزش ہو یا جس میں شرک، غیر اللہ پر اعتماد ویقین کا شائبہ بھی ہو، اس سلسلہ میں علامہ مرحوم ایمانی جرأت اور سخت موقف رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کو دین خالص اور صاف ستھرے عقیدہ کے سلسلہ میں اونچا مقام حاصل تھا۔

شیخ مرحوم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی شدید تمنا رکھتے تھے، خصوصا دینی، علم اور دعوت وتربیت کے معاملات میں ان کا احساس ذمہ داری قابل دید اور قابل رشک تھا، چنانچہ شیخ مرحوم بطور نیند کے چند جھپکیاں لے لیتے اور بہت ہی کم وقت میں آرام کر لیتے تھے، اور اپنے سارے اوقات کو للہی کاموں اور اللہ کے تمام بندوں کے تعاون ومدد میں مشغول کر رکھتے تھے، یہ بھی حقیقت قابل ذکر ہے کہ ان کا ہر عمل اللہ اور صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لئے تھا، علامہ ابن باز اسی مومن صادق کی زندگی کی عکاسی کرتے تھے، جس کو اس کے ایمانی راستہ سے کوئی مال ودولت اور نہ جاہ ومنصب ہٹا سکتا ہے، چنانچہ مرحوم دنیا اور دنیا کے زیب وزینت کو ڈھلتی چھاؤں اور سراب سمجھتے تھے ''مومن صرف وہ ہیں، جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے، تو ان کے دل روشن ہو جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں انھیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ اپنے ہی رب پر بھروسہ کرتے ہیں''۔

علامہ مرحوم کے صفات وکمالات بہت زیادہ ہیں اور ان کی ساری صفات قابل تعریف وستائش، لائق اتباع وپیروی، اور قابل ذکر ہیں، اگر ان اوصاف حمیدہ کے عناوین متعین کئے جائیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شیخ مرحوم صرف کبار العلماء ہی کے سربراہ نہ تھے، اور نہ صرف دارالافتاء والبحوث العلمیۃ کے سرخیل تھے اور نہ صرف رابطہ عالم اسلامی اور اس کے ماتحت اداروں کے تنظیمی وتنفیذی مجالس کے ذمہ دار اعلی تھے، بلکہ شیخ مرحوم دین ومذہب، علم ومعرفت، حلم وبردباری، دور بینی ودور اندیشی، عزم وارادہ، تقویٰ وپرہیزگاری، عدل وانصاف، اعتدال ومیانہ روی، وقار وسنجیدگی، نصیحت وخیر خواہی، ایثار وقربانی کے روشن وتابناک مینار تھے،

یہ ان کی مثالی زندگی کے ظاہری عناوین ہیں، ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ سارے اوصاف واخلاق کسی ایک عالم دین یا کسی ایک داعی الی اللہ میں بیک وقت جمع ہو گئے ہوں، بلاشبہ علامہ مرحوم صفات وکمالات کے جامع تھے، نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ مرحوم کو علم وعمل اور دین ودعوت کے میدان میں چند ایسی نمایاں خدمات انجام دینے کی توفیق دی جو خیر القرون کے علماء کی یاد دلاتی ہیں اور اسلام کے عہد زریں کے واقعات کی یاد تازہ کرتی ہیں، اپنی انھیں صفات وخصوصیات کی بنا پر شیخ مرحوم عالم دین، داعی الی اللہ اور مربیوں کے لئے زندۂ جاوید مثال بن گئے تھے، اور تقویٰ، پاکیزگی، عالی ظرفی اور علم وعمل کی جامعیت کا ایک تھے، ایثار وقربانی، اخلاص ووفا اور فیاضی وسخاوت کا عملی پیکر تھے۔

علامہ مرحوم کتاب وسنت کا بہت گہرا علم رکھتے تھے، اور اسی کو اسلامی زندگی کا محور قرار دیتے تھے، چنانچہ ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا کرتے تھے اور اسی کی روشنی میں فیصلہ صادر فرماتے تھے، اور ان دونوں مراجع سے استنباط کر کے سارے مسائل ومشکلات میں فتویٰ صادر کرتے تھے، وہ ان مراجع کے علاوہ مختلف آراء وافکار کا اعتنا نہیں فرماتے تھے اور نہ عرف ومصلحت کا لحاظ کرتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ دین کے معاملہ میں صاف گوئی، اور حق وانصاف کی راہ میں بیباکی اور جرأت ایمانی ان کی وہ امتیازی شان ہے، جس کی بدولت علامہ مرحوم تمام معاملات اور حالات میں ایک ممتاز مقام ومرتبہ رکھتے تھے، وہ کسی کی ملامت ومذمت کی پرواہ کئے بغیر علی الاعلان حق کو حق اور باطل کو باطل کہتے تھے، حلال کو حلال قرار دیتے تھے اور حرام کو حرام گردانتے تھے، اور ہر قسم کی بدعنوانی سے ڈراتے تھے اور ان ہی چیزوں پر عمل کرنے کا حکم دیتے تھے، جن کے کرنے کا حکم اللہ کے نبیؐ نے دیا ہے، اور ان تمام باتوں سے منع کرتے تھے، جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے اس فرمان الٰہی کے حوالہ سے کہ ''جو رسول تمھیں دیں، اسے لے لو، اور جس سے وہ روک دیں، اس سے رک جاؤ'' چنانچہ علامہ مرحوم ہر معاملہ میں

اطاعت الٰہی اور طاعت رسول ﷺ کا حکم دیتے تھے، اور جب نصوص کتاب وسنت میں کوئی رہنمائی نہ پاتے تو سربرآوردہ صحابہ کرامؓ کا عمل تلاش کرتے، اگر حضرات صحابہؓ کے عمل میں کوئی رہنمائی نہ مل پاتی تو اس معاملہ سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کو بدعت کی فہرست میں شمار کرتے، جو بدعتیں حضرات صحابہ کرامؓ کے زریں دور اور خیر القرون کے بعد اسلام میں داخل ہوگئی ہیں، انھیں واضح فکر وخیال کی بناء پر عالم اسلام کے عظیم ترین علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ اس صدی کے ایک بڑے روشن دماغ، دور بین اور صاحب علم وبصیرت عالم دین کی نمائندگی کرتے تھے۔

ان کی وفات حسرت آیات سے ذرا پہلے ''البعث الاسلامی'' کے جلد ۴۴ آخری شمارہ میں ان کا اہم ترین مضمون ''سوگ میں جھنڈوں کا سرنگوں کرنا اور عام تعطیل کا اعلان کرنا دین کے لحاظ سے بدترین بدعت ہے'' شائع ہوا، اس مضمون میں ان کے عقیدہ اسلامی اور ان کے دینی نظریہ کا برملا اظہار ہوتا ہے، علامہ مرحوم اپنے عقیدہ ونظریہ سے کبھی بھی اور کسی حال میں تنازل اختیار نہیں فرماتے تھے، نیز عقیدہ واصول کے معاملات میں ان کا طریقہ اتنا سخت تھا کہ ہر شخص ان کا بے حد لحاظ کرتا اور ادب سے ملتا تھا اور محتاط رہتا تھا، اسی بناء پر علامہ مرحوم ایمان کی پختگی اور ضمیر کی آواز پر عمل پیرا ہونے کے مقام بلند وبالا پر فائز تھے، سخت سے سخت حالات بھی ان کی استقلال وثبات قدمی میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتے تھے، اور نہ کسی قسم کی فکر وتشویش اور خوف واندیشہ ان کو اپنے مستحکم نظریہ سے پھیر سکا، دین کے احکام وتعلیمات کی تعمیل، شریعت الٰہی کے اوامر وفرمان کی بجا آوری اور منکر کی پرزور مخالفت میں ان کا مضبوطی سے قائم رہنا ہر کس وناکس کے سامنے واضح ونمایاں تھا، ان کے مذکورہ مضمون ''سوگ میں جھنڈوں کا سرنگوں کرنا اور تعطیل عام کا اعلان کرنا دین کے لحاظ سے بدترین بدعت ہے، کا درج ذیل اقتباس کس قدر ان کی دینی حمیت وحمایت پر دلالت کرتا ہے:

''بڑے بڑے سربراہ مملکت اور عظیم وکبیر امیر وفرمانروا کی موت پر،

بہت سے لوگوں کے یہاں یہ رسم ورواج بن گیا ہے کہ ملکی جھنڈوں کو سرنگوں کر دیا جاتا ہے، اور تعطیل عام کا اعلان کر دیا جاتا ہے، اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ بالکل ناپسندیدہ بدعت ہے اور اس بدعت پر عمل کرنا ناجائز ہے، کیوں کہ حضرت نبی کریم (ا) اور حضرات صحابہ کرامؓ سے اس طرح کا عمل ثابت نہیں ہے، واقعات بھی اس کی نفی کرتے ہیں، چنانچہ جب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات فرما گئے، اور یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ یہ مصیبت سب سے بڑی اور تکلیف دہ مصیبت تھی، اس کے باوجود بھی حضرات صحابہ کرامؓ نے اسلامی جھنڈوں کو نہ سرنگوں کیا اور نہ تعطیل ہی منائی، پھر افضل البشر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات ہوئی اور حضرت عمر فاروقؓ شہید ہو گئے تب بھی حضرات صحابہ کرامؓ نے نہ تو جھنڈوں کو سرنگوں کیا اور نہ تعطیل عام کا اعلان فرمایا، اسی طرح جب حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے، اور پھر جب حضرت علیؓ شہید ہو گئے، تب بھی حضرات صحابہ کرامؓ نے ان رسموں میں سے کوئی رسم ادا نہ کی، الغرض حضرات صحابہ کرام کے نقش قدم پر چلنا، ان کی تقلید و پیروی کرتے ہوئے ہر قسم کی بدعتوں سے اجتناب و کنارہ کشی اختیار کرنا واجب اور ضروری ہے، کیونکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے، کہ ''ہمارے اس دین میں جس نے بھی کوئی ایسی چیز داخل کر دی، جو دین کا جزء نہیں ہے تو وہ مردود ہے'' (متفق علیہ) نیز اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت نبی کریمؐ نے مزید فرمایا ہے کہ ''جس نے بھی ایسا کوئی عمل کیا، جس کے بارے میں ہمارا عمل نہیں ہے تو وہ بھی مردود ہے۔''

علامہ مرحوم نے پختگی ایمان، یقین محکم اور دعوت وعمل کی جامعیت، تعلیم وتربیت کی عمومیت اور توجیہ وارشاد کے جہد مسلسل کے ذریعہ بڑی تعداد کو فیض یاب کیا اور گم گشتہ

راہ انسانوں صراط مستقیم پر گامزن فرمایا۔

چنانچہ ان کے ساتھ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد دنیا کے کونے کونے میں شمع علم وعرفان روشن کئے ہوئے ہے، نیز کتنے ہی ایسے لوگ تھے، جو زندگی کے صحیح راستہ سے بھٹک چکے تھے اور بدعت وگمراہی میں جا پڑے تھے، خواہشات نفس اور آرزؤں کی وادیوں میں غلطاں وپیچاں تھے لیکن علامہ مرحوم کے ارشادات وتوجیہات سے صراط مستقیم پر واپس آگئے اور تمام بدعات وخرافات سے تائب ہوگئے اور بقیہ زندگی ایمان خالص اور عقیدہ توحید پر عمل کر کے اسی کی دعوت دیتے ہوئے گذاردی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علامہ مرحوم نے اپنی پوری زندگی مسلسل تگ ودو، محنت وعمل اور فکرمندی میں گذاردی اور اسی حالت میں انہوں نے ۸۸ر سال کی عمر میں اپنی جان آفرینی کے سپرد کردی، نماز جنازہ حرم مکی میں ہوئی اور تدمین مقبرۃ العدل مکہ مکرمہ کے مشرقی جانب واقع قبرستان میں ہوئی۔

''آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے''

علامہ مرحوم کا انتہائی مخلصانہ اور محبابہ تعلق ہمارے مرشد ومربی حضرت مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے بہت گہرا اور عقیدت ومحبت کا عجیب وغریب تعلق تھا، اس کا ذکر خود ''پرانے چراغ'' میں موجود ہے۔

عالم اسلام علامہ مرحوم کی وفات اور اس یکتائے زمانہ عالم دین، مخلص داعی ومفکر اور عظیم مفتی سے صرف محروم نہیں ہوا، بلکہ پوری دنیا ایمان راسخ، نظر ثاقب اور وسیع القلب اور ہمہ جہت معلومات رکھنے والی ہستی سے محروم ہوگئی، لیکن ان کی زندگی حرکت وعمل کے میدان میں ایک شفاف آئینہ، ان کا ایمان راسخ، سارے مسلمانوں کے لئے اسوہ، اور ان کی حق گوئی وبیبا کی تمام علماء اور سارے داعیوں کے لئے راہ عمل ہے، ان کارناموں کے علاوہ ان کی خصوصیات وکمالات، ان کے علمی ودینی کارنامے اس قدر ہیں کہ قلم میں صفحۂ قرطاس پر

منتقل کرنے کی طاقت ہے اور نہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش ہے۔

''سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے''

اللہ کی رحمت ان پر ہو، رضاء ومغفرت الٰہی کے دامن میں ان کو پناہ حاصل ہو، اور جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین مقام میں ان کا قیام ہو، اور وہاں نبیوں اور صدیقین اور شہداء وصالحین کی رفاقت عطا ہو (آمین) (عربی سے ترجمانی: خالد فیصل ندوی)

☆☆☆

باب پنجم

چند محترم اور بزرگ شخصیات

مولانا دریابادیؒ

کردار سازی کے آئینے میں

بیسویں صدی کے ادیب شہیر اور صاحب اسلوب انشاء پرداز مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی شخصیت سے کون نہیں واقف ہوگا، ان کی تحریریں، واقعہ نگاری بلکہ صحیح معنوں میں جادونگاری ایک زندہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں، وہ اپنے عصر کے مزاج داں اور زبان وادب کے نکتہ شناس تھے، وہ ادب کے تمام اصناف پر پوری دسترس رکھتے تھے، وہ تمدن وفلسفہ اور تاریخ وعلم الاجتماع کے رازداں بھی تھے، اوران تمام موضوعات پران کا مطالعہ نہایت وسیع اور گہرا تھا، اوران کا شمار دنیا کے عظیم ادیبوں اور ماہرین فکروفن میں ہوتا تھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم حقیقت نگار سے ان کے فطری اور صاحب کمال ادیب ہونے کی شہادت ملاحظہ فرمائیں:

''ایک فطری ادیب اور صاحب قلم کی پہچان یہ ہے کہ موضوع کیسا ہی سادہ وسنجیدہ، خشک وپرتقدس ہو، وہ اپنے قلم کی جولانی، خیال کی رعنائی اور طرز ادا کی دلآویزی کو روک نہیں سکتا، اوراس کے لئے اپنے ادبی ذوق واسلوب تحریر سے عاری وخالی ہوجانا ناممکن ہوتا ہے، خلافت کی پرخار وادی ہو، یا تفسیر وتصوف کا پرعظمت اور نازک میدان، جہاں ہر قدم پر ''ہوشیار اور نگاہ روبرو'' کی آواز بڑے ادیبوں کے کان میں:

''قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں''

کی صدا آتی ہے، اس کا قلم گل کاری اور گلفشانی سے باز نہیں رہتا، اور یہی راز ہے

کہ ادب و زبان کے رسیا اور لطف بیان کے جویا بھی یہ "بھاری بھرکم" تحریریں ذوق وشوق سے پڑھ لیتے ہیں اور گرانی محسوس نہیں کرتے، خالص ادیبوں میں یہ امتیاز مولوی محمد حسین آزاد کا ہے کہ شعراء کی محفل شعر وسخن ہو یا سلطان وقت کا دربار اکبری، ان کی ہر تصویر میں نیرنگ خیال اور ان کی ہر تحریر میں آب حیات نظر آتا ہے، عالموں اور محققوں میں مولانا شبلیؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ "شعر العجم" اور "موازنہ انیس و دبیر" جیسی خالص ادبی وتنقیدی تصنیف ہو یا "الفاروق" و "سیرۃ النبیؐ" جیسی ثقہ پر شوکت وباعظمت موضوع یا "الکلام" و "علم الکلام" جیسا سنگین وخشک مضمون ہر جگہ ان کی تحریر کی شگفتگی ورعنائی قائم رہتی ہے اور ادب و زبان کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا"۔

مولانا دریابادیؒ نے قرآن کریم کا مطالعہ نہایت گہرائی سے کیا تھا، انہوں نے قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کے سلسلہ میں بہت سے ایسے مراجع سے بھی مدد لی تھی جو دوسری زبانوں سے تعلق رکھتے تھے، اور انہوں نے قرآن کریم میں مذکور اقوام وواقعات کے بارے میں مستند مورخین کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، انہوں نے اپنے قدیم دور الحاد سے جدید زندگی کی طرف لوٹنے کے بعد قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا آغاز کیا، اور وہ "تفسیر ماجدی" کے نام سے معروف ومقبول ہے، ان کی زندگی کا یہ روشن پہلو دیگر ادوار زندگی پر امتیازی حیثیت رکھتا ہے، انہوں نے اسی روشنی سے نہ صرف اپنے دل ودماغ کو روشن کیا بلکہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے زبان وادب کی رمز شناسی اور بلاغت وبیان کی چاشنی عطا کی۔

اس وقت ہم آپ کے سامنے ان کی جملہ تصنیفات اور ان کی ادبی تحریروں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے اس لئے کہ یہ موضوع ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے، ہم آپ کے سامنے ان کی آخری تصنیف "آپ بیتی" سے کچھ ایسے اقتباسات پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو علم وادب اور فکر وعمل کی راہ سے اخلاقیات عالیہ کی دعوت دیتے ہیں، اور ان کے اندر کردار سازی کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں، اور ان کو نوجوان نسل کی تربیت اور اس کے مستقبل

کو روشن کرنے کی راہ میں ایک قابل قدر رہنما اصول کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

مولانا نے ۱۹۲۴ء کے اخیر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور معروضی اسلوب میں مضمون نگاری کو جلا بخشنے کے لئے اہل علم وادب کی ایک جماعت کے ساتھ ایک مستقل ہفتہ وار ''سچ'' کے نام سے نکالا، اگرچہ ظفر الملک علوی اس پرچہ کے منیجر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے سامنے آئے، لیکن واقعۃ اس کے مرتب اور مضمون نگار اور ایڈیٹر سب کچھ مولانا دریابادیؒ تھے، اس ہفتہ وار کے ذریعہ مولانا نے نہ صرف ادبی ذوق کو صحیح سمت عطا کی اور بامقصد صحافت کے زریں اصول سے صحافتی طبقے کو آشنا کرایا، بلکہ اصلاح عقیدہ، رسوم وبدعات اور غیر اسلامی خیالات کی تردید میں بھی مضامین لکھ کر معاشرہ میں اخلاقیات کا شعور پیدا کیا، اور نوجوانوں میں اسلامی کردار سازی کی ذہنیت کو پروان چڑھایا، لیکن اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے بہت سے مراحل سے گذرنا پڑا، وہ لکھتے ہیں:

''شروع شروع توجہ اصلاح رسوم وبدعات پر تھی، اس لئے قدرتاً اہل بدعات بھی زیادہ ناخوش رہے، پھر بعض اور طبقوں کی دشمنی مول لینی پڑی، پھر ستمبر ۱۹۲۵ء میں شریفی سعودی آویزش سرزمین حجاز میں شروع ہوئی، ''سچ'' نے سعودیوں کی پہلے حمایت کی اور کئی مہینہ بعد ان پر نکتہ چینی شروع کی، پہلے وہ وہابیوں کا ترجمان سمجھا گیا، بعد کو بدعتیوں کا پشت پناہ، ایک مدت تک شیعہ حضرت اسے اپنا حریف ومعاند سمجھتے رہے، تجدد، ترقی پسندی کا مقابلہ وہ ہر محاذ پر کرتا رہا، اور جمود کا وہ حامی نہ رہا، فتنۂ انکار حدیث کا مقابلہ اس نے مدتوں کیا، اور ۳۱ء، ۳۲ء میں تو اس نے نیاز فتحپوری کے الحاد اور فتنۂ ''نگار'' کے مقابلہ کے لئے مہینوں اپنے کو وقف رکھا، نظریات خلافت کی بھی تبلیغ وہ مدت دراز تک کرتا رہا، حالانکہ خود تحریک خلافت ۲۵ء ہی میں بالکل مردہ وبے جان ہو چکی تھی۔ زبان شروع شروع میں ''عوامیت'' کی سطح پر قصداً لے آئی گئی تھی، یہاں تک کہ اس کی اردو پر لوگوں نے پھبتی ''کانگریسی اردو'' کی کس ڈالی، بعد کی زبان شستہ ونستعلیق اختیار کر لی گئی۔ جولائی ۳۰ء میں صوبۂ سرکار نے ''سچ'' سے ضمانت

طلب کیا اور پرچہ کو مجبوراً کئی مہینوں کے لئے بند رکھنا پڑا، نومبر سے پرچہ از سر نو جاری ہوا، اور جنوری ۱۹۳۱ء سے مدتوں سردار ملت مولانا محمد علی کا ماتم ہوتا رہا“۔

اس کے بعد حالات کی ستم ظریفی نے پرچہ کی اشاعت پر اثر ڈالا، اور مجبوراً اسے بند کرنا پڑا، لیکن دل کے تقاضے اور اس عصر میں اردو با مقصد صحافت کو رواج دینے اور اس کے اثرات سے زندگی کو نئی سمت عطا کرنے کے لئے اپنے بڑے بھتیجے اور داماد حکیم عبدالقوی صاحب مرحوم کو تیار کرلیا، انہوں نے پوری ذمہ داری اٹھالی، اور دسمبر ۱۹۵۰ء کے شروع میں یہ نیا پرچہ ”صدق جدید“ کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔

اس کے مقاصد اور خدمات کے بارے میں رقمطراز ہیں:

”پرچہ کی خدمات پر اپنے قلم سے تبصرہ کر ہی کیا سکتا ہوں، دین اور ضمناً علم، ادب، صحافت کی خدمت، بری بھلی جو کچھ بھی اس ۴۰، ۴۲ سال میں بن پڑی، اس کا فیصلہ خود ناظرین پرچہ کے سو پچاس نمبر پڑھنے کے بعد کر سکتے ہیں، البتہ اپنی طرف سے یہاں صرف اتنی گزارش کی اجازت چاہتا ہوں کہ:

(۱) واقعات حاضرہ پر اس طرز خاص سے تبصرہ کرنا کہ پہلے نفس خبر بجنسہ نقل کر دی، اور پھر اس پر مختصر جچے تلے لفظوں میں کچھ لکھ لکھا دیا ”صدق“ اور ”سچ“ سے پہلے شاید اردو کی دنیائے صحافت کے لئے نامعلوم تھا۔

(۲) ”صدق“ نے طنز و تعریض کا استعمال بے شک کثرت سے کیا ہے لیکن اپنی والی کوشش ہمیشہ ذاتیات کا پہلو بچا کر اور صرف پبلک زندگی کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر۔

(۳) مروت اور شخصی تعلقات سے یہ تو نہیں کہ سرے سے اثر قبول ہی نہیں کیا گیا، البتہ اس تاثر کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھا گیا ہے اور اسے پبلک فریضۂ احتساب پر غالب نہیں آنے دیا گیا۔

(۴) ہر حق کو حق اور ہر باطل کو باطل بلا کسی پارٹی کے خیال اور بغیر کسی تعصب و تحزب

کے پیش کیا، اور جہاں کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ ہوئی تو اس سے سکوت ہی اختیار کرلیا گیا۔

(۵) اظہار رائے اور جنبش قلم میں، یہ کس منہ سے کہوں کہ کبھی بھی ذاتی جذبات سے متاثر نہیں ہوا ہوں، جہاں کہیں بھی اس قسم کی لغزشیں ہوں اللہ سے دعا ہے کہ اسے معاف فرمائے اور ناظرین سے عرض ہے کہ وہ اس پر آمین کہیں۔''

اس پرچہ کے ذریعہ دین کی سربلندی اور دعوت الی الخیر کی کوششوں کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

''پرچہ کی ارادی، شعوری، دانستہ کوشش ہر دور میں دین کو بلند کرنے کی رہی، اور اس کی دعوت ہمیشہ خیر ہی کی رہی، لیکن خدا معلوم کتنی بار اس کا نکالنے والا اور چلانے والا غصہ وطمع یا کسی اور شہوت نفس کا شکار ہوکر خود ہی پستیوں میں چلا گیا اور خیر کی دعوت میں شر کی آمیزش ہوتی گئی۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا''۔

۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۲۰ء کا وقفہ مولانا دریابادیؒ پر اسلام سے برگشتگی اور الحاد وارتداد کا دور کہا جاسکتا ہے، اس عرصہ میں بہت سے مدوجزر آئے اور اللہ اللہ کرکے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ناظر یار جنگ کے یہاں اورنگ آباد میں قیام کا اتفاق ہوا، اور ان کے انگریزی کتب خانہ میں محمد علی لاہوری احمد (قادیانی) کے انگریزی تفسیر وترجمہ کا پڑھنا تھا کہ کایا پلٹ گئی، اور شکوک وشبہات کے سارے غبارے ڈھل گئے، اور دل اسی اسلام کی روشنی سے منور ہوگیا جس سے طبیعت بیزار ہوگئی تھی، اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے مولانا کے لئے ہدایت کا راستہ نہایت روشن کردیا، اسی اثناء میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے کانپور میں ملاقات ہوئی اور پھر اس کے بعد مختلف اوقات میں حضرت مدنیؒ سے شرف نیاز حاصل ہوتا رہا، اور جولائی ۱۹۲۸ء میں حضرت کی وساطت سے حضرت تھانویؒ تک رسائی ہوئی، اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا رقمطراز ہیں:

''حضرت تھانویؒ سے جس قدر استفادہ دینی، روحانی، اخلاقی حیثیت سے ہوا وہ

حد بیان مصلح، مرکزی معلم و مرشد حضرت کو فرد فرید پایا، جس طرح ملی وسیاسی لیڈر کی حیثیت سے ''محمد علی'' کو پایا تھا، اپنی اس محرومی اور حرماں نصیبی کو کیا کہئے کہ اتنی رسائی ہو جانے کے بعد بھی بے مایہ و تہی دست ہی رہا، اور جو اول میں کورا ہی رہا، پڑھنے والے جب اس مقام پر پہنچیں تو حسبۃً للہ اس ناکارہ و ننگ خلائق کے حق میں دعائے خیر فرمادیں، یہ کسی قسم کا مطالبہ نہیں ہے محض ایک بھیک ہے''۔

اس سلسلہ میں اور جن اللہ کے مخلص بندوں سے استفادہ فرمایا اور جن سے ایمان ویقین کو تقویت پہونچی اور جن کی صحبتوں سے دل ودماغ کو ایمان کی روشنی اور عشق رسول کی چاشنی حاصل ہوئی، ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لکھنؤ میں ایک صاحب دل بزرگ تھے، مولوی عبدالاحد کسمنڈوی بظاہر کلکٹری میں ملازم، لیکن صاحبِ باطن، ان کی خدمت میں بہت شوخ بلکہ ڈھیٹ رہا (متوفی ۱۹۲۹ء) جو اربارہ بنکی میں اور بزرگ تھے، مولوی عابد حسین فتح پوری صاحب علم، متبع شریعت وصاحب نسبت (متوفی ۱۹۲۷ء) ان دونوں سے بھی بقدر اپنے ظرف وبساط کے استفادہ رہا، سب سے بڑھ کر استفادہ ایمانی مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) سے رہا، دیکھنے میں نہ درویش، نہ عالم، نہ مصلح لیکن حقیقت میں دس درویشوں کے ایک درویش، حرارتِ ایمانی کے دہکتے ہوئے تنور، عشقِ رسول وعشق قرآن کو گویا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے، اپنے ایمان میں اگر جان پڑی تو انہیں کے فیض صحبت سے، اخیر ۲۳ء سے اخیر ۳۰ء تک ان سے بارہا ملاقاتیں رہیں، اکثر تو لکھنؤ اور دہلی اور کبھی ممبئی، علی گڑھ وغیرہ میں بھی، ہر صحبت ازدیاد ایمان ہی کا باعث ہوتی رہی''۔

حضرت تھانویؒ سے تعلق ہونے اور ان سے استفادہ کا سلسلہ جاری ہونے کے بعد ہی ۱۹۲۹ء میں مولانا کو سفر حج وزیارت کا موقع ملا، اور اس کے بعد تو جیسے اسلام کے حق میں تصنیفات ومحاضرات کا سلسلہ چل پڑا، اور اسلامی فکر ودعوت کو عام کرنے، اسلامی

تہذیب کے خط وخال اجاگر کرنے اور علم وعمل کے میدان میں پوری سرگرمی کے ساتھ مشغول ہوجانے کے سوا، اورکوئی کام ہی نہ رہ گیا، انہوں نے فلسفہ جیسے خشک مضمون کو اورنفسیات وعلم الاجتماع کوبھی اپنی اس روح ایمانی سے اس قدر دلچسپ اور مفید بنادیا کہ وہ ایک خالص اسلامی موضوع بن گیا، اوراس کی وجہ سے اسلامی کتب خانہ میں ایک وقیع اضافہ ہوا، آیئے مولانا کی زندگی کے اس اہم ترین پہلو کو اورزندگی کو آراستہ کرنے کی کاوشوں کو ذرا تفصیل سے انہیں کی تحریر کے آئینہ میں دیکھنے اوراس سے مستفید ہونے کی کوشش کریں، وہ لکھتے ہیں:

''علمی وفلسفیانہ مضمون ایک زمانہ میں کثرت سے لکھے تھے، ایک صاحب نے انہیں بغیر میری اجازت کے ''فلسفیانہ مضامین'' کے نام سے یکجا کرکے چھاپ دیا، اور ڈوردھوپ کرکے کتاب کولکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔اے کے کورس میں داخل کرادیا، مجھے جب اس کا علم ہواتو میں نے اس پر نظر ثانی کرکے ایک خاص ترتیب کے ساتھ ''مبادی فلسفہ'' کے عنوان سے جمع کیا، اوردوحصوں میں اسے شائع کیا، پہلا ۱۹۳۱ء میں دوسرا ۱۹۴۱ء میں، عام فہم، نام ان کا فلسفہ کی پہلی کتاب'' اور''فلسفہ کی دوسری کتاب'' رکھا۔

۱۹۳۳ء ہی سے اس خدمت عظیم کا حوصلہ ہوا، جسے حاصل زندگی اور توشۂ آخرت سمجھتا ہوں، اوردل ودماغ کی بہترین توانائیاں اس کی نذرکردیں، اس کا مستقل ذکرایک اگلے ذکرایک اگلے باب میں انشاء اللہ ملے گا، ۱۹۳۸ء تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات نے ایک خطبہ سنانے کے لئے علی گڑھ طلب کیا، اورمیں اپنے پسند کئے ہوئے عنوان ''اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام'' کے تحت ایک خطبہ جاکرسنا آیا، تین سال بعد ۱۹۴۱ء میں پھراس مجلس کی طرف سے دعوت آئی، اوراب کی ''تمدن اسلام کی کہانی اس کی زبانی'' کے عنوان سے جاکرلکچردے آیا، دونوں لکچر پسند کئے گئے، اورمجلس مذکور کی طرف سے شائع ہوئے اورخوب نکلے، اسی درمیان میں سچ کے مضمونوں اور مقالوں کی خدادامقبولیت

دیکھ کر حیدر آباد کے ایک ناشر نے تین مجموعے ''محمد علی! ذاتی ڈائری''، ''مضامین عبدالماجد دریابادی'' اور ''مردوں کی مسیحائی'' کے نام سے چھاپ ڈالے اور نقد معاوضہ برائے نام سا بھیج دیا، چند سال اور گذرے کے ریاست حیدر آباد ہی کے ایک صاحب نے ایک مجموعہ ''سچی باتیں'' کے نام سے شائع کر دیا۔

۴۱ء آخری سہ ماہی تھی کہ رام پور کی رضا لائبریری نے فرمائش کی کہ ہمارے یہاں آکر کسی علمی و ادبی عنوان پر علمی رنگ میں آکر مقالہ پڑھو۔ دعوت منظور کر لی، اور اسی وقت ایسی ہی فرمائش مجلس اسلامیات پشاور کی طرف سے موصول ہوئی (آہ پشاور اس وقت ہندوستان ہی کا حصہ تھا اور کٹ کر جدا نہیں ہوا تھا) اسے بھی منظور کر لیا، پہلے دسمبر ۴۱ء میں رام پور گیا، اور وہاں بعض قدیم مسائل جدید روشنی میں'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا اور پھر جنوری ۴۲ء میں پشاور کا سفر اختیار کر لیا، وہاں ایک مبسوط مقابلہ جدید ''قصص الانبیاء کے دو باب'' کے عنوان سے پڑھا پشاور میں وہی مقالمہ دوبارہ ایک دوسری جگہ بھی پڑھوایا گیا، بعد کو یہ دونوں لکچر یکجا کر کے نظر ثانی و ترمیم کے بعد کتابی صورت میں شائع کرائے اور نام ''قصص و مسائل'' رکھا، پہلا ایڈیشن چند سال میں ختم ہو گیا جب پھر دوسرا ایڈیشن نکلا۔

فلسفہ و نفسیات پر کچھ لکھنا ایک عرصہ سے ترک تھا، ۴۵ء میں ہندوستان اکیڈمی (الہ آباد) نے فرمائش کی کہ ''پاپولر سائیکالوجی'' (عام فہم نفسیات) پر ایک رسالہ دوڈھائی سو کی ضخامت کا تیار کر دو، ۴۶ء میں اس فرمائش کی تعمیل کر دی، اور نام ذرا عجیب سا ''ہم آپ'' رکھا، کہیں ۴۸ء میں جا کر شائع ہوئی، معاوضہ دوبارہ سو نقد ملا، اور فروخت پر ۱۰ر فیصد رائلٹی اس کے علاوہ، اسی زمانہ میں اپنے ادبی مقالوں کی اشاعت کا خیال آیا، صدق کے علاوہ اور بھی متعدد رسالوں میں نکل چکے تھے، پہلی جلد مرتب کر کے انشائے ماجد یا ادبی مقالات کے نام سے پبلشر (تاج آفسیٹ بمبئی) کو بھیجی، چھپ کر آئی تو نام ''مقالات ماجد'' پڑا ہوا تھا، اب کیا کرتا! معاوضہ ایک ہزار نقد ملا اور کتاب کے کچھ نسخے بھی، دوسرا ایڈیشن لاہور کی

عشرت پبلشنگ کمپنی نے شائع کیا، اور معاوضہ اس نے بھی شاید وہی ایک ہزار پیش کیا، تیسرا ایڈیشن اسی حصہ اول کا دسمبر ۶۲ء میں نکلا اور معاوضہ دوسرے حصہ کا پہلا ایڈیشن مارچ ۶۱ء میں یہ دونوں حصے صحیح نام "انشائے ماجد" سے نکلے اور انہیں نسیم بکڈپو لکھنؤ نے شائع کیا، نشری ریڈیائی تقریروں کی بھی خاصی تعداد ہوگئی تھی، ان کا مجموعہ بھی اسی نسیم بکڈپو نے مارچ ۳۶ء میں نشریات ماجد حصہ اول کے نام سے شائع کیا، وقت کے مشاہیر اہل علم، اہل شعروادب واہل سیاست کے خطوں کا ذخیرہ اپنے پاس ایک عرصہ سے موجود تھا۔ جی میں آیا انہیں مرتب کر کے اور ان پر اپنے حاشیے بڑھا کر انہیں چھاپ دیجئے، چنانچہ پہلی جلد "خطوط مشاہیر" کے نام سے مولانا شبلی اور اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی جوہر کے خطوں کی اپنے دیباچوں اور بکثرت حاشیوں کے اضافہ کے ساتھ تاج کمپنی کو پانچ سو نقد معاوضہ پر دے دی اور اس نے غالباً ۷۴ء میں چھاپ دی، مولانا شبلی کے خط تو پہلے بھی نکل چکے تھے، مولانا حسین احمد مدنی، اقبال، اور مولانا ابوالکلام کے خطوط ان کے خطوں کے مجموعہ میں نکل گئے ہیں اور مولانا سید سلیمان ندوی کے خطوط کی پہلی جلد "مکتوبات سلیمانی" کے نام سے ۶۳ء میں چھاپ دی اور دوسری جلد عین اس وقت (جولائی ۶۷ء) زیر طبع ہیں مولانا مناظر احسن گیلانی کے خطوط ایک صاحب کو چھاپنے کے لئے مدت دراز ہوئی بھیج چکا ہوں، مہدی حسن کے خط بھی ان کے مجموعہ خطوط میں نکل چکے ہیں، اب میرے پاس شرر، ریاض خیر آبادی، مولانا شوکت علی، سید جالب دہلوی وغیرہ کے خطوط باقی رہ گئے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی وفات جولائی ۴۳ء میں ہوئی، اس کے کچھ ہی روز بعد خیال آیا کہ اپنے اور حضرت کے تعلقات پر حضرت کے خطوط کی روشنی میں کچھ لکھ ڈالوں، خطوط سینکڑوں کی تعداد میں محفوظ مل گئے، میرے اصل عریضے بھی اور ان ہی پر حضرت کے جوابات بھی، بڑا وقت ان کے چھانٹنے اور تاریخ وار مرتب کرنے میں لگ گیا، پر کتاب کو بھی قدرتاً ضخیم ہی ہونا تھا، خیر خدا خدا کر کے کتاب ۵۰ء میں "حکیم الامت، نقوش و تاثرات"

کے عنوان پر تیار ہوگئی اور اب کئی سال سے اس کا کوئی نسخہ باقی نہیں رہا، لکھنؤ سے ایک بڑے پرانے مخلص مولوی سید رئیس احمد ندوی جامعی نے اسے بہت شوق سے دوسرے ایڈیشن کے لئے مانگا، لیکن خدا معلوم کیا بجوگ پڑ گیا کہ اب تک نہ چھپ سکی، اور نہ اب کوئی جواب ہی مل رہا ہے (یہ دوسرا ایڈیشن لاہور سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوگیا) (عبدالقوی)

اب خیال آیا کہ مولانا محمد علی قرضہ تو اس سے بھی پرانا اپنے اوپر باقی چلا آ رہا ہے کسی طرح اسے بھی بے باق کیجئے، مرحوم کی وفات کے بعد ہی ''سچ'' میں ان پر لکھنا شروع کر دیا تھا، اور ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق'' کے عنوان سے ۱۶ر۱۷ نمبر ''سچ'' میں لکھ ڈالے تھے، اب انہیں کو بنیاد بنا کر کتاب از سر نو لکھنا شروع کی، اور ۸۸ بابوں میں اور متعدد ضمیموں کے ساتھ دو جلدوں میں ختم کی، مسودہ ۴۸ء میں تیار ہو چکا تھا، دو چار سال اچھے ناشر کے انتظار میں پڑا رہا، بلکہ کچھ گشت بھی کرتا رہا۔ اخیر ۵۲ء میں پریس کو خود ہی دی، پہلی جلد ۵۴ء میں پریس سے باہر آئی اور دوسری ۵۶ء میں۔

حضرت تھانویؒ کی بہترین کتابوں میں سے ایک کا نام ''مناجات مقبول'' ہے، کچھ قرآنی اور زیادہ تر حدیثی دعاؤں کا بہترین مجموعہ، گویا قرآن وحدیث دونوں کا انتہائی عطر نکال کر پیش کر دیا ہے، اور ترجمہ بھی حضرت ہی کے ایک خلیفہ اعلیٰ کا کیا ہوا صحیح وشستہ اردو میں، مدت سے آرزو تھی کہ اس کی شرح عام فہم زبان میں کیجئے اور کتاب اپنے ہی عامیوں عاصیوں کے حلقہ میں پہنچایئے۔ آرزو ۵۰ء میں پوری ہوئی، اور ہلکی ہلکی سی نظر ثانی زبان ترجمہ پر بھی، اور آخر میں ایک بندہ مقبول کے معمولات میں سے ایک دعاء کا اضافہ کیا، پہلا ایڈیشن ۵۲ء میں نکلا، دوسرا ۵۵ء میں، تیسرا ۵۶ء میں، جو دعا کرنے میں خود حد درجہ بد ہمت وغفلت شعار ہے عجب کیا کہ اس کی کوتاہیوں، غفلتوں، بدراہیوں کا کفارہ کسی درجہ میں اسی دعاء آموز کتاب سے ہو جائے۔

شاعروں میں سب سے زیادہ لکھنے لکھانے کا اتفاق اکبر الٰہ آبادی پر ہوا خدا معلوم

کتنے مضمون، مقالے، نوٹ ان پر لکھ ڈالے اور نشریئے اس کے علاوہ ۱۵ء میں نظر ثانی کر کے بہت سی تحریروں کو یکجا کر کے اور نام ''اکبرنامہ'' یا ''اکبر میری نظر میں'' رکھا اور ۵۴ء میں لکھنو کے ایک پبلشر نے اسے اچھاپ دیا، لیکن کتاب کیا ہے مطبعی غلطیوں کی پوٹ ہے کتابیں یوں بھی میری بہت غلط چھپتی ہیں اس کا نمبر سب سے اول ہے اور شعر تو چند ہی اس میں صحیح چھپے ہوں گے۔ پڑھ کر دلی اذیت ہوتی ہے ۵۵ء کا آغاز تھا کہ پاکستان کے گونر جنرل جناب غلام محمد صاحب نے کراچی آنے کی دعوت دی، جی کوئی بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا، تاہم منظوری بہت کچھ سوچ بچار کے بعد ہی دی، اور اپریل میں ایک مختصر قافلہ کے ساتھ جا کر لاہور اور کراچی ہو آیا، واپس آ کر ''صدق'' میں قسط وار ایک مضمون ''ڈھائی ہفتہ پاکستان میں'' کے عنوان سے لکھا، بہت سے پرچوں نے اسے نقل کیا، ختم پر نظر ثانی کے بعد اسی عنوان سے ۵۶ء میں چھاپ بھی دیا''۔

قرآن کریم کی تفسیر لکھنے اور اس کے لئے نہایت گہرائی کے ساتھ سینکڑوں مراجع سے استفادہ کرنے اور لغت، تاریخ، جغرافیہ، تاریخ مذاہب وادیان، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام غرض مختلف علوم وفنون کی کتابیں بغور پڑھنے اور ان سے نتائج وحقائق کا استنباط کرنے کی تفصیل کتنی عبرت انگیز اور اہل علم کے لئے کس قدر مفید ہے، زندگی کے اس بیش قیمت وقفہ کی کہانی بہت دلچسپ اور علمی کام کرنے والوں کے لئے بہت ہی حوصلہ بخش اور ہمت افزا ہے، مولانا نے پہلے انگریزی زبان میں تفسیر لکھ کر خراج تحسین حاصل کی، پہلے اس کی کہانی مولانا کی زبان سے سماعت فرمائیں:

''۳۳ء تھا اور اپنا قیام تھانہ بھون کئی ہفتے کی مدت کے لئے تھا کہ ایک مقیم خانقاہ مولوی سراج الحق مچھلی شہری استاذ مجیدیہ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد سے ملاقات ہوئی اور تعلقات بڑھے، یہ مخلص ہونے کے ساتھ ہی صاحب فہم ونظر بھی نظر آئے، جو ایک بہت بڑی بات ہے ایک روز انہوں نے باتوں میں کہا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہم اہل سنت

وجمہور امت کی اپنے انگریزی وعربی دونوں کی قابلیت کے حدود اربعہ سے خوب واقف ہیں، ان کی فرمائش پر دنگ ہی رہا اور جواب کچھ اس طرح کا دیا کہ آپ نے حسن ظن کی حد کر دی، کہاں میں اور کہاں اتنا بڑا کام! کچھ تھوڑی بہت مناسبت بھی تو ہو؟

لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے، اصرار کئے گئے آخر میں بولے ''نیا ترجمہ نہ سہی'' آخر محمد علی لاہوری کا ترجمہ تو موجود ہی ہے اسی کو زمین بنا کر اسی میں ترمیم وتصرف کر کے کام چلایئے۔

اب ان کے اخلاص کی کرامت سمجھئے یا جو کچھ، بات دل میں اتر سی گئی، اپنی کامل نااہلی کے احساس کے باوجود بھی آخر ہمت کر ہی ڈالی، اور اللہ کا نام لے کر جوں توں قلم ہاتھ میں لے لیا، کام شروع کر دینے اور تھوڑا بہت کر ڈالنے کے بعد ہی جا کر کام کی عظمت، اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوا، یہ اگر پہلے سے کہیں ہو گیا ہوتا تو ہرگز جرأت ہی نہ کرتا، ابتدائی خیال کہ دو ایک ڈکشنریوں کی مدد سے اور دو ایک انگریزی ترجمہ سامنے رکھ لینے سے کام چل جائے گا، اب بالکل طفلانہ نظر آنے لگا، ''سچ'' (صدق کا پرانا نام) عارضی طور پر بند کر کے اس کے کام سے چھٹی لے لی، اور کہنا چاہئے کہ سارا ہی وقت اس خدمت قرآنی کے نذر کر دیا، بعد عصر باہر بیٹھنے کا جو معمول تھا اسے روزانہ سے سہ روز کرنا پڑا، اس ساری کتر بیونت کے بعد بھی معلوم ہوا کہ وقت بالکل ناکافی ہے، اور تفسیری حاشیوں کی تیاری کے لئے تو کتابوں کے انبار کی حد ہی نہیں کہ ''عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا'' کا معاملہ، بیسیوں نہیں پچاسوں کیا سینکڑوں ہی جلدیں، کیسی کیسی ضخیم وگراں قیمت، لغت عربی انگریزی کی، جغرافیہ عرب کی، جغرافیہ شام وعراق ومصر کی، تاریخ اقوام عرب واسرائیل کی، تاریخ روم وایران کی، تاریخ مذاہب یہود ونصاریٰ کی، عقائد مجوس ومشرکین کی، تاریخ تمدن کی اور علاوہ تفسیر کے حدیث، فقہ، کلام وغیرہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں منگانا اور مطالعہ کرنا پڑ گئیں اور تفسیری حاشیے الگ رہے نفس ترجمہ کا کام کتنا دشوار نکلا، شروع شروع میں دلیل راہ محمد علی لاہوری کے

ترجمے کو بنانا سوچا تھا، آگے چل کر اسے بالکل ترک کردیا، پکتھال، سیل بیل وغیرہ کے مکمل اور لین وسید حسین بلگرامی کے نامکمل ترجموں سے یقیناً بڑی مدد ملی، پھر مشکلات ایسی ایسی پیش آئیں کہ کہنا چاہئے رورو دیا ہوں!

لین کے عربی انگریزی لغت نے بڑا سہارا دیا، سال ڈیڑھ سال جٹ کر کام کرنے کے بعد کہیں مسودہ اول تیار ہوا، پھر نظر ثانی کی، اس کے بعد منزل ٹائپ کرانے کی آئی، جو خود بڑی طویل اور پیچیدہ ثابت ہوئی ایک مخلص سید مرتضیٰ علی بی اے دہلوی تھے، پارہ اول کی سودوسو کاپیاں اپنے خرچ پر شملہ میں طبع کرادیں، انہیں درمیان میں ایک ایک سادہ ورق لگا کر لوگوں کے پاس صلاح ومشورہ رائے زنی کے لئے بھیجا، شکریہ وتحسین کے خط تو بہت سے آگئے، عملی کام کے خط بہت ہی کم آئے، ایسے ایک ہی صاحب کا نام اس وقت یاد آرہا ہے، یوپی کے رہنے والے لیاقت علی، ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی، بھوپال میں غالبا وزیر قانون وسیاست تھے اور انگریزی کے بڑے اچھے لکھنے والے، ان کا خط کام کا آیا، دو آدمی اسی دوران میں شدت سے یاد آتے رہے ایک مولانا حمید الدین فراہی کہ ان سے عربی عبارت کے کتنے نکتے حل ہوجاتے، دوسرے اپنے مولانا محمد علی (کامریڈ والے) کہ وہ ترجمہ کی انگریزی کو کچھ سے کچھ بنادیتے"۔

اس کے بعد اردو تفسیر کا حوصلہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا، یہ کام انگریزی تفسیر سے زیادہ وسیع اور تفصیلی تھا اس کے لئے بھی مولانا کمر بستہ ہوئے اور اس کو پایہ تکمیل تک پہونچانے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کردیں وہ لکھتے ہیں:

"انگریزی کام کرنے سے ہمت کھل گئی، اور ابھی اسی کی نظر ثانی پوری طرح نہیں ہوئی تھی کہ حوصلہ اسی طرز وانداز میں گواور زیادہ تفصیل ووسعت کے ساتھ اردو ترجمہ وتفسیر کا بھی ہوگیا، اور اس میں مدد سب سے بڑھ کر حضرت تھانویؒ کے ترجمہ وتفسیر "بیان القرآن" سے ملی، قرآن مجید کے اردو ترجمے اور بھی اچھے اچھے ہوچکے ہیں اور شاہ عبدالقادر دہلوی کا

ترجمہ تو کہنا چاہئے اپنی نظیر آپ تھا، لیکن جتنی رعایتیں حضرت تھانویؒ کے ترجمہ میں جمع ہوگئی ہیں وہ اور کہیں بھی نہ مل سکیں، میرا ترجمہ تو کہنا چاہئے کہ ۷۵ر فیصدی اسی ترجمہ اشرفیہ کی نقل ہے اور تفسیری حصہ میں بھی فقہیات میں نے بڑی حد تک اسی بیان القرآن سے لی ہے۔

حضرت مرحوم اس کام کے آغاز سے ۳، ۴ سال بعد تک حیات رہے اور برابر زبانی وتحریری ہر قسم کا مشورہ اس باب میں دیتے رہے بلکہ میں خود بھی ہمت کر کے ہدایتیں حاصل کرتا رہا۔

اردو تفسیر کی ضخامت گو انگریزی تفسیر سے کہیں بڑھ گئی اور لغت اور قدیم تفسیروں کی عبارتوں کی عبارتیں اس میں کثرت سے نقل ہوتی رہیں، پھر بھی کام اپنی ہی زبان میں کرتا رہا، اس لئے اس میں وقت بھی انگریزی کے مقابلہ میں کہیں کم لگا اور کوئی چار برس کی محنت میں اس کا مسودہ تیار ہوگیا، اور ۴۴ء میں پارہ بہ پارہ اسی تاج کمپنی لاہور کے پہونچنا شروع ہوگیا، لاہور یاد کر لیجئے کہ ۴۴ء میں ہندوستان کا حصہ اسی طرح تھا جس طرح آج دہلی اور لکھنو ہیں اور پاکستان کا خیال محض خواب ہی خواب تھا، شیخ صاحب نے وہی تعویق وتاخیر اس کی چھپائی میں بھی شروع کی لیکن خیر اتنی طویل مدت کی نوبت نہیں آئی، لشٹم پشٹم کام چند سال کے اندر ختم ہوگیا۔

میں نے تفسیر کی جو مستقل کتاب لکھی تھی اور اس کی چھپائی بالکل اسی طرح چاہتا تھا جیسے کسی کتاب کی ہوتی ہے اور اس کے نمونے بھی اردو میں کئی کئی موجود تھے، لیکن ناشر صاحب نے اسے مترجم مصحف کی صورت میں طبع کیا، یعنی اصل صفحہ پر متن وترجمہ اور تفسیری حصہ صرف بغلی حاشیہ بنا کر تجارتی مصلحتیں ناشر صاحب کو اس سے جو کچھ بھی مدنظر رہی ہوں، تصنیفی اعتبار سے اس میں متعدد قباحتیں پیدا ہوگئیں، ان میں سے ایک تو یہی کہ میں نے جو الگ الگ پیراگراف قائم کئے تھے وہ باقی نہ رہے اور پھر نوٹ کی پوری عبارت بلا وقف متن کے مسلسل ہوگئے اور ظاہر ہے کہ چھپ چکنے کے بعد اصلاح کی صورت ہی کیا باقی رہی۔

اپنی نااہلی، ناقابلیت اور اپنی علمی بے بساطی پر غور کرتا ہوں تو دو دو تفسیر کا کام بن پڑ جانے پر دنگ وحیران ہی رہ جاتا ہوں، ہزار سقم اور خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ تفسیریں وجود میں آئیں کیونکر! چاہئے تو یہ تھا ورق دو ورق کے بعد قلم جواب دے جاتا!

شان کریمی وکارسازی کے بس قربان جائیے کہ وہ چاہے تو کاہ سے کام کوہ کا، اور چیونٹی سے ہاتھی کا لے لے، اردو تفسیر نکلی ہی تھی کہ اس میں خامیاں، کوتاہیاں نمایاں پر طور پر نظر آنے اور کھٹکنے لگیں اور جی بے اختیار چاہنے لگا کہ جابجا ترقیم سے کام لیا جائے، ایک بڑی ضرورت بعض حالات خارجی نے پیدا کردی، ۴۰، ۴۲ء تک بنی اسرائیل دنیا کی ایک مغضوب ترین قوم تھی ہر ملک میں مقہور ورسوا، اس وقت قدیم تفسیروں کی طرح اپنی بھی تفسیر کی آیات متعلقہ میں ان کی اسی حالت کا اظہار ضروری تھا، ۴۵ء کے بعد سے صورت حال بدلنا شروع ہوئی، یہاں تک کہ ۴۸ء میں ان کی ایک مستقل حکومت قائم ہوگئی، اور حکومت روز بروز ترقی کرتی گئی، اب لازم ہوگیا کہ ان آیات کی تفسیر وتاویل پر دوبارہ نظر کی جائے اور حواشی متعلقہ پر حذف واضافہ، ترمیم وتصرف سے کام لیا جائے پھر خلائی پرواز وغیرہ میں جو حیرت انگیز ترقیاں ان چند برسوں کے اندر ہوئیں ان کا لحاظ بھی طبیعیات وتکوینیات والی آیتوں کی تفسیر میں کرنا ضروری تھا اور متعدد ترمیمات بھی ضروری نظر آئیں، نظر ثانی کا کام شروع کردیا اور ختم بھی ہوگیا''۔

اس کے علاوہ علمی کمالات اور دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی شان امتیازی کا تعارف کرانے اور عقیدہ وشریعت کے امتزاج وتوازن کا جائزہ لینے میں مولانا کا درجہ بہت بلند ہے، مولانا نے زبان وقلم کی طاقت کا استعمال کرنے اور اس کے ذریعہ مکارم اخلاق کا پیغام اہل دنیا کو پہونچانے میں بڑی احتیاط اور دقت نظر سے کام لیا ہے انہوں نے ''آپ بیتی'' میں زندگی بھر کے تجربات کا خلاصہ پیش کیا ہے، اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کی تربیت کس نہج پر کرنا چاہتے تھے اور کردارسازی کی مہم میں وہ کتنے صریح اور حقیقت پسند واقع ہوئے تھے، ملاحظہ کیجئے!

''طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جاسکتی ہے لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لئے کوئی حدونہایت نہیں، ہوس رانی جتنی بھی کیجئے گا طبیعت بجائے آسودہ ہونے کے حریص سے حریص تر ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی ضرروزیاں صریح واقع

ہوتا جائے گا لیکن طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا۔

نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ واقع ہوا ہے ہر نفس پرستی، ہوسنا کی اور اس سے پیدا ہونے والے ہر ضررو زیاں کی کوئی نہ کوئی خوبصورت سی تاویل و توجیہ ہر بار کرے گا اور ''ھل من مزید'' کا نعرہ لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ میں مبتلا اور دھوکے میں الجھائے رہے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں عقل کو رکھئے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہئے۔

ہیجان نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حب جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، شہوت جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہو جاتی ہے ایسے موقع پر دستگیری شریعت سے پائیے اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈھیے، نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجئے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹکا۔

غصہ اور شہوانیت، یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں، اور انسانیت کے دشمن قاتل! اگر ان پر نوعمری ہی میں قابو پالیا گیا، انہیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا، جب تو خیر ہے ورنہ اگر یہ سنپولیئے بڑھ کر اژدھے ہو گئے تو کوئی صورت ان کے عذاب سے نجات پانے کی نہ رہے گی، سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی انسان خمیازہ اٹھائے گا، پچھتائے گا، جھنجھلائے گا پھر بھی بس پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا ان کے پنجہ سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی۔

روپئے کی محبت بھی بڑی بری بلا ہے، سن کے ساتھ ساتھ یہ گھٹتی نہیں بلکہ حرص وہوس عموماً بڑھ ہی جاتی ہے، اور وجہ جواز میں ذہن نئی نئی ضرورتیں گڑھنا شروع کر دیتا ہے ضرورت اس وقت مال پر شروع ہی سے قابو پالینے اور اپنے کو قناعت کا خوگر بنالینے کی ہے، یہ جس نے نہ کیا اسے تلخیاں قدم قدم پر پیش آتی رہیں گی، لیکن روپیہ کی محبت اور شئی ہے اور اس کی قدر اور روپیہ کی محبت تو بے شک ہرگز نہ پیدا ہونے پائے، لیکن روپیہ کی قدر ضرور ہو، یہ نہ ہو تو دوسرا مرض اسراف کا پیدا ہو کر رہے گا، بخل اور اسراف دونوں مرض ایک ہی درجہ

کے ہیں اور دونوں بڑے سخت، ان کے حملے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی واحد یہ صورت ہے کہ قلب کو ایک طرف حب مال سے خالی رکھا جائے اور دوسری طرف روپیہ کی ناقدری سے ، دل کو ریا اور نمائش سے خالی اور اخلاص سے لبریز رکھنا بھی کوئی آسان و معمولی چیز نہیں، بڑی ریاضت اور بڑے مجاہدوں کے بعد ہی یہ دولت ہاتھ آسکتی ہے اور پھر بھی ہر وقت ڈگمگا جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے، "ومایلقاھا الا ذوحظ عظیم" ایک بڑا دخل اس میں صدق دل سے دعا مانگنے کا ہے اور اسباب وذرائع شہرت سے اپنے کو دور رکھنے کا ہے، نفس عاشق ہے جاہ کا، اور انسان ایک حد تک خوشامد پسند طبعا ہوتا ہے راہ اخلاص کا سب سے بڑا راہزن، مداحوں، معتقدوں و مریدوں کا گروہ ہوتا ہے، ہر وقت کی داد و تحسین رضا جوئی حق کا گلا گھونٹ دیتی ہے تفسیر قرآن تک کے بظاہر سو فیصدی خالص دینی کام کو جب سوچتا ہوں اور اپنے اوپر جرح کرتا ہوں کہ اگر داد و تحسین خلق، مسرت نفس اور مالی منفعت وغیرہ سارے خارجی خیالات کو منتزع کرلیا جائے، جب بھی یہی اہتمام وانہماک کام کے لئے باقی رہے گا تو ضمیر کچھ کانپ سا اٹھتا ہے۔

علم بہ معنی لکھائی پڑھائی کتابوں کی ورق گردانی کے شوق کا مرض بچپن سے رہا ہے، اب بھی طالب علم ہی ہوں ہر وقت اپنے گرد ایک کتب خانہ چاہتا ہوں، بغیر کتابوں کے وقت کا ٹنا دشوار ہوجاتا ہے، بارہا شوق مطالعہ کے آگے دوسرے طبعی جسمانی شوقوں کو مغلوب کر چکا ہوں، لیکن پھر بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس سے ہوتا کیا ہے اور اس سے حاصل کیا، جب تک یہ دھن تمام رضائے حق کی خاطر نہ ہو، دنیا میں بالفرض اردو کا نامی مصنف اور گرامی اہل قلم کہہ کر پکارا بھی گیا اور حشر میں القاب کیا نفع پہونچائیں گے اور حیات ابدی کے حصول میں یہ کتنا کام آئیں گے"۔

مولانا کی زندگی کے اس پہلو کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنی کتاب "پرانے چراغ" میں اس طرح واضح فرمایا ہے۔

’’مولانا کی خصوصیات وکمالات میں سب سے بڑا جوہر ان کی اسلامی حمیت تھی، ذات نبوی، اسلام، شریعت اسلامی کے لئے کوئی توہین آمیز مضمون، رسالہ یا کتاب یا فلم یورپ وایشیاء میں کہیں نکلتی یا کوئی گستاخ وبےادب کوئی تصویر شائع کردیتا تو سب سے پہلے مولانا ’’صدق‘‘ میں اس کا نوٹس لیتے، اس وقت ان کا خامۂ گوہر بار شمشیر جوہر دار بن جاتا اور اس کا سلسلہ جاری رکھتے، یہاں تک کہ خود ناشر کی طرف سے معذرت یا تلافی کی کوشش ہوتی یا اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں عمومی احتجاج ہوتا، اس بارے میں ان کی عقابی نگاہ سے کم ہی کوئی چیز پوشیدہ رہ پائی، اسی دینی حمیت نے ان کو انکار حدیث کے فتنہ کے موقع پر نیاز فتحپوری اور خدا اور رسول اور مذہب کے خلاف دریدہ ذہنی سے بیتاب ہوکر جوش ملیح آبدی اور یگانہ چنگیزی کے مقابلہ میں صف آرا کردیا اور انہوں نے ’’صدق‘‘ کو عرصہ تک ان کی تردید اور ان کے خلاف مضامین کی اشاعت کے لئے وقف کردیا، وہ چونکہ رسمی واصطلاحی طور سے کسی مدرسہ کے عالم ومدرس نہ تھے، بلکہ اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ، صاحب طرز ادیب وانشاء پرداز، فلسفہ ونفسیات کے فاضل اور مغرب اور اہل مغرب سے (مذہب کا مذاق اڑانے والوں سے زیادہ) واقف تھے، اس لئے ان کی تحریروں کو ’’ملائے مذہبی‘‘ کا طعنہ دے کر یا ’’شعر من بمدرسہ کے برد‘‘؟ کا فقرہ چست کر کے ٹالا نہیں جاسکتا تھا، اس بارے میں مولانا کی ذکاوت حس اتنی تیز تھی کہ کسی شاعر کے کلام یا کسی ادیب کے مضمون میں مذہب وشریعت کی توہین، یا طنز واستہزاء کا کوئی جملہ دیکھ لیتے تو فوراً اس کا نوٹس لیتے اور اس پر تنبیہ فرماتے، مولانا کی مغفرت ومقبولیت کے لئے شاید یہی دینی حمیت کافی ہوجائے جو ہزار عبادت وتسبیح سے زیادہ خدا کے یہاں وزن رکھتی ہے‘‘۔

امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور ملی خدمات

بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ایک روشن ضمیر، اور صاحب نسبت بزرگ ہونے کے ساتھ، صاحب بصیرت اور زمانے کے نبض شناس، عالم باعمل اور مستقبل بعید پر نظر رکھنے والے دانائے راز بھی تھے، انہوں نے اس ملک میں ندوۃ العلماء کی ضرورت کا احساس اس وقت کرلیا تھا، جب قائدین ملت بدلتے ہوئے حالات سے مصالحت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور اسلامی تہذیب کا احیاء ایک خواب بن کر رہ گیا تھا، اور امت مسلمہ کی وحدت ٹوٹ کر دو خانوں میں تقسیم ہوگئی تھی، اور دین و دنیا کی جامعیت کی بات کرنا ایک گناہ سمجھا جانے لگا تھا، اس وقت مولانا مونگیری نے یہ پیغام دیا تھا:

''بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات اور واقعات سے بھی باخبر ہو، اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بسر کرتی ہے اس کے اصول سلطنت کیا ہیں، اس کو سلطنت سے کس قسم کا تعلق ہے، مسلمانوں کی دنیوی حالت کیا ہے، ان کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں، سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جارہا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں، اور ان کو دنیا کے حال کی بالکل خبر نہیں، اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابل التفات ہے، بے شبہ جو علماء دنیا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اور ان کو

کثرت عبادت اور ذکر وفکر کی وجہ سے اپنے زن وفرزند کے ضروریات کی طرف بھی توجہ نہیں، اصحاب صفہؓ سے ان کو تشبیہ دی جاسکتی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کل صحابہ کرامؓ اصحاب صفہ نہیں تھے اور نہ ہوسکتے تھے، بے شبہ اصحاب صفہؓ کے مشابہ ایک گروہ ہمیشہ قوم میں موجود رہنا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ نہایت ضروری ہے کہ ایک جماعت کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت واطلاع انتظام وتدبیر، حزم ومصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، عمرو بن العاصؓ، خالد بن ولیدؓ، ابوعبیدہ امینؓ کے نقش قدم پر ہو"۔

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی بانی ندوۃ العلماء کے آخری فرزند ہیں، مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں چار سال تعلیم حاصل کی، اور بیعت کا تعلق حضرت مولانا مونگیری سے رکھا، اور مولانا شاہ قمرالدین صاحب پھلواری کے بعد صوبہ بہار واڑیسہ کے امیر شریعت مقرر ہوئے، اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے انھوں نے اپنے زمانہ امارت میں بڑی ذہانت جرأت اور دوراندیشی کے ساتھ مسلمانوں کے شرعی، عائلی قوانین کو نافذ کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور جب بھی حکومت وقت نے کسی شرعی مسئلے میں مداخلت کرنا چاہی تو امیر شریعت نے اس کو روکنے کا پورا انتظام کیا، متبنی بل، اور نفقۂ مطلقہ تاحیات، اور تدوین فقہ اسلامی خاص طور سے ان کے دور امارت کے اہم ترین کارناموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے عائلی شرعی قوانین میں مداخلت کا خطرہ روز بروز بڑھتا ہی جارہا تھا، اور اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ یکساں سول کوڈ نافذ کرکے شریعت کے قوانین کو ختم یا بے اثر کردیا جائے، اور مسلم عائلی قانون کی کوئی حیثیت باقی نہ رہ جائے، اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے جس علمی استعداد اور صلاحیت کی ضرورت تھی، وہ پوری طرح مولانا کے اندر موجود تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اس فتنہ کا ادراک کرلیا اور اس کو دفع کرنے کی تیاری میں دارالقضاء کا قیام اور اس کو وسیع پیمانے پر پورے ملک میں رائج کرنے کا فیصلہ کیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے امیر شریعت کے اس وصف کو بیان کرتے

ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''اس خطرہ کو سمجھنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہانت، وسیع مطالعہ، حقائق کے ادراک امیر شریعت کے فرائض کی وسعت ونزاکت کو سمجھنے، اکثریتی فرقہ کے رجحانات اور مجالس قانون ساز کے اختیارات کو وسعت کا ادراک کرنے اور اخبارات ومضامین، تقاریر وبیانات اور مجلسی گفتگو کے ذریعہ اس قریبی خطرہ کو محسوس کرنے کی صلاحیت کی ضرورت تھی، جو ہر قائد اور عالم کو آسانی سے میسر نہیں ہوتی، اس کے لئے ذہانت، مطالعہ کی وسعت، خطرہ کے ادراک کے ساتھ توفیق الٰہی کی بھی ضرورت ہے، اور بعد کے واقعات اور تجربہ نے ثابت کردیا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا سید منت اللہ صاحبؒ کو اس دولت سے نوازا تھا'' ''ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء''

امارت شرعیہ کے ابتدائی وبنیادی فرائض اور دائرہ عمل کے ساتھ جس میں مختلف مقامات پر قضاء شرعی کے مراکز (دارالقضاء) کا قیام، قضاۃ کا تقرر اور مسلمانوں کو سرکاری عدالتوں (Courts) کے بجائے شرعی عدالتوں کی طرف رجوع کی ترغیب اور ایسے فیصلوں کا صدور شامل ہے، جن کو سرکاری عدالتوں میں بھی چیلنج نہ کیا جاسکے، اور جن کے بارے میں مولانا کے دور امارت میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ سرکاری عدالتوں نے بھی عام طور پر ان فیصلوں کا احترام کیا اور بہت سے مواقع پر ان کو قائم رکھا، اسی طرح اصلاح معاشرہ کی تحریک جس کا مولانا کے دور امارت میں خاص طور پر کام ہوا۔

امیر شریعت ایک عظیم عالم، مدبر، فقیہ اور صاحب علم وبصیرت شخصیت کے مالک تھے، ان کی اصلاحی اور عوامی تربیت کا دائرہ بہت وسیع تھا، وہ تعلیم کے میدان بھی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، جامعہ رحمانی کی نشاۃ ثانیہ انھیں کا کارنامہ ہے، اس کی تنظیم جدید اور تعمیری وسعت اور تعلیمی معیار کی بلندی اور اس کو صحیح معنوں میں جامعہ بنانے میں مولانا کا زبردست حصہ ہے، وہ اپنی خاندانی بلند نسبت اور عالی ہمتی کی وجہ سے علماء کے طبقے میں

بہت زیادہ مقبول تھے، ملک کی عظیم اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم ترین رکن اور اپنی توجہات سے فائدہ پہونچاتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کے تعلقات بہت وسیع اور پائیدار تھے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ ان کا بے حد احترام فرماتے تھے، اور ان کی بے نفسی اور تواضع کا ان کے دل پر بہت گہرا اثر تھا، شاہ بانو کیس کے سلسلے میں امیر شریعت کے ساتھ ذمہ داران حکومت سے بار بار ملاقات اور اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہو، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے لکھا ہے کہ:

''راقم الحروف کو اپنے دور صدارت (مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت) میں (جو ۲۸/۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء سے شروع ہوا) مولانا کے ساتھ دورہ کرنے، جلسوں میں خطاب کرنے، اور اس وقت کے وزیر اعظم ہند آنجہانی راجیو جی سے بار بار ملنے ان سے اس مسئلہ پر تنہائی میں اور کبھی اس وقت کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور بعض دوسرے مشیران حکومت کی موجودگی میں گفتگو کرنے پھر ان کے بعد وی پی سنگھ جی (سابق وزیر اعظم ہند) اور دوسرے ذمہ داران حکومت سے بار بار ملنے کا موقع ملا، اس میں راقم کو مولانا کی بے نفسی، تواضع، حقیقت پسندی، اور مقصد سے لگن اور اس کی فکر کا اندازہ ہوا، اور اب یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس مسئلہ میں کامیابی (جس حد تک ہوئی) مولانا کی بے نفسی، اشتراک عمل کی صلاحیت اور صرف مقصد کے حصول سے دلچسپی کو بہت بڑا دخل ہے، انھوں نے کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ وہ ان گفتگوؤں میں نمایاں اور پیش پیش ہوں اور کامیابی کا سہرہ ان کے سر بندھے، اور وہ پریس میں یا پبلک میں زیادہ نمایاں مقام حاصل کریں''۔

حضرت امیر شریعت جب بھی ندوہ تشریف لاتے حضرت مولانا علی میاں صاحب ان کے لئے آنکھیں فرش راہ کرتے تھے، اور ان کے احترام میں وہ اپنے دوسرے کاموں کو مؤخر کر دیتے تھے، اور جب تک قیام رہتا حضرت مولانا ان کے ساتھ اپنا پورا وقت صرف

کرتے، اور ہر طرح کے آرام وراحت کا خیال فرماتے تھے، دوران قیام طلبہ کی بڑی تعداد میں امیر شریعت کو دیکھنے اوران سے مستفید ہونے کی کوشش کرتی تھی، اساتذہ کرام ان کی مجلسوں میں عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے اور مولانا کی بلند قامت شخصیت سے مل کر انبساط محسوس کرتے تھے، اور بعض اہم مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔

ہر سال جلسہ انتظامیہ کے موقع پر حضرت مولانا علی میاںؒ ان کو باصرار مدعو فرماتے تھے، اور اکثر جلسہ کی صدارت انھیں سے کراتے، جلسہ انتظامیہ میں بھی امیر شریعت اپنے تأثرات پیش فرماتے تھے، اور الگ سے بھی طلبہ کی انجمن میں تقریر فرمایا کرتے تھے، رفیق سفر کی حیثیت سے اکثر حضرت مولانا قاضی مجاہد اسلام صاحبؒ اور کبھی صاحبزادۂ گرامی حضرت مولانا ولی رحمانی صاحب ہوا کرتے تھے، ۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے تاریخی جشن تعلیمی میں حضرت امیر شریعت نے حضرت مولانا علی میاںؒ کی خصوصی درخواست پر شرکت فرمائی تھی، اور اپنی تشریف آوری سے جشن کی رونق اوراس کی افادیت میں اضافہ فرمایا تھا، اور اختتامی جلسہ کی صدارت فرماتے ہوئے تقریر فرمائی اوراس کی غیر معمولی اور حیرت انگیز کامیابی اوراس کے دوررس ہمہ گیر اور متوقع اثرات کا ذکر کیا، انھوں نے علمائے دین اور منتظمین مدارس کو بدلے ہوئے حالات میں زیادہ وسیع النظری اور زمانہ شناسی کی دعوت دی اور فرمایا کہ اگر موجودہ دور میں ہمیں کوئی نقش قائم کرنا ہے تو اس کے لئے اب ہمیں اپنے طرز فکر اور طرز عمل میں تبدیلی لانا ہوگی، انہوں نے ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا علی میاںؒ کو خاص طور سے اوران تمام حضرات کو جنہوں نے جشن کے انعقاد میں حصہ لیا مبارک باددی۔

امیر شریعت کو اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کی ہمہ جہت خدمت کے لئے منتخب فرمالیا تھا، وہ صرف امارت شرعیہ کی ذمہ داریوں کو درجۂ کمال کے ساتھ انجام نہیں دیتے تھے، بلکہ معاشرتی اور ملی حالات سے بھی پوری طرح تعلق رکھتے تھے، آزادی کے بعد ملک میں

فرقہ وارانہ فسادت کے تسلسل سے احساس کمتری کی جو فضا مسلم معاشرے میں پیدا کرنے اور شریعت کا پابند بنانے میں امیر شریعت کا کردار بہت بلند اور بے لوث ہے ان کی بلند قامت شخصیت کا لحاظ نہ صرف ریاستی حکومت کو بلکہ مرکزی حکومت کو بھی کرنا پڑتا تھا۔

شرعی قوانین کو نافذ کرنے اور مسلم معاشرہ کو اس کا پابند بنانے کے لئے امیر شریعت کی بے چینی اور مسلسل اسفار کے ذریعہ ان کی کوششوں کو کون نہیں جانتا، اسی کا نتیجہ تھا انھوں نے ملک کے ہر طبقہ کے علماء سے رابطہ قائم کر کے شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں گفتگو کی اور امت مسلمہ کے تمام نمائندوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور ان کے سامنے مسلم عائلی قوانین کے نفاذ کے لئے ایک متحدہ بورڈ کے تشکیل دینے کی تجویز پیش کی اور اس کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نام سے بمبئی کے اجلاس منعقدہ ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صدارت میں یہ بورڈ قائم ہوا، اور امیر شریعت متفقہ طور پر اس کے سکریٹری جنرل مقرر ہوئے، اور طے پایا کہ بورڈ کا ایک نمائندہ وفد حکومت وقت سے ملاقات کر کے اس کو بتادے کہ مسلم معاشرہ میں شرعی قوانین کو نافذ کرنے کے لئے بورڈ کا قیام عمل میں آیا ہے، اور اس امانت کو ادا کرنا ہمارا ملی اور مذہبی فریضہ ہے، اس لئے مسلمانوں کے شرعی قوانین میں مداخلت کا حق حکومت یا عوام کسی کو نہیں ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام امیر شریعت کا ایک عظیم کارنامہ ہے، ان کے اخلاص اور فکرمندی نے بورڈ کو زینت وھیبت عطا کی، اور وہ اپنے مدبرانہ عمل سے اس کی افادیت، وسعت وطاقت میں برابر اضافہ کرتے رہے، اور انھیں کی جدوجہد اور بے چینی کی وجہ سے مشہور زمانہ "شاہ بانو کیس" کے سلسلے میں سپریم کورٹ کا فیصلہ جو شرعی قانون کے منافی تھا پارلیمنٹ کے ذریعہ منسوخ کرانے اور نئے مسلم مطلقہ بل کو پاس کرانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے مضمون میں امیر شریعت کے اس

تاریخی کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مولانا کے دور امارت کا کارنامہ اور تاریخی کردار'' آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام ہے، جس کی ۲۷/۲۸/ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں تشکیل ہوئی اور جس کے صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند منتخب ہوئے، جو اس اہم ملی منصب وقیادت کے لئے موزوں ترین شخصیت تھے، اور جن کو زیادہ سے زیادہ اعتماد واحترام عام حاصل تھا، اور مسلمان فرقوں، جماعتوں اور تنظیموں کی اس میں ایسی نمائندگی ہوئی جو کم کسی نمائندہ ادارہ اور جماعت میں ہوتی ہے، پھر اس کے بعد سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی تنسیخ جو اس نے شاہ بانو کیس میں جو اس نے ۲۳/ اپریل ۱۹۸۵ء کو دیا تھا، ۵/ مئی ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ سے نئے مسلم مطلقہ بل کا متفقہ طور پر پاس ہونا اس کے ذریعہ مسلم مطلقہ قانون کے بارے میں اس قانون وتعامل کا باقی رہنا جو سپریم کورٹ کے فیصلہ سے پہلے رائج اور معمول بہ تھا، اکثریت کے رہنماؤں، فرقہ پرست جماعتوں، اور انگریزی، ہندی پریس کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان سپریم کورٹ کے فیصلہ کو بدلوانا چاہتے ہیں، اور اپنے قدیم شرعی قانون کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، تو انھوں نے اس کو قومی وقار کا مسئلہ بنالیا، اور مسلمانوں کے اس مطالبہ کے خلاف ایسے شدید ردعمل کا اظہار کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے منسوخ ہوجانے اور مسلمانوں کو اپنی شریعت پر عمل کرنے کی آزادی سے ملک پر کوئی بجلی گر جائے گی، یا کوئی بیرونی طاقت حملہ کرنے والی ہے، اس تحریک کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہوگیا، اور ایسا نظر آنے لگا کہ اس صورت حال میں تبدیلی ناممکن ہے، لیکن عاقلانہ اور متوازن قیادت اور مسلمانوں کے اتفاق رائے سے ۵/ مئی ۱۹۸۶ء کو مسلم مطلقہ بل کی پارلیمنٹ میں منظوری عمل میں آئی، آنجہانی وزیر اعظم ہند راجیو جی کے مسلم خاتون کے بارے میں اسلام کے منصفانہ اور فراخدلانہ قوانین اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں واضح بیانات، پھر خود مسلمانوں میں اصلاح معاشرہ کی ہندگیر تحریک اور تعمیری، اصلاحی وفکری وعملی جدوجہد اور اس

کے اثرات، پرسنل لاء بورڈ کے وہ عظیم الشان جلسے جو بمبئی، کلکتہ، بنگلور، رانچی، حیدرآباد اور کانپور میں ہوئے اور جن کی (حاضرین کی تعداد ان کی سنجیدگی اور مقصدیت کے غلبہ میں) ہندوستان کی قریبی تاریخ میں نظیر ملنی مشکل ہے، اس پورے سلسلہ کی کامیابی اور اس کے دور رس اثرات جو عرصہ سے کسی تحریک میں دیکھنے میں نہیں آئے تھے، مولانا کے تعمیری ذہن، حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر، دماغی توازن اور مقصد سے اتفاق رکھنے والے تمام عناصر سے مخلصانہ تعاون، ان کی قدر دانی، ان سے کام لینے کی صلاحیت اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان کے حسب مرتبہ سلوک و معاملہ کرنے کی فکری و مزاجی قابلیت کا بھی بڑا دخل ہے، اب یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ "آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ" جس طرح ملت اسلامیہ ہندیہ کا متفقہ پلیٹ فارم اور اجتماعی نمائندہ ہے ویسا ہندوستان میں کوئی دوسرا ملی و مذہبی بلکہ سیاسی پلیٹ فارم بھی نہیں ہے"۔

امیر شریعت کی یہ تمنا بھی اللہ تعالیٰ نے پوری کرادی کہ اسلامی اور شرعی قوانین کی تدوین اردو زبان میں ہوجائے تاکہ مسلم معاشرہ کو شرعی قوانین پر عمل کرنے کی ہر طرح آسانی حاصل ہو اور وہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے مختلف اداروں اور فقہی شخصیات سے بار بار ملنے اور فتویٰ معلوم کرنے کی زحمت سے بچ جائیں اور کم سے کم وقت میں وہ مسائل کو سمجھ لیں۔

اس کام کے لئے مولانا نے شرعی قانون کے ماہرین اور علماء کی ایک جماعت کو متعین فرمایا اور ان کی سرپرستی میں یہ کام شروع ہوا اور اس کا مسودہ آپ کی حیات ہی میں مکمل ہوگیا تھا، اس پر نظر ثانی کرنے اور انگریزی داں ماہرین قانون کی اس پر آخری نظر پڑنے کے بعد یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوکر تمام مراکز اور اداروں میں پہونچ چکی ہے۔

امیر شریعت کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کا عملی ذوق عطا فرمایا تھا، اور حالات سے آگہی، تاریخ عالم پر گہری نظر ملک کے قوانین اور آئین ہند کے جملہ دفعات سے پوری

واقفیت اور امت کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور اس کو صراط مستقیم سے ہٹانے کی سازشیں، یہ ساری باتیں آپ کے پیش نظر ہوا کرتی تھیں، آپ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے امین عام کی حیثیت سے اس کے نشیب وفراز اور اس کی ضرورت اور خدمات، نیز سول کوڈ پر آپ نے نہایت پر مغز مضامین تحریر فرمائے، ان میں مسلم پرسنل لاء اور یکساں سول کوڈ پر آپ کا رسالہ نہایت قیمتی اور معلومات افزا ہے، اور ان مسائل کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی ایک دستاویزی حیثیت ہے۔

اس رسالہ کے ناشر فرید بکڈ پو دہلی کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب ناصر خاں نے امیر شریعت کے بارے میں کتنی متوازن بات تحریر کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ (بانی وجنرل سیکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) ان صاحب بصیرت علماء کرام میں بڑا امتیاز مقام رکھتے ہیں، جنھوں نے دین وشریعت کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو بہت پہلے سمجھا، اور ان سازشوں کے خلاف سینہ سپر ہوئے، انھوں نے حکمت وتدبر، فراست وبصیرت سے کام لیتے ہوئے مسلم پرسنل لاء کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا، اور نہ صرف تحفظ شریعت کی تحریک کو پورے ملک میں پہونچایا، اور امت کے دلوں میں اتار دیا، بلکہ انھوں نے اتحاد ملت کا عملی سبق دیا، اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم پر ہر طبقہ اور فرقہ کے مسلمانوں کو جمع کر کے ایک خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔

ان کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے سازشوں کا سلسلہ جاری رہے گا، اور قانون شریعت کے بارے میں مسئلے پھر کھڑے کئے جائیں گے، ''مسلم پرسنل لاء'' میں ترمیم کی سازش رچی جائے گی، اس لئے انھوں نے علماء کرام اور رہنمایانِ ملت کو ساتھ لیکر نہ صرف آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قائم کیا، اسے مستحکم کیا، بلکہ اپنی تحریروں، رسالوں، مضامین اور کتاب کی شکل میں امت مسلمہ کو عملی اور فکری غذا بھی فراہم کی''۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے جانشیں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء نے امیر شریعت کی وفات کے موقع اپنے مضمون میں لکھا تھا:

''مولانا رحمانی کا شمار مسلمان ملی قائدین میں صرف دو تین چوٹی کے افراد میں ہوتا تھا، ہر اہم موقعہ پر ان کی دوراندیشی اور ان کے علم سے ملت کو مدد ملتی تھی، افسوس ہے کہ ملت اسلامیہ ہندیہ اپنے اس عظیم فرزند سے محروم ہوگئی اور اس کے لئے مولانا کی وفات موت العالم موت العالم کا صحیح مصداق بن گئی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملت کے اس عظیم خسارہ میں اس کی مدد فرمائے اور بدل عطا فرمائے اور مولانا مرحوم کو اپنے خاص قرب سے نوازے، مولانا کی وفات ۳؍رمضان ۱۴۱۱ھ مطابق ۳۰؍مارچ ۱۹۹۱ء کو صلاۃ تراویح ادا کرتے پیش آئی اس سے بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا جو مقام ہوگا اس کا اندازہ ہوتا ہے''۔

اخیر میں ایک حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو تفقہ فی الدین کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا اور ان کو اس کا بڑا حصہ اور اس کا ذوق عطا فرمایا تھا، اور وہ (من یرد الله به خیر یفقهه فی الدین) کا مصداق کامل تھے، اور اب مولانا کے خلف صالح جناب مولانا ولی رحمانی اپنے والد معظم کے نقش قدم پر چل کر ملت کی پاسبانی اور امت کی رہنمائی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ الحمد للہ ۲۹؍نومبر ۲۰۱۵ء کو ارباب حل وعقد کے جلسہ میں منعقدہ ۲۹؍نومبر ۲۰۱۵ء ارریہ بہار کے دار العلوم زیرومائل میں امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کے بعد امیر شریعت سابع کے لئے حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحب کا بالاتفاق انتخاب عمل میں آیا۔ تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور کاموں میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائیں اور ان کی کوششوں کو ''سعی مشکور'' کا درجہ مرحمت فرمائیں۔ وماذلك على الله بعزيز"

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ
کچھ یادیں، کچھ باتیں

۲۶ /ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۴/مئی ۱۹۹۷ء کی وہ تاریک رات عمر بھر یاد رہے گی، جب یہ خبر دل و دماغ پر بجلی بن کر گری کہ عالم اسلام آج ایک عالم دین اور داعی حق یعنی حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے محروم ہو گیا۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دینی اور دعوتی میدان میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی رفاقت میں مولانا مرحوم کے قابل فخر و تقلید اقدامات اور کارنامے مخفی نہیں ہیں، یہ دونوں بزرگ تقریباً ۶ دہائیوں ۱۹۳۸ء تا ۱۹۹۷ء) کو محیط لمبے عرصہ تک علمی، دعوتی اور فکری میدان میں ایک ساتھ دعوت اسلام کے میدان میں اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بڑے جوش و خروش ،عزم و ہمت اور استقامت کیساتھ کام کرتے رہے، مگر ان ۶/دہائیوں کے گزر جانے کے بعد مشیت ایزدی کے پیش نظر مولانا مرحوم اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، قدرت کو یہ مفارقت وجدائی منظور تھی، جو وقوع پذیر ہو کر رہی ،انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مرحوم برصغیر کے چوٹی کے علماء میں تھے اور دعوت و تبلیغ علم حدیث سے خصوصی اشتغال اور تالیف و تحقیق کے لحاظ سے جماعت علماء میں سرفہرست سمجھے جاتے تھے، ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ان کو بڑا طویل موقعہ نصیب ہوا، ان کی عمر ۹۴ برس ہوئی

اور بلاشبہ مولانا نے اپنی طویل عمر کو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے کام کرنے علم و دین کی خدمت کے میدان میں اور ہر سطح پر اسلامی بیداری کی لہر تیز کرنے، مردہ دلوں میں روح پھونکنے اور مسلمانوں کو ان کے منصب سے آگاہ کرنے میں گزاری، بایں ہمہ خداوند قدوس نے انھیں اس کی بھی توفیق عطا فرمائی کہ انھوں نے اپنے علمی وفکری کارناموں کو زندہ جاوید بنادیا، اور اپنی عظیم وقابل قدر تصنیفات وتالیفات کا ایک ذخیرہ تیار کر دیا، جن کی تعداد سو کے قریب ہے، گویا مولانا نے اپنی ان کتابوں سے ایک مستقل اسلامی ودینی کتب خانہ تیار کر دیا، مزید برآں انھوں نے مشہور علمی ودینی مجلّہ ماہنامہ ''الفرقان'' کو اپنے عنفوان شباب میں ہر قسم کی رکاوٹوں اور مشقتوں کے باوجود جاری کیا، اس کے ذریعہ انھوں نے اپنے دینی وعلمی افکار کو دنیا کے سامنے پیش کیا، اور جہاد بالقلم کا فریضہ پورے طور پر انجام دیا۔

مولانا مرحوم کو میں نے سب سے پہلے اس وقت دیکھا جب میں مدرسہ مفتاح العلوم میں طالب علم تھا، اور مولانا وہاں کسی موقعہ پر تشریف لائے تھے، یہ واقعہ اسی صدی عیسوی کی چوتھی دہائی کا ہے، مولانا مرحوم کے مدرسہ کے ذمہ داروں سے اچھے روابط تھے، خصوصاً محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی سے مولانا کے بڑے گہرے تعلقات تھے، پانچویں دہائی کے آغاز ہی میں، میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جب بغرض تعلیم آیا، اور تخصیص فی الادب العربی کے شعبہ میں داخلہ لیکر تعلیم شروع کی، تو میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا، میرا معمول تھا کہ میں جماعت تبلیغ کے ہر اجتماع میں پابندی سے شریک ہوتا تھا، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جامع مسجد میں ہر ہفتہ جمعرات کی شام کو منعقد ہوتا تھا، اس میں مولانا مرحوم کی موثر دینی تقریر ہوا کرتی تھی، اسی طرح اس اجتماع میں بھی شرکت کرتا تھا، جو شہر کی تبلیغی مرکز میں منعقد ہوتا تھا، مولانا مرحوم اپنے اہل خاندان کے ہمراہ وہیں قیام پذیر تھے، اور مرکز کی شمالی جانب حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی ؒ کا قیام تھا، میں روزانہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی مجلسوں سے حسب مقدرت استفادہ کرتا تھا، مولانا نعمانی مرحوم مولانا (رحمہ اللہ) کیساتھ تمام دعوتی

مشغولیات اور فکری سرگرمیوں میں برابر کے شریک و سہیم تھے،حتی کہ دسترخوان خوردونوش پر بھی دونوں بزرگوں کا ساتھ رہا کرتا تھا،اس زمانہ میں ندوہ کے طلبہ کی تعداد بہت کم تھی اوران کا وہاں آنا جانا بہت کم تھا،میں ان حضرات کی مجلسوں،باہمی گفتگو،دعوتی جلسوں اور دینی موقعوں کی تقریروں اور خاص طور سے مرکز کی مسجد میں ہونے والے درس قرآن کے پروگرام سے جو ہراتوار کو بعد نماز مغرب حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ دیا کرتے تھے،ان ایام کی حاضری کے دوران میں نے بخوبی محسوس کرلیا تھا کہ ان دونوں بزرگوں میں باہم کس قدر مخلصانہ سچی محبت ہے،اور ایک دوسرے پر کتنا زبردست اعتماد و بھروسہ ان کے دلوں میں موجود ہے؟ کیوں کہ کوئی بھی مسئلہ یا معاملہ ہو اس میں باہم مشورہ کے بعد ہی دونوں حضرات قطعی و حتمی فیصلہ کرتے تھے،اور ایسا تو بہت ہوا ہے کہ دونوں حضرات ایک ساتھ سفر پر جاتے اور ایک ہی جذبہ اور تڑپ کیساتھ یہ دونوں حضرات اپنی مسافرت کے ایام پورے کرتے اور تعاون علی البر والتقویٰ کی ایک ہی روح دونوں کے دلوں میں کارفرما ہوتی،یہ دینی اور دعوتی اسفار کبھی کبھار ہفتوں جاری رہتے تھے۔

جب ہمارے اس ملک میں سیکولر(غیر دینی) تعلیم اور سیکولر حکومت ہند کے طے کردہ نصاب تعلیم کو بلا استثناء ہر ایک کے لئے نافذ کرنے کا مسئلہ اٹھا تو اصحاب غیرت وحمیت ،خوددار و باکردار مسلمانوں کی نیند حرام ہوگئی،آرام وچین اڑ گیا،کیوں کہ یہ نصاب تعلیم عقیدۂ اسلام وایمان کے حق میں مہلک اور نقصان دہ مضامین وکتب پر مشتمل تھا اس وقت یہ دونوں مخلص رفیق حد سے زیادہ پریشان ومضطرب ہوئے اور قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی دعوت پر بصدق قلب لبیک کہا،قاضی صاحب نے اس نصاب تعلیم کے خلاف احتجاج کے طور پر ہندوستان کی تمام ذمہ دار اسلامی تحریکات تک اپنی آواز پہونچائی تھی، اوران کو جھنجھوڑا تھا،ان کا حکومت سے یہ مطالبہ تھا کہ مسلمان بچوں کے لئے خاص طور سے ایک ابتدائی نصاب تعلیم مرتب کرنے کی اجازت دی جائے،اور اسکو سرکاری سطح پر منظوری دی جائے،اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے ۱۹۶۰ء کے اواخر میں شہر بستی میں ایک عام تعلیمی کانفرس

منعقد کی، جس میں بڑے مسلم علماء لیڈران اور قائدین کو دعوت دی، اس میں یہ دونوں حضرات سرفہرست تھے، کانفرس میں باتفاق رائے یہ طے کیا گیا کہ پہلے صرف صوبائی سطح پر دینی تعلیمی کونسل کے سارے پروگرام، اور اس کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کی مکمل دیکھ ریکھ اور نگرانی ان دونوں بزرگوں کے ذریعہ انجام پائے، قاضی صاحب مرحوم انتہائی دلچسپی، دلجمعی، سنجیدگی اور خوش اسلوبی سے تحریک کی قیادت کے فرائض انجام دے رہے تھے، اس وقت سے آج تک یہ کونسل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی زیر صدارت اپنے کام انجام دے رہی ہے، فی الوقت اس کے جنرل سکریٹری جناب ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشیؒ ہیں۔(ڈاکٹر صاحب کا انتقال ۲۶؍اگست ۲۰۰۳ء مطابق ۲۷؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ میں ہوا)۔

چھٹی دہائی کے آغاز میں بہار میں جمشید پور اور اوڑیسا کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے، جن کی وجہ سے اس ملک میں مسلمانوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہوگیا، اور اس بات کے واضح اشارے مل چکے تھے کہ ہندوستانی معاشرہ اور سوسائٹی میں اسلام کے وجود کو ختم کرنے کی ذہنیت غلبہ حاصل کر چکی ہے، مسلمانوں کے خلاف غیظ وغضب کا اظہار انتہا پسند طبقے کی طرف سے ہو رہا تھا، اس نازک صورت حال میں یہ دونوں حضرات بڑے دل گرفتہ و پریشان ہوئے، اور یہ عزم مصمم کر لیا کہ وہ اس فاسد ذہنیت کو ختم کرنے اور دشمنی کو محبت سے بدلنے کے لئے ہر ممکن کوشش انجام دیں گے، چنانچہ ان دونوں حضرات نے فسادات سے متاثرہ علاقوں اور شہروں کا دورہ کیا اور دونوں فرقوں کے نمایاں افراد اور ذمہ داروں سے لمبی ملاقاتیں کیں، اور انھیں کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کی ایک نمائندہ تنظیم مجلس مشاورت قائم ہوئی، جس سے ہندوستان کی تمام جماعتوں اور پارٹیوں کی نمائندگی ہوئی، اس وقت اس کے صدر سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر سید محمود مرحوم تھے، مجلس کے ممبران نے اپنے علماء و لیڈران کی قیادت میں پورے ملک کا دورہ کیا، ان میں سرفہرست نام انھیں دونوں مخلص رفیقوں کا ہے، یہ سارے اسفار ان سفروں کے علاوہ ہیں، جو دعوت وتربیت

کی راہ میں ان دونوں حضرات نے ایک ساتھ کیئے، ان کے علاوہ رابطہ عالم اسلامی کے سالانہ اجلاس میں رکن کی حیثیت سے دیار مقدسہ کا سفر ہر سال یہ دونوں حضرات ساتھ کیا کرتے تھے، کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے رابطہ کی رکنیت کے لئے اپنے انہی رفیق مخلص کا نام تجویز کیا تھا، جس پر رابطہ نے بسر وچشم منظوری دی تھی، بلاشبہ یہ امت اسلامیہ ہندیہ کے لئے ایک شرف تھا کہ یہ دونوں حضرات اس کی ترجمانی کے فرائض رابطہ جیسی عالمی تنظیم میں انجام دیتے رہے، چنانچہ مولانا نعمانیؒ تاحیات رابطہ کے ممبر رہے۔

مولانا مرحوم نے ہندوستان میں خصوصاً اور عالم اسلام میں بالعموم مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور احساس کے نتیجہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان سے مولانا کی رفعت وعظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، بلکہ یہ کارنامے علماء اور داعیوں کے لئے ہر جگہ بہترین نمونہ ثابت ہوں گے، بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نے اس سلسلہ میں ایسے لائق تعریف وفخر متعدد کارنامے انجام دیئے ہیں جن سے مولانا کے اعلائے کلمۃ اللہ اور بلاخوف لومۃ لائم مکمل صراحت ووضاحت کے ساتھ اعلان حق کے جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا اظہار حق کے لئے دوستی، قرابت داری اور بلاوجہ کی ترجیح ومیلان سے بہت دور تھے اور اس سے نفرت کرتے تھے، اور یہی ان کا وہ امتیازی وصف ہے، جس سے وہ ہر حلقہ میں معروف ہوئے، اور عام وخاص سب نے آپ کی بلند کرداری اور عظمت کی شہادت دی، جہاں تک ان کے علمی رسوخ وعمق کی بات ہے تو اس کے لئے حضرت مولانا ندویؒ کی وہ تعزیتی تقریر کافی ہے جو مولانا نے ان کی وفات کے سانحہ کے بعد فرمائی تھی:

"مولانا نعمانی دیوبند کے چوٹی کے اساتذہ مولانا انور شاہ کشمیری جیسے حضرات سے تعلیم حاصل کی تھی، اس لئے ان کو علم میں بڑا رسوخ اور کمال تھا، ان کا یہ رسوخ آخر عمر تک باقی رہا، ہمارے مشاہدے اور علم میں یہ بات ہے کہ بعض حضرات کو ابتدائی دور میں رسوخ فی العلم حاصل ہوتا ہے، لیکن جوں جوں ان کی مشغولیتیں بڑھتی جاتی ہیں، زندگی کے

تقاضے ،راحت وآرام اورخانگی زندگی کے مطالبات بڑھتے جاتے ہیں،دینی وملی اورسیاسی جدوجہد میں حصہ لیتاپڑتا ہے،ان سے متاثر ہوکر بلکہ ان سے دب کر وہ ایسے ہوجاتے ہیں کہ صحیح عبارت کا پڑھنابھی ان کے لئے مشکل ہوجاتا ہے،لیکن مولانا کا رسوخ فی العلم آخرتک باقی رہا،جوبہت کمیاب بلکہ در یافت ہے،یہ نتیجہ ہے ان کے والدین کے حسن نیت،ان کے اساتذہ کرام کی للٰہیت وخلوص اورربانیت کا،پھرمولانا کی محنت وخلوص اور مسلسل علمی اشتغال کا،اسلئے کہ ان کا تعلق علم سے برابرقائم رہا،آخرتک علمی رسوخ وپختگی باقی رہی،اس کا میں عینی شاہد ہوں،اورقریب ترین رفیق کی حیثیت سے مجھے خوداس کا تجربہ ہے۔''

حضرت مولانا کواللہ تعالیٰ نے حمیت دینی اورغیرت اسلامی سے نوازاتھا،یہی وجہ تھی کہ اسلام اورمسلمانوں اورعالم اسلام کو درپیش مسائل ومشاکل سے وہ ہمہ دم بے چین ومضطرب رہاکرتے اوروہ جس مشکل کی زندگی گزاررہے ہیں،ان مشاکل ومصائب کوبڑی گہرائی سے محسوس کرکےان کا حل نکالتے اورتجویز کرتے تھے،ان کواس کی بڑی فکرتھی کہ ایسا طریقۂ عمل بروئے کارلایا جائے ،جس کواپناکران مشکلات کا سامنا کرنے سے بچا جاسکے اوران باطل یلغاروں سے نجات پائی جائے جومسلمانوں کی زندگی تنگ بنائے ہوتے ہیں،اس سلسلہ میں وہ باربارا پنے مخلص رفیق قدیم حضرت مولاناعلی میاں ندویؒ سے مشورہ کرتے،اظہارخیال کرتے تھے پھرآخروہ ایک طریقہ کارپرمتفق ہوجاتے اوراسےانجام دیتے اوراس طرح لوگوں کےسامنے وہ حل آجاتا جومولانانے حالات کا گہرائی سے جائزہ لے کر طے کیا ہوتا،حضرت مولاناندویؒ نے مولانا کےاس دوسرے وصف خاص ''حمیت اسلامی'' کی وضاحت اس تقریر میں اس طرح فرمائی ہے کہ''مولانا کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی حمیت دینی ہے،ایک ہے حمایت،دوسری چیز ہے حمیت،حمایت سے وہ اندرونی جذبہ اوردل سوزی پیش ہوتی اوروہ دل کی تپش اورذہن کی خلش اوروہ اضطراب وبے چینی پیش ہوتی،جوحمیت

میں ہوتی ہے حالانکہ حروف دونوں کے متقارب ہیں، اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیت دینی کا جوہر عطا فرمایا تھا وہ کم لوگوں کو ملتا ہے، ہوسکتا ہے دینداری، عبادت گزاری، تہجد اور شب بیداری اور ذکر و شغل میں دوسرے لوگ بڑھے ہوتے ہوں، لیکن دینی غیرت وحمیت کی دولت ونعمت سے مولانا مالا مال تھے، حمیت یہ ہے کہ دل میں آگ سی لگ جائے، سوزش پیدا ہوجاتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیا خطرات درپیش ہیں، مسلمانوں کی آبادی کا کیا حشر ہوگا، خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کا نجام کیا ہوگا۔ وہ کس روش پر چلے گا، تقسیم کے بعد مسلمانوں کے یہاں رہنے کے سلسلہ میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں بات واضح نہیں تھی کہ مسلمان اب کیسے رہیں گے، لیکن مولانا کا ذہن بہت واضح تھا اور ان کے سامنے کام کا پورا نقشہ بنا ہوا تھا، یہ اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیت جیسی نعمت سے نوازا تھا، یہ ایک نفسیاتی نکتہ اور تجربہ کی بات ہے کہ یہ حمیت بھی ہمیشہ یکساں باقی نہیں رہتی، اس لئے کہ علم جتنا بڑھتا اور معلومات وتجربات میں جتنی وسعت ہوتی جاتی ہے، حمیت میں اس اعتبار سے کمی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ احساس ہی ختم ہوجاتا ہے، جو لوگ عجائب گھر اور میوزیم دیکھتے رہتے ہیں، ان کے اندر استعجاب کا مادہ باقی نہیں رہتا، وہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سب چیزیں یکساں ہیں، لیکن میں عینی شاہد کی حیثیت سے گواہی دیتا ہوں کہ اپنے وسیع علم ومطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ مولانا کے اندر دینی حمیت وغیرت بھری ہوئی تھی"۔

مولانا مرحوم اسلامی علوم میں اپنے علوشان کے باوجود، دین کے فہم اور سنت کی اتباع میں مرتبۂ بلند اور دین ودنیا کی خوبیوں اور اچھائیوں کے مکمل توازن واعتدال کے ساتھ جامع ہونے کے باوجود انتہائی متواضع، سادہ اور پرہیزگار تھے، لوگوں سے ان کی عقلی حیثیت ودرجہ کے لحاظ سے گفتگو کرتے، ہر صاحب حق کو اس کا حق دیتے کہ وہ آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرے اور زندگی اور معاشرہ سے اپنا حق وصول کرے، مہمانوں کا اکرام واحترام، بچوں اور کمزوروں اور ناداروں سے شفقت وہمدردی کا معاملہ ان کا وصف خاص

تھا، تربیت کا ان کا اپنا ایک خاص انداز تھا، اپنے عزیز بچوں وشا گردوں کی اسی نہج پر تربیت کرتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اچھی و نیک خصلتوں پر پرورش پاتے اور دینی تعلیمات کے سلسلہ میں باغیرت وحمیت رہتے، اور زندگی کے تمام معاملات میں اللہ کے لئے مخلصانہ جذبہ رکھتے تھے خواہ اس کی وجہ سے ان کا دنیاوی نقصان ہی بظاہر کیوں نہ ہوتا ہو، مولانا نرم دل تھے، قرآن پڑھتے پڑھتے رک جاتے اور ایک ایک لفظ پر غور فرماتے تھے، راتوں میں اپنے رب کی عبادت کرتے اور روتے گڑگڑاتے، خلوتوں وتنہائیوں میں اپنے رب سے سرگوشی کرتے، دین کی ہر حال میں دعوت دیتے قولا بھی اور عملا بھی، ظاہراو باطنا ہر حال میں، مولانا نہایت منظّم ومرتب زندگی گزارتے تھے، انہوں نے اپنے کاموں کے اوقات نہایت باریک بینی سے تقسیم کرر کھے تھے۔

بڑھاپے اور دیگر امراض نے مولانا کو کمزور کر دیا تھا، اور اس کی وجہ سے زندگی کی سرگرمیوں میں کمی پیدا ہوگئی تھی، یہ سلسلہ ایک معتد بہ عرصہ تک قائم رہا، مگر پھر بھی حسب استطاعت مولانا تالیفی کام کرتے رہے اور اپنے مشن سے کبھی غافل نہ ہوئے، تا آنکہ زندگی کے آخری دنوں میں جو انھوں نے نرسنگ ہوم میں گزارے، اور ان پر بے ہوشی کی کیفیت طاری رہی، خداوند قدوس نے ان کو بہت سی دینی کتابوں کی تصنیف کی توفیق دی جن کی تعداد نوے سے متجاوز ہو کر سو تک پہونچتی ہے، ان میں سب سے اہم کتاب ''معارف الحدیث'' ہے جو آٹھ جلدوں میں ہے، اس میں زندگی ومعاشرہ سے متعلق احادیث کی دلنشیں پیرایہ میں تشریح کی گئی ہے، ان کی دوسری معروف ومشہور کتاب ''اسلام کیا ہے..........'' ہے، اس کتاب نے ہر طبقہ میں اسلام کا مکمل واضح اور اصل اسلوب میں تعارف کرایا ہے، چنانچہ اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور بار بار چھپی اور اس کے ۲۰؍ سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں، اسی طرح ان کی وقیع کتاب 'قرآن آپ سے کیا کہتا ہے' ہے، یہ کتاب ماہنامہ ''البعث الاسلامی'' میں قسط وار عربی ترجمہ کی شکل میں چھپ چکی ہے، راقم سطور نے اس کا ترجمہ ''القرآن یتحدث

الیکم ‘‘ کے نام سے کیا تھا، اور اسے مرتب ومنقح کرنے کے بعد مولانا مرحوم کے صاحبزادہ جناب مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی کے ذریعہ الحمد للہ اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔

مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے تصنیفات کا ایک وسیع ذخیرہ اور چار لائق فرزند چھوڑے ہیں۔

۱۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

۲۔ جناب حفیظ الرحمٰن نعمانی

۳۔ مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

۴۔ مولانا محمد حسان ندوی

نیز مولانا کی دو نیک صاحبزادیاں ہیں، دینی تعلیم سے آراستہ اور پوتوں اور قرابت داروں سے بھرا ایک آباد خاندان ہے۔

خداوند قدوس مولانا کو جنت الفردوس میں مقام کریم سے نوازے، اعزہ واقارب وپسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں، اور ان کے تیار کیے ہوئے راستے پر چلنے کی توفیق بخشیں۔

آسماں اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ
ایک تذکرہ

محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ کی ذات مبارک اس عصر میں روشنی کا ایک مینار تھی، لوگوں کو ان سے زندگی گذارنے کے تعلق سے قیمتی رہنمائی ملتی تھی، اس روشنی کے اثرات بہت دور تک پھیل چکے ہیں اور سنتوں کو زندہ کرنے اور ان پر عمل کرنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، اصلاح امت کا یہ طریقہ ہر طبقہ میں معروف ومقبول ہے، یہ ایک انوکھا تجربہ ہے جو حضرت ہردوئیؒ کے جذبۂ ایمانی اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے سچی محبت کا نتیجہ ہے۔

حضرت والا کی ذات گرامی اور ان کے کاموں سے متعلق ان کے فرمودات اور افادات کے بارے میں اہل علم کے قلم سے بڑی بڑی کتابیں نکلیں گی اور ان سے استفادہ کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہوگا، اور وہ اسلامی کتب خانے کے لئے ایک تاریخی دستاویز ثابت ہوں گی۔

وہ لمحہ کتنا سخت اور صبر آزما تھا جب حلیم نگر کے مدرسہ سید امیر علی شہید کے اجلاس عام کے دوران حضرت محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحقؒ کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی، پورے اجتماع پر ایک غم کی کیفیت طاری ہوگئی اور سب کی زبانوں پر انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد جاری ہوگیا، کتنی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور اس گوہر نایاب پر ہر فرد نے اپنے شدید صدمے کا اظہار کیا اور حضرت محی السنۃ کی اچانک اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوگیا اس کے احساس سے ہر شخص متاثر ہوکر رہا۔

یہ واقعہ بدھ کی رات ۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۸؍مئی ۲۰۰۵ء (یہ مدرسہ ضلع بارہ بنکی میں دار العلوم ندوۃ سے ملحق ہے اس کے ناظم مولانا محمد خالد ندوی ہیں) شام ۸ بجکر ۴۰ منٹ پر پیش آیا اور پورے ملک میں رنج وغم کی ایک لہر دوڑ گئی اور پیغام تعزیت کے ساتھ اہل تعلق جوق درجوق ہردوئی شہر کی طرف روانہ ہونے لگے، ہمارا قافلہ بھی نماز فجر کے فوراً بعد لکھنؤ سے روانہ ہوکر ہردوئی پہنچا، اس وقت تک انسانوں کا ایک سیلاب ہردوئی میں حضرت والا کی قیام گاہ کے اردگرد جمع ہو چکا تھا اور تقریباً ساڑھے آٹھ بجے صبح کو حضرتؒ کا جنازہ ان کی قیام گاہ سے عیدگاہ کی طرف روانہ ہوا جہاں نماز جنازہ کا پہلے سے اعلان تھا، نہایت مختصر مسافت کے باوجود تقریباً پونے دو گھنٹہ میں جنازہ عیدگاہ تک پہنچ سکا، اس دوران حضرت کے جانشیں جناب مولانا حکیم ڈاکٹر محمد کلیم اللہ صاحب جو حضرت والا کے خویش ہیں، وقتاً فوقتاً تقریر کرتے رہے اور لوگوں کو صبر کی تلقین کے ساتھ دنیا کی اس فانی زندگی کے موقف اور اس سے اہل ایمان کے تعلق کو بتاتے رہے، جنازہ کی نماز شروع ہونے تک لاکھوں آدمیوں کا مجمع عیدگاہ کے اردگرد جمع ہو چکا تھا، حضرت کے جانشین کے مشورہ سے جناب مولانا قاری امیر حسن صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب تھانوی اسکول کے آخری فرزند شمار ہوتے تھے اور اپنے مربی کے نقش قدم پر چل کر ان کے امتیازات کو باقی رکھنے والے تنہا مردمیداں تھے، حضرت تھانویؒ کی تربیت کا پورا انداز آپ کی تربیت کے اندر جلوہ گر تھا، احیائے سنت اور اتباع سنت پر توجہ مرکوز تھی، جو لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں تھے انہوں نے اخلاص عمل کے ساتھ اتباع سنت کو اپنا شعار بنایا اور جو لوگ مجاز بیعت تھے انہوں نے احتیاط وتقویٰ، احیائے سنت اور اطاعت کی زندگی کا نمونہ پیش کیا اور اپنے مرشد کے نقش قدم پر چلنے کو اپنی زندگی کی کامیابی کا راز تصور کیا۔

حضرتؒ کی دینی تربیت کا انداز صاف ستھرا اور مؤثر تھا، نہایت اختصار کے ساتھ

دینی حقائق کو بیان کرتے تھے اور نہایت آسان طریقہ سے لوگوں کو دین کی بنیادی باتیں بتا کر ان پر عمل کرنے کا آسان نسخہ تجویز فرماتے تھے، مثال کے طور پر گھریلو اصلاح کا طریقہ اس طرح بیان فرماتے تھے:

(۱) گھر کے سب افراد کو جمع کر کے ایک سنت مؤکدہ یا غیر مؤکدہ سنائیں مثلاً وضو کی سنت شروع میں بسم اللہ شریف پڑھنا۔

(۲) سنت کا ایک فائدہ بتلانا مثلاً رزق میں برکت ہوتی ہے۔

(۳) ایک گناہ کبیرہ بتلانا مثلاً کسی کو ذلیل وحقیر سمجھنا۔

(۴) گناہ کا ایک نقصان بتلانا جو دنیا میں سامنے آتا ہے مثلاً رزق کی تنگی۔

(۵) کم از کم سات دفعہ کلمہ طیبہ، تین دفعہ درود شریف، گیارہ گیارہ دفعہ أستغفر الله، سبحان الله، الحمدلله اور الله اکبر پڑھنا۔

(۶) نیک اور صالح حضرات کے پاس جس قدر وقت ملے جا کر بیٹھنا، اگر کوئی شخص نہ مل سکے تو صلحاء واکابر کے ملفوظات کا مطالعہ کرنا۔

اور اس نسخہ کی ہدایات اس طرح بیان فرماتے تھے:

(۱) ایک تا چار کا علم کسی عالم یا مسجد کے امام صاحب سے حاصل کرنا۔

(۲) جو سبق دیا جائے اس کو کاپی پر لکھنا۔

(۳) دوسرے دن سننا، اگر سب یاد نکلے تو آگے سبق دینا، ورنہ وہی سبق پھر دہرانا۔

(۴) جنہوں نے یاد کرلیا ہے ان کے حوالے ان کو کرنا جو یاد نہیں کر سکے ہیں۔

مسجد والوں کی اصلاح

(۱) مسجد کے متولی صاحب یا منتظم صاحب یا امام صاحب سے گزارش کرنا کہ گھریلو اصلاح کے معمول کو وہ بھی اپنے یہاں جاری کریں، اور ان ہدایات کو جو اوپر مذکور ہوئیں یہاں بھی ان پر عمل کیا جائے،

نمازی لوگوں کو ہدایت کی جائے کہ ان باتوں کو وہ اپنے بیوی بچوں کو جا کر پہنچائیں اور دوسرے دن نمازیوں سے پوچھا بھی جائے کہ گھروں میں یہ بات پہنچائی گئی یا نہیں، اگر بھول گئے ہوں تو آج پہنچائیں۔

مدرسہ کے طلبہ کی اصلاح

(۱) ناظم مدرسہ کا منتظمین یا اساتذہ میں سے کسی سے کہنا کہ یہی معمول وہ اپنے درجے میں جاری رکھیں۔

(۲) طلبہ کو ہدایت کی جائے کہ یہ باتیں اپنے گھروں میں سنائیں اور دوسرے دن ان سے پوچھا بھی جائے کہ ان پر عمل کیا یا نہیں؟

دارالاقامہ کے طلبہ اپنے اپنے حلقوں میں باری باری سے سنائیں۔

عام ہدایات

(۱) متفرق اوقات میں جن مقامات پر لوگ جمع ہوتے ہیں (دکانوں اور ہوٹلوں میں) ان مقامات پر بھی اس کا سلسلہ شروع کیا جائے تو بہت جلد امت کی حالت درست ہونے کی امید ہے۔

(۲) مدرسہ و مسجد کے حضرات و عامۃ المسلمین کو آپس میں دینی دوست بنانے کا فائدہ بھی بتلاتے رہنا کہ میدان حشر میں جب کوئی سایہ نہ ہوگا تو ایسے لوگوں کو عرش کے سایہ میں جگہ ملے گی جیسا کہ حدیث میں ہے ''رجلان تحابا في الله، اجتمعا عليه وتفرقا عليه'' (متفق علیہ)(۱)

اب چلئے مسلمان کی شب و روز کی زندگی کے بارے میں ایک مختصر اور نہایت آسان طریقہ معلوم کرنے کی طرف، جسے ہر مسلمان اپنا کر اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کرسکتا ہے، یہ نسخہ حضرت تھانویؒ کے ارشادات سے ماخوذ ہے جو ذیل میں نمبر وار درج ہے:۔

---

(۱) مشکاۃ شریف جلد ۱/ ۶۸

(۱) ضرورت کے موافق دین کا علم حاصل کرے، خواہ کتاب پڑھ کر یا عالموں سے پوچھ پاچھ کر۔

(۲) سب گناہوں سے بچے۔

(۳) اگر کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ کرے۔

(۴) کسی کا حق نہ رکھے، کسی کو زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ دے، کسی کی برائی نہ کرے۔

(۵) مال کی محبت اور نام کی خواہش نہ رکھے، نہ بہت اچھے کھانے کپڑے کی فکر میں رہے۔

(۶) اگر اس کی خطا پر کوئی ٹوکے، تو اپنی بات نہ بنائے فوراً اقرار اور توبہ کرے۔

(۷) بدون سخت ضرورت کے سفر نہ کرے، سفر میں بہت سی باتیں بے احتیاطی کی ہوتی ہیں، بہت سے نیک کام چھوٹ جاتے ہیں، وظیفوں میں خلل پڑتا ہے، وقت پر کوئی کام نہیں ہوتا۔

(۸) نہ بہت ہنسے، نہ بہت بولے، خاص کر نامحرم سے بے تکلفی کی باتیں نہ کرے۔

(۹) کسی سے جھگڑا، تکرار نہ کرے۔

(۱۰) شرع کا ہر وقت خیال رکھے۔

(۱۱) عبادت میں سستی نہ کرے۔

(۱۲) زیادہ وقت تنہائی میں نہ رہے۔

(۱۳) اگر اوروں سے ملنا جلنا پڑے تو سب سے عاجز ہو کر رہے (تواضع کے ساتھ رہے)، سب کی خدمت کرے، بڑائی نہ جتلائے۔

(۱۴) امیروں سے تو بہت کم ہی ملے۔

(۱۵) بددین آدمی سے دور بھاگے۔

(۱۶) دوسروں کے عیب نہ ڈھونڈھے، کسی پر بدگمانی نہ کرے، اپنے عیبوں کو دیکھا کرے اور ان کی درستی کیا کرے۔

(۱۷) نماز کو اچھی طرح اچھے وقت دل سے پابندی کے ساتھ ادا کرنے کا بہت خیال رکھے۔

(۱۸) دل یا زبان سے ہر وقت اللہ کی یاد میں رہے، کسی وقت غافل نہ رہے۔

(۱۹) اگر اللہ کا نام لینے میں مزہ آئے، دل خوش ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے۔

(۲۰) بات نرمی سے کرے۔

(۲۱) سب کاموں کے لئے وقت مقرر کرے اور پابندی سے اس کو نبھائے۔

(۲۲) جو کچھ رنج وغم، نقصان پیش آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانے، پریشان نہ ہو اور یوں سمجھے کہ اس میں مجھ کو ثواب ملے گا۔

(۲۳) ہر وقت دل میں دنیا کا حساب وکتاب اور دنیا کے کاموں کا ذکر مذکور نہ رکھے بلکہ خیال بھی اللہ ہی کا رکھے۔

(۲۴) کھانے پینے میں اتنی کمی نہ کرے کہ کمزور یا بیمار ہو جائے نہ اتنی زیادہ کرے کہ عبادت میں سستی ہونے لگے۔

(۲۵) جہاں تک ہو سکے دوسروں کو فائدہ پہنچائے خواہ دنیا کا ہو یا دین کا۔

(۲۶) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے طمع نہ کرے نہ کسی طرف خیال دوڑائے کہ فلانی جگہ سے ہم کو یہ فائدہ ہو جائے۔

(۲۷) اللہ کی تلاش میں بے چین رہے۔

(۲۸) نعمت تھوڑی ہو یا بہت اس پر شکر بجالائے اور فقر وفاقہ سے تنگ دل نہ ہو۔

(۲۹) جو ان کی حکومت میں ہیں ان کی خطا وقصور سے درگذر کرے۔

(۳۰) کسی کا عیب معلوم ہو جائے تو اس کو چھپائے البتہ اگر کوئی شخص کسی کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور تم کو معلوم ہو جائے تو اس شخص سے کہہ دو۔

(۳۱) مہمانوں اور مسافروں اور غریبوں اور عالموں اور درویشوں کی خدمت کرے۔

(۳۲) نیک صحبت اختیار کرے۔

(۳۳) ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرے۔

(۳۴) موت کو یاد رکھے۔

(۳۵) کسی وقت بیٹھ کر روز کے روز اپنے دن بھر کے کاموں کو سوچا کرے، جو نیکی یاد آئے اس پر شکر کرے، گناہ پر توبہ کرے۔

(۳۶) جھوٹ ہر گز نہ بولے۔

(۳۷) جو محفل خلاف شرع ہو وہاں ہر گز نہ جائے۔

(۳۸) شرم وحیا اور بردباری سے رہے۔

(۳۹) ان باتوں پر مغرور نہ ہو کہ میرے اندر ایسی خوبیاں ہیں۔

(۴۰) اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ نیک راہ پر قائم رکھیں۔(۱)

ان دونوں اقتباسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرتؒ کس قدر مسلمانوں کی زندگی کو شفافیت کے آئینہ میں اتارنا چاہتے تھے اور شرک وبدعت سے دور رکھنے اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے سچی محبت رکھنے اور ان کی اطاعت کا ہر وقت خیال کرنے کی فکر کتنی شدت سے ان کو دامن گیر تھی، وہ زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح سنت کے آئینہ میں کرنے کی پوری تاکید فرماتے تھے اور ایک مسلمان کی زندگی کو ہر اعتبار سے ممتاز اور اس کو دوسروں کے لئے نمونہ بنانا چاہتے تھے، اللہ کے رسولؐ کے بارے میں قرآن کریم میں آیا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیراً'' اس ہدایت کے بموجب اسوۂ حسنہ کو سنتوں کے ذریعہ عوام وخواص سب کی زندگی میں نافذ کرنے اور اس کی روشنی میں چلنے کی پوری طرح عملی تاکید فرماتے تھے، اور غفلت سے دوچار تمام سنتوں کو زندہ کرنے اور ان پر سچائی کے ساتھ عمل کرنے کی نصیحت کرنا آپ کا شب وروز کا معمول تھا اور اس معمول کی نہایت پابندی کے ساتھ ادائیگی میں اپنی جملہ توانیاں صرف فرماتے تھے، ایک انسان کا دوسرے انسان پر کیا

---

(۱) بہشتی زیور حصہ ۷ ص: ۲۵

حق ہے اور ان کے آپس کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے اور تمام انسانوں کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی کیا نوعیت ہونا چاہئے ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہدایات وارشادات کا ایک قیمتی ذخیرہ امت کو عطا فرمادیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دائی روشنی کا ایک مینار قائم کر دیا اور گم کردہ راہوں اور بھٹکے ہوئے مسافروں کے لئے صحیح رہنمائی کا مستند ذریعہ فراہم کر دیا۔

چونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی عبادت کا حکم دینے کا ساتھ والدین کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے حقوق کے ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے اس لئے حضرتؒ نے والدین کے چودہ حقوق بیان فرمائے ہیں جن میں سات حقوق ان کی زندگی میں ادا کرنے کی تاکید ہے اور سات حقوق ان کے انتقال کے بعد ادا کرنے کی رہنمائی فرمائی گئی ہے۔ زندگی میں جن سات حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان میں (۱) عظمت یعنی ان کا اکرام واحترام کرنا (۲) محبت یعنی ان سے الفت وانسیت رکھنا (۳) اطاعت یعنی ان کی فرمانبرداری کرنا (۴) خدمت یعنی ان کا کام کرنا۔ ان کے کام آنا (۵) فکر راحت یعنی ان کو آرام پہنچانے کی فکر کرنا (۶) رفع حاجت یعنی ان کی ضروریات پوری کرنا (۷) گاہ گاہ ان کی ملاقات وزیارت۔

اور انتقال کے بعد جن سات حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان میں (۱) دعائے مغفرت یعنی ان کے لئے اللہ سے معافی، رحمت کی درخواست کرنا (۲) ایصال ثواب اطاعت یعنی ان کو ایصال ثواب کرنا (۳) اکرام اعزا واحباب واہل قرابت یعنی ان کے رشتہ دار، دوست اور متعلقین کی عزت کرنا (۴) اعانت اعزا واحباب واہل قرابت یعنی ان کے رشتہ دار، دوست اور متعلقین کی حسب طاقت مدد کرنا (۵) ادائے دَین وامانت یعنی ان کی امانت وقرض ادا کرنا (۶) تنفیذ جائز وصیت یعنی ان کی جائز وصیت پر عمل کرنا (۷) گاہ گاہ ان کی قبر کی زیارت کرنا۔

اسی طرح عام معمول کی چیزوں میں اتباع سنت کا اہتمام کرنے کی ہدایت نہایت

تاکید کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، جن چیزوں میں عام طور سے لوگوں کے دلوں میں کسی سنت کا خیال بھی نہیں آتا اور اسلامی آداب کے برتنے سے اکثر غفلت پائی جاتی ہے۔ حضرت مولانا بڑی اہمیت کے ساتھ ان معمولی کاموں میں سنت پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے تھے مثلاً پانی پینے کی سنتیں، کھانے کی سنتیں، گفتگو کرنے اور اظہار تعلق کی سنتیں، غرض یہ کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضور اکرم ﷺ کا طریقہ اور سنت موجود نہ ہو، گویا پوری اسلامی زندگی سنتوں پر عمل کرنے کا نام ہے۔

جب ہمیں پیاس لگتی ہے اور پانی سے سیرابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو نہایت آسانی کے ساتھ کمال بے خیالی کے انداز میں بے تکلف پانی کا برتن ہاتھ میں لے کر پانی پی لیتے ہیں، شروع میں بسم اللہ پڑھنا اور آخر میں الحمد للہ کہنا بھی اکثر بھول جاتے ہیں، اور یہ سوچنے کی نوبت نہیں آتی کہ یہ پانی کہاں سے آیا، کسی نے اس کو ہماری سیرابی کے لئے پیدا کیا، اور اگر پانی کا چشمہ سوکھ جائے تو کون سی طاقت ہے جو دوبارہ اس کو جاری کر دے اور کس نے پینے کا پانی میٹھا بنایا، اور سمندر کے پانی کو نمکین اور کھاری بنا کر پیدا کیا، یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دینا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، ایسی عظیم نعمت کے نہایت آسانی کے ساتھ حاصل ہونے کے بعد اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے، اب حضرت والا کی پینے کی سنتوں پر عمل کرنے کی ہدایات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) داہنے ہاتھ سے پینے کا برتن پکڑنا۔

(۲) بیٹھ کر پینا، کھڑے ہو کر پینا منع ہے۔

(۳) بسم اللہ کہہ کر پینا۔

(۴) تین سانس میں پینا اور سانس لیتے وقت برتن کو منھ سے الگ کرنا۔

(۵) برتن کے ٹوٹے ہوئے کنارے کی طرف نہ پینا۔

(۶) مشک سے منھ لگا کر نہ پینا یا کوئی بھی ایسا برتن جس سے دفعتاً پانی زیادہ آجانے

کا احتمال ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ اس میں کوئی سانپ بچھو آجائے۔

(۷) صرف پانی پینے کی یہ دعا پڑھنا بھی مسنون ہے: الحمد لله الذی سقانا عذبافراتابرحمته ماء ا ، ولم يجعله بذنوبنا ملحا أجاجا (روح المعانی)

(۸) پانی اگر دوسروں کو دینا ہو تو پہلے داہنے طرف والوں کو دیں پھر اسی ترتیب سے دور ختم ہو، اسی طرح چائے یا شربت بھی پیش کریں۔

(۹) دودھ پینے کے بعد یہ دعا پڑھیں: اللّٰهم بارك لنا فيه وزدنامنه۔

(۱۰) پلانے والے کو اخیر میں پینا۔

(۱۱) آب زمزم کھڑے ہو کر پینا۔

(۱۲) وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا، اس میں بیماریوں کے لئے شفا ہے، علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ میں نے بارہا اپنی بیماریوں میں اس کا تجربہ کیا ہے اور شفا پائی ہے۔

نماز کے بارے میں عام مسلمانوں کے اندر جو روایتی انداز قائم ہے اور عبادت کا استحضار کئے بغیر ادا کرنے کا عام رواج ہے اس کو محسوس فرماتے ہوئے حضرت ہردوئیؒ نے چند ضروری ہدایات تحریر فرمائی ہیں تاکہ نماز کے آداب، وضو کی سنتیں، عبادت کا استحضار، نماز کی سنتیں وغیرہ نہایت مختصر طریقے سے عام مسلمانوں کے پیش نظر رہیں، اس سلسلہ میں ضروری پہلوؤں کی طرف جو رہنمائی فرمائی گئی ہے اس کو ذیل میں درج کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

وضو کے فرائض

وضو میں فقط چار فرض ہیں:

(۱) ایک مرتبہ سارا منہ پیشانی کے بالوں سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک دھونا۔

(۲) ایک ایک مرتبہ کہنیوں سمیت دونوں ہاتھ دھونا۔

(۳) ایک بار چوتھائی سر کا مسح کرنا۔

(۴) (دو پاؤں) ایک ایک مرتبہ ٹخنوں سمیت دھونا۔

ان میں سے اگر ایک چیز بھی چھوٹ گئی یا کوئی جگہ بال برابر خشک رہ گئی تو وضو نہ ہوگا۔

وضو کی سنتیں

وضو میں بارہ سنتیں اور پانچ مستحبات ہیں

(۱) وضو کی نیت کرنا مثلاً یہ کہ میں نماز کے مباح ہونے کے لئے وضو کرتا ہوں۔

(۲) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر وضوء کرنا، بعض روایات میں وضو کی بسم اللہ اس طرح آئی ہے: بسم اللہ العظیم، الحمد للہ علی دین الاسلام۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو کہ عظمتوں والا ہے، اللہ کی تعریف ہے میں دین اسلام پر ہوں۔

(۳) دونوں ہاتھوں کو پہنچوں تک تین بار دھونا۔

(۴) مسواک کرنا، اگر مسواک نہ ہو تو انگلی سے دانتوں کو ملنا۔

(۵) تین بار کلی کرنا۔

(۶) تین بار ناک میں پانی چڑھانا۔

(۷) تین بار ہی ناک چھنکنا۔

(۸) ہر عضو کو تین تین بار دھونا۔

(۹) چہرہ دھوتے وقت داڑھی کا خلال کرنا۔

(۱۰) ہاتھوں اور پیروں کو دھوتے وقت انگلیوں کا خلال کرنا۔

(۱۱) ایک بار تمام سر کا مسح کرنا۔

(۱۲) سر کے مسح کے ساتھ کانوں کا مسح کرنا۔

(۱۳) اعضائے وضو کو مَل مَل کر دھونا۔

(۱۴) پے در پے وضو کرنا۔

(۱۵) ترتیب وار وضو کرنا۔

(۱۶) داہنی طرف سے دھونا۔

(۱۷) وضو کے بعد گوشۂ نگاہ آسمان کی طرف متوجہ کر کے کلمۂ شہادت: أشهد أن لاالٰه الا الله وأشهد أن محمداً عبده ورسوله پڑھ کر یہ دعا پڑھیں: اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين۔ اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں میں شامل کر دے۔ (حصن حصین)

فائدہ: اس دعاء کے متعلق ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ وضو میں ظاہری طہارت ہے، اس دعا سے باطنی طہارت کی درخواست پیش کی گئی ہے کہ اول اختیاری تھی وہ ہم کر چکے، اب آپ اپنی رحمت سے ہمارے باطن کو بھی پاک فرما دیجئے۔

فائدہ: وضو کے بعد کلمۂ شہادت پڑھنے والوں کے لئے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

(۱۸) وضو سنت کے موافق گھر پر کرنا چاہئے۔

وضو کرنے کا مسنون طریقہ

وضو کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کر کے کسی اونچی جگہ بیٹھیں تا کہ چھینٹیں اڑ کر اوپر نہ پڑیں، بسم اللہ کہتے ہوئے تین مرتبہ گٹوں تک ہاتھ دھوئیں پھر تین دفعہ کلی کریں اور مسواک کریں، اگر مسواک نہ ہو تو انگلی سے اپنے دانت صاف کریں پھر ہاتھ سے تین بار ناک میں پانی ڈالیں اور بائیں ہاتھ سے ناک صاف کریں، پھر تین دفعہ اس طرح منہ دھوئیں کہ سر کے بالوں سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک سب جگہ پانی پہنچ جائے، پھر تین بار دایاں ہاتھ کہنی سمیت دھوئیں، پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت تین مرتبہ دھوئیں اور ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر خلال کریں، انگوٹھی، چھلہ (عورت نے چوڑی) پہن رکھے ہوں تو ہلا لیں تا کہ کہیں سے سوکھا نہ رہ جائے، اب ایک مرتبہ سارے سر کا مسح کریں پھر کان کے اندر کی طرف کا انگشتِ شہادت سے اور کان کے

اوپر کی طرف کا انگوٹھوں سے مسح کریں، پھر انگلیوں کی پشت کی طرف سے گردن کا مسح کریں، لیکن گلے کا مسح نہ کیا جائے کہ یہ ممنوع ہے، کان کے مسح کے لئے نیا پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے، اب تین بار دایاں پاؤں ٹخنے سمیت تین دفعہ دھوئیں، پھر بایاں پاؤں تین دفعہ ٹخنہ سمیت دھوئیں، اور بائیں ہاتھ کی چھنگلیاں سے پاؤں کے انگلیوں کا اس طرح خلال کریں کہ دائیں پاؤں کی چھنگلیا سے شروع ہو کر بائیں پاؤں کی چھنگلیا پر ختم ہو۔

یہ وضو ہو گیا، اب آسمان کی طرف گوشۂ نگاہ متوجہ کر کے کلمۂ شہادت پڑھیں، یاد رہے کہ کلمۂ شہادت پڑھتے وقت آسمان کی طرف انگلی اٹھانا ثابت نہیں ہے اور نہ ہی عین سر کے اوپر والے آسمان حصہ کی طرف دیکھنا ضروری ہے، اگر وقت مکروہ نہ ہو تو دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھیں، حدیث میں اس کا بڑا ثواب آیا ہے۔

فقہ حنفیہ کے مطابق ارکان نماز، سنت کے مطابق صحیح طریقے

نماز میں پیروں کی انگلیاں قبلہ رو ہوں، دونوں پیروں کے درمیان چار انگلی کا فاصلہ ہو، تکبیر تحریمہ کہتے وقت دونوں ہاتھ سنت کے مطابق اٹھانا دل کی بہت سی بیماریوں سے بھی بچاتا ہے، حالتِ نماز میں چاق و چوبند اور سیدھا کھڑا رہنا چاہئے، سر دائیں بائیں اٹھا ہوا یا بالکل جھکا ہوا نہ ہو، نظر سجدہ کی جگہ مرکوز ہو، ہاتھوں کی ہتھیلیاں قبلہ رو ہوں، سنت کے مطابق ہاتھ باندھنا یعنی ناف کے نیچے زور لگا کر دونوں ہاتھوں کو پکڑنا، اعصاب کے عوارض میں بھی بیحد مفید ہے، حالت رکوع میں گھٹنے خوب کس کر پکڑیں، انگلیاں کھلی ہوئی ہوں، کمر و سر بالکل سیدھ میں ہوں، کمر اٹھی ہوئی نہ ہو، بلکہ قدرے پست رہے تا کہ نوے زاویے پر آجائے، یہ سنت طریقہ ہے اور کمر کے امراض سے محفوظ بھی رکھتا ہے، نیز صحت کے لئے بھی مفید ہے، رکوع سے کھڑا ہونے کے بعد اتنا قیام کریں کہ جسم کے تمام اعضاء اپنے معمول پر آجائیں، ہو سکے تو حمداً کثیرا مبارکاً فیہ پڑھ لیں پھر سجدے میں جائیں، سجدہ بہت اہم حیثیت رکھتا ہے، جب مومن سجدہ میں جاتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ اے مومن! اگر تجھے معلوم

ہوتا کہ حال سجدہ میں تو اللہ سے کتنا قریب ہے تو اپنا سر سجدہ سے زندگی بھر نہ اٹھاتا، سجدہ میں نظر ناک پر مرکوز رہے، سجدہ میں سبحان ربی الأعلیٰ رٹنے کے انداز میں نہ پڑھیں بلکہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، دونوں سجدوں کے درمیان کم از کم اتنا وقفہ ضرور ہو کہ جسم کے تمام اعضاء اپنے معمول پر آ جائیں، ہو سکے تو دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھ لیں: اللھم اغفرلی وارحمنی وعافنی واھدنی وارزقنی پوری نماز سنت کے مطابق پڑھنے میں ہمارا ہی فائدہ ہے، چالیس روز اگر نمازیں سنت کے مطابق ادا کی جائیں تو آپ کو انشاء اللہ بہت لذت محسوس ہوگی اور صحت میں بھی آپ نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے۔

الحاج نور عالم علوی صاحب کا قول ہے کہ ہمارے حضرت محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نماز جیسی عظیم الشان عبادت بغیر سیکھے کیسے ادا کی جا سکتی ہے جبکہ ایک معمولی چیز جیسے سائیکل، کار، کمپیوٹر، لکھنا پڑھنا یا کوئی دستکاری کا کام بغیر سیکھے نہیں آ سکتا، لوگوں کو ساٹھ سال گذر گئے مگر نماز کی روح حاصل نہ ہوئی، اس کی وجہ نماز کے ارکان سے ناواقفیت ہے، نماز سیکھنے میں کچھ وقت ضرور لگائیں، اصلاح آج بھی ممکن ہے، دونوں سجدوں کے درمیان کم از کم اتنا وقفہ ضرور ہو کہ جسم کے تمام اعضاء اپنے معمول پر آ جائیں یا ہو سکے تو دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھ لیں: اللھم اغفرلی وارحمنی وعافنی واھدنی وارزقنی۔

عورتوں کے نماز کا طریقہ

(۱) تکبیر تحریمہ کہتے وقت دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھائے۔

(۲) ہاتھوں کو دوپٹہ سے باہر نہ نکالے۔

(۳) سینہ پر ہاتھ باندھے۔

(۴) درمیان کی تین انگلیاں نہ کلائی پر رکھے اور نہ چھنگلیا اور انگوٹھے سے گٹے کو پکڑے بلکہ صرف داہنے ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت پر رکھے۔

(۵) رکوع میں کم جھکے۔

(۶) رکوع میں دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑتے وقت انگلیوں کو ملائے رکھے۔

(۷) دونوں بازو پہلوؤں سے خوب ملائے۔

(۸) دونوں پیروں کے ٹخنے بالکل ملادے۔

(۹) خوب سمٹ کر اور دب کر سجدہ کرے۔

(۱۰) سجدے میں بغلیں نہ کھولے۔

(۱۱) پیٹ کو دونوں رانوں سے ملائے۔

(۱۲) دونوں بازوؤں کو پہلوؤں سے ملادے۔

(۱۳) کہنیوں کو زمین پر رکھ دے۔

(۱۴) سجدہ میں ہاتھ پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف رکھے، مگر پاؤں کھڑا نہ کرے، بلکہ داہنی طرف نکال دے۔

(۱۵) قعدہ میں بائیں طرف پر بیٹھے۔

(۱۶) دونوں پاؤں داہنی طرف نکال دے۔

(۱۷) قعدہ اور جلسہ میں انگلیاں ملی رکھے۔

موجودہ دور میں جس کو ہم سرعت اور تیز رفتاری کی تہذیب کا دور قرار دیتے ہیں بیشتر افراد کاموں اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اس قدر مشغول ہیں کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی نفسیات سے کام کرنے کا سابقہ پڑتا ہے، ایسے لوگوں تک دین کی بات پہنچانا اور ان کا وقت اس کام کے لئے مشغول کرنا مشکل ہوتا ہے، اس میں عوام وخواص سبھی شریک ہیں، ایسے حضرات کے لئے حضرت محی السنۃؒ نے دین کی باتیں نہایت آسان طریقہ سے سکھانے کے لئے ایک منٹ کا مدرسہ قائم فرمایا، اس مدرسہ میں صرف ایک منٹ میں نماز میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معنی، ایک سنت، ایک گناہ کبیرہ کے

نقصانات اور نیکی کے فوائد سبق وار بتائے گئے ہیں اور نماز فجر یا نماز عصر کے بعد یا دونوں وقت اس ایک منٹ کے مدرسہ کو جاری کرنے کا مشورہ عنایت فرمایا ہے۔

اس ایک منٹ کے مدرسہ کی تفصیلات، اس کا طریقہ اور اس کا فائدہ حضرت والا کے خلیفۂ اجل مولانا حکیم محمد اختر صاحب کے قلم گہر بار سے اس طرح مذکور ہے:۔

''آج کل تمام عالم میں حضرت والا ہردوئی کا جہاں بھی سفر ہوتا ہے ایک منٹ کا مدرسہ سفر اور حضر میں جاری کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور عملاً اس کی مشق بھی کراتے ہیں کیونکہ امت مسلمہ میں غفلت کا مرض بڑھ رہا ہے، زیادہ دیر کا وعظ سننے سے گھبراتے ہیں اور اکثر اوقات دفتر کی ملازمت یا تجارت کی مصروفیت بھی ان کے لئے طویل وعظ سننے سے مانع رہتی ہے، اس لئے یہ آسان طریقہ ''ایک منٹ کا مدرسہ'' بعد نماز فجر یا بعد نماز عصر یا دونوں وقت جاری کرنے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ ایک امتی بھی محروم نہ رہے اور دین کی ضروری ضروری باتوں سے آگاہی نصیب ہوجائے، اس ایک منٹ میں حسب ذیل مضمون بیان کرنے کا مشورہ دیتے ہیں:

(۱) نماز کی سورتوں اور دعاؤں اور تسبیحات کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ بتایا جاوے جس کی ترتیب نماز کی ترتیب کی مطابق ہو یعنی پہلے اللہ اکبر کے معنی پھر ثناء پھر اعوذ باللہ پھر بسم اللہ سورۂ فاتحہ وغیرہ، برسوں نماز پڑھتے ہوئے ہوجاتے ہیں لوگوں کو اپنی نمازوں کی تسبیحات اور دعاؤں اور اذکار کا ترجمہ نہیں معلوم ہوتا جس سے نماز میں دل نہیں لگتا، ورنہ جو کچھ نماز میں پڑھا جاتا ہے اگر اس کا ترجمہ معلوم ہو اور اس کی طرف دھیان رکھا جاوے تو نماز کا لطف بڑھ جاوے اور نماز میں یکسوئی اور حضوری عطا ہو، کیونکہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ''النفس لاتتوجه الى شيئين فى آن واحد'' فلسفہ کا قاعدہ ہے نفس ایک وقت میں دو شئی کی طرف توجہ نہیں کرسکتا، پس جب رب سے مناجات کے مفہوم کا خیال رکھے گا تو غیر اللہ کی طرف خیال نہ ہوسکے گا، چنانچہ نماز کو حسین بنانے کی تعلیم اس حدیث میں ہے کہ ''

اذاقمت فی صلاتك فصل صلاة مودع ''جب نماز پڑھوتواس نماز کوکس قدر حسین اوراچھی پڑھے گا، یہ مشکاۃ شریف کی ایک حدیث کا جزء ہے، ملاعلی قاریؒ اسی حدیث کے اس جزء کی شرح اس طرح فرماتے ہیں کہ مودع أي لما سوى الله بالاستغراق في مناجاة مولاه(۱)

(۲) ایک سنت ایک دن بتائی جاوے مثلاً نماز میں قیام کی گیارہ سنتوں سے ایک سنت یہ بتائی جاوے کہ سیدھے کھڑا ہونا اور سر کونہ جھکانا، دوسرے دن یہ بتانا کہ کل سیدھے کھڑے ہونے کی سنت بتائی گئی تھی آج یہ سنت بتائی جارہی ہے کہ پیروں کی انگلیاں بھی کعبہ شریف کی طرف ہوں، تیسرے دن اس طرح بتائیں کہ پہلے دن اور دوسرے دن یہ سنت بتائی گئی سیدھے کھڑا ہونا اور پیروں کی انگلیوں کا قبلہ رو ہونا آج تیسرے دن یہ سنت بتائی جارہی ہے کہ امام تکبیر تحریمہ کے ساتھ ساتھ مقتدی کی تکبیر تحریمہ ادا ہو لیکن شرط یہ کہ امام کی تکبیر تحریمہ سے مقتدی کی تکبیر تحریمہ پہلے نہ ختم ہو ورنہ نماز ہی صحیح نہ ہوگی، اس لئے ساتھ ساتھ سے مراد یہ ہے کہ تاخیر نہ کرے، امام کی تکبیر تحریمہ ختم ہوتے ہی مقتدی بھی تکبیر تحریمہ کہہ لے، اس طرح ایک سنت تین دن اور تین سنت ایک دن کا سلسلہ جاری ہوگا، اور یاد کرنے میں آسانی ہوگی، برسوں ہوجاتے ہیں ہماری نمازیں سنت کے مطابق ادا نہیں ہوتی ہیں، بعض اہل علم کو بھی دیکھا گیا ہے کہ عملی مشق نہ ہونے سے ان کو سنتوں کا استحضار نہیں ہوا جب گزارش کی گئی تو بہت مسرور ہوئے، طریق مذکور سے پوری زندگی سنت کے مطابق ہوسکتی ہے، سنت کی عظمت پر احقر کا ایک شعر ہے

نقشِ قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے

اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

ہر مسجد کے ائمہ حضرات اگر ایک منٹ کا مدرسہ اسی طرح جاری فرماویں تو نماز، وضو،

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح ج۹/۳۹۱

کھانے، پینے، سونے، جاگنے، مسجد میں آنے جانے کی تمام سنتوں کا علم ہوسکتا ہے، ایک سال میں ۳۶۰ سنتیں یاد ہوسکتی ہیں۔

(۳) بڑے بڑے گناہوں میں سے ایک گناہ بتایا جاوے جو جہنم میں گرانے کے لئے کافی ہیں تاکہ اس سے توبہ کی توفیق ہو۔

(۴) گناہوں کے نقصانات جو دنیا میں پیش آتے ہیں جن کو جزاء الاعمال میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے تحریر فرمایا ہے ہر روز ایک نقصان کو بتاوے بعد میں گناہوں سے آخرت کے چند نقصانات بھی روزانہ ایک ایک بیان کردے۔

(۵) نیکیوں کے فوائد جو دنیا میں عطا ہوتے ہیں ان میں سے ایک بتادیا جاوے اور آخر میں نیکیوں سے آخرت کا ایک ایک فائدہ روزانہ بتادیا جاوے، ان پانچ باتوں کو ایک منٹ میں بیان کردے، یہ ایک منٹ کا مدرسہ ہے، شاید کوئی بھی ایک منٹ کے مدرسہ سے محروم نہ رہے گا، کیونکہ مشغول سے مشغول آدمی بھی ایک منٹ دے سکتا ہے، اس کے بعد درس تفسیر یا درس حدیث کا جو سلسلہ علمائے کرام اور ائمہ کرام کا ہو اس کو جاری فرمائیں جن کو وقت ہوگا وہ اس میں شرکت کریں گے اور جن کے پاس وقت نہ ہوگا وہ ایک منٹ کے مدرسہ سے نفع اٹھالیں گے، اللہ تعالیٰ ایک منٹ کا مدرسہ سارے عالم میں جاری فرمادیں اور امت مسلمہ کو اس سے مستفیض فرمادیں اور اس کے نفع کو عام و تام فرمادیں اور اس کے موجد و مؤلف کے لئے قیامت تک صدقۂ جاریہ بنادیں آمین''۔

اب اس ایک منٹ کے مدرسہ اور اس کے پہلے سبق کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

"بسم الله الرحمن الرحيم، نحمده ونصلى على رسوله الكريم

(۱) ترجمۂ نماز: اللہ اکبر کے معنی اللہ تعالیٰ سب سے بڑے ہیں بلکہ بڑائی صرف اللہ کے لئے خاص ہے۔

(۲) ایک سنت: نماز کے قیام کی سنتوں سے ایک سنت یہ ہے کہ قبلہ رو سیدھے

کھڑے ہونا اور سر کو نہ جھکانا۔

(۳) ایک کبیرہ گناہ: بڑے بڑے گناہ جن پر عذاب کی وعیدیں آئی ہیں ان میں سے ایک بڑا گناہ ہے کسی پر حقارت سے ہنسنا۔

(۴) گناہ کے نقصانات: گناہوں کے نقصانات سے جو دنیا میں ملتے ہیں ایک یہ ہے کہ گناہ کی نحوست سے بندہ علم دین سے محروم کردیا جاتا ہے۔

(۵) طاعت اور عبادت کے فوائد: نیکی اور عمل صالح کے فوائد جو دنیا ہی میں عطا ہوتے ہیں ایک یہ کہ رزق میں برکت عطا ہوتی ہے، یعنی کبھی رزق ظاہری میں زیادتی بھی ہوتی ہے، اور برکت تو ہمیشہ عطا ہوتی ہے''۔

اس نمونہ کے ایک سو بیس اسباق کا مجموعہ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب نے ایک کتاب کے اندر جمع فرمادیا ہے جس کا نام ہے ''ایک منٹ کا مدرسہ'' ناظرین کرام اس عظیم تربیتی پروگرام سے فائدہ اٹھانے کے مواقع کو اچھی طرح سمجھ رہے ہوں گے، اس سے پورا اندازہ ہوجائے گا کہ حضرت ہردوئیؒ کی زندگی کس انہماک کے ساتھ امت کی اصلاح کی فکر میں گزری، اس دینی، دعوتی اور اصلاحی عمل کا ایک مختصر خاکہ اس چھوٹے سے مضمون میں پیش کیا گیا، ورنہ حضرت کی مجاہدانہ زندگی کا مفصل ذکر وتعارف بڑی بڑی جلدوں میں پورا نہ ہو سکے گا، خود ''مجالس ابرار'' جو حضرت حکیم محمد اختر صاحب نے ترتیب دیا ہے حضرت والا کے اصلاحی ذہن اور ان کا احسانی مرتبہ سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

حضرت کے ایک سچے معتقد جناب الحاج نور علوی صاحب لکھنوی کا عجیب والہانہ تعلق حضرت ہردوئیؒ سے تھا، انہوں نے حضرت ہردوئی رحمۃ اللہ کے اصلاحیات کے اکثر مضامین کو چھوٹے چھوٹے رسالوں، پمفلٹ اور کتبوں کی شکل میں اپنے ادارہ احیاء السنۃ واصلاح المنکرات کی طرف سے شائع کیا ہے اور ان کو عوام وخواص تک پہنچانے میں بذات

خود بے لوث محنت کی ہے اور کر رہے ہیں ان کا شمار بھی احیائے سنت کے خادموں کے ضمن میں جلی حروف میں ہوتا رہے گا، اور حضرت ہردوئیؒ کی ذات والا صفات پر جان چھڑکنے والوں میں ان کو ایک ممتاز مقام حاصل رہے گا، اللہ تعالیٰ ان کے مبارک اوقات میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے، ان کی اس بے لوث خدمت کو قبول فرما کر اصلاح امت کا ذریعہ بنائے۔

حضرت محی السنہؒ کا تعلق ہمارے مرشد و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے انتہائی مخلصانہ اور ایک دوسرے پر اعتماد سے معمور تھا، اسی بنا پر حضرت والاؒ جب بھی لکھنؤ تشریف لاتے یا اس طرف سے گذرتے تو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی قدم رنجہ فرماتے اور کچھ وقت گزارتے تھے، اس دوران دونوں بزرگوں کی ملاقات بہت ہی مخلصانہ فضا میں ہوتی تھی، اکثر ایسا بھی ہوا کہ حضرت مولانا فجر کی نماز کے وقت دارالعلوم کی مسجد میں اچانک تشریف لائے اور درخواست کرنے پر امامت بھی فرمائی، نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لئے طلباء و اساتذہ کو خطاب فرمایا، اذان اور تکبیرات کی صحیح صورت حال بیان فرمائی اور دیگر نصیحتوں سے دلوں کو آباد کیا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات حسرتِ آیات کے موقعہ پر جو پیغام دیا اس میں صبر کی تلقین فرمائی اور تخفیف غم کا طریقہ بتایا اور سنت کی روشنی میں اس موقع پر راضی برضا رہنے کا مشورہ عنایت فرمایا، اس کے بعد بھی برابر حضرت مولانا کا مخلصانہ تعلق ندوہ و اہل ندوہ کے ساتھ قائم رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ندوہ کے ذمہ داران حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور حضرت مولانا سید واضح رشید ندوی حضرت ہردوئی کے خدمت میں جا کر دعاؤں کی درخواست کرتے تھے، حضرت ان کا بے حد خیال فرماتے تھے، دارالعلوم کے استاذ حدیث حضرت مولانا محمد برہان سنبھلی بھی حضرت سے وابستہ ہوگئے تھے اور اکثر ان کی خدمت میں کچھ وقت

گزارا کرتے تھے، اسی طرح ندوہ کے طلباء بعض اساتذہ حضرت سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی خدمت میں حاضری دے کر اطمینان قلب محسوس کرتے تھے، عزیزی حافظ مصباح الدین سندیلوی سلمہ خاص طور سے حضرت والا سے تعلق رکھتے تھے، اور برابر خیریت معلوم کرتے رہتے تھے اور رابطہ کا کام دیتے تھے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے افاضات، افادات اور فیوض وبرکات کا سلسلہ دراز سے دراز تر فرمائے اور احیائے سنت واتباع سنت کے راستہ پر چل کر ان کی پاکیزہ روح کو زیادہ سے زیادہ تسکین عطا فرمائے۔

ان لله ماأخذ وله ماأعطى، وكل شئى عنده الى أجل مسمى۔

انتقال کے بعد چہرۂ مبارکہ پر بشاشت اور تازگی کے جو آثار تھے، اس کی مثال بہت کم ملتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو انشاء اللہ نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت عطا فرمائی ہوگی اور ان کے ساتھ اپنے عفو وکرم کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمایا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اپنے ایسے ہی بندوں کے لئے یہ بشارت عطا فرمائی ہے۔

ومن يطع الله والرسول فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقاً۔

اور جو کوئی اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے خاص انعام کیا ہے یعنی پیمبر، اولیاء اور شہید اور صالحین اور یہ کیسے اچھے رفیق ہیں۔ وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه محمد وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين۔

☆☆☆

مولانا مختار احمد ندویؒ
چند یادیں اور کارنامے

مخلص علماء کا وجود

''ہر جان موت کا ذائقہ ہے، اور تم کو اپنے اعمال کا اجر قیامت کے دن پورا پورا ملے گا'' (آل عمران:۱۸۵)

اس عظیم حقیقت پر ایمان رکھتے ہوئے ایک باشعور مسلم، صاحب علم کے لئے دنیا کی زندگی میں آخرت کی تیاری کا احساس قائم رہنا ایک طبعی بات ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت کی فکر اور اس کے زادِ راہ کے لئے ہمہ دم فکرمند رہتے ہیں، وہ دنیا کی زندگی میں اپنی ذمہ داریوں کو پوری کرتے ہیں، اور ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی رضاء کے طالب رہتے ہیں، ان مخلصین کی تعداد کو اگر ہم جمع کرنا چاہیں تو یہ ایک ناممکن العمل بات ہوگی، اس لئے کہ جن علماء اور اہل اخلاص کی زندگی کے واقعات مدون ہیں اور کتابوں کے صفحات ان سے مزین ہیں، ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ایسے بندگان خدا کی بھی ہے، جو مجہول ومستور رہ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے، لیکن مؤرخین نے میدان عمل میں سبقت لے جانے والے علماء وصلحاء کے حالات کو پوری امانت داری کے ساتھ قلمبند کرنے میں کبھی کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

ایک عظیم داعی اور مصلح

مولانا مختار احمد سلفی اسی نوع کے علماء میں تھے، ان کی زندگی عملی اور اسلامی زندگی تھی، وہ اپنے مثالی کردار، اپنے علم وآگہی کی ممتاز صفت کے ساتھ جانے پہچانے جاتے تھے، وہ

ابتدائے عمر ہی سے نہایت ذہین اور طباع تھے اور حصول علم کو انہوں نے اپنا مقصد بنالیا تھا، اپنے علم میں پختگی پیدا کرنے اور اس کو عملی حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے اپنے اندر ایک اضطرابی کیفیت محسوس کرتے تھے، اسی بنا پر انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالمیت کرنے کے بعد بھی سلسلہ تعلیم جاری رکھا، اور مختلف مراکز علمیہ اور شخصیات سے استفادہ کیا، اور جب اپنے اندر اس علم سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت محسوس کی تو انہوں نے اپنے آبائی وطن سے نکل کر کلکتہ کی ایک مشہور جامع مسجد میں امامت وخطابت کا فریضہ تقریباً دس سال تک انجام دیا، اس دوران کچھ تجارتی عمل کی طرف رجحان ہوا، لیکن اس میں ان کو کامیابی نہ مل سکی، پھر بمبئی میں مومن پورہ کی جامع مسجد میں اسی منصب پر فائز ہوئے اور بمبئی میں ان کا قیام بہت زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہوا، یہاں رہ کر انہوں نے عرب کے علماء اور فضلاء سے تعارف حاصل کیا اور ان کی دعوت پر انہیں بار بار بلاد عربیہ کے سفر کا موقع ملا، خاص طور سے سعودی عرب میں وہاں کے بڑے علماء اور حرمین شریفین کے ائمہ اور خطباء سے ان کے گہرے تعلقات ہوئے، علامہ عبدالعزیز بن بازؒ ان کی عملی اور دعوتی زندگی سے متاثر ہوکر ان کا بہت زیادہ لحاظ کرتے تھے، کویت میں علماء کے خاندان عبداللطیف وصالح الشائع سے برادرانہ تعلقات تھے، یہ خاندان علم وتجارت دونوں کی نمائندگی کرتا ہے اور خیر کے کاموں میں اس کے بھرپور حصہ لینے کی روایت ہے، اسی کے ساتھ جناب شیخ طارق العیسی سے ان کا بہت ہی مخلصانہ اور محبانہ تعلق تھا۔

امارات میں آل محمود کے خاندان سے انتہائی مخلصانہ تعلق تھا، اور علامہ عبداللہ بن علی المحمود سے بہت قریبی تعلقات تھے، اور دبئی کے بڑے بڑے شرفاء اور تاجروں سے تعلق رکھتے تھے، خاص طور سے معالی الشیخ سیف الغریر اور شیخ الفطیم اور دیگر اہم شخصیتوں سے مخلصانہ اور محبانہ تعلقات تھے، قطر میں علامہ عبداللہ بن زید آل محمود اور علامہ عبداللہ بن ابراہیم انصاری اور درویش خاندان سے گہرے روابط تھے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کی امارت

ہندوستان کے ہر گوشہ میں لوگ ان سے واقف ہونے کے ساتھ ان کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، وہ جمعیت اہل حدیث کے نمائندے اور اس کے بڑے عالموں میں تھے، ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک جمعیت اہل حدیث کے امیر کے عہدہ پر فائز رہے، اور اس دوران انہوں نے جمعیت کو اپنی سرگرمیوں اور شعور علمی کی بنا پر زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانے کی کوشش کی اور اس کو فعال ومتحرک بنایا، یہ ان کا زبردست علمی اور اجتماعی کارنامہ ہے، تاریخ کے صفحات ہمیشہ اس سے مزین رہیں گے۔

مولانا مختار احمد ندویؒ کا علمی اور صحافتی کارنامہ

مولانا مختار صاحبؒ نے حدیث کی کتابوں اور فن حدیث سے تعلق رکھنے والے مخطوطات کو تحقیق وتشریح کے ساتھ اچھی شکل وصورت میں شائع کرنے کے لئے بمبئی میں ''الدار السّلفیہ'' کے نام سے ایک دارالاشاعت قائم کیا، جہاں سے بہت سی نادر ونایاب کتابوں کی اشاعت میں ایک خاص کردار ادا کیا، اسی کے ساتھ ''دار المعارف'' کے نام سے قائم کردہ ادارہ کے ذریعہ بھی دینی اور علمی کتابوں کی اشاعت کا کام جاری رکھا، انہوں نے جن کتابوں کی تالیف وترجمہ میں اپنا بیش قیمت وقت صرف کیا، ان میں علامہ عبدالعزیز بن بازؒ کی کتاب جو حج اور عمرہ کے مسائل پر تصنیف کی گئی ہے، اس کتاب کا ترجمہ مولانا ندوی کے قلم سے ''حج، عمرہ اور زیارت'' کے نام سے اس کو شائع ہوا، اور مملکت سعودیہ سے وہاں کے دارالافتاء اور وزارۃ الشؤون الاسلامیہ نے بڑی تعداد میں شائع کر کے تقسیم کیا، ''دار المعارف'' سے جو اہم کتابیں شائع ہوئیں ان میں حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ کی کتاب ''کتاب المصنف'' ہے، اس مخطوطہ کی تحقیق کر کے بہترین شکل وصورت میں پندرہ جلدوں میں شائع کیا، اور مقدسی کی مشہور کتاب ''عمدۃ الاحکام'' کا اردو ترجمہ ''ضیاء الکلام'' کے نام سے شائع کیا، اور عصر حاضر کے محقق فؤاد عبدالباقی کی بیش قیمت تصنیف ''اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان'' بھی شائع کر کے

افادۂ عام کا ذریعہ بنایا، اور ''الدار السلفیہ'' ہی سے ایک اردو ماہنامہ ''البلاغ'' کے نام سے ۱۹۹۰ء میں نکالا جو آج تک نہایت پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے، اور اپنی ایک پہچان رکھتا ہے، اور ملک کے تمام علمی اور صحافتی طبقوں میں پڑھا جاتا ہے۔

دینی وعصری اداروں کا قیام

مولانا مختار احمد ندویؒ کو علم وتحقیق کا بہترین ذوق اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور صحافت سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اس کا نمونہ ''البلاغ'' کے صفحات کے اندر موجود ہے، مولانا مرحوم کو تعلیم وتربیت اور اس کے لئے مدارس کے قیام سے والہانہ لگاؤ تھا، انہوں نے مرکزی دار العلوم جامعہ سلفیہ بنارس قائم کرنے میں زبردست حصہ لیا، منصورہ مالیگاؤں میں جامعہ محمدیہ وسیع پیمانہ پر قائم کیا اور لڑکیوں کے لئے ''کلیۃ عائشۃ الصدیقۃ'' بھی قائم کیا، اس لئے کہ وہ مسلم نوجوانوں (لڑکوں، لڑکیوں) کے علم وعمل کو کتاب وسنت کی روشنی میں رائج کرنے اور ان کی زندگیوں میں نافذ کرنے کے لئے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے، اسی بناء پر اپنے وطن مئو میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ''کلیۃ فاطمۃ الزہراء'' قائم کیا، اور اس کے لئے اچھے اساتذہ اور معلمات کا انتخاب کیا۔

مولانا مرحوم کو ملت کی طبی خدمت کی فکر انسانیت کی بنیاد پر ہمہ وقت دامن گیر رہتی تھی، اور وہ بہتر سے بہتر طبی مراکز قائم کرنا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تمنا پوری کردی اور منصورہ مالیگاؤں میں ''محمدیہ طبیہ کالج'' کے نام سے طبی تعلیم کا ایک عظیم مرکز قائم کیا اور اس کے لئے ایک بڑا اسپتال بھی ''السائر ہاسپٹل'' کے نام سے قائم کیا، تاکہ جامعہ طبیہ میں پڑھنے والے طلباء وطالبات کے لئے عملی مشق وتربیت کا بڑا ذریعہ بن سکے، الحمد للہ کہ آج بھی وہ اپنا کام کررہا ہے، اپنے وطن مئو میں انہوں نے ''عالیہ اسپتال'' بڑے جذبہ سے قائم کیا، جو ہر طرح کے آلات سے مزین تھا، اس کا سنگ بنیاد مئو کے ایک (میرے والد رحمہ اللہ) عالم دین اور محدث حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ سے رکھوایا، اور اس موقع پر ایک جلسہ ہوا، جس

میں مئو اور بیرون مئو کے علماء اور فضلاء اور عوام شریک ہوئے، اور سب نے اس کو وقت کی ایک اہم ترین ضرورت قرار دیا۔

الطب النبوی لابن القیم

علامہ ابن قیم الجوزیۃ کی کتاب ایسی ہے کہ اس کا اردو ترجمہ اردو داں ممالک اور اردو طبقے کے لئے ضروری تھا، شیخ ندوی نے اس کا ترجمہ اپنے ایک ثقہ اور معتمد شخص مولانا حکیم عزیز الرحمٰن الاعظمی کو اردو میں کرنے کی دعوت دی، حکیم صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کام کو قبول کر لیا اور بہت کم عرصہ میں اس اہم کتاب کا اردو ترجمہ ''طب نبوی'' کے نام سے کر کے شیخ ندوی صاحب کے حوالے کر دیا، اور یہ کتاب تھوڑے عرصہ میں بہترین طباعت اور خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ الدار السّلفیہ سے شائع ہو کر مقبول عوام وخواص ہوئی، یہ بھی علم حدیث میں ان کی مزاج شناسی کی ایک بہترین مثال ہے، اس اہم پہلو کی طرف بہت کم لوگوں کی نظریں ملتفت ہوتی ہیں، لیکن شیخ ندوی اپنی وسعت فکر ونظر کی بنا پر سنت نبوی کی تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔

مساجد کی تعمیر وتجدید کی طرف شیخ ندوی کی توجہ

جہاں تک مسجدوں کی تعمیر وتجدید کا مسئلہ ہے تو مولانا مرحوم نے اس میدان میں زبردست کردار ادا کیا، اور تقریبا پانچ (۵۰۰) سو مسجدیں ملک کے مختلف حصوں میں تعمیر کرائیں، اور ان کے لئے امام ومؤذن کا انتظام بھی کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں پنجوقتہ نمازوں کی طرف سے رغبت پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوئی، اور خواص میں بھی تعمیر مساجد کا جذبہ پیدا ہوا، بالخصوص بابری مسجد کے واقعہ کے بعد مساجد کی تعمیر کا جذبہ پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا، اللہ تعالیٰ اس بے نظیر کارنامہ کو قبولیت سے سرفراز فرمائیں۔

مولانا مرحوم نے جب علمی اور حدیث کی کتابوں کی تحقیق شروع کی تو ان کو ایک بڑے مطبع کے قائم کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی، انہوں نے اپنے بڑے صاحبزادہ محمد

اسلم صاحب کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ممبئی جیسے بڑے شہر میں ایک مثالی پریس قائم کریں، اس کے لئے بہت قیمتی بلڈنگ بھی حاصل کی، اور اس میں وسیع پیمانہ پر پریس قائم ہوا، ممبئی میں حاضری کے وقت ملاقات ہونے پر انہوں نے جہاں اپنے تمام مراکز اور کام کرنے کی جگہوں کو دکھایا، وہیں اس پریس کی زیارت بھی کرائی، جس کی وسعت اور طباعت دیکھ کر رشک آیا، اور دل میں یہ خیال ہوا کہ علماء و محققین کو اس پہلو کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے۔

ندوۃ العلماء اور مولانا مختار احمد ندویؒ

مولانا کو ندوۃ العلماء سے ایک خاص اور گہرا تعلق تھا، وہ اکثر یہاں تشریف لاتے تھے اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے خاص تعلق کی بنا پر ان کے مہمان ہوا کرتے تھے، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء کا جلسہ ہونے والا تھا، مولانا صاحبؒ بھی اسی موقع پر تشریف لائے، اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ان سے بھی مجلس انتظامیہ کے مجلس میں شرکت کرنے کی درخواست کی، بلکہ خود اپنے ساتھ لے کر سلیمانیہ ہال میں تشریف لے گئے، اور اپنے قریب کی مجلس میں ان کو بٹھایا، انہوں نے اپنے صاحبزادگان کو ندوہ میں داخل کیا اور یہاں سے وہ فراغت کی سند لے کر گئے، اپنے قریبی عزیزوں کو بھی ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کیا، اور انہوں نے بھی یہاں رہ کر خاص فائدہ اٹھایا، اور فضیلت کی سند حاصل کی، ندوہ کے تمام ذمہ دار حضرات اور اس خاکسار سے بھی محبت و تعلق کا اظہار کرتے تھے، اور اپنے جلسوں میں مدعو کرتے تھے، چنانچہ جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں کی کانفرنس میں مجھ کو بھی مدعو کیا، اور باوجود اس کے کہ میری طبیعت ان دنوں کچھ خراب تھی، لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے تاکید فرمائی کہ تم ضرور ان کی کانفرنس میں شرکت کرو، الحمد اللہ شرکت ہوئی، اور وہاں کے نظام کے دیکھنے اور اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا، اور کانفرس میں تشریف لائے ہوئے علمائے کرام سے ملاقات ہوئی، جن کے خیالات ندوہ کے بارے میں نہایت اچھے تھے، ندوۃ العلماء کے عربی رسالہ البعث الاسلامی سے بھی ان کو خاص لگاؤ تھا، وہ

اس کو بڑی اہمیت کے ساتھ پڑھتے تھے، اور بہت پسند کرتے تھے، اگر ڈاک کی خرابی کی وجہ سے ان کے یہاں رسالہ نہیں پہونچا تو اس کی دوسری کاپی طلب کرتے تھے۔

عارضۂ قلب اور کامیاب آپریشن

مولانا مرحوم نے اپنے دینی اور علمی کاموں میں اتنی زیادہ محنت کی کہ ان کو دل کا عارضہ لاحق ہوگیا، اور ماہرین کے مشورہ سے دل کا آپریشن کرنا طے ہوا، اس کے کچھ ہی دنوں بعد ممبئی کے ایک سفر کے موقع پر مولانا مرحوم کی عیادت کرنے اور ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا، مولانا نے نہایت مخلصانہ استقبال کیا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا اور کافی دیر تک آپریشن اور صحت کے حالات بیان کرتے رہے، عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر ہوئی، لیکن انہوں نے حکماً مجھ کو نماز کی امامت کے لئے منتخب کیا، اور باصرار پڑھانے کا حکم دیا۔

مولانا مختار احمد ندویؒ کے بارے میں میرا ایک تأثر

مجھے یاد ہے کہ اثناء سفر میں اکثر مولانا سے سعودی عرب میں ملاقات ہوئی، اور ایک دفعہ ۱۹۸۳ء میں "توعیہ" کے مہمانوں کے ساتھ ان سے ملاقات ہوئی، اور کچھ دنوں تک ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، میں نے ان کو تمام معاملات میں ایک پابند اور عقیدۂ توحید کا علمبردار پایا، اور ان کے شب و روز کو دیکھ کر ان کے ساتھ حسن ظن میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔

اپنی ذات میں انجمن

مولانا اپنی ذات میں فرد فرید ہونے کے ساتھ ایک انجمن تھے، اور انجمن ساز تھے، اور دعوت الی اللہ کے میدان میں بڑی حیثیت کے مالک تھے، شرک و بدعت سے متنفر اور توحید و شریعت سے وابستہ، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نائب صدر بھی تھے، اور دل کی گہرائیوں سے امت کو ایک رشتہ میں پرودینے کی انتہائی تمنا رکھتے تھے، وہ مسلکی بنیاد پر ملت کے اجتماعی اور بنیادی کاموں میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہونے دیتے تھے، ان کے اخلاق بلند تھے، اور تواضع ان کا شعار تھا، وہ مزاح میں گفتگو کرنے کے مخالف نہیں تھے، اس لئے کہ

حضور اکرمؐ نے مزاح بھی فرمایا ہے، سنت کے پابند اور فرائض پر کار بند رہنا ان کا شیوہ تھا، ۹ر ستمبر ۲۰۰۷ء مطابق ۲۸ رشعبان ۱۴۲۸ھ بروز دوشنبہ مختصر علالت کے بعد ممبئی میں اپنی قیام گاہ پر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی، اور پورے ملک میں اور ملک سے باہر ان کی وفات پر لوگوں نے افسوس کیا اور ان کو خراج عقیدت پیش کیا، یقیناً وہ ایک بلند قامت انسان تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کے بیش قیمت آثار چھوڑ کر آخرت کی راہ لی، اور ان کی عمر ۷۷ یا ۷۸ برس کی تھی، اب مولانائے مرحوم کے صاحبزادگان میں جناب محمد اسلم صاحب اور مولانا اکرم صاحب ندوی اور ان کے چھوٹے صاحبزادے مولوی ارشد صاحب ندوی ان کے جانشیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے عفو وکرم کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمائیں، ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ عطا فرمائیں۔

الدار السّلفیہ کا قیام اور اسلامی تراث (Islamic Heritage) کی اشاعت

شیخ مختار احمد سلفیؒ نے اپنی علمی اور تحقیقی پیاس بجھانے کے لئے جو ادارہ الدار السّلفیہ کے نام سے قائم کیا تھا اس نے علم وتحقیق کے میدان میں اور خاص طور سے علم حدیث کی تحقیق وطباعت کے سلسلے میں بہت وسیع خدمت انجام دی، مناسب ہوگا کہ اس کی کچھ تفصیلات اس موقع پر پیش کردی جائیں:

یہ ادارہ شہر بمبئی میں جو ہندوستان کا عظیم اور معتبر شہر سمجھا جاتا ہے اور اس کو بمبئی عظمی کے نام سے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں، اسی شہر کے ایک قدیم علاقہ میں ۱۹۷۵ء میں مولانا مختار احمد ندوی نے یہ ادارہ قائم کیا اور جلد ہی وہ عالمی شہرت کا حامل بن گیا، اب یہ شہر بہت زیادہ وسعت اختیار کرچکا ہے، اور نیو بمبئی کے نام سے اس کے جوار میں ایک ترقی یافتہ شہر قائم ہوچکا ہے اور برابر اس کا پھیلاؤ جاری ہے۔

الدار السّلفیہ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ آزاد ہندوستان کا سب سے پہلا علمی ادارہ ہے، جو تحقیق وتالیف کے بہترین ذرائع ووسائل اور (Latest) ترقی یافتہ مشینوں

سے آراستہ ہے، تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا، اس ادارہ نے اپنے بنیادی مقصد میں تحقیق وطباعت کے ساتھ دعوت اسلامی کو پیش نظر رکھا، زندگی کے تمام معاملات میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا اور ہر طرح کے مسلکی تعصب اور ذاتی آراء سے محفوظ رکھنے کا بیڑا اٹھایا، اسی ادارہ نے سب سے پہلے ''اسلامی تراث'' اور سنت کے تمام اعمال کو زندہ کر کے شرک وبدعت سے جنگ کا اعلان کیا، سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنے کو اور مشرکانہ اور جاہلی رسم ورواج سے مسلمانوں کے ذہنوں کو آزاد کرانے پر اپنی خاص توجہ مرکوز کی، عربی زبان میں جو اہم مطبوعات اس ادارہ سے شائع ہوئیں، ان کی تعداد ۷۰ رسے زیادہ ہیں، اس کے علاوہ مختلف زبانوں میں بھی کتابیں اشاعت پذیر ہیں، حدیث وتفسیر کی جو اہم کتابیں عربی زبان میں اس ادارہ سے شائع ہوئیں ان میں چند کتابوں کے نام ذکر کئے جاتے ہیں:

(۱) ''المصنف في الأحاديث والأخبار'' یہ چوتھی صدی ہجری کے محدث ابوبکر بن أبي شیبہ العیسی کی کتاب ہے، یہ ۱۵ ر جلدوں میں الدار السّلفیہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

(۲) پانچویں صدی ہجری کے عالم مکی بن حموش کی التبصرة في القر أت السبع ہے۔

(۳) ''کتاب الأمثال في الحديث'' چوتھی صدی ہجری کے عالم ابوالشیخ الأصفهانی کی کتاب ہے۔

(۴) چوتھی صدی ہجری کے عالم أبو محمد الرامهرمزي کی ''أمثال الحديث'' ہے۔

(۵) تیسری صدی ہجری کے عالم ابوبکر بن عاصم النبل کی کتاب "کتاب فیه ذکر الدنیا والزهد فیها" ہے۔

(۶) نویں صدی ہجری کے عالم ابوحامد مقدسی کا رسالہ "رسالة في الرد علی الرافضة" ہے۔

(۷) آٹھویں ہجری صدی کے مصنف ابن جماعۃ کی ''مناسبات تراجم ابواب البخاري'' ہے۔

نئی مطبوعات میں تفسیر سورۃ الاخلاص امام ابن تیمیہ کی تصنیف ہے، الدار السلفیۃ کے ایک رکن ڈاکٹر عبد العلی عبد الحمید جو مرکز تحقیقات اسلامی کے مدیر تھے، کی تحقیق سے شائع ہوئی، یہ ایک بہت ہی مفید اور قیمتی کتاب ہے جو الدار السّلفیہ سے شائع ہوئی اور سورۂ اخلاص کی تفسیر پر مشتمل ہے، اس میں توحید کے وہ مسائل مندرج ہیں جس نے متکلمین اور فلاسفہ کی عقلوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا ہے، اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں غلطیاں بہت زیادہ تھیں، اس کا تقاضا تھا کہ اس کتاب کو تحقیق وتعلیق کا نیا لباس پہنا کر الدار السّلفیہ کی طرف سے شائع کیا جائے۔

فہارس المصنف لابن أبي شيبة کی طباعت واشاعت

مصنف ابن ابی شیبہ کی فہرست دو حصوں میں الدار السّلفیہ نے شائع کیا ہے، اس میں احادیث مرفوعہ، آثار موقوفہ اور اعلام رواۃ کی پوری ابجدی فہرست ہے، یہ کتاب تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بہت زیادہ مفید ہے، اور ہر مطلوبہ حدیث پر آسانی کے ساتھ واقفیت کا ذریعہ ہے، پانچویں صدی ہجری کے عظیم حافظ حدیث ابوبکر احمد بن الحسین البیھقی کی الجامع لشعب الایمان، جو احادیث کا نادر مجموعہ ہے، بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ یہ احادیث کا انسائیکلو پیڈیا ہے، اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھی، کئی سال تک الدار السّلفیہ کے ذمہ داروں نے اس کی تحقیق وتخریج میں زبردست محنت کی، باصلاحیت اہل علم سے کام لیا، اور جزء اول سے تا آخر یہ کتاب تحقیق وتخریج کے زیور سے آراستہ ہوکر ۱۵؍جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اور الدار السّلفیہ کے ذمہ داروں کی اجازت سے اس کے ایڈیشن عالم عربی کے ناشرین نے بھی شائع کئے ہیں، یہ کتاب اہل علم اور اہل تحقیق کے لئے یکساں طور پر ضروری اور مفید ہے۔

الجامع لشعب الایمان کی اشاعت پر

اس کتاب کو الدار السّلفیہ کے بانی اور اس کے روح رواں مولانا شیخ مختار احمد سلفی ندویؒ نے الدار السّلفیہ سے شائع کی، کتاب کی پہلی جلد میں بحیثیت ناشر کے اپنے خیالات

کا اظہار اس طرح کیا ہے:

”الدار السّلفیہ کے لئے انتہائی خوشی کی بات ہے کہ وہ اسلامی کتب خانہ کے لئے نادر کتابوں کا مجموعہ بہترین طباعت کی شکل میں پیش کرے، ان کتابوں میں سب سے اہم کتاب امام بیہقی کی کتاب الجامع لشعب الایمان ہے جو پہلی مرتبہ الدار السّلفیہ کی طرف سے زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آرہی ہے، اس کتاب کی تحقیق وتخریج اور ترتیب وتعلیق ڈاکٹر عبد العلی عبد الحمید نے کی ہے، اس کتاب کی اشاعت پر الدار السّلفیہ کو اہل علم کی طرف سے مبارک باد کے پیغامات موصول ہوئے، جو الدار السّلفیہ اور ہم سب کے لئے باعث فخر اور حوصلہ افزا ہیں، الدار السّلفیہ نے قدیم اسلامی علوم کو منصۂ شہود پر لانے میں بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

جب میں یہ دیکھتا تھا کہ دمشق و بیروت اور مصر وشام سے عربی زبان میں علم حدیث پر لکھی ہوئی تحقیقات نہایت خوبصورت شکل میں شائع ہورہی ہیں تو میری خواہش ہوتی تھی کہ اس انداز سے اسلامی علوم پر قدیم لکھی ہوئی کتابوں کو خوبصورت انداز میں شائع کرنے کا موقع ملے، اس کے لئے میں نے کوشش کی اور اللہ کے فضل وکرم سے ایسی مشین اور آلات سے مزین بہترین اور عظیم الشان پریس فراہم ہوگیا جس کے ذریعہ ہماری یہ تمنا پوری ہوئی، اس کے ذریعہ سے ہم نے اسی انداز سے مخطوطات کی تحقیق وتخریج اور تعلیق وترتیب کے ساتھ زمانہ قدیم میں لکھی ہوئی کتابوں کو شائع کیا، جیسا کہ الدار السّلفیہ کی مطبوعات کے ضمن میں ذکر آچکا ہے، مجھے سب سے زیادہ جن لوگوں سے تعاون حاصل ہوا، وہ الدار السّلفیہ کے ممبران اور اس کو کامیاب بنانے میں کوشش کرنے والے حضرات میں جناب ڈاکٹر عبد العلی عبد الحمید ہیں، جنہوں نے امام بیہقی کی ”الجامع لشب الایمان“ کی مکمل طور پر تحقیق وتخریج کی اور یہ اہم ترین تصنیف جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھی، منصۂ مشہود پر آگئی، اور ہر ملک کے اسلامی مکتبات میں اس کی تمام جلدیں پہونچ گئیں، اور اس کتاب کا مکمل دوسرا ایڈیشن بھی عرب ممالک کے مکتبات کی طرف سے شائع ہو چکا ہے“۔

اس کتاب کے محقق جناب ڈاکٹر عبدالعلی عبدالحمید اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی اشاعت اور اس کے بہترین شکل میں شائع ہونے کے لئے میں اپنے محترم بھائی شیخ مختار احمد ندوی جو الدار السّلفیہ کے بانی ہیں، کا احسان مانتا ہوں، شیخ مختار احمد ندوی ہندو بیرون ہند میں سنت نبوی کے فروغ اور بدعات سیۂ کے ازالہ میں اپنی مخلصانہ کاوشوں کی وجہ سے معروف ہیں، مجھے یاد ہے کہ اس علمی کام کے آغاز سے چند سال قبل انہوں نے مجھ سے کہا، اس وقت تک میں نے یہ کتاب دیکھی بھی نہیں تھی، صرف یہ جانتا تھا کہ یہ حدیث شریف کی ایک کتاب ہے، انہوں نے مجھ سے پھر اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے کہا، میں اپنے آپ کو اس عظیم کام سے قاصر پاتا تھا، وہ برابر مجھ سے اصرار کرتے رہے اور مسلسل اس کام کی ترغیب دیتے رہے، چنانچہ میں نے ان کی درخواست قبول کرلی، چونکہ میں نائیجیریا میں ملازم تھا وہاں سے استعفیٰ دے کر الدار السّلفیہ کے لئے یکسو ہوگیا، جب میں نے کتاب کو دیکھا اور متعدد نسخے پیش نظر آئے تو معلوم ہوا کہ یہ کام بڑا دشوار گذار اور مشکل ہے اور یہ غیر معمولی محنت کا طالب ہے، میرا احساس تھا کہ اس کام کے بالمقابل پہاڑ کو کھودنا زیادہ آسان ہے، چنانچہ میں نے استخارہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگی، اللہ رب العزت نے میری تقویت فرمائی اور اپنے فضل خاص سے نوازا''

بہت مناسب ہوگا کہ اس موقع پر سیرت نبوی علی صاحبھا ألف ألف تحیۃ وسلام کی ایک کتاب جو ''رحمۃ للعالمین'' کے نام سے شیخ سلیمان منصور پوری کی دستاویزی کتاب سمجھی جاتی ہے اس کا تذکرہ کر دیا جائے، اردو زبان میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے، اس حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے قطر کے مشہور عالم دین شیخ عبداللہ ابراھیم الانصاری کے ایماء پر الدار السّلفیہ سے عربی میں شائع ہوئی، اس کتاب کا ترجمہ مرحوم شیخ ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری صاحب نے کر کے عربی زبان جاننے والوں پر احسان کیا، اور یہ اہم کتاب تمام ممالک میں پہونچی، اس عظیم کام کو شیخ ندوی نے اپنے اہتمام و ذمہ داری میں پورا کرایا، اور

الدار السّلفیہ کی طرف سے اس کو تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔

عالم عربی میں مولانا مختار احمد ندوی کی دعوتی کوششوں کے آثار

شیخ مرحوم مولانا مختار احمد سلفی ندویؒ نے اپنے اعتدال اور علم حدیث کے خادم کی حیثیت سے امت اسلامیہ کی قائدانہ اور داعیانہ نمائندگی کی اور اسلامی وحدت کو بروائے کار لانے کے لئے انہوں نے اپنی تمام معنوی اور مادی توانائیوں کو اخلاص وللّٰہیت کی روح کے ساتھ صرف کیا، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق کامل اور داعیانہ مزاج سے نوازا، انہوں نے ہر جہت سے عقیدۂ توحید کے علم کو بلند کیا، اور اندرون ملک اور عالم عرب میں ہر جگہ اپنے امتیاز کی وجہ سے مقبولیت ومحبوبیت حاصل کی، میں نے شیخ ندوی کو ہر دینی، علمی اور دعوتی وفکری اجتماعات کانفرنسوں، سیمیناروں اور مختلف جماعتوں کے دینی امور میں حصہ لیتے ہوئے دیکھا ہے۔

جب بھی وہ سعودی عرب تشریف لیجاتے تو وہاں کے کبار علماء ان کا از حد اکرام کرتے تھے اور حدیث وسنت کے نشر واشاعت کے سلسلے میں ان سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے تھے، وہ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن بازؒ سے بہت گہرا اور داعیانہ تعلق رکھتے تھے، کئی دفعہ میرا ان کا توعیہ میں بھی ساتھ ہوا، امارات کے سفروں میں بھی اکثر ملاقات اور ساتھ بیٹھنے اور دینی معاملات میں گفتگو کرنے کا موقع ملا، جب بھی ریاض تشریف لیجاتے تو شیخ ابن بازؒ کے مہمان ہوا کرتے تھے اور امور شرعیہ ودینیہ اور علوم حدیث وکتاب میں ان سے استفادہ کرتے تھے، اکثر ایام حج میں وہ توعیہ اسلامیہ کے پروگراموں میں انہیں کی دعوت پر شرکت کرتے تھے، کئی دفعہ میرا ان کا توعیہ میں بھی ساتھ ہوا، امارات کے سفروں میں بھی اکثر ملاقات اور ساتھ بیٹھنے اور دینی معاملات میں گفتگو کرنے کا موقع ملا، امارات میں سب سے پہلے ۱۹۷۰ء سے قبل حاکم شارقہ سمو الشیخ خالد بن محمد القاسمیؒ کے بے تکلف مہمان رہے، شیخ خالد ایک علمی اور دینی اونچے خاندان سے تعلق رکھنے کی بنا پر شیخ ندوی سے

بہت مانوس رہے، ۱۹۷۰ء میں میں بھی علامہ شیخ عبداللہ العلی المحمود کی دعوت پر سب سے پہلے شارقہ گیا، تو وہاں شیخ مختار احمد ندوی کے سفر کا چرچا سننے میں آیا، وہاں دوران قیام میری جب بھی سمو الشیخ خالد بن محمدؒ سے ملاقات ہوئی تو شیخ مختار اور ان کی علمی وجاہت کا ذکر کیا، وہ شروع شروع میں شیخ شارقہ کے مہمان ہوا کرتے تھے، بعد میں الغریر فیملی کے مہمان ہونے لگے، اور الغریر فیملی سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو وہ ان سے بہت مانوس ہوئے اور ان کا اکرام کیا، اس کے علاوہ متحدہ امارات کے رئیس سمو الشیخ زاید بن سلطان سے پوری طرح متعارف تھے، اور امارات کے دورے میں ان سے اور ان کے اہل تعلق سے ملاقات کرتے تھے، ان کے علاوہ دبئی کے شیخ راشد بن سعید آل مکتوم سے ان کے گہرے روابط تھے، اسی طرح دیگر امارات کے ذمہ داروں سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں میری ان سے کویت میں ملاقات ہوئی اس وقت وہ کویت کے مرد مسلمان اور ایک بڑے عالم خاندان کے نمائندہ جناب عبداللطیف الشائع اور ان کے بھائی صالح الشائع کے مہمان خاص تھے، وہ مجھ کو بھی اپنے ساتھ ان کی مجلس میں لے گئے، مولانا کی گفتگو سے سارے اہل مجلس ان کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے، میں نے بھی کچھ دیر گفتگو کی، کویت کے حکام اور وہاں کے عالی مرتبت شیخ ابو بدر عبداللہ بن علی المطوع، ان کے برادر بزرگ جناب عبدالعزیز بن علی المطوع سے بڑے گہرے روابط تھے، کویت کی داعیانہ علمی شخصیت شیخ طارق العیسی سے ان کے گہرے روابط تھے، ان کا وہ نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا کرتے تھے، یہ حضرات بھی جب بمبئی کا سفر کرتے تو مولانا ان کے لئے قیام اور علاج وغیرہ کا انتظام نہایت اچھے انداز سے کرتے، ان کو اپنے اداروں اور خاص طور سے الدار السلفیہ کی زیارت کا موقع فراہم کرتے تھے، قطر میں وہاں کے حاکم آل ثانی کے خاندان سے ان کے گہرے روابط تھے، شاہی خاندان کے وزیر داخلہ شیخ خالد آل ثانی سے ان کے مراسم نہایت بے تکلفانہ اور دوستانہ تھے۔

وہ اپنی علمی اور دینی وجاہت کی بنا پر ہر جگہ نہایت مقبول تھے اور التفات خاص کی نعمت سے بہرہ اندوز، مولانا نے جب مئو میں مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک دینی ادارہ ''جامعہ فاطمۃ الزہراء للبنات'' جس کا ان کے آبائی ادارے مدرسہ عالیہ سے الحاق تھا نئی ترتیب کے ساتھ قائم کیا تو اس کے سالانہ جلسہ کے موقع پر اس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا، اور اصرار کے ساتھ اس میں شریک ہونے کے لئے فرمایا، میں ان کی بات کو ٹال نہ سکا، جب عالیہ اسپتال کے قیام کا فیصلہ ہوا تو اس کے سنگ بنیاد کی تقریب میں سنگ بنیاد رکھنے کے لئے میرے والد معظم حضرت مولانا محمد ایوب صاحب شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل کو دعوت دی، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اور مجھے بھی ان کے ساتھ شرکت کرنے کا حکم دیا، وہ تقریب بھی بہت پر اثر تھی، ملک کے علماء وفضلاء اور عام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، ان کی موجودگی میں سنگ بنیاد رکھنے کا عمل پورا ہوا، میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں نہ صرف بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرائیں، بلکہ بہت سے مدرسے اور ادارے بھی قائم کئے۔

مناسب ہوگا کہ اخیر میں ان کا ایک خط بھی شائع کردیا جائے:

برادر گرامی محترم حفظکم اللہ وبارک لکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دونوں گرامی نامے موصول ہوئے، محترم شیخ صاحب ابھی پرسوں ہی واپس بمبئی تشریف لائے ہیں، آج ان سے استفسار کیا تو کل انہوں نے بلایا ہے، اگر کل ہی صبح ملاقات ہوگئی تو کل ہی، ورنہ پرسوں جمعرات کو انشاء اللہ حسب حکم وہدایت عمل کروں گا، میں الحمد للہ اب بالکل صحت مند ہوں اور آپ کی دعا سے کچھ مفید علمی کاموں میں مشغول ہوگیا ہوں، ادھر کنونشن (غالباً جمعیت اہل حدیث کنونشن کی طرف اشارہ ہے) کی وجہ سے زندگی کے دوسرے معمولات بیحد متاثر تھے، اب سکون خاطر نصیب ہوا ہے، حضرت مولانا

علی میاں صاحب سے بس سرسری ملاقات رہی، مولانا برھان الدین صاحب وڈاکٹر اشتیاق قریشی صاحب ودیگر حضرات سے بھی ملاقات بڑی تشنہ رہی، جس کا افسوس ہے، ان تمام حضرات کو سلام عرض کردیں گے۔

میں انشاء اللہ عیدالاضحیٰ کی نماز بمبئی میں پڑھا کر اسی دن شام کی گاڑی سے مئو کے لئے روانہ ہوں گا، البعث کے لئے مضمون کی تسوید میں لگا ہوں۔

باقی سب خیریت ہے۔

والسلام

مختار احمد ندوی

اس طرح مولانا مختار احمد ندوی نے اپنی پوری زندگی کتاب وسنت کی تعلیمات کو پھیلانے اور حدیث وسنت سے متعلق نادر کتابوں کا ایک ذخیرہ شائع کرنے کا بڑا کارنامہ انجام دیا، وہ جہاں بھی گئے نہایت عزت واحترام سے نوازے گئے، ان کی مقبولیت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی، اور انہوں نے اللہ کے دین اور اس کی دعوت کو عام کرنے اور علوم اسلامیہ کی نشرواشاعت کے لئے ایک بہترین مثال اپنے پسماندگان کیلئے چھوڑی، اور اللہ کے دربار میں حاضر ہوگئے، ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے یہ آیت پڑھنے کا جی چاہتا ہے "ومن يطع الله والرسول فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقا" وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وعلى آله واصحابه أجمعين۔

مولانا قاضی معین اللہ ندویؒ
بافیض شخصیت کی چند جھلکیاں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے دست راست اور سفر وحضر میں ان کے رفیق خاص مولانا معین اللہ ندویؒ کی وفات سے دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس سے وابستہ مدارس ومکاتب کی فضا سوگوار ہوگئی، اور یہاں کے طلباء اور علماء وفضلاء خاص طور پر حضرت مولانا کے لئے یہ اندوہناک خبر انتہائی صدمہ کا باعث بنی۔

یہ حادثہ پیر کی صبح تقریبا چار بجے مورخہ ۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۳ر اگست ۱۹۹۹ء پیش آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا معین اللہ صاحب مرحوم حضرت مولانا کے بڑے مخلص اور بہت ہی قریب (شاگرد) تھے چنانچہ مولانا مرحوم حضرت مولانا کے سفر وحضر میں اکثر ساتھ رہتے تھے، اور حضرت مولانا کے آرام وراحت کا ہمیشہ بڑا خیال رکھتے تھے، مولانا مرحوم بہت ہی فکر مندی کے ساتھ اپنی ذمہ داری انجام دیتے تھے، انہوں نے حضرت مولانا کی نگرانی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندر اور باہر کئی بڑے اور اہم منصوبے پورے کئے، اور بہت سی ایسی گرانقدر خدمات انجام دینے کی توفیق ان کو حاصل ہوئی، جو ندوۃ العلماء کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ تھیں۔

مولانائے مرحوم ومغفور کا سانحۂ ارتحال ان کے آبائی وطن اندور مدھیہ پردیش میں تقریبا دو سال کی مسلسل علالت کے بعد پیش آیا، مولانا مرحوم کو لہے کی ہڈی ٹوٹ جانے

کے بعد سے برابر صاحب فراش تھے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے، اس کے باوجود بھی مولانا مرحوم اپنی طاقت بھر دینی فرائض وواجبات کی ادائیگی کے لئے کوشاں رہے، اور آخر تک انھوں نے حضرت مولاناؒ اور ندوۃ العلماء کے دیگر ذمہ داروں سے اپنے قدیم ودیرینہ تعلقات کو استوار رکھا اور یہ حقیقت ہے کہ سارے معاملات بحسن وخوبی اپنے وقت پر انجام پاتے رہے اور یہ اندیشہ بالکل نہیں تھا کہ مولانا مرحوم نے اپنے رب کے بلاوے کو رات کے اس مبارک وافضل پہر یعنی تہجد کے وقت قبول کیا (جس کے مولانا مرحوم عنفوان شباب ہی سے عادی تھے) اور اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

''آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے''

مولانا مرحوم ندوۃ العلماء کے ان ابنائے قدیم میں تھے، جنھوں نے یہاں سے فراغت چالیسویں دہے میں حاصل کی تھی، مولانا مرحوم حضرت مولانا کے خاص محبوب ترین تلامذہ میں تھے۔ انھوں نے فراغت کے بعد حضرت مولانا سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا، اور انھیں کے مشورہ سے ''جماعت تبلیغ'' سے منسلک ہو گئے اور جماعت کے ذمہ داروان اور کارکنان، خاص طور سے بانی جماعت حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے استفادہ کیا، اسی شوق وتعلق کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت مولانا نے ۱۹۵۰ء میں عالم عربی اور بلاد مقدسہ کا دعوتی وتبلیغی سفر فرمایا تو مولانا مرحوم ومغفور حضرت مولانا مدظلہ کے رفیق خاص قرار پائے اور حضرت کے ساتھ ۱۹۵۱ء میں مصر، سوڈان اور بلاد شام کا سفر کیا۔

مولانا مرحوم ومغفور دعوتی سفر سے واپسی کے بعد ندوۃ العلماء کے استاذ ونگراں مقرر ہوئے، انھوں نے یہ ذمہ داری بحسن وخوبی پوری امانت اور دیانت داری اور اخلاص ولگن کے ساتھ انجام دی، پھر مولانا مرحوم ندوۃ العلماء کے ''شعبہ تعمیر وترقی'' میں منتقل کئے گئے، مولانا مرحوم نباض وقت تھے، چنانچہ انھوں نے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ضروریات کی تکمیل کے لئے کچھ عملی منصوبے اور کارآمد پروگرام مرتب کئے نیز طلباء کی رہائش گاہیں، مسجد

چند دفاتر، اور کچھ درجوں کی ضروری تعمیرات کی طرف پوری توجہ کی۔

مولانا مرحوم ومغفور نے حضرت مولانا کے حسب منشاء قرآن کریم کے حفظ وتجوید کے لئے معاہداور دیہات وگاؤں میں ابتدائی مکاتب اور متوسط وثانوی تعلیم کے لئے مدارس کا ایک جال بچھا دیا۔ ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کے مطابق پورے ہندوستان میں اور دیگر پڑوسی ممالک میں بھی اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہی ابتدائی مدارس ومکاتب اعلیٰ تعلیم کے مدارس وجامعات کے قیام اوران کے دارالعلوم سے الحاق کرانے کی ہندوستان گیر کوشش کا پیش خیمہ ثابت ہوئے، اس وقت ایک محتاط اندازہ کے مطابق ملحقہ مدارس وجامعات کی تعداد ۳۰۰ رتین سو سے اوپر تک جا پہنچی ہے، یہ مدارس وجامعات ہندوستان کے تمام بڑے صوبوں میں اور پڑوسی ممالک ملیشیا، نیپال، بنگلہ دیش اور برطانیہ تک میں موجود ہیں۔

مولانا مرحوم ومغفور دینی مدارس ومکاتب میں خالص دینی ودعوتی فضا بنانے کے لئے بہت زیادہ فکرمند رہا کرتے تھے، چنانچہ وہ مدارس کے ذمہ داران طلباء اور علماء کو جماعت تبلیغ (فی سبیل اللہ) میں نکلنے پر آمادہ کرتے تھے، اور خیر وصلاح کے طالبین کو علماء صادقین کی صحبت، اوران سے ربط وتعلق رکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، تاکہ ان کے اندر اخلاص وتقویٰ کی روح موجزن ہواوراسی طرح ان کا اپنے رب سے تعلق مستحکم وپائیدار ہو، یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم اکثر وبیشتر طالبان علوم نبوت اور علماء وفضلاء کو حضرت مولانا مدظلہ العالی، ان کی تربیتی مجالس، اورن کے علمی ودینی ارشادات اوران کی جامع الکمالات شخصیت سے استفادہ کرنے پر ابھارتے رہتے تھے۔

اخیر دور میں مولانا مرحوم ندوۃ العلماء کے ایک طویل عرصہ تک نائب ناظم رہے، اورانھوں نے اس ذمہ داری کو پورے اخلاص، توجہ اور لگن کے ساتھ انجام دیا، اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا کہ ان کے دور میں ندوۃ العلماء اوراس کی فکر بلنداوراس کے اثرات وخدمات

کا حلقہ وسیع تر ہو، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سرپرستی میں اس کے نصاب تعلیم اور دیگر امور میں خاطر خواہ اضافہ ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ہر جگہ اس کے اثرات محسوس کئے گئے۔

اخیر وقت میں مولانا مرحوم نے نیابت کی یہ ذمہ داری بغیر کسی معاوضہ کے انجام دی اور اپنی وفات سے تین ماہ قبل انھوں نے اپنی معذوریوں کے پیش نظر یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی مفوضہ ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں، چنانچہ یہ اہم ترین ذمہ داری انجام دینے کے لئے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے فیصلہ کے مطابق نائب ناظم کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے، نیز حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو نائب ناظم کی خصوصی تنخواہ دیئے جانے کا بھی فیصلہ ہوا جس کو انھوں نے نامنظور کر دیا اور اپنی پرانی تنخواہ کو ہی قبول کرتے رہنے پر راضی رہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور ندوۃ العلماء کے مصالح وضروریات میں ان کی دن رات کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ آمین

اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، مغفرت کا معاملہ کرے، آخرت میں ان کے اچھے کاموں کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور لغزشوں کو معاف فرما کر جنت الفروس میں جگہ مرحمت فرمائے نیز ان کے اہل وعیال کو صبر وسکون دے، اور ان کو حضرات انبیاء صدیقین اور شہداء وصالحین کے زمرے میں شریک فرمائے۔ اور تمام اہل تعلق کو صبر جمیل اور دعائے مغفرت کی توفیق سے نوازے۔

کل نفس ذائقة الموت وانماتوفون اجورکم یوم القیامة فمن زحزح عن النار وادخل الجنة فقدفاز، ومالحیاة الدنیا الامتاع الغرور

ہر جان موت کا ذائقہ ہے، اور بلاشبہ تم کو قیامت کے دن تمہارے اجر پورے پورے دیئے جائیں گے۔ پس جو جہنم کی آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب ہو گیا، اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔

حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ

نقوش وتأثرات

چودہویں صدی ہجری کے ممتاز علماء

ہمارے علمائے کرام کی صفوں میں اس وقت جس تیزی کے ساتھ ایک خوفناک خلا پیدا ہوتا جارہا ہے، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے، اور یہ علم وعمل کے میدان کا ایک ایسا زبردست خسارہ ہے جس کی تلافی بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے، اگر جائزہ لیا جائے تو چودہویں صدی ہجری کے شروع ہونے کے بعد ہی سے نہ صرف ہمارے اس ملک بلکہ پورے عالم اسلام میں طبقۂ علماء کے درمیان سے بہت سی عظیم شخصیتیں آنا فانا اٹھ گئیں، ان میں بطور مثال شیخ عبدالقدوس الأنصاری، محمد الحرکان، قاری محمد طیبؒ، الأستاذ صالح العثماوی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت باشا، مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مولانا منت اللہ رحمانی، شیخ عمر بہاء الأمیری، شیخ محمد محمود الصواف، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ عبداللہ بن علی المحمود، شیخ محمد الغزالی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا محمد منظور نعمانی، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الأعظمی، شیخ عبداللہ بن زید آل محمود، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مولانا عبدالحلیم جونپوری، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبیداللہ الرحمانی، شیخ علی طنطاوی، ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی، ڈاکٹر مصطفیٰ احمد الزرقاء، شیخ محمد المجذوب، مولانا عبدالکریم پاریکھ، ڈاکٹر انور الجندی، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، علامہ صالح بن عثیمین، شیخ محمد بن علی المحمود، حضرت مولانا ابرار الحق حقی، شیخ عبداللہ علی المطوع، شاہ فہد بن عبدالعزیز۔

حضرت مولانا محمد انظر شاہؒ کی وفات حسرت آیات

ابھی حال ہی میں ہندوستان جیسے ملک کے محدث اعظم اور دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم ادارے کے شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند، دارالعلوم وقف دیوبند کے شیخ الحدیث اور مفسر قرآن، طبقۂ علماء میں اپنی امتیازی حیثیت رکھنے والے اور عوام الناس میں بے حد مقبول حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی رحمۃ اللہ علیہ نے علالت کے ایک مختصر وقفہ کے بعد اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی، اور اپنے رب کے حضور میں اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ حاضر ہوگئے، یہ واقعہ ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء مطابق ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ کی صبح کو دہلی کے ایک اسپتال میں پیش آیا، إنا لله وإنا إليه راجعون۔

ان کی اس ناگہانی وفات کی خبر بیک وقت ذرائع ابلاغ سے نشر ہوئی، اور نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں یہ اندوہناک خبر پہونچی اور طبقۂ علماء پر بجلی بن کر گری، بلکہ بیرونی ممالک میں بھی انتہائی افسوس اور رنج وغم کے گہرے جذبات کے ساتھ سنی گئی۔

مولانا مرحوم کی علمی اور سیاسی بصیرت

مولانا مرحوم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ علوم اسلامیہ میں محققانہ مرتبہ رکھتے تھے، حدیث اور علم حدیث پر انتہائی ماہرانہ حیثیت حاصل تھی، وہ تفسیر کے بڑے اور مثالی عالم شمار کیے جاتے تھے، اور دنیا کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے، اور اجتماعی مسائل پر ان کی نظر بہت گہری تھی، اسی طرح فقہ اسلامی میں ان کو ایک خاص مقام حاصل تھا، وہ سیاست کے راستہ سے اس ملک کے مسلمانوں کا جائز اور مکمل حق دلوانے کیلئے اہل سیاست سے تبادلۂ خیال کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے، وہ ہندوستان کے مدارس اسلامیہ کے مسئلہ میں مرکزی مدرسہ بورڈ کے ایک اہم ممبر کی حیثیت سے اپنے بیش قیمت خیالات کو حکومت کے سامنے پیش کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ فروغ انسانی وسائل کے ذمہ دار جناب ارجن سنگھ کی بلائی ہوئی میٹنگوں میں نہایت پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے، انہوں نے

بنام راقم ایک خط میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

برادر عزیز القدر مولانا سعید الرحمٰن الأعظمی ندوی عافاکم اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ آپ جملہ اہل خانہ کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں۔

آپ سے ملاقات کو عرصہ ہو گیا، اس لئے اشتیاق بڑھ گیا ہے، ایک خوش خبری آپ کو سنا دوں کہ حال ہی میں مرکزی حکومت کی طرف سے تشکیل شدہ ''اقلیتی تعلیمی بورڈ'' کا اس حقیر کو بھی ممبر منتخب کیا گیا ہے۔

دعا کریں کہ حق تعالیٰ اس ناچیز کو دین کی اور مسلمانوں کی صحیح خدمت کرنے کا جذبہ عطاء فرمائے، اور یہ ادارہ مدارس اور مسلمانوں کے لئے بہتر خدمت کا ذریعہ ہو۔

دعوات صالحہ میں فراموش نہ کریں۔

نوٹ: کتابیں ہدیۃً ارسال ہیں، اگر عربی کتب پر آپ تبصرہ بھی کر دیں تو نوازش ہوگی۔

انظر

۲۶/۶/۲۵ھ

خلیجی ممالک کے دعوتی اسفار

آج سے تقریباً آٹھ، دس سال قبل خلیجی ممالک کے احباب کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے تو درس قرآن کے ساتھ عوامی اجتماعات کا بھی لوگوں نے اہتمام کیا اور دونوں مجلسوں میں برصغیر کے دیندار مسلم حضرات نہایت جوش وخروش کے ساتھ شرکت کرتے تھے، اور دینی فوائد حاصل کر کے اپنی قسمت پر نازاں وفرحاں تھے، ان حضرات نے مولانا مرحوم کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کیا، اور ان کی خدمت کی انجام دہی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

''جامعۃ الإمام محمد أنور'' کا قیام اور ماہنامہ ''محدث عصر''

حضرت مولانا محمد انظر شاہ علم وعمل کے میدان میں اپنی امتیازی شان کے ساتھ ایک

بڑے مصنف اور باخبر صاحب قلم تھے، ان کے باکمال قلم سے بہت سی کتابیں شائع ہوئیں ، وہ ''محدث عصر'' کے نام سے ایک علمی اور تحقیقی ماہنامہ نکالتے تھے، اور علماء کے بڑے طبقہ میں ہر جگہ اس کا استقبال ہوتا تھا، اور اب بھی اس کا سلسلہ جاری ہے، لوگ اس کو ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے اور مستفید ہوتے ہیں، انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت علامہ شاہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے علمی افکار وخیالات کو کتابی اور تحریری شکل میں پیش کرنے کے لئے ''معہد الأنور علامہ انور شاہ'' کے نام سے دیوبند میں ایک ادارہ قائم کیا، جہاں شعبۂ نشر واشاعت کے ساتھ اسلامی تعلیم وتربیت کا بنیادی عمل انجام پانے لگا، اور بعد میں اس کو ''جامعۃ الإمام محمد أنور شاہ کشمیری'' کے نام سے پہچانا گیا، اور اب جامعہ ہی کے شعبۂ نشر واشاعت کی طرف سے ماہنامہ ''محدث عصر'' شائع ہونے لگا اور جامعہ کے نصاب کے مطابق تعلیمی شعبہ سرگرم عمل ہوگیا، ماہنامہ ''محدث عصر'' میں حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ مسعودی کشمیری افتتاحیے کی شکل میں اپنے خیالات ونظریات کو تحریر فرماتے رہے۔

اس ماہنامہ کے ایک شمارہ میں مسلمانوں کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں جو عذاب الٰہی ظالم وجابر حکمرانوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس کی ایک مؤثر تصویر پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''خدائے برحق کا ارشاد ہے کہ'' ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت أیدی الناس'' پھر ہمارا یقین اور ایمان ہے کہ خدا اور اسکے مقدس رسول ﷺ کا ارشاد یا پیشین گوئی یا پیش آمدہ واقعات کی جو بنیاد بیان کی جاتی ہے، وہ کبھی غلط نہیں ہوسکتی، پیشانی میں مذکور آیت اسی حقیقت کا سراغ دیتی ہے کہ جو کچھ پیش آرہے ہیں حوادث ہوں یا واقعات، ہولناک مراحل ہوں یا کٹھن منزلیں، یہ سب انسانوں کی بداعمالیوں اور ان ہی کے کرتوت کا نتیجہ ہے، خدا جب راضی ہوتا ہے تو اقتدار پسندیدہ ہاتھوں میں، ناراض ہو تو ظالم وجابر حکمراں مسلط ہوتے ہیں، آفات سماوی وارضی یہ بھی بندوں کے فساد عمل اور مفسدانہ حرکات کا نتیجہ ہیں، آج صدر امریکہ جارج بش جو ایک

عذاب اور قہر الٰہی بن کر چنگیزی کردار کا مظاہرہ کر رہا ہے وہ ہم اسلامیان عالم کے بدترین اعمال کی مجسم شکل ہے، تاریخ میں ہے کہ چنگیز اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے مفتوحہ سرزمین کی جامع مسجد میں آکر رکا تو وہاں سیکڑوں علماء اور ارباب جبہ و دستار دست بستہ کھڑے تھے، چنگیز نے سوال کیا: یہ کون ہیں؟ تو جواب یہ تھا کہ یہ شمس العلماء ہیں، یہ قاضی القضاۃ شیخ الاسلام اور یہ مفتی دیارِ عرب، چنگیز نے کہا: ''اچھا'' ''اچھا'' غیظ و غضب اور چنگیزی تمسخر کا مظاہرہ تھا، بولا اور پورے طرارے کے ساتھ کہ ان سب کو ہمارے اصطبل میں پہنچا دو، اور ہمارے فوجیوں کے گھوڑوں کی خدمت میں لگا دو۔

یہ وہ وقت ہے جب امراء اسلام، بادشاہاں وقت، شاہی وزراء و امراء عیاشیوں میں ایسے پھنسے کہ دامن فکر آخرت ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا، بقول غالب:

سنبھلنے دے مجھے اے ہجوم نامرادی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

امریکہ نے روس کی طاقت کو پاش پاش کرنے، اس کے کمیونزم نظام کے پرخچے اڑانے کے لئے ان ہی مولویوں کے قلم سے کام لیا، قلم دوڑ پڑے، کاغذات سیاہ کر دیئے گئے، تردیدی لٹریچر وجود پذیر ہو گیا، اور الماریوں کی زینت بن گیا، جب نظریۂ کمیونزم پاش پاش ہو گیا تو روسی طاقت کے ڈھانچہ پر یلغار کی گئی، طالبان مجاہدین اسلام قرار دیئے گئے، اور افغانستان کی پہاڑیاں بدر و احد کی زمینیں بنا دی گئیں، کمیونزم کے خلاف طاقتوں کا جب نشانہ پورا ہو گیا تو ان ہی مجاہدین کو دہشت گرد کہا جانے لگا، گویا کہ کل کے مجاہد آج کے شیاطین، کہنے دیجئے کہ ہندوستان میں جب تک علماء جنگ آزادی میں محاذ آراء رہے تو مجاہد کہلائے، آزادی کی جنگ سر کر لی گئی تو دہشت گرد قرار دیئے گئے، اور وہ مدرسے جنہیں حریت پسندوں کا مرکز کہا جاتا آج انہی مدارس کو دہشت گردی کے مرکز بتایا جا رہا ہے، اور

وہاں کی پیداوار کواُ گرو ادی قرار دیا جارہا ہے بع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو“(۱)

حالات حاضرہ اور مولانا مرحوم

اس طرح وہ ان تمام قدیم وجدید فتنوں سے آگاہ تھے جو اسلام کی حقانیت اور اسکے دوام وخلود کو چیلنج کرتے تھے، نئے فتنوں کے بارے میں ان کی معلومات خاصی وسیع تھیں، وہ مسلمانوں کی پستی اوران کی مغلوبیت کے راز سے اچھی طرح واقف تھے، وہ برابر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس کی طرف اشارہ کرتے رہے، موجودہ دور میں دنیا کی طاقتور حکومتوں اور مغربی طرز زندگی کی طرف سے اسلام کے خلاف ان کے منصوبوں پر گہری نظر رکھتے تھے، اور مغرب کے تہذیبی اور فکری حملوں کے ساتھ عسکری جارحیت کے نتائج کا بنظر غائر انہوں نے مطالعہ کیا تھا، اور امت مسلمہ کو گھیرنے اور ذلت ونکبت سے دوچار کرنے کی اس مہم سے اس درجہ تک مطلع اور باخبر تھے کہ اس کا مقابلہ کرنے کی جو تدبیریں ہوسکتی تھیں ان کو بروئے کار لانے کی جدوجہد میں پوری طرح مصروف اور فکرمند تھے، وہ اپنے تلامذہ اور احباب کے حلقے میں برابر اس موضوع پر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے، اور امت مسلمہ کو اٹھانے اور اسکو اپنے مقام قیادت پر واپس لانے کے سلسلہ میں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات پر عمل کرنے کو امت کی عزت وسعادت کا بنیادی ذریعہ سمجھتے تھے۔

فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی میں علامہ کشمیری کا کردار

برطانوی سامراج کی طرف سے عقیدۂ ختم نبوت کو مٹانے کے لئے ایک ایسے نامراد انسان کی ضرورت تھی جو اس حقیر اور بدترین خدمت کا اپنے آپ کو اہل ثابت کرسکے، اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے انگریزی استعمار نے اس وقت بڑی کامیابی حاصل کی، جب قادیان کے رہنے والے ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی نے اس کے سامنے سرنگوں ہوکر اپنی

---

(۱) محدث عصر نومبر ۲۰۰۶

خدمات پیش کیں، اور اپنی بدنصیبی کی وجہ سے اس نے انگریز کی غلامی کو فخریہ انداز میں قبول کرلیا، اوران کے زیر تربیت رہ کر قادیانیت کے نام سے ایک فرقۂ باطلہ کی بنیاد رکھی، جس کا اصل مقصد خاتم النبیین ﷺ کی ختم نبوت کا انکار اور سلسلہ نبوت کے جاری رہنے کا اعلان کیا، اوران کے بعد اپنے آپ کو عالم انسانیت کا نبی بنا کر پیش کیا۔

لیکن بہت سے علماء نے عقیدۂ ختم نبوت کا انکار کرنے والے لوگوں کے ساتھ احتیاط کا رویہ اپنایا اوران پر کفر کا فتوی لگانے کی فوری طور پر ہمت نہیں کی، لیکن جب قادیانیت کا یہ فتنہ انگریزی سامراج کی سرپرستی میں برگ وبار لانے لگا اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے بیج بونے کے لئے ہمہ تن تیار ہو گیا، تو علامہ مرحوم محمد انظر شاہ کے والد معظم محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ایمانی حمیت جوش میں آئی اور وہ اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے انتہائی بے چینی کا شکار ہوئے، اور اپنے آپ کو اپنی تمام توانائیوں اور علمی تحقیقات کے ساتھ اس تازہ ترین فتنہ کی سرکوبی کے لئے تیار کرلیا، اور ''خاتم النبیین'' کے نام سے فارسی زبان میں ایک کتاب تصنیف فرمائی جو علامہ کی سب سے آخری تصنیف ہے۔(۱)

علامہ مرحوم مولانا سید محمد انظر صاحب نے اس کتاب کے تعارفی مضمون میں لکھا ہے:

> ''جس وقت ''قادیانیت'' نے سر اٹھایا تو واقعات شاہد ہیں کہ خود اکابر دارالعلوم ''القادیانی'' کے بارے میں متردد تھے، چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ قادیانیوں کو کافر قرار دینے میں محتاط رہے، لیکن جوں جوں قادیانیت کے پٹارے سے سپولیوں کے بعد سانپ اور اژدہے نکلنے لگے تو حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ نے اپنے فتویٰ کا رخ بدل دیا، پھر تو بات یہاں تک پہونچی کہ مرحوم ہی کے مسترشد بلکہ معروف مجاز شاہ

---

(۱) یہ کتاب فارسی زبان کے علمی اسلوب میں تصنیف کی گئی، اس کا اردو ترجمہ ہمارے برادر بزرگ مخدوم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن اعظمیؒ سابق استاد جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند نے کیا اور اس سے اردو داں طبقہ کے لئے محدث عصر کے افکار وخیالات سے آگاہ ہونے کی راہ آسان ہوگئی۔

عبدالرحیم رائے پوری علیہ الرحمۃ نے حکیم نورالدین کو (جو بعد میں قادیانی کا خلیفہ بلافصل ہوا) دیکھتے ہی فرمایا: ''مجھے تمہاری پیشانی میں کفر نظر آرہا ہے'' اور محتاط رہنے کی تلقین فرمائی، لیکن ''اِنک لاتھدی من اُحببت، ولکن اللہ یھدی من یشاء اِلی صراط مستقیم'' اسے بھی نہ بھولنا چاہئے کہ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم لدھیانوی کے آباء واجداد جس طرح جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں کفن بردوش حریت پسندوں کے ساتھ براہِ راست دہلی پہونچے، انہیں کے آباء کرام سب سے پہلے قادیانیت کے خلاف استفتاء کرنے والے ہیں، اور حضرت گنگوہی کو مبنی براحتیاط موقف چھوڑ کر کفر کا بے لاگ فیصلہ کرنے پر انہیں نے ہی مجبور کردیا۔

بہرحال ہزاروں علماء، شعراء، مصنف، مولف، مقرر، واعظ، عوام وخواص جنہوں نے قادیانیت کا سر کچلنے کے لئے اپنی حیات کا ایک ایک لمحہ صرف کیا، اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو منور فرمائے، اور شفیع الامم ﷺ کی بہترین شفاعت انہیں نصیب ہو۔

اب ادھر آیئے، جس انیق تصنیف کا ترجمہ اس وقت آپ کے زیر مطالعہ ہے، وہ عالم اسلام کی ممتاز شخصیت امام المحد ثین رئیس العلماء حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی آخری تصنیف ہے، جن کے بارے میں مشہور محقق ومحدث علامہ کوثری نے فرمایا کہ حافظ ابن ہمام کے بعد اس بلند وبالا حیثیت کا کوئی عالم اس دنیا میں نظر نہیں آتا، جس نے ذخیرۂ احادیث سے استخراج مسائل میں ایسی کامیاب دقتِ نظری کا مظاہرہ کیا ہو''۔(۱)

علامہ کشمیری کی سوانح ''نقش دوام'' مولانا مرحوم کے قلم سے

مولانا مرحوم محمد انظر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی سوانح ''نقش دوام'' کی صورت میں پیش کیا، اس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات مبارکہ کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے، ان کی تحقیقات علمیہ،

(۱) خاتم النبیین: ۳۶۔۳۷

تصنیفات وتالیفات اوران کے بعض علمی تفردات کا ذکر بھی کیا ہے، قرآن کریم کے اعجاز اور اسکی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے ترکیبی اعجاز، اعجاز قرآن اور دقائق اسلوب قرآن کا نہایت شرح وبسط کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

اس کتاب کا مقدمہ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نہایت اہتمام کے ساتھ تحریر فرمایا تھا، اوراس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی امتیاز اور علمائے سلف کے مطابق ان کی بلند قامت شخصیت کا ذکر کیا ہے، اور مذاہب باطلہ سے بیزاری اوران کے بارے میں پوری معلومات رکھنے اوران مذاہب کے مبلغین سے مناظرہ کرنے کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی فراست ایمانی اور تبحرِ علمی کے ساتھ ان کے ظاہری ہیبت وجلال کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حضرت شاہ صاحب کی ہستی ان مبارک اور معدودے چند ہستیوں میں سے ایک ممتاز ہستی ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، اور صدیوں کو علم وفضل سے رنگین کر جاتی ہیں، حضرت مرحوم کا علم اگر متقدمین کی یاد تازہ کرتا تھا تو ان کا عمل سلف صالحین کو زندہ کئے ہوئے تھا، اور اسوۂ سلف کے لئے نمونہ ساز تھا، علم، حافظہ، تقویٰ، طہارت اور زہد وقناعت مثالی تھی، علمی حیثیت سے ہم تلامذہ انہیں ''چلتا پھرتا کتب خانہ'' کہا کرتے تھے، اور علمی حیثیت سے جو ہمہ جہت اتباع سنت کے نور میں ڈھلا ہوا تھا، اکثر بیشتر ان کے عمل ہی سے مسائل معلوم کر لیتے تھے، اور مسئلہ وہی نکلتا تھا جو ان کا عمل ہوتا تھا، ان کے روشن چہرہ پر ایمان کی چمک اس طرح نمایاں تھی کہ غیر مسلم بھی دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے تھے کہ اگر اسلام مجسم صورت میں آتا تو وہ علامہ انور شاہ کی صورت میں ہوتا''۔

چنانچہ آج سے ستر یا اسی سال قبل جبکہ حضرت شاہ صاحب جوان العمر تھے، مظفرنگر کے اک جلسۂ مناظرہ میں جو مسلمانوں اور آریوں کے درمیان ہوا تھا، حضرت مرحوم بھی

دار العلوم دیوبند کی طرف سے اپنے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ کے ساتھ شرکت جلسہ کے لئے تشریف لے گئے، اور اسٹیج پر تشریف فرما تھے تو آریہ مبلغ نے کھلے لفظوں میں کہا تھا کہ ''اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جاتا تو آج مجھے مولانا انور شاہ کی صورت دیکھ کر مسلمان ہو جانا چاہئے تھا جن کے چہرے ہی پر اسلام برستا ہوا دکھائی دیتا ہے'' درس حدیث کے لئے جب حضرت مرحوم اپنے قیام کے کمرے سے درسگاہ کی طرف چلتے ہوئے نظر آتے، تو ہم لوگوں میں ایک دوسرے کو آمد کی اطلاع دینے کے لئے بے ساختہ جو کلمہ زبان زد تھا، وہ یہ تھا کہ ''جاء الشیخ الثقۃ الأمین'' جو در حقیقت ان کے ظاہری و باطنی کمالات کی وجہ سے خود بخود قلوب میں وضع ہو گیا تھا، درس میں اس وقار سے بیٹھتے جیسے کوئی پُر رعب و ہیبت بادشاہ اپنی رعایا کے سامنے تخت نشین ہو، کلام نہایت باعظمت، متین اور علمی مواد سے لبریز ہوتا اور نقل و رواۃ کی قسم سے جو بھی دعوی فرماتے اسی وقت کتب متعلقہ کھول کر اسکی عبارت سامنے کر دیتے، کتب حدیث کا ڈھیر خصوصیت سے سامنے رکھا ہوا تھا، درس میں تبحر اور تفقہ دونوں یکساں چلتے تھے، درسِ حدیث فقط فن حدیث تک محدود نہ تھا، بلکہ جمیع علوم وفنون کے حقائق پر مشتمل تھا۔''(۱)

''تصویر انور'' شاہ صاحب کی شخصیت کا ایک حسین مرقع

۱۹۷۷ء میں سری نگر کشمیر کے اندر وہاں کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ جناب شیخ عبداللہ کی دعوت پر ایک سیمینار منعقد ہوا، اس کا مقصد شاہ صاحب کی شخصیت کی جامعیت کا ایک خوبصورت اور دلکش مرقع تیار کرنا تھا، اس میں اس بات کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا کہ حضرت شاہ صاحب کے اجل تلامذہ ان کی عظیم شخصیت اور یکتائے روزگار ہستی کا، مقالات کے اندر اپنے افکار و تجربات اور اپنے تاثرات کو پیش کریں۔ چنانچہ سیمینار میں نہ صرف شاہ صاحب سے علمی استفادہ کرنے والے شاگردوں نے شرکت کی بلکہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ

(۱) نقش دوام ص: ۱۰-۱۱

عبداللہ نے سیمینار کا افتتاح کیا ان کی تقریر انتہائی دلپذیر اور معلومات سے معمور تھی۔

اس سیمینار کو منعقد کرنے اور کرانے کا سہرا حضرت شاہ صاحب کے دونوں فرزندان گرامی حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر اور حضرت مولانا انظر شاہ مسعودی (رحمہما اللہ) کے سر بندھتا ہے، خاص طور سے حضرت مولانا سید انظر شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے سیمینار کو منعقد کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا، اور اس کے لئے سرزمین کشمیر (جو ان کا وطن اصلی تھا) کا انتخاب کیا، اور اسے اس مقصد کے لئے تیار کیا، انہوں نے بارہا اس اہم ترین خدمت کو انجام دینے کے لئے شیخ عبداللہ مرحوم کی توجہ مبذول کرائی اور بذریعہ مراسلت وملاقات اس اہم علمی جلسۂ مذاکرہ کو منعقد کرانے میں اپنی تمام تر کوششوں کے مثبت نتائج برآمد ہونے پر انتہائی مسرت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔

اس سیمینار میں نابغۂ روزگار حضرت شاہ صاحب کی شخصیت پر نہایت منتخب اور مستند مضامین کا ذخیرہ جمع ہوگیا، اور شاہ صاحب کی زندگی کے روشن پہلوؤں پر مشتمل ان کے کبار تلامذہ کے نہایت پر مغز اور معلومات افزا تحریروں کا اتنا بڑا ذخیرہ اگر کسی کتاب میں یکجا موجود ہے تو وہ ''تصویر انور'' ہے، اس کتاب کے مرتب اور مدون حضرت مرحوم مولانا سید انظر شاہ مسعودی تھے، انہوں نے اس کتاب کو شائع کر کے علمائے اسلام کے طبقہ پر ایک احسان کیا ہے، اس سے علامہ مرحوم کی جامعِ کمالات ہستی اور ان کی عبقری شخصیت بڑی حد تک تاریخ اسلامی کے آئینہ کو جلا بخشے گی۔

اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اپنے پیغام میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مجھے امید ہے کہ سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں اور تاثرات کی اشاعت سے ایک ایسی مستند تاریخی دستاویز تیار ہوسکے گی، جو آج کے

معاشرہ میں اور آنے والی نسلوں کے لئے اصلاح اور رہنمائی کا حق ادا کر سکے گی۔''

''نفحۃ العنبر'' پر مولانا مرحوم کا مقدمہ

علامہ مرحوم سید محمد انظر شاہ محدث کبیر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کی عربی تصنیف ''نفحۃ العنبر فی حیاۃ إمام العصر الشیخ أنور'' پر عربی زبان میں مقدمہ لکھتے ہوئے لکھا ہے کہ امام العصر کے بلند علمی مرتبہ کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ ابن الھمام کے بعد احادث شریفہ کے مفاھیم سے نہایت نادر علوم کا استنباط کرنے میں وہ اپنی مثال آپ تھے، اسی طرح شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ اسلامی تاریخ کی پانچ آخری صدیوں میں کوئی ایسا عالم عبقری نہیں پیدا ہوا جو شاہ صاحب کی ہمسری کر سکتا، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے لکھا ہے کہ اسلامی تاریخ کے آخری پانچ صدیوں کے علوم کو اگر جمع کیا جائے تو وہ شاہ صاحب کے علوم کی زکوۃ کے برابر نہیں ہو سکتے۔

علامہ کشمیری کی دیگر تصنیفات

علامہ مرحوم نے اپنے مقدمہ میں ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی اہم ترین عربی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: صحیح بخاری پر ان کی تقریروں کا مجموعہ ''فیض الباری'' چار جلدوں میں اور ''العرف الشذی علی سنن الترمذی'' اور ''معارف السنن علی الترمذی'' اور ''أنوار المحمود علی سنن أبی داوٗد'' اور ''سنن ابن ماجہ'' کا تعلیق وتحشیہ اور ''آثار السنن'' جو حدیث کے اہم ترین ایک ہزار مراجع پر مشتمل ہے اور مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔

امام العصر کے باکمال شاگرد

امام العصر کے باکمال شاگردوں کے بارے میں شاہ محمد انظر شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ہزار شاگردوں کا تذکرہ کیا ہے جو نہ صرف فن حدیث میں مشہور ہوئے بلکہ ان کو امتیازی

حیثیت حاصل ہوئی، ان کے شاگردوں میں محدث کبیر شیخ محمد یوسف بنوری تنہا اپنے استاد حضرت شاہ صاحب کے لئے بالکل ایسے ہی تھے جیسے ابن القیم اپنے استاذ ابن تیمیہ کے لئے اور قاسم بن قطلو بغا اپنے استاذ سخاوی کے لئے، شیخ بنوری تنہا وہ شاگرد رشید ہیں جنہوں نے امام العصر کے علوم سے زبردست استفادہ کیا، اور ان کے علوم کا تعارف نہ صرف اپنے شاگردوں کے حلقے میں کرایا، بلکہ پورے برصغیر ہندوستان میں ان کی عظیم خدمات اور ان کے علوم ومعارف کو پھیلانے کی کوشش کی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاذ کی حیات اور ان کے کارناموں پر ''نفحۃ العنبر'' کے نام سے عربی زبان میں کتاب شائع کر کے عالم عرب کو بھی ان کی عبقریت اور ان کے علوم ومعارف کے خزانوں سے متعارف کرایا۔

اس مختصر مضمون کے اندر امام العصر کے باکمال اور قابلِ فخر تلامذہ کرام جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے تعارف کرانا ممکن نہیں ہے اس لئے انہیں مختصر اشارات پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم کی ہشت پہل شخصیت

حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ مسعودی (اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے) بذات خود ایک زبردست عالم دین، محدث اور مفسر ہونے کے ساتھ وہ اسلامی تاریخ میں گذرے ہوئے علمائے سلف کا ایک قابل تقلید نمونہ تھے، وہ علم کی گہرائی، اخلاق کی بلندی اور وسعتِ معلومات میں اپنی مثال آپ تھے، اپنی صلاحیتوں میں وہ ایک زبردست ادیب کی شان رکھتے تھے، ایک بلند پایہ خطیب کی حیثیت سے عوام وخواص میں اپنی ایک خاص پہچان رکھتے تھے، وہ اگر چہ امام العصر، فخر المحد ثین حضرت مولانا سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے آخری فرزند تھے، لیکن قدرت نے انہیں اپنے والد گرامی کے نقش قدم پر چلنے اور علم وتقوی کا روشن مینار بننے کی سعادت عطا فرمائی، وہ اخلاص اور پاکیزگی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینے کے قائل تھے، اور اپنے نقطۂ نظر کا برملا اظہار کرتے تھے، ان کا تفسیری مطالعہ

بہت گہرا تھا اور انسانی زندگی کے حالات اور اس کے مزاج کو سمجھنے اور حالات حاضرہ کا قرآنی اشارات کی روشنی میں جائزہ لینا ان کی خاص صفت تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کا درسِ قرآن ہر جگہ بہت زیادہ مقبول تھا، اور لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوتے تھے۔

اسی کے ساتھ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کے لئے اپنی زندگی وقف کررکھی تھی، اور اپنی انتظامی صلاحیت کی بناء پر ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے، انہوں نے دارالعلوم کے تعلیمی منہج کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کا کام انجام دیا، انہوں نے علماء کی قدردانی اور ان کے مقام سے لوگوں کو واقف کرانے کے لئے "تنظیم علمائے ہند" کے نام سے ایک جمیعۃ قائم کی تھی، وہ اخیر تک اس کے صدر رہے، وہ اپنی ان تمام خصوصیات کی بنا پر علمائے دیوبند کے نمائندہ اور ان کے جانشین قرار پائے، انہوں نے دعوت اسلامی کے سلسلہ میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو مسحور کیا، اور اسلام کی عظمت واہمیت کا سکہ ان کے دلوں میں بٹھایا، وہ ایک استاد ومربی کی حیثیت سے اپنے ہزاروں شاگردوں کے درمیان ایک خاص معتبریت کی شان کے مالک تھے، انہوں نے بیرونی اور مغربی ممالک کا سفر بھی وہاں کے لوگوں کی دعوت واصرار پر کیا، اور مقبولیت حاصل کی، اور دعوت الی اللہ کے میدان میں نہایت قیمتی خدمات انجام دینے کی توفیق حاصل کی۔ ان کی تصنیفات میں "الفیض الجاری" "تراجم ابواب" "تفردات کشمیری" "نقشِ دوام" "تصویر انور" "تقریر شاہی" "اسمائے حسنی کی برکات" "خطبات کشمیری" "فروغ سحر" "گل افشانی گفتار" قابل ذکر ہیں۔

اسی کے ساتھ وہ میدان صحافت کے شہ سوار تھے، چنانچہ وہ ملک کے طول وعرض سے نکلنے والے رسالوں اور اخبارات میں اپنے پرمغز مضامین شائع کرتے تھے، انہوں نے ابتداءً "ہادی دیوبند" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور بعد میں اسے "نقشِ دیوبند" کے نام سے شائع کیا، وہ ایک عرصہ تک دیوبند سے نکلنے والے پندرہ روزہ اخبار "یثرب دیوبند" کی ادارت کرتے رہے، اور ۲۰۰۱ء میں انہوں نے "محدث عصر" کے نام سے ایک ماہنامہ

جاری کیا، جو برابر پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے ان کو مختلف اداروں سے ایوارڈ بھی دیا گیا، اور ۲۰۰۳ء میں عربی زبان کی خدمات پر صدر جمہوریہ ایوارڈ بھی ان کو حاصل ہوا، اور بھی مختلف اداروں کی طرف سے انکی پذیرائی کی گئی، وہ معہد الانور کے بانی تھے، جو بعد میں ''جامعۃ الانور'' کے نام سے پہچانا گیا، اور اسکی تمامتر ذمہ داریوں کو صاحبزادہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی نے اٹھایا، اور اب وہ اپنے والد مرحوم کے جانشیں اور ان کے شروع کئے ہوئے مختلف کاموں کے ذمہ دار قرار پائے۔

حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ عرصۂ دراز تک محسوس کیا جاتا رہے گا، اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہی اسکے پُر کرنے اور اس عظیم خسارہ کی تلافی کی امید کی جاتی ہے، ان کی وفات حسرت آیات کسی محدود حلقہ کا نقصان نہیں ہے، بلکہ یہ پوری ملت اسلامیہ کا زبردست خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے اسکی تلافی فرما کر پوری ملت پر احسان فرمائیں۔

عربی شاعر نے شاید کسی ایسے ہی موقع پر کہا تھا۔

وما كان قيس هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمتوں کی بارش ان کی تربت پر نازل فرمائیں، اور تمام خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرمائیں اور ان کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائیں، اور تمام سوگواروں کو صبر وتسلی عطا فرما کر مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی توفیق بخشیں۔

☆☆☆

مولانا ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلیؒ

تاریخ ساز شخصیت

علمائے فرنگی محل کی شہرت ونا موری ملا نظام الدین کے ذریعہ ان کے تیار کردہ نصاب تعلیم وراس کے جاری کرنے سے ہوئی، ان کے والد ماجد ملا قطب الدین تھے، جو قصبہ سہالی ضلع بارہ بنکی کی طرف نسبت رکھتے تھے، ملا قطب الدین علوم وفنون میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اور عزلت وگوشہ نشینی کی زندگی گذارتے تھے، وہ اپنے درس وتدریس میں پورا انہاک رکھتے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اورنگ زیب کی ملاقات کی دعوت کو مسترد کردیا، اور عدیم الفرصتی کا اظہار کر کے حاضر ہونے سے معذرت ظاہر کردی، اور وہ اپنے تعلیمی مشغلے اور تدریس کی خدمت میں برابر مصروف رہے، لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے اپنے مخالفین کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا، یہ واقعہ رجب ۱۱۰۳ھ، مطابق مارچ ۱۶۹۲ء کو پیش آیا۔

اس سلسلہ میں علامہ شبلیؒ نے مقالات میں لکھا ہے:

> ”سہالی میں مشہور دو خاندان آباد تھے، انصاری حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے تھے، عثمانی حضرت عثمانؓ کی اولاد سے تھے، ملا قطب الدین انصاری تھے............ایک دن عثمانی ملا قطب الدین کے گھر چڑھ آئے، اور ان کو قتل کر کے گھر میں آگ لگادی۔“

ملا قطب الدین جو ملا نظام الدین کے والد ماجد تھے، انہوں نے اپنے زمانہ تدریس میں ایک نصاب تیار کیا تھا، جس پر وہ خود کاربند تھے، اس کے بعد ان کے صاحبزادے ملا

نظام الدین نے اس کو اپنا لیا، اور طلبائے علوم دینیہ کو درس دینا شروع کیا، پھر یہ نصاب تعلیم درس نظامی کے نام مشہور ہوا، اور ارباب مدارس نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اس نصاب کی بنیادی کتابیں آج بھی داخل درس ہیں۔

ملا نظام الدین کی چھٹی پشت میں سابق امام عیدگاہ مولانا ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلی تھے۔ مولانا مرحوم سے میری پہلی ملاقات حضرت مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی کے دولت کدے پر اس وقت ہوئی تھی جب ایک روسی وفد جو مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کی قیادت میں ہمارے دار العلوم میں آیا تھا، اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ان کا استقبال کیا تھا، ان کے اعزاز میں ایک ترحیبی جلسہ منعقد ہوا تھا، اس میں حضرت مولانا نے استقبالی تقریر فرمائی تھی، اور اس کے جواب میں مفتی ضیاء الدین بابا خانوف نے عربی میں تقریر کی تھی۔ اس وفد نے فرنگی محل کے مشہور عالمی ادارے کو دیکھنے اور وہاں کے علماء سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی، تو حضرت مولاناؒ کے حکم سے میں وفد کے ہمراہ فرنگی محل گیا تھا، جہاں ان کے استقبال میں علمائے فرنگی محل موجود تھے، جن میں مولانا مفتی محمد رضا انصاری صاحب اور مولانا مفتی ابوالطیب احمد میاں صاحب، حضرت مولانا ہاشم میاں صاحب کے دولت کدے پر تشریف رکھتے تھے، اور مہمانوں کی خاطر تواضع کے ساتھ گفتگو میں امام عیدگاہ مولانا مفتی احمد میاں صاحب بھر پور حصہ لے رہے تھے۔ یہ غالباً ۱۹۸۰ء یا اسکے آس پاس کا زمانہ تھا۔

فرنگی محل کے اس ادارے سے بہت جید اور ممتاز علماء پیدا ہوئے، ان میں چند حضرات کے اسماء گرامی کچھ اس طرح ہیں: ملا مبین فرنگی محلی جو معقولات کے بڑے عالم تھے، بحر العلوم علامہ عبد العلی فرنگی محلی، مولانا ابوالحسنات عبد الحی فرنگی محلی، مشہور عالم دین اور فقیہ، مولانا عبد المجید فرنگی محلی، مولانا قیام الدین محمد عبد الباری فرنگی محلی، مولانا عبد الرشید فرنگی محلی۔

حضرت مولانا ابوالطیب احمد میاں صاحب فرنگی محلی ۲۸ ردسمبر ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا عبد الرشید فرنگی محلی تھے، اس طرح آپ مولانا نظام الدین صاحب

کی چھٹی پشت میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا احمد میاں صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم فرنگی محل کے اپنے خاندان میں حاصل کی، اور یہیں سے انہوں نے علوم اسلامیہ کی تکمیل کی، پھر جب عصری علوم حاصل کرنے کا تقاضا ہوا تو آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اور B.S.C کیا، پھر دینیات سے ایم اے کی ڈگری آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات سے حاصل کی، اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں آپ لکھنؤ کی مشہور عیدگاہ عیش باغ کے امام عیدین مقرر ہوئے، اگر چہ اس وقت آپ کی عمر صرف ۱۸ ر سال تھی، کچھ لوگوں نے مخالفت بھی کی اور اس منصب اور عیدگاہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بھی بنایا، مگر ناکام رہے، اس واقعہ کے بعد آپ نے عیدگاہ کی حفاظت اور اس کے رقبہ کو مزید وسیع کرنے کے انتظامات نہایت اچھے پیمانہ پر کیا، اور اسی نقطہ پر آپ نے اپنی پوری توجہ مرکوز رکھی، اس کے نتیجہ میں آج عیدگاہ کے مشرقی حصہ میں جو شارع عام سے متصل ہے، ایک عظیم دینی مرکز تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا، چنانچہ وہاں مدرسہ نظامیہ کا قیام عمل میں آیا، اور ایک ہسپتال رفاہ عام کے لئے قائم کیا، اور اسلامک سنٹر آف انڈیا قائم فرمایا اور اس غیر آباد علاقے کو ہمہ دم آباد اور علم وفقہ اور تعلیم وتربیت کے ایک بڑے مرکز کی حیثیت سے محفوظ کردیا، اور غیر شرعی مطامع اور اس زمین پر قبضہ کرنے کے منصوبہ کو ناکام بنادیا، اس طرح کی کوششیں متعدد بار ہوئیں۔

فرنگی محل علمائے کبار کا مرکز رہا ہے، جہاں سے اس ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں علماء نے بھرپور شرکت کی، اور انگریزی سامراج کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصہ لیا، چنانچہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی قیادت میں ہندوستان کو انگریزی سامراج سے آزاد کرانے کے لئے جو مشورہ ہوتا تھا، اس میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور دیگر آزادی کے متوالے جمع ہوتے تھے، اور اس موضوع پر اپنی اپنی رائیں پیش کرتے تھے، اس میں جس رائے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے، تاکہ وہ جنگ آزادی میں حصہ لیں، اور ایک دوسرے کا تعاون کریں، اور انگریز کو اس ملک سے باہر نکالنے کے لئے جو تدبیریں ہوسکتی تھیں، ان میں ہر فرقہ کے لوگ

مسلک ومذہب کے اختلاف کونظر انداز کرکے ایک ایک جسم ہوکر اس لڑائی میں بھرپور حصہ لیں۔

مولانا ابوالطیب احمد میاں سابق امام عیدگاہ نے بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر ملک کی آزادی کے بعد کے حالات کو پیش نظر رکھ کر مختلف دینی اوراجتماعی تنظیموں کو قائم کیا، اور کسی مخالفت کی پروا کئے بغیر انہوں نے مدرسہ نظامیہ کی تعمیر نو کے ساتھ اسلامک سنٹر آف انڈیا بھی قائم کیا، اور جیسا کہ گذر چکا ہے کہ رفاہ عام کے طور پر ایک ہاسپٹل بھی قائم کرکے مفت علاج ومعالجہ کی طرح ڈالی، اور نہایت ہی وقار، مصالحانہ اسلوب اور نرم جوئی اور صلح جوئی کے انداز سے کام کرتے رہے، اور مسلمانوں کے مسائل اور ان کی روز افزوں مشکلات کا حل نکالنے کے لئے قد آور سیاسی لیڈروں سے بھی ملاقات کرنے اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کرنے سے گریز نہیں کیا۔

مسلم طالبات کی تعلیم وتربیت کے لئے مولانائے مرحوم نے مدرسہ نظامیہ للبنات قائم کیا، جس میں علوم اسلامیہ اور عربی زبان وادب کی تعلیم کا انتظام ہوا، یہ اور دیگر تمام ادارے اب ان کے صاحبزادے اُن کے جانشیں کی سرپرستی میں چل رہے ہیں، میری مراد مولانا خالدرشید فرنگی محلی نظام الدین محمد فرنگی محلی سے ہے، انہوں نے جانشینی کا پوراحق ادا کرتے ہوئے تمام تنظیموں اور اداروں کو نہ صرف باقی رکھا ہے، بلکہ ان میں وسعت وترقی کے آثار بھی ہویدا ہو چکے ہیں۔

مولانا مرحوم نے اپنے علمی ذوق وگہرائی کی بنا پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب مجموعۃ الفتاوی، مجموعۃ الخطب، مختصر القدوری، ہدایۃ النحو، اعلام فرنگی محل بمافي نزھۃ الخواطر، مشاہیر فرنگی محلی اور ان کی علمی خدمات، مولانا عبدالباری فرنگی محلی: حیات وخدمات اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا اجلاس عام منعقدہ مارچ ۲۰۱۰ء کی روداد کی طباعت کا انتظام اپنی نگرانی میں کرایا۔

مولانا مرحوم کی سرپرستی میں بہت سے سیمینار اور کانفرنسیں اعلی سطح پر اسلامک سنٹر آف انڈیا کے زیر انتظام منعقد ہوئیں، ان میں خاص طور سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اکیسواں

اجلاس، بچوں کی لازمی اور مفت تعلیم کا قانون، دہشت گردی کے الزامات اور عالمی سطح پر فقہ الاقلیات کا سمینار اور مئی ۲۰۱۱ء میں عالمی پیمانہ پر سیمینار علمائے فرنگی محل کی خدمات کے موضوع پر مولانا مرحوم کی سرپرستی میں عیدگاہ کے میدان میں منعقد ہوئیں، اسی طرح مولانا مختلف تنظیموں اور اداروں کے سرپرست اور مرکزی چاند کمیٹی کے صدر تھے، اور ہمیشہ ان کی طرف سے رؤیت ہلال کا اعلان ہوا کرتا تھا، جس کا ہر طبقہ میں اہمیت کے ساتھ استقبال کیا جاتا تھا۔

علمائے فرنگی محل اور علمائے ندوہ کے مابین علمی اور فکری رشتہ قائم رہا، حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کے والد ماجد علامہ عبدالحی حسنیؒ کا علمی تعلق فرنگی محل کے علماء سے قائم تھا، اسی طرح حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ علمائے فرنگی محل کے قدرداں، ان کی خدمات کے معترف تھے، بلکہ مخلصانہ گہرا تعلق رکھتے تھے، اسی طرح علمائے فرنگی محل ندوہ سے نہ صرف یہ کہ گہرا تعلق رکھتے تھے، بلکہ مختلف مواقع پر ندوہ تشریف لایا کرتے تھے، اخیر زمانہ میں میں نے دیکھا کہ مولانا مفتی رضا انصاری صاحب رحمہ اللہ برابر حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ملنے اور ان کی خدمت میں کچھ وقت گذارنے آیا کرتے تھے، مولانا ابوالطیب احمد میاں رحمہ اللہ بھی اکثر تشریف لایا کرتے تھے، مولانا محمد ہاشم صاحب فرنگی محلی تو حضرت مولانا کے تقریباً ہر کام میں شریک تھے، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کے بورڈ کے ممبر تھے، دینی تعلیمی کونسل کے سرگرم رکن تھے، وہ حضرت مولانا کی خدمت میں اکثر ندوہ کے مہمان خانہ میں تشریف لایا کرتے تھے، اور حضرت مولانا ان حضرات کا بے حد احترام فرمایا کرتے تھے، ندوہ سے اسی تعلق کی بنا پر حضرت مولانا ابوالطیب احمد میاں رحمہ اللہ نے اپنے دونوں صاحبزادگان مولانا طارق رشید فرنگی محلی اور مولانا خالد رشید فرنگی محلی کو ندوہ میں تعلیم کے لئے شروع سے داخل کیا، اور الحمد للہ ندوہ سے فراغت حاصل کی، اور ایک با توفیق ندوی ہوکر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

”مولانا احمد میاں کے چند خواب تھے، ایک یہ کہ اس عیدگاہ کی حفاظت

،اس کی توسیع اور ترقی کے بہتر انتظامات کئے جائیں،دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے تمام مسالک میں باہمی اتحاد کی فضا قائم کی جائے،تا کہ ملت اسلامیہ کے مسائل اجتماعی طور پر حل کئے جائیں۔تیسرے یہ کہ علمائے فرنگی محل کے دینی، علمی،تعلیمی اور ثقافتی مشن کو فروغ دیا جائے اور ان کے نامکمل کاموں کی تکمیل کی جائے،خدائے رحمٰن ورحیم کے فضل وکرم سے ان کے صاحبزادے مولانا خالدرشید فرنگی محلی کے قائم کردہ اسلامک سنٹر آف انڈیا فرنگی محل کی شکل میں ان خوابوں کی حسین تعبیر نظر آ رہی ہے۔اللھم زد فزد۔

سنٹر کے اعلی وارفع مقاصد کی تکمیل کے لئے شعبۂ دعوت وتبلیغ،شعبہ امور مساجد،شعبہ تعلیم وتربیت،دارالافتاء ،دارالقضاء،عبدالحی فرنگی محلی فقہ اکیڈمی،شعبہ نکاح،مولانا عبدالمجید فرنگی محلی کتب خانہ،شعبہ تحقیقات ونشریات،میڈیا سیل اور شعبہ نشر اشاعت جیسے کارآمد شعبے سرگرم عمل ہیں‘‘۔

اس مضمون کا حق ادا کرنے کے لئے ایک بڑا دفتر نا کافی ہے،میں اپنے اس مختصر مضمون کے ذریعہ مولانائے مرحوم کی خدمات اور ان کے روشن کارناموں کو بیان کرنے سے بڑی حد تک قاصر رہا،یہ چند سطریں خانوادۂ فرنگی محل اور مولانا احمد میاں صاحب سے عقیدت کے ایک رمز کے طور پر پیش کرنا اپنے لئے باعث سعادت تصور کرتا ہوں،اور مولانا خالدرشید اوران کے افراد خاندان کے لئے دل کی گہرائیوں سے یہ تمنا رکھتا ہوں کہ ملت کے اس عظیم اور فرد فرید کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے حدیث شریف میں مذکور صدقہ جاریہ کو مولانا مرحوم کے لئے ایک دائمی حقیقت بنا دیں گے،اور ولد صالح کا مصداق بن کر اپنے والدین کی روح کے لئے تسکین وانبساط کا باعث ہوں گے اور دیگر علمی خاندانوں کے فرزندوں کے لئے بیش قیمت نمونہ پیش کریں گے۔اللہ تعالی مولانا مرحوم کو اپنے بیش قیمت ردائے رحمت ومغفرت میں چھپالیں،اور جنہت الفردوس کے اعلی ترین مقام میں نبیین،صدیقین،شھداء وصالحین کے ساتھ قیام کرنے کا فیصلہ فرمائیں(آمین)۔

حضرت مولانا مجیب اللہ ندویؒ

علم وتحقیق اور فقہ اسلامی کا عظیم سرمایہ

مولانا مجیب اللہ ندوی کا سانحۂ وفات علمی اور دینی حلقوں کے لئے صاعقہ اثر ثابت ہوا، خاص طور پر دار العلوم ندوۃ العلماء، اس کے فضلاء، فارغین، اور دینی دعوت وفکر کے حاملین اور فقہ اسلامی کے ماہرین نے ہند وبیرون ہند اُن کی وفات سے ایک ایسا خلا محسوس کیا، جس کو بآسانی پُر نہیں کیا جاسکتا، وہ انتقال سے قبل ضعف و بیماری سے متاثر رہے، لکھنؤ کے سحر اسپتال میں جناب ڈاکٹر محمد غوث صاحب کی نگرانی میں ان کا علاج جاری رہا، کچھ حالت اچھی ہوئی تو اپنی قیام گاہ اعظم گڑھ چلے گئے، پھر صحت پر مرض کا حملہ ہوا، سحر اسپتال لائے گئے، اور ایک مہینے تک زیر علاج رہے، بالآخر جمعہ کے روز ۱۳ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۲ مئی ۲۰۰۶ء کو دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کی خبر ملتے ہی ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور اساتذۂ دار العلوم سحر اسپتال پہونچے اور پسماندگان سے تعزیت کی، بلکہ ندوہ کا ایک موقر وفد بھی جنازہ کی نماز میں شرکت کے لئے اعظم گڑھ گیا، جامعۃ الرشاد جس کے مولانا مرحوم بانی وناظم تھے کے جوار میں تدفین عمل میں آئی۔ تغمده الله بواسع رحمته وأكرم نزله وجعل الجنة مثواه وألهم أهله وذويه الصبر والسلوان ۔(كل نفس ذائقة الموت ، وانما توفون أجوركم يوم القيامة) ۔

مولانا مجیب اللہ ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء کے ان ممتاز فضلاء میں تھے، جنہوں نے

تعلیم وتربیت اور فقہ اسلامی کو موضوع بنا کر قابل قدر کارنامہ انجام دیا، وہ دارالمصنفین کے رفیق بھی رہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے بعد سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مشورہ سے دارالمصنفین آگئے، اور یہیں بحث وتحقیق کے میدان میں کمال پیدا کیا، اور اہل کتاب صحابہ وتابعین، اور تبع تابعین کے نام سے اہم کتابیں تصنیف کیں، پھر مولانا کو نئی نسل بالخصوص نوجوانوں میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس ہوا، چنانچہ جامعۃ الرشاد کے نام سے شہر اعظم گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کیا، اس کی خاطر دارالمصنفین کی رکنیت سے سبکدوش بھی ہوئے، اور ساری توجہ جامعہ کے فروغ اور اسکے دائرہ کو وسیع کرنے میں صرف کی۔

اسی کے ساتھ فقہ اسلامی کے میدان میں مولانا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ نے جب فقہ اسلامی اکیڈمی کی بنیاد رکھی تو مولانا اس کے تاسیسی رکن رہے، اور ملی کونسل کو بھی اپنے خون جگر سے سینچا، اور اپنی دینی اور فکری صلاحیتوں کو اس کے فروغ میں صرف کیا۔ فقہ اسلامی کے سلسلہ میں پورے ہندوستان کے دورے کئے، اور ملی کونسل کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ ان خوبیوں کے علاوہ تصنیف وتالیف میں بھی مشغول رہے، ان کی تصنیفات درجنوں ہیں، چند کے نام حسب ذیل ہیں:

اسلامی فقہ اول، دوم، سوم، جہیز کی شرعی حیثیت، اسوۂ حسنہ، مسئلہ کفاءت، فتاوی عالمگیری اور اس کے مؤلفین، اجتہاد اور تبدیلی احکام، اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات، فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل، تبع تابعین، اہل کتاب صحابہ وتابعین، ثبوت رجم، سرمد اور اس کی رباعیاں، ریاض الحدیث، اسلامی تعلیم اول، دوم، سوم، انوار محمدی، اہل دل کی باتیں، دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں، خطبۂ نکاح، عبادت وخدمت۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، انھوں نے حضرت سید صاحب سے دو سال تک متواتر استفادہ کیا، اور علم وعمل کی دولت کے ساتھ فقہ حیات

اورآداب وفضائل کے وسیع میدان میں بھی غیر معمولی فائدہ اٹھایا، اس قلیل مدت میں آپ نے علم وفن اور دعوت وعمل کے وہ اسالیب سیکھے جس نے آپ کو دارالمصنفین جیسے عظیم اور بامقصد علمی مرکز میں امتیازی حیثیت عطا کی، اورآپ کا شمار ممتاز رفقائے دارالمصنفین میں ہوا، اور جامعیت کی صفت کے ساتھ متعارف ہوئے۔

اس جامعیت کو اگر آپ دیکھنا چاہیں تو ان کی قرآنی خدمات، حدیث شریف نیز ادب وتاریخ، فقہ وسیرت اور حیات وسوانح نگاری کے میدان میں ان کے تصنیفی کاموں کو دیکھ کران کی جامع کمالات زندگی کی شہادت دے سکتے ہیں، انھوں نے علم وعمل کے توازن کو پیش کر کے ایک مثال قائم کی، اور سید صاحب علیہ الرحمہ سے علم وعمل کے آداب سیکھنے کے ساتھ ان کی روحانیت سے بھی فیض یاب ہوئے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے مشہور اور ممتاز علمائے تربیت سے تعلق رکھا، اور حکمت ومعرفت کو حاصل کرنے میں انھوں نے مشہور روایت الحکمة ضالة المؤمن فحيثما وجدها فهو أحق بها پر برابر عمل پیرا رہے، اور جامعۃ الرشاد کے ذریعہ اپنے اس اصول کو دوسروں تک پہونچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا مرحوم نے جہاں تصنیف وتالیف کے ہر میدان میں تاریخی خدمات انجام دیں، وہیں انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل اور ملی کونسل کے قیام اور تحریک اصلاح معاشرہ جیسے بنیادی نوعیت کے کاموں میں بھرپور حصہ لیا، اور اپنی جامع اسلامی فکر سے سارے اداروں کو تقویت پہونچائی۔

مولانا تعلیم وتربیت کے بارے میں ایک خاص نظریہ کے مالک تھے، اس نقطۂ نظر کے ماتحت انھوں نے جامعۃ الرشاد قائم کیا، اور اپنے تعلیمی مشن کو عملی طور سے بروئے کار لانے اور وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے لئے انھوں نے رفیق دارالمصنفین کے منصب پر اسکو ترجیح دی، اور اعظم گڑھ کے مسلم علاقوں کو اپنی تعلیمی توجہ کا مرکز بنایا، عربی ادب میں مہارت حاصل کرنے کی ہمیشہ فکر کی، اور اسکے لئے فضلائے ندوہ کو بحیثیت

اساتذۂ ادب کے جامعۃ الرشاد میں متعین فرمایا، اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کی کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے عمید مولانا نذرالحفیظ صاحب ندوی کی استاذ ادب کی حیثیت سے جامعۃ الرشاد میں تقرری ہوئی تھی، اوران کے زمانے میں عربی زبان وادب کے شعبے میں خاصی پیش رفت ہوئی، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا نے ازراہ شفقت مجھ ناچیز کو بھی جامعۃ الرشاد میں عربی ادب کے ایک مدرس کی حیثیت سے وہاں حاضر ہونے کی پیشکش فرمائی تھی، اسکے لئے ہمارے محترم دوست جناب مولانا ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی صاحب کے ذریعہ مجھے پیغام ملا تھا، مگر ندوہ میں اپنی مشغولیت اور عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے کاموں میں مصروفیت اس راہ میں حائل ہونے کی وجہ سے میں اس پیغام پر عمل نہ کرسکا، اور مولانا نے مجھے معذور سمجھ کر معاف کردیا۔

ہندوستان میں کافی حدتک دینی مدارس کا آپ نے دورہ کرکے وہاں کے تعلیمی وتربیتی حالات کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی، اوراس موضوع پر اپنی رائے کو ظاہر کرنے کے لئے ''دینی مدارس اوران کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے ایک موقر اور قابل استفادہ مضمون ''الرشاد'' میں تحریر فرمایا، اسی طرح بابری مسجد کے مسئلے پر اپنی جدوجہد کو ہندوستان میں مسلم دینی اداروں اور عبادت گاہوں کی بقاء کے سلسلے میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش اوراس جہدوجہد میں پوری طرح مصروف رہے۔

مولانا نے تبلیغی جماعت کے کاموں میں عملی طور پر حصہ لینے اور جماعت اسلامی کے علماء اوراوران کے کاموں کے تعلق سے ان کے ساتھ حسب مقدور تعاون کرنے میں اپنے آپ کو پیچھے نہیں رکھا، ندوۃ العلماء کی فکرودعوت سے ان کا قلبی تعلق تھا، اسلئے وسعت فکراوردعوت دین کے طریقوں کواپنانے میں کوئی تکلف نہیں محسوس کرتے تھے، بلکہ اسی فکر وطریقے کواپنانے کی دعوت دیتے تھے، اوراپنی حمیت دینی اور غیرت ایمانی کے بلند درجے پر فائز رہتے ہوئے اس کا اعتراف کرتے، اوران کی دینی اور ملی کاموں میں سرگرمی کے

ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا ہر طبقہ کے علماء ودانشوروں کو مشورہ بھی دیتے تھے، مولانا کے وصال کے بعد شائع شدہ مضامین میں اس بلندی کا اعتراف کھل کر موجود ہے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا تعلق صرف شاگردانہ نہیں تھا، بلکہ نہایت مخلصانہ اور والہانہ تھا، وہ بے تکلف حضرت مولانا سے اپنے خیالات کا اظہار کردیتے تھے، ۱۹۷۹ء میں جب دارالعلوم میں ایک اسٹرائک ہوئی اور اسکے نتیجہ میں جلسہ انتظامیہ منعقد ہوا، تو اس میں مولانا مجیب اللہ صاحب کا حسن ظن طلبہ کے ساتھ تھا، اور اس کو ذمہ دار حضرات کی کسی غلطی کا نتیجہ سمجھ رہے تھے، اسی لئے مجلس انتظامیہ میں اس تیاری کے ساتھ تشریف لائے تھے کہ وہ اس معاملہ پر کھل کر بحث کرینگے، اور کسی قسم کی معذرت خواہی کو سننے کے روادار نہیں ہونگے، مگر حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خطبۂ صدارت سننے کے بعد جس میں اسٹرائک کے جملہ اسباب وعلل کا ذکر تھا، اور اس میں طلبہ کی خودرائی کا مدلل ذکر تھا، تو اس کے بعد انھوں نے حقیقت حال کو تسلیم کرلیا اور ذمہ داران کی طرف سے جو ان کو شکایت تھی وہ دور ہوگئی، اس موقع پر ان سے حضرت مولانا نے بڑی صفائی اور بے تکلفی سے بات کی تھی، اس گفتگو کے انداز کو میں نے بھی کسی قدر قریب سے دیکھا اور سنا تھا۔

مولانائے مرحوم نہایت صاف دل، متقی، عالم باعمل، اور علوم اسلامیہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اسی کے ساتھ وہ ملی مسائل سے کبھی غافل نہیں ہوئے، بلکہ اور زیادہ اس میں خلوص وگہرائی کے ساتھ حصہ لیتے رہے، یہی وجہ تھی کہ ان کا تعلق ملک کے تمام نامور علماء اور مراکز علمیہ سے تھا، اور مسلم مسائل کو حل کرنے اور عوام کو باشعور بنانے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مجیب اللہؒ صاحب کے درجات بلند فرمائیں، اور ان کی نیکیوں اور ملی ودینی خدمات کو قبول فرما کر ان کو سرخ روئے آخرت فرمائیں۔ (آمین)

☆☆☆

الحاج منت اللہ کانپوریؒ

نقوش وتأثرات

۲۸؍جولائی ۱۹۹۷ء مطابق ۲۲؍ربیع الاول ۱۴۱۸ھ کو کانپور کے سب سے معمر، دیندار اور صنعت کار بزرگ الحاج منت اللہ مرحوم اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دل پر اس کا اثر پڑنا ایک طبعی بات تھی، جو لوگ حاجی صاحب مرحوم سے واقف تھے۔ وہ ان کے انتقال سے بہت متاثر ہوئے، اور سب نے دل سے مرحوم کے لئے رحمت ومغفرت کی دعا کی۔

میں نے بہت عرصہ پہلے حاجی صاحب مرحوم کا ذکر اپنے والد مرحوم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ سے سنا تھا اور پھر ایک دفعہ مدرسہ مفتاح العلوم میں ان کو والد صاحبؒ کے کمرے میں بیٹھے ہوئے دیکھا، اس وقت معلوم ہوا کہ حاجی صاحبؒ مدرسے کے تعاون وتعارف میں بڑا حصہ لیتے ہیں اور مختلف اہل خیر سے اس کے لئے مستقل تعاون کی کوشش کرتے رہتے ہیں، حاجی صاحب مرحوم کا یہ طریقہ تقریباً ان تمام مدارس اسلامیہ کے ساتھ تھا، جن سے وہ واقف تھے، اور وہاں کے ذمہ داروں پر اعتماد رکھتے تھے۔

پھر جب لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے مجھے تعلق ووابستگی کا شرف حاصل ہوا اور مستقل طور پر یہاں رہنے کا موقع ملا تو حاجی صاحب مرحوم کو اور قریب سے دیکھنے اور ملنے کا موقع بار بار ملا۔ وہ حضرت العلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ملاقات کرنے کے لئے برابر دار العلوم تشریف لاتے تھے، ان کو یہاں کا نظام تعلیم وتربیت بہت زیادہ پسند

تھا اس لئے انھوں نے اپنے صاحبزادگان کو ندوہ میں تعلیم دلانے کی خواہش ظاہر فرمائی، چنانچہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے شروع میں ان کے دو بیٹے محمد اسحاق اور محمد اسماعیل ابتدائی درجات میں داخل ہوئے، لیکن ان کی خصوصی تربیت کے لئے الگ سے ایک اتالیق ماسٹر محمد اطہر صاحب کو حضرت مولاناؒ نے متعین فرمایا۔ اس تعلق کے بعد حاجی صاحب مرحوم نے ندوہ کے لئے اور زیادہ اپنی ہر طرح کی خدمات پیش کر دیں، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مالی لحاظ سے ندوہ پر بڑا سخت وقت آیا تو حضرت مولاناؒ نے حاجی صاحب مرحوم کے مشورہ سے اور ان کے توسط سے کانپور کے اہل خیر سے ملاقات کر کے اس بحران کو دور فرمایا۔ وہ حاجی صاحب مرحوم کا بہت قیمتی اور مخلصانہ تعاون تھا، جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ندوہ کے نظام تعلیم و تربیت سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ جاج مئو کانپور میں جہاں ان کا کارخانہ (ٹینری) تھا، ایک وسیع زمین حاصل کر کے اس میں ندوہ کے نصاب و نظام تعلیم کو جاری کرنے کے لئے دار التعلیم والصنعت کے نام سے ایک ادارہ ۱۹۶۲ء میں قائم کیا اس وقت جبکہ دینی تعلیم کے ساتھ صنعتی تعلیم کا تصور بہت محدود تھا۔ حاجی صاحب مرحوم نے اپنے وسیع تجربے کی بنیاد پر اس کو بھی ساتھ چلانے کا منصوبہ بنایا۔ اور دار التعلیم والصنعت کو نمونے کا ایک مدرسہ بنا کر پیش کیا جہاں اسلامی علوم کی تعلیم کے ساتھ صنعتی تعلیم کو بھی فروغ ہوا۔ اور اس مدرسہ کے احاطہ میں عصری تعلیم کی ایک درسگاہ مسلم طالبات کے لئے بھی ہائی اسکول تک کی تعلیم کے لئے قائم کی اور باقاعدہ گورنمنٹ سے اسے منظور کرایا۔ دار التعلیم میں کمپیوٹر کا شعبہ قائم کیا اور اس کے لئے ماہر معلمین کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے نتیجہ میں یہ شعبہ آج ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

مدارس دینیہ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہی مدارس دراصل ملت اسلامیہ کی پناہ گاہ اور اسلامی قلعے ہیں جہاں ملت کے پاسبان تیار ہو رہے ہیں۔ اور ایسے فضلاء تربیت گاہوں سے نکلتے ہیں جو بلند حوصلہ اور ذہانت و جرأت، ہمت و شجاعت، خود اعتمادی اور

خودشناسی اور علمی لحاظ سے بلند قامت ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا زمانہ بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔ اور زمام قیادت ان کے ہاتھ میں دے کر راستے کی تاریکیوں کو دور کرنے اور قوم کو عالی ہمتی کا درس دینے کی راہ میں ان سے بہت بڑے بڑے کام لے لیتا ہے۔

اس جیسے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے انھوں نے اعلیٰ پیانے پر دارالتعلیم والصنعت کو قائم کیا اور زندگی کا تازہ خون حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اس کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شاخ قرار دیئے جانے کی ہر طرح خواہش ظاہر کی، کانپور کی سنگلاخ وادی میں اس جیسی درسگاہ کا قائم کر لینا اور اس کی زندگی کو برقرار رکھتے ہوئے اسے ترقی کی شاہراہ پر لے چلنا بڑے دل وجگر کا کام تھا، جس کو حاجی صاحب مرحوم نے اپنی شب وروز کی محنتوں سے جاری رکھا، اور قوم مسلم کے طلباء اور طالبات کی تعلیمی ترقی کے لئے انہوں نے اس درسگاہ کی عمر بھر سرپرستی کی، ان کے نزدیک سیکولر حکومتوں میں اسلامی عقیدے کی حفاظت اور چھوٹے بچوں کے ذہن کے لئے مکاتب کا قیام نہایت ناگزیر تھا، چنانچہ اس مقصد کے لئے ہمیشہ انہوں نے بڑی جدوجہد کی۔ اکثر وہ میرے پاس اس سلسلہ میں خط لکھتے تھے۔ اور میں جب بھی کانپور دارالتعلیم والصنعت کی دعوت پر وہاں جاتا تھا تو ان سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔

انھوں نے ضلع بستی (سدھارتھ نگر) کے ایک موضع گورا بازار میں اپنی خاص توجہ سے ایک قطعۂ زمین میں ایک ابتدائی مدرسہ اور درجات حفظ جاری کیا، اور اس کے لئے ہمہ وقت لائق استاذ اور مدرسین کی تلاش میں رہا کرتے تھے اور اپنی ذاتی آمدنی سے وہ اس کا خرچ چلاتے تھے، ان کے آبائی وطن کاٹھ تراؤں ضلع مئو (اعظم گڑھ) میں قدیم اسلامی مدرسہ بھی انہیں کی سرپرستی میں چلتا رہا، اور وہ اب تک قائم اور سرگرم عمل ہے اس مدرسہ کے بھی جملہ مصارف کا بوجھ خود حاجی صاحب مرحوم اٹھاتے تھے اور اس طرح کے مدارس ومکاتب کو کھولنے کے لئے ہمہ وقت فکرمند رہا کرتے تھے۔

ملک کے علماء کرام سے جنھوں نے جنگ آزادی اور تحریک خلافت میں حصہ لیا تھا، مرحوم کے تعلقات بہت مخلصانہ تھے۔ انہوں نے آزادی کی لڑائی میں علماء کی شرکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بلکہ وہ ان کے ساتھ بڑی حد تک شریک بھی رہے۔ یہی وجہ تھی کہ علماء کرام سے ان کو بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کو ملت کی آبرو سمجھتے تھے۔

ان کا یہ یقین تھا کہ دینی مدارس کی مثال ایک قلعہ کی ہے، ان کی حفاظت اور ان کے استحکام و بقاء کی ذمہ داری اہل تقویٰ و اخلاص ہی پوری کر سکتے ہیں، حاجی صاحب مرحوم نے اپنی تحریروں میں اس حقیقت کو بہت وضاحت اور یقین کے ساتھ بیان کیا ہے ، وہ کہتے ہیں: کسی مدرسہ کو چلانے کے لئے اس کی باگ ڈور علماء و صلحاء اور مجاہدین دردمندان دین کے ہاتھوں میں ہو، اور وہی اس کشتی کے ناخدا ہوں، چنانچہ بڑی خوش نصیبی اور سعادت کی بات ہے: یہ مدرسہ (دارالتعلیم والصنعت) بھی عالم اسلام کی مشہور اور ممتاز دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ماتحتی میں چل رہا ہے۔

ان دونوں اداروں کی سرپرستی دنیائے اسلام کی ایک بزرگ اور مایہ ناز ہستی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی فرمارہے ہیں۔

حاجی صاحب مرحوم نے اپنا تعارف خود اپنے قلم سے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس سے ان کے فکر و عمل کا دائرہ اور دینی و تعلیمی اعتبار سے ان کا نقطۂ نظر سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے، وہ رقمطراز ہیں:

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے طویل عمر سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ ہم سے آخری وقت تک اپنی رضا کا کام لیتا رہے، میری پیدائش ۱۳۱۵ھ کی ہے اور میرے خاندان کا تعلق برابر بزرگوں سے قائم رہا ہے، جس کی تفصیل اپنی کتاب (نصیحتیں اور وصیتیں) میں لکھی ہوئی ہے، جس کو اپنے لڑکوں کے نام لکھا ہے۔ امید ہے کہ اسی طرف میرے لڑکے توجہ کریں گے۔ ندوۃ العلماء کے نصاب کے مطابق کچھ تھوڑی تعلیم میرے لڑکوں نے

حاصل کی ہے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی صحبت میں تربیت حاصل کرتے رہے ہیں، ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم ایسا مکمل اور مفید ہے، جس کو ہر مسلمان حاصل کرکے دینی، اخلاقی، تجارتی وغیرہ تمام تر مسائل کے علاوہ ملک وملت کی خدمت بھی کرسکتا ہے، چنانچہ میرے تینوں لڑکے محمد اسماعیل، محمد اسحاق اور محمد احمد اس کام میں پیش پیش ہیں، کاروباری مصروفیت کے ساتھ اس ادارہ (دارالتعلیم والصنعت) کی ذمہ داری بھی بخوبی سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور ملک وملت کی خدمت بھی کرتے ہیں۔ یہ سب حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے فیوض ہیں۔

اس کے علاوہ ملک کے بگڑے ہوئے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک دیہاتی اسکیم وتحریک جو حضرت مولانا مدظلہ العالی کے اشارے سے شروع کی گئی ہے۔ وہ ایسی تحریک ہے جو دیہاتی اور علاقائی پیمانہ پر ایک مرکزی مکتب کی شکل میں چلائی جارہی ہے، جس سے قریب کے گاؤں کا جوڑ بھی ہے۔ وہاں تعلیم وتربیت، تبلیغی اجتماع، مطالعہ درسیات وکتاب وسنت اور دیہاتوں میں گشت لگانا، ہر ہر گاؤں میں پیام انسانیت کو پہونچانا اور زہریلے مادے کو دھونا اور ہر بچے کو تعلیم کی طرف لانا اس کا مقصد ہے، یہ سب ندوہ کی برکت ہے، اس لئے میں تمام اہل ثروت اور علماء کرام اور تمام مدرسین اور دانشوروں سے عرض کرتا ہوں کہ نصاب ندوہ پورے طریقہ سے رائج فرمائیں اور دیہاتی اسکیم کو گاؤں گاؤں پھیلائیں۔ اس اسکیم کا ایک نمونہ دیہاتی مرکز گورا بازار ضلع سدھارتھ نگر میں قائم ہے۔ میری درخواست حضرات علماء، اہل ثروت، عمائدین اور ارباب مدارس سے ہے کہ ایک ایک مرکز اپنے حلقۂ اثر میں قائم کریں۔ یہ مزید میرے لئے سعادت کی بات ہے کہ حضرت مولانا (مدظلہ العالی) کی نظر عنایت مجھ بوڑھے پر ہی رہی ہے اور اس لئے انہوں نے مجھے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کا رکن بنا رکھا تھا۔ اور ہمیشہ اس مجلس میں حاضری دیتا رہا ہوں، یہ سب انھیں کی نظر کرم کا ثمرہ ہے۔ اس مرتبہ ۴/اگست ۱۹۹۲ء میں انتظامیہ کے جلسہ میں حاضر ہوا تھا، جس کی کارروائی میں

حضرت مولانا نے بحیثیت ناظم اعلیٰ ایک رپورٹ پیش کی جس سے علماء کرام اور اہل فضل وکمال حضرات استفادہ فرمائیں اور ندوۃ العلماء کے نصاب کی اہمیت کو دل میں جگہ دیں اور ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے تشخص کو قائم رکھنے کے لئے جماعتی، انفرادی ہر اعتبار سے نہایت اخلاص سے کام کریں"

حاجی صاحب مرحوم نے اپنی دینداری کی وضع ہر موقع پر قائم رکھی۔ کاروبار میں ہر اعتبار سے نہایت احتیاط کے ساتھ رزق حلال کی شدید تاکید اور اس کے لئے ضروری طریقے استعمال کرنے کی طرف ہمیشہ متوجہ رہے۔ اس دور میں جبکہ بینکوں کے ذریعہ کاروبار کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے، حتی الوسع پوری احتیاط برتنے کی ہدایات جاری رکھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کے جملہ معاملات میں اپنے صاحبزادگان اور افراد خاندان کو دین کے تقاضوں کے مطابق چلنے کی تاکید جاری رکھی۔ اس مقصد کے ماتحت انھوں نے اپنی کتاب (نصیحتیں اور وصیتیں) نہایت تفصیلی انداز میں تحریر کیا ہے۔ اور اس پر ان کے تمام فرزندوں اور افراد خاندان نے بھی عمل کیا اور وہ ہمیشہ ان کے لئے مشعل راہ ہے۔ حاجی صاحب مرحوم نے طویل عمر پائی، وہ اپنی کبرسنی اور کمزوری کے باوجود اخیر تک اپنی تعلیمی اور فکری ذمہ داری کو انجام دیتے رہے اور دینی فکر میں مشغول رہے۔ کاروبار سے باخبر رہتے تھے۔ زندگی کے آخری لمحے تک ہوش وحواس برقرار رہا۔ اور وہ ایسے معذور نہیں ہوئے جس میں ہر وقت دوسرے لوگوں سے خدمت لینی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور ان کو شایان شان جزاء سے نوازیں۔ اور ان کی تمام لغزشوں کو معاف فرما کر بلند درجات عطا فرمائیں۔ (آمین)

☆☆☆

پروفیسر وصی احمد صدیقیؒ

ایک باغ و بہار شخصیت

نیا تعلیمی سال شروع ہوتے ہی فضیلت ادب سال اول میں انگریزی کا بھی ایک گھنٹہ مقرر ہوا، شروع شروع میں یہ گھنٹہ چند دنوں تک خالی رہا کہ اچانک ایک دن مہتمم صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی کی طرف سے ہمارے درجے فضیلت ادب سال اول اور فضیلت دینیات اول کے درجہ میں یہ حکم پڑھ کر سنایا گیا کہ کل سے صبح نماز فجر کے بعد مسجد ہی کے اندر استاد الأساتذہ جناب ماسٹر محمد سمیع صاحب ان دونوں درجوں کو انگریزی پڑھائیں گے، یہ ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳۷۱ھ کا زمانہ تھا۔

میں نے اپنے ان استاد کو مسجد کی باجماعت نمازوں میں دیکھا تھا، اب جب درجہ میں تشریف آوری ہوئی تو ان کے علمی اور دینی مقام سے واقف ہونے کا موقع ملا، ماسٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے طلباء سے بہت زیادہ شفقت اور مروت کا معاملہ فرماتے تھے، درجہ میں عبارت پڑھنے والے کسی ساتھی سے تلفظ میں اگر کوئی غلطی ہوتی تو نہایت نرمی کے ساتھ اس کو درست فرمادیا کرتے تھے، اور انگریزی کے الفاظ کے معنی بتانے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، بلکہ ان الفاظ کو دوسرے جملوں میں استعمال کر کے مزید فائدہ پہونچاتے تھے، اسی طرح انگریزی زبان کے گرامر (Grammar) کو بھی ساتھ ساتھ پڑھاتے تھے، اس بناء پر استاد اور طلباء کے درمیان پورے ادب واحترام کے ساتھ کسی حد تک بے تکلفانہ تعلق ہوگیا تھا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرۃ الاستاذ نہایت انہماک کے ساتھ ہم لوگوں کو مسجد

آواز تھی دار العلوم کے مہتمم اعلی حضرت مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی ازہری رحمۃ اللہ علیہ کی، وہ کہہ رہے تھے کہ سبق ختم ہونے کے بعد فوراً یہ بتی بجھادی جایا کرے، مزید یہ بھی کہا کہ کل یہ بتی دیر تک جلتی رہی، اگر پھر ایسا ہوا تو مسجد کا بلب استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی ، الحمد للہ پھر اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، ہماری تعلیم حسب معمول جاری رہی، اس اثناء میں بعض اوقات اپنے استاد ماسٹر محمد سمیع صاحب کے ساتھ ان کے گھر تک جو مسجد کے پیچھے تھا، باتیں کرتے ہوئے حاضر ہونے کا موقع ملا، اور اکثر کسی خالی وقت میں بھی گھر پر جا کر ملنے کی جرأت کرتا تھا، وہاں حضرۃ الأستاذ کے صاحبزادگان سے بھی ملاقات ہوجایا کرتی تھی، ان کے بڑے صاحب زادے پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب اس وقت مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے، دوسرے صاحبزادے فصیح احمد صدیقی صاحب لکھنؤ یونیورسٹی سے بسلسلۂ تعلیم وابستہ تھے، تیسرے صاحبزادے جناب احمد مطیع صدیقی صاحب لکھنؤ یونیورسٹی سے حسب ضرورت تعلیم مکمل کر کے لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں داخل ہوگئے، چوتھے صاحبزادے جناب احمد رضی صدیقی صاحب بھی تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول تھے، ان حضرات کی دو بہنیں لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم میں مشغول تھیں، ان دونوں سے بڑی ہمشیرہ کا شادی ہونے کے بعد کم عمری ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔

اس طرح میرے لئے استاد محترم کے اس خاندان سے ایک طرح کا تعلق قائم تھا، جو دار العلوم کی تعلیم سے فراغت کے بعد دار العلوم میں قیام کے دوران مزید پختہ ہوا، اور رفتہ رفتہ حضرۃ الأستاد کی شفقت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک وہ دور آیا کہ سبھی صاحبزادگان اور صاحبزادیاں تعلیم یا ملازمت کے سلسلہ میں لکھنؤ سے باہر رہنے لگے، میں جب بھی گھر پر حاضر ہوتا تو استاد محترم سامنے ہی بیٹھے ہوئے نظر آتے اور مجھ کو کمرے کے اندر آنے کی اجازت دیتے، اس دوران پروفیسر وصی احمد

صاحبہ استاد محترم) خوش اور مسرور تھے، اللہ تعالی نے پروفیسر صاحب کو اولاد کی نعمت سے بھی سرفراز کیا، اور اعلی سے اعلی تعلیم کی خاندانی روایت کو قائم رکھا، پروفیسر صاحب کو شاہجہاں پور کے فیض عام انٹر کالج میں پرنسپل شپ کی پیش کش ہوئی، چونکہ وہ پی، ایچ، ڈی مکمل کر چکے تھے، اس لئے ان کو اچھے انداز سے اچھی ملازمت کا یہ علمی تحفہ عطا ہوا، اور ریٹائرمنٹ تک وہیں قیام پذیر رہے، ان کے صاحبزادوں نے تعلیم کے میدان میں اپنا مشغلہ جاری رکھا، کوئی لکھنؤ یونیورسٹی سے، تو کسی نے علی گڈھ سے، اعلیم تعلیم حاصل کی، صاحبزادی نے بھی اعلی تعلیم حاصل کی، اور اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ان کو اردو زبان ادب پر پورا عبور حاصل تھا، ان کا عقد لکھنؤ ہی کے ایک مشہور تعلیم یافتہ خاندان میں مقدر ہوا اور ایک اچھی علمی اور ادبی زندگی گذارنے کا موقع فراہم ہوا۔

پروفیسر صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد والدین کی خدمت میں لکھنؤ آ گئے، ان کا علمی اور ادبی مقام بلند تھا، اور وہ استاذ الاساتذہ کے صاحبزادہ تھے، اس لئے ندوۃ العلماء کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں پیدا ہوا، اس زمانہ میں حضرت الاستاذ مولانا ڈاکٹر سید عبداللہ عباس صاحب ندویؒ ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے اور یہیں احاطہ دارالعلوم میں ان کا قیام تھا، پروفیسر صاحب اور ڈاکٹر ندوی کے درمیان محبت واخلاص کا رشتہ پہلے ہی سے قائم تھا، وہ اس اثناء میں اور زیادہ بڑھ گیا، ندوۃ العلماء کے سابق معتمد مال جناب ہدایت حسین صاحب کا جو حکومت یوپی میں سکریٹری کے عہدہ پر فائز تھے، مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا، تو حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب نے پروفیسر وصی احمد صدیقی کو معتمد مال بنائے جانے کی تجویز مفکر اسولام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء کے سامنے پیش کی اور حضرت مولانا نے اس سے اتفاق کیا، اور ان کو معتمد مال کے عہدہ پر اپنے اختیار سے فائز کر کے مجلس انتظامیہ کے سامنے پیش کیا، مجلس نے بالاتفاق اس کو منظور کیا اور پروفیسر صاحب

سمجھ کر پورے خلوص اور پاکیزگی کے ساتھ فرض انجام دیا، ایک عرصہ تک وہ وقت کی پابندی کے ساتھ دفتر نظامت کے سکریٹریٹ میں اپنے آفس میں بیٹھتے تھے، اور وہ تمام مالی معاملات کو خود دیکھ کر نمٹاتے تھے، اور نظامت کے کارکنان حسب الحکم ان پر عمل کرتے رہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحہ وفات ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء کو پیش آیا، ندوۃ العلماء کا یہ اتنا زبردست حادثہ تھا کہ غیر متعلق لوگوں نے اس کو ندوہ کے لئے شگون بد سے تعبیر کیا اور یہاں تک سننے میں آیا کہ بعض حلقوں میں یہ کہا گیا کہ اب ندوۃ ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا، اور اختلافات کا دور دورہ ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور ساری پیشن گوئیاں غلط ثابت ہوئیں، ذمہ داران نے پورے اتحاد کا مظاہرہ کیا، حضرت الاستاذ مولانا سید عبداللہ عباس صاحب ندویؒ دوسرے ہی دن مکہ سے رائے بریلی پہونچ گئے اور مجلس نظامت کے تمام ارکان کو وہیں مدعو کیا، اور جلسہ نظامت منعقد کر کے باتفاق رائے ناظم ندوۃ العلماء کے منصب کے لئے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا اسم گرامی پیش کیا، جو باتفاق آراء منظور ہوا، اور ان کی مساعدت کے لئے جناب مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی کا نام بطور ناظر عام ندوۃ العلماء منظور کیا گیا، اور اسی جلسہ میں دارالعلوم ندوۃ کے مہتمم کا انتخاب بھی بالاتفاق عمل میں آیا، اس جلسہ کی نظامت کی کارروائی فوراً اخباروں میں شائع ہوگئی، دارالعلوم اپنے وقت پر ۶/شوال ۱۴۲۰ھ کو کھل گیا، ندوۃ العلماء کے تمام دفاتر حسب معمول نئے ناظم اعلیٰ کی ہدایت کے مطابق کام کرنے لگے، ناظم اعلیٰ کا دفتر بھی ندوۃ العلماء کے سکریٹریٹ میں کھل گیا، اسی کے ساتھ معتمد مال کا دفتر بھی سکریٹریٹ کی عمارت میں رکھا گیا، اور نہایت اہتمام وفکر سے ندوۃ العلماء کی تمام ذمہ داریوں کو صحیح طریقہ سے انجام دینے کا سلسلہ مزید بہتری کے ساتھ شروع ہوگیا۔

معتمد مال صاحب انتہائی پابندی کے ساتھ اپنے دفتر تشریف لاتے تھے، وہاں

یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا، حضرت معتمد تعلیم صاحب تعلیمی امور کے ساتھ دارالعلوم کے درجات عالیہ میں درس بھی دیا کرتے تھے، اور سب کے اتفاق کے ساتھ ندوۃ العلماء کے تمام شعبے نہایت خوبی کے ساتھ اپنے کاموں اور ذمہ داریوں کو انجام دیتے رہے۔

پروفیسر صاحب سے نئے دور میں ملاقاتوں کا سلسلہ بعض معاملات کے سلسلہ میں جاری رہا، اور بحیثیت مہتمم بعض مسائل کے سلسلہ میں جن کا تعلق عام طور سے مالیاتی نظام سے ہوتا تھا، ملاقات کرنے کے مواقع حاصل ہوتے رہے، اور ایسا بھی ہوا کہ پروفیسر صاحب نے انٹر کام کے ذریعہ کسی معاملہ میں بات چیت کی، اس موقع پر دفتر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ملاقات کے لئے حاضر ہوتا تھا، کئی بار ایسا ہوا کہ کسی درخواست پر میں نے سفارش کی تو انہوں نے میری حقیر سفارش منظور کرلی اور درخواست پر لکھا کہ مہتمم صاحب کی سفارش اور تصدیق کے بعد درخواست منظور نہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جب بھی ملاقات ہوتی تو کچھ نہ کچھ والدِ محترم اور استاذ مکرم جناب ماسٹر محمد سمیع صاحب صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی شفقتوں کا ذکر آہی جاتا تھا، وہ اس بات کا میرے ساتھ بہت زیادہ خیال رکھتے تھے کہ استاذ محترم ماسٹر صاحب رحمۃ اللہ کی شفقتیں مجھے بلا استحقاق حاصل تھیں۔ پروفیسر صاحب مہمان خانہ کے سامنے عصر بعد کی مجلس میں پوری پابندی کے ساتھ تشریف لایا کرتے تھے، جہاں حضرت الاستاذ مولانا عبداللہ عباس صاحب سے ان کی ملاقات ہوتی تھی، اور شعر وسخن اور علم وحکمت کی باتیں ہوا کرتی تھیں، اکثر دارالعلوم کے سینئر استاذ تفسیر وحدیث جناب مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی بھی شریک مجلس رہا کرتے تھے، پروفیسر صاحب بذلہ سنجی اور لطائف کے اندر بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے، مجھ خاکسار کو بھی اس مجلس سے مستفید ہونے کا موقع مل جایا کرتا تھا، ایک دفعہ پروفیسر صاحب

سے ہمت نہیں کر پارہے تھے، جناب ''شیطان'' صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی، وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کوئی مکان بنوانا چاہتے ہیں، ان صاحب نے کہا کہ یہ بات صحیح ہے لیکن میرے پاس وسائل کی کمی ہے، اس لئے ہمت نہیں کر پارہا ہوں، شیطان صاحب نے کہا: آپ اس کی فکر نہ کیجئے، میں حاضر ہوں اور آپ کی پوری مدد کروں گا، چنانچہ وہ صاحب بہت خوش ہوئے، شیطان صاحب نے ان کو بینک سے قرض دلوایا، مکان بنانے کی منظوری بھی، مکان کا نقشہ پاس کرا کے دلوادی، اور اس طرح کی جو بھی ضرورت پیش آئی، انہوں نے اسے پوری کرادی، اور وہ تعمیر کے دوران مسلسل نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے، جس چیز کی ضرورت ہوتی، اس کا انتظام کرادیتے تھے، یہاں تک کہ مکان بن کر تیار ہوگیا اور صاحب مکان نے سامنے والے حصہ کی دیوار پر قرآن کی یہ آیت لکھوادی: ''ہٰذا من فضل ربی'' ان شیطان نے دیکھا کہ اس میں میرا کہیں ذکر و تذکرہ نہیں، جب کہ میں نے ہی دراصل اس مکان کی تعمیر کرائی ہے اور اس کے لئے جملہ وسائل کی فراہمی میں اپنا کردار ادا کیا ہے تو وہ مکان کے قریب ایک الگ جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے اور رونے لگے، لوگوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ شیطان صاحب نے جواب دیا: رؤوں نہ تو کیا ہنسوں، آپ دیکھتے نہیں کہ یہ مکان میں نے اپنی محنتوں اور اپنے ذرائع استعمال کر کے بنوایا اور جب یہ مکان بن کر تیار ہوگیا تو اس پر ''ہٰذا من فضل ربی'' لکھوادیا، ایسی احسان فراموشی کیا کسی نے کی ہوگی۔

یہ اور اس طرح کے بہت سے لطائف اپنی علمی اور ادبی مجلسوں میں بیان کیا کرتے تھے، اس سے پروفیسر صاحب کی زندہ دلی اور لطیفوں کے ذریعہ اصلاح اور زندگی کی حقیقتوں کو بیان کرنے کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

ودعوت کے میدان میں فائدہ پہنچا، ان کی یہ صفات انتہائی قابل قدر اور لائق فخر تھیں، چنانچہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء نے ان سے نائب ناظم کا عہدہ قبول کرنے کی درخواست کی، انہوں نے جذبہ خدمت کی بنا پر قبول کرلیا اور اس طرح ان کو مزید خدمت کا موقع ملا، وہ ہمیشہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں نماز باجماعت ادا کیا کرتے تھے، لیکن ایک مرتبہ مسجد ہی میں جمعہ کی نماز کے بعد اعصابی اور قلبی تکلیف میں مبتلا ہوگئے، ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا، اس لئے وہ کہیں باہر آنے جانے میں احتیاط کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود معتمد مال کے کسی کام کو انجام دینے میں عذر نہیں کیا، اور حضرت ناظم صاحب مدظلہ کی عدم موجودگی میں کبھی کسی ضروری کام کی انجام دہی سے معذرت نہیں کی، اور کچھ دنوں تک وہ مسجد نہیں آسکے، اور گھر ہی میں نماز ادا کیا کرتے تھے، ان کو دیکھنے کے لئے ان کے برادر عزیز جناب ڈاکٹر احمد مطیع صاحب کئی بار امریکہ سے تشریف لائے اور کچھ دن ان کی خدمت میں وقت گذار کر واپس چلے گئے اور ان سے بڑے بھائی پروفیسر جناب فصیح احمد صدیقی بھی اکثر ان سے ملنے اور ان کے پاس کچھ وقت گذارنے کے لئے آیا کرتے تھے، اور ان کو اپنے والد مرحوم کا جانشین سمجھ کر ان کی بے حد عزت کیا کرتے تھے، خاندان کے اور دیگر افراد بھی جو ہندوستان سے باہر رہتے ہیں، وہ بھی برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، ابھی رمضان میں ان کے بڑے صاحبزادہ انجینئر وسیم احمد صاحب صدیقی، کافی وقت گذار کر واپس گئے تھے، ان کو اس حادثہ پر واپس آنا پڑا، اور وہ دیگر افرادِ خاندان نماز جنازہ اور تجہیز وتکفین میں پوری طرح شریک ہوئے۔

یہ حادثہ ۱۴ ستمبر ۲۰۱۰ء بروز سہ شنبہ بوقت شام پیش آیا، اناللہ وانا الیہ راجعون، حادثہ کے وقت اہل خانہ اور چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی کے بچے موجود تھے، اس

[illegible] اپنے رب حقیقی سے جاملے اور گویا کہ وہ غالب کا یہ شعر سناتے ہوئے اپنے والدین اور اپنے بزرگوں سے جاملے:

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی سے آئے ، نہ اپنی خوشی چلے

یہ ایک مختصر یادداشت ہے ان کی خوبیوں کی، لیکن ان کے علمی اور ادبی مرتبہ کے مطابق اہل قلم کے مضامین نکلیں گے، اور ان کی کتاب زندگی پر بھرپور روشنی ڈالیں گے، انشاء اللہ۔

میں بھی اپنی گھٹنوں کی کمزوری اور انحطاط صحت کو دیکھتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ غالب نے شاید کچھ ایسے ہی حالات میں دو شعر کہے ہونگے:

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

موت وحیات کا مالک اللہ ہے، کسی انسان کے اختیار میں موت وحیات نہیں ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: تبارك الذى بيده الملك وهو على كل شئى قدير ، الذى خلق الموت والحياة ليبلوكم أيكم أحسن عملا ، وهو العزيز الغفور (الملك : ١۔ ٢) بہت بابرکت وہ اللہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور جو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، جس نے موت اور حیات کو اس لئے پیدا کیا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے۔ اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے موت کو حیات سے پہلے ذکر کر کے غالباً یہ بتادیا ہے کہ زندگی فانی اور موت اصل ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

عالم با عمل مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہریؒ

۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے کہ دار العلوم کا نیا تعلیمی سال شروع ہو چکا تھا، طلباء کی انجمن الاصلاح کا انتخاب عمل میں آچکا تھا، اور النادی العربی کے نئے ممبران اور عہدیداروں کا انتخاب بھی ہو چکا تھا، اس سال النادی العربی کے الامین العام ہمارے محترم دوست جناب ڈاکٹر محمد راشد صاحب اعظمی ندوی منتخب ہوئے تھے، اس زمانہ میں وہ فضیلت ادب سال دوم (جس کو اب تخصص ادب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے طالب علم تھے، وہ نہ صرف اپنے درجہ میں بلکہ پورے دار العلوم کے ماحول میں عربی زبان وادب میں فائق تھے، اور ان کی عربی زبان دانی کا اعتراف طلباء اور اساتذہ سبھی کرتے تھے، اور ان کے اس انتخاب کو ہر شخص نے بنظر تحسین دیکھا، انہوں نے ازراہِ کرم مجھے بھی النادی العربی کا رکن بنا لیا تھا، اس کے باوجود کہ میں اسی سال دار العلوم کے فضیلت ادب کے سالِ اول میں داخل ہوا تھا، اور نسبۃً نیا طالب علم تھا۔

اس سال النادی العربی کے افتتاحی جلسہ کا اعلان ہوا، اور اس کی صدارت کیلئے دار العلوم کے سابق استاد اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے استاد حال جناب مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہری (رحمہ اللہ تعالی) کا نام پیش کیا گیا تھا، اور ان کا نام اس افتتاحی جلسہ کے لئے بہت ہی موزوں اور مبارک تھا، میں نے سب سے پہلے جناب مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ کو اس جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا، اخیر میں انہوں نے اپنی صدارتی تقریر فصیح وبلیغ عربی زبان میں کی اور زندگی کے مختلف میدانوں میں عربی زبان وادب کے عظیم کردار کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے جمال الدین افغانی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور باوجود اس کے کہ وہ عجمی ملک کے قائد اور رہنما تھے، لیکن انہوں نے مصر میں رہ کر وہاں کے عظیم ادباء وزعماء کے ساتھ جس انقلابی تحریک کی قیادت کی، وہ صرف اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ وہ عربی زبان کے علمبردار تھے، اور انہوں نے اپنی سطح کے علماء وادباء کو اپنی زبان دانی اور

درجے کے علماء، ادباء، زعماء اور وہاں کے لیڈروں کو اپنی فکر اور انقلابی کوششوں سے متاثر کرسکیں۔

میں نے یہ تقریر عربی زبان میں مولانا محبوب الرحمٰن ازہری رحمۃ اللہ علیہ سے عربی لہجہ اور اسلوب میں سنی تھی، تو اس کا مجھ پر ایک عجیب تاثر ہوا، میں نے سوچا کہ عربی زبان وادب کا انسانی مزاج اور اسکی ترجیحات سے کتنا گہرا تعلق ہے، اور ہم بھی عجمی ملک میں رہ کر عربی زبان وادب میں اپنی محنت صرف کریں اور اسکو اپنی فکر وعمل کی جولانگاہ بنائیں تو ہم عرب ملکوں کی فکری رہنمائی کے قابل ہوسکتے ہیں، میری نگاہوں کے سامنے اچانک حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت متمثل ہوئی، اور میں نے اپنے جی میں کہا کہ اسکی زندہ مثال خود حضرت مولانا کی شخصیت میں موجود ہے، جو ابھی کچھ ہی مدت پہلے اپنے دعوتی اور علمی سفر سے واپس تشریف لائے ہیں، اور جنہوں نے عرب ملکوں میں جاکر خاص طور سے مصر میں اپنی عربی زبان دانی اور عظیم ادبی صلاحیت کی بنیاد پر وہاں کی بڑی سے بڑی شخصیت کو متاثر کیا، اور پورے مصر میں اپنی عربی زبان دانی اور اسکی فصاحت وبلاغت اور عظیم فکری بلندی اور ندوہ کی دعوت اور اسکی تحریک کا تعارف ایسے انداز میں کرایا کہ اس کو سن کر اس عہد کے شیخ الازہر حیران وششدر رہ گئے۔

استاذ الاساتذہ جناب مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ازہریؒ سے اس موقع پر مختصر تعارف کے بعد پھر اکثر جب وہ کلکتہ سے وطن لکھنؤ تشریف لاتے تو دارالعلوم کے اکثر اساتذہ کرام ان سے ملنے کے لئے جایا کرتے تھے، میں بھی بعض دفعہ اپنے دوستوں کے ساتھ ملنے گیا، اور مولانا کی قیام گاہ واقع ارادت نگر ڈالی گنج کو دیکھنے اور مولانا کی خدمت میں بیٹھنے کا موقع ملا، پھر جب مولانا کا وہاں سے ریٹائرمنٹ ہوگیا تو مستقل طور سے لکھنؤ آگئے، اور حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ندوہ میں باقاعدہ استاذ کی حیثیت سے تشریف لانے کی پیشکش کی، مولانا نے اس کو اس شرط پر قبول کرلیا کہ وہ باقاعدہ استاذ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک مدرس کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کے لئے تیار ہیں، مولانا نے گریڈڈ (Graded) استاذ کی

پیش کرنے سے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرالیا تھا، اس طرح مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے اپنے تعلق کو تادم واپسیں باقی رکھا، اور اپنے دونوں صاحبزادگان سعید الرحمٰن فیضی اور خالد سلمہما اللہ تعالیٰ کو ندوہ میں داخل کرایا اور یہیں سے انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔

۱۹۵۸ء میں میرا سفر برائے تعلیم واستفادہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے ان کے استاذ جلیل جناب ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالیؒ کی خدمت میں خط وکتابت کے بعد ہوا، وہ اس وقت بغداد یونیورسٹی کے دار المعلمین العلیا کے پروفیسر تھے، اور محلہ الأعظمیۃ میں اپنے ذاتی مکان میں قیام پذیر تھے، میں تقریباً ۱۱ر مہینے بغداد، دمشق اور حرمین شریفین میں قیام کر کے جب ۱۹۵۹ء میں دارالعلوم واپس آیا تو اس وقت کے درجہ دوم میں بھی میرا تعلیمی گھنٹہ مقرر ہوا، اس درجہ میں منجملہ اور طلباء کے ایک طالب علم محمد نعیم صدیقی اعظمی سے تعارف ہوا، انہوں نے بتایا کہ وہ جناب مولانا محبوب الرحمٰن ازہری صاحب کے حقیقی بھانجہ ہیں، اس وقت سے جناب مولانا ازہری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت میرے لئے اور زیادہ کشش کا باعث بنی، اور جب بھی مولانا چھٹیوں میں کلکتہ سے تشریف لاتے تو میں مولانا سے ملنے کے لئے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر جایا کرتا تھا، مولانا بھی میرے ساتھ شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، اور اپنی دعاؤں سے نوازتے تھے، یہ مولانا کے ریٹائر ہونے سے پہلے کی بات ہے، لیکن جب مولانا کلکتہ سے ریٹائر ہو کر واپس آگئے اور دارالعلوم سے ان کا تعلق ہو گیا تو ملاقات کا سلسلہ جاری رہا، یوں تو میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت سے اسی وقت سے متاثر تھا جب میں دارالعلوم کے درجہ اول میں ان کی کتاب "دروس الأشیاء، والمحاورۃ العربیۃ" پڑھانے لگا تھا، لیکن یہ تعلق روز بروز مستحکم ہوتا گیا۔

مولانا کے لکھنؤ میں قیام کے دوران ان کے مخلص دوست علامہ ابو محفوظ الکریم معصومی صاحب بھی مولانا کی دعوت پر لکھنؤ تشریف لایا کرتے تھے، حضرت مولانا معصومی صاحب سے بھی حضرت مولانا ازہری صاحب کے ذریعہ ملاقات کرنے اور ان کی علمی وجاہت سے فائدہ اٹھانے کا

تھے، اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں ٹھہرنے کے بجائے مولانا ازہری کے مکان پر اور بعد میں مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی کے مکان پر قیام فرماتے تھے، جنہوں نے علامہ معصومی رحمۃ اللہ علیہ کے بلند علمی مقام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا، ان کا یہ تعلق بھی مولانا ازہری رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ سے ہوا، اور علم حدیث اور رجال کے ایک بڑے عالم اور محدث ہونے کی وجہ سے علمی فیض رسانی کا سلسلہ دراز تر ہوا، یہاں تک جب مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی حفظہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم حضرت علامہ سید عبدالحی حسنیؒ کی کتاب ''تہذیب الاخلاق'' جو منتخب احادیث کا مجموعہ ہے کی شرح وتعلیق کا بیڑا اٹھایا تو حضرت مولانا معصومی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی بیش قیمت علمی رہنمائی کی، اور اس کتاب کا نام: ''روائع الأعلاق فی شرح تہذیب الاخلاق'' انہیں نے رکھا، اور علم حدیث اور اس کے متعلقات کے موضوع پر ایک مفصل مقدمہ تحریر فرمایا، اس سے اس کتاب کی قیمت میں مزید اضافہ ہوا، اس کتاب پر اصل مقدمہ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلم مبارک سے کتاب کی زینت بنا، اور تمام علمی اور تعلیمی حلقوں میں کتاب کے تعارف اور مقبولیت کا ذریعہ ثابت ہوا۔

اس کے بعد حضرت مولانا معصومی رحمہ اللہ جب بھی لکھنؤ تشریف لاتے تو ان کی میزبانی کا شرف مولانا ازہری کی وساطت سے جناب مولانا ابوسحبان ندوی کو حاصل ہوتا، اور وہ زیادہ تر انہیں کے گھر پر قیام فرماتے، اور علم حدیث میں زبردست افادہ کا باعث ہوتے تھے، ایک سے زائد مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہمارے عزیز دوست مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی کے والد ماجد بھی تشریف فرما ہوتے تھے، اور میری تمنا ہوتی کہ یہ حضرات میرے غریب خانہ کو زینت بخشیں اور اپنی برکتوں کا کچھ حصہ مجھے بھی عطا فرمادیں، ان حضرات کا اجتماع بہت ہی دلچسپ، مفید اور جانفزا ہوا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کے درجات بلند فرمائیں، اور ان کی زندہ دلی، علم دوستی اور خورد نوازی کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائیں۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھیوں میں تھے، ان کے انتقال (۲۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء) کے موقع پر حضرت سید صاحبؒ نے ماہنامہ معارف میں ایک مضمون تحریر فرمایا تھا، اس کا ایک اقتباس نذر قارئین ہے:

''علمائے ندوہ کی برادری میں یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اُن کی برادری کے سب سے پرانے رفیق اور دوست حافظ فضل الرحمٰن صاحب ندوی امام وخطیب جامع مسجد خانقاہ مجددیہ سرہند نے چند ماہ کی علالت کے بعد بمرض استسقاء بمقام مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء بروز جمعہ ۷ بج کر ۴۳ منٹ شام کے وقت اس دنیا کو الوداع کہا، ان کی عمر غالباً ۶۵ برس کی ہوگی، کیرانہ ضلع مظفرنگر ان کا وطن تھا، مگر بچپن سے وہ لکھنؤ آئے اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوکر متوسطات تک کی تعلیم پائی، وہ استاذنا جناب مولانا محمد فاروق چریا کوٹی مدرس اعلی کے محبوب شاگردوں میں تھے، صرف ونحو اور ریاضیات سے بڑی دلچسپی اور مہارت رکھتے تھے، مرحوم نے عین جوانی میں انابت الی اللہ کی توفیق پائی تھی، قناعت پسند، زہد پیشہ، پھر بذلہ سنج، ہمیشہ بہار اور شاداں وفرحاں رہتے تھے، دوستوں کی دوستی میں پائیدار اور مخلص تھے۔

مرحوم کے بڑے لڑکے کا نام مولوی محبوب الرحمٰن ہے، ابتدائی تعلیم ہندستان میں دلا کر مدرسۂ صولتیہ مکہ معظمہ میں بھیج دیا، جہاں وہ کئی سال رہ کر علوم درسی سے فراغت پا کر مزید تعلیم کی غرض سے جامع ازہر چلے گئے، وہاں دو سال رہ کر قدیم وجدید علوم فلسفہ وتاریخ وادب ودینیات کی تعلیم پائی، اور دو سال ہوئے کہ شام وعراق ہوکر ہندوستان واپس آئے، اور اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہیں''۔

جناب مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ ہمیشہ اپنی شفقتوں سے مجھ خاکسار کو نوازتے تھے، اور جب بھی دار العلوم تشریف لاتے، ازراہ شفقت دفتر اہتمام کو تھوڑی دیر کے لئے زینت بخشتے اور اپنی مفید گفتگو اور تجربات سے مستفید فرماتے تھے، وہ اپنی قیام گاہ سے دار العلوم تک کسی سواری سے تشریف لاتے تھے، مگر صحت کی کمزوری کے باوجود نہ تو اس کا شکوہ کرتے اور نہ بوقت ضرورت کسی کا سہارا قبول فرماتے، یہاں تک کہ چھڑی استعمال کرنے کے بارے میں میں نے جب بھی

جاتے، اپنا شطہ بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے، اہلیہ صاحبہ کی وفات کے بعد فکر مندی میں اضافہ ہو گیا تھا، اور زندگی کے تمام معاملات میں تنہائی کا احساس غالب تھا صاحب زادگان باہر ملازمت اور خدمت دین کے سلسلہ میں مقیم ہیں اور صاحب زادیوں کی شادی ہو چکی ہے، چھوٹے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا اور گویا وہ زبان حال سے عربی شاعر کا یہ شعر پڑھتے تھے:

ذهـب الـذيـن أحبهـم　　وبقيت مثل السيف فردا

(سبھی اہل تعلق رخصت ہو گئے اور میں تلوار کی طرح تن تنہا باقی رہ گیا)۔

مولانا حسن اخلاق اور تواضع میں اپنی مثال آپ تھے، چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور بڑوں کی تعظیم ان کا شعار تھا، قول و فعل میں ہر طرح کے جارحانہ انداز سے محفوظ تھے، اور دوسروں کے لئے نمونۂ عمل تھے، مولانا نے اپنی کچھ علمی نشانیاں چھوڑی ہیں، ان میں سر فہرست "دروس الأشياء والمحاورة العربية" کتاب ہے اور وہ دار العلوم کے نصاب تعلیم میں مقرر ہے، دوسرے نمبر پر انہوں نے اور مولانا معصومی نے عربی اشعار کا مجموعہ "المنتخبات العربية (قسم النظم)" کے نام سے تیار کیا تھا، جو حضرت مولانا کے مقدمہ کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عصر حاضر کی شاعری سے شروع ہوتی ہے، اور عصر جاہلی کی شاعری پر اس کا اختتام ہوتا ہے، رد قادیانیت کے سلسلہ میں بہت کوششیں کیں اور اس سلسلہ میں مختلف اسفار کئے، اور "سفر قادیان" کے نام سے ایک کتابچہ تحریر فرمایا، جو ندوۃ العلماء کے شعبۂ دعوت وارشاد کی طرف سے اشاعت پذیر ہوا، مسجد کے تقدس، اور مسلمانوں سے اس کے تعلق کے موضوع پر "مسجد اور مسلمان" کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا، جو بہت مفید ہے۔

مولانا ازہری رحمۃ اللہ علیہ کمزوری اور بیماری کی مشقتیں جھیل کر ۱۹/۲۰/اپریل ۲۰۱۰ء کی درمیانی شب میں اپنے رب حقیقی سے جا ملے اور اپنی مسندِ علم کو سونی کر کے مسکراتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے، انا لله وانا اليه راجعون ۔ اللہ تعالیٰ مولانائے مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائیں، ان کے درجات بلند فرمائیں اور ان کو اپنی ردائے رحمت سے ڈھانپ دیں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائیں (يا يتها النفس المطمئنة ارجعي الى ربك راضية مرضية، فادخلي في عبادي وادخلي جنتي)۔

[redacted]

باب ششم

والد محترم اور مشفق اساتذۂ کرام

[redacted]

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ

رمضان ۱۴۱۲ھ کے پہلے عشرہ میں رحمت کی گھٹائیں موسلا دھار برس چکی تھیں اور دوسرے عشرہ کے آغاز پر بارگاہ خداوندی سے عفو عام اور بخشش دوام کی منادی ہورہی تھی کہ اسی پاکیزہ فضا میں علامہ اعظمیؒ برکتوں اور رحمتوں کے جلو میں اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، علامہ اعظمیؒ جن کی ذات سے علم وفضل کے حلقوں، محدثین کرام اور فن اسماء الرجال کے نقادوں کی مجلسوں میں ستر سال سے جو چراغ روشن تھا جس سے علم وتحقیق کی سینکڑوں قندیلیں روشن تھیں، ایک لخت خاموش ہوگیا، بلکہ درحقیقت آسمان وعلم وفضل کا ایک درخشاں ستارہ ٹوٹ کر بکھر گیا اور اہل علم کی محفلوں میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیل گئی، ہندوبیرون ہند علم الحدیث اور علوم الحدیث کے آسمان پر جو آفتاب فضل وکمال پوری فیاضی کے ساتھ روشنی لٹاتا رہا ،وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، علمائے کرام اور محدثین عظام کی محفلوں میں دینی علمی مشکلات کے عقدۂ لاینحل کے لئے جو ناخن گرہ کشا کی حیثیت سے رہا وہ ہمیشہ کے لئے ان کی آنکھوں سے بہت دور چلا گیا۔ ’’انا للہ وانا الیہ راجعون‘‘

مولانا کی ذات علم وتحقیق کی ایک مستند ومعتبر کتاب تھی، جس سے علماء کرام اور محدثین عظام یکساں کسب فیض کرتے تھے، ان کی ذات اہل علم کے لئے چشمۂ آب حیات بن کر رہی، جس سے ہر ایک نے اپنی علمی پیاس بجھائی، جب ان کے سامنے کوئی علمی پیچیدگی آتی، یا کسی دقیق بحث سے سابقہ پڑتا، جس سے وہ بذات خود عہدبرآ نہیں ہو پاتے تو فوراً علامہ اعظمیؒ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے، وہاں علم وتحقیق کے جواہر پاروں سے ان کا دامن بھر جاتا اور اپنی تہی دامنی کا احساس کافور ہوجاتا اور مطمئن ہوکر واپس ہوتے علوم وفنون کی جامعیت نے ان کی

قدرت نے ان کی ذات کو فیضانِ علم ہونے کے لئے ایک چلتے پھرتے مدرسہ کی شکل دے دی تھی۔

وہ مشرقی اتر پردیش کے ایک معزز علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد ماجد مولانا محمد صابر بن عنایت اللہ علیہ الرحمہ (جو ایک جلیل القدر عالم اور دینی معاملات میں شہر کے مسلمانوں کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے) اپنے فرزند جمند کی تعلیم و تربیت اور ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں لگے رہے۔

ابتدائی تعلیم، تجوید، خط کی مشق و تمرین کی تکمیل کے بعد مزید تعلیم کے لئے انھیں امام المحدثین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ممتاز شاگرد مولانا عبد الغفار صاحب مئوی کی خدمت میں بھیجا، استاد و شاگرد میں کچھ ایسی ذہنی مناسبت ہوئی کہ تعلیم کا بیشتر زمانہ مولانا ممدوح کی معیت میں گذرا، اور استفادہ کی کوئی صورت نہیں چھوڑی وہ جہاں گئے مولانا اعظمی ان کے ہمراہ رہے۔

تعلیم کا پہلا مرحلہ تمام ہونے کے بعد دورۂ حدیث کے لئے نگاہیں ہندوستان کی مثالی درسگاہ دار العلوم دیوبند کی جانب لگی ہوئی تھیں۔

تقدیر نے یاوری کی اور دار العلوم دیوبند میں داخل ہو گئے وہاں انھیں علامہ محدث انور شاہؒ کشمیری، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، علامہ شبیر احمد عثمانی، شاہ اصغر حسین دیوبندی جیسے چوٹی کے علماء سے استفادہ کا بھرپور موقع ملا۔

دار العلوم دیوبند کے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد دار العلوم مئو کے صدر مدرس مولانا کریم بخش سنبھلی سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، اور سند فضیلت حاصل کی اسی طرح شیخ محمد سعید سنبھلی کا تالیف کردہ رسالہ الاوائل فی الحدیث مولانا عبد الغفار مئوی سے پڑھا اور انھوں نے روایت حدیث کی اجازت دی ان کی سند حدیث عالی ہے، شیخ عبد القیوم اور شیخ

فرائض چار سال تک انجام دیئے، ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء میں جامعہ مظہر العلوم بنارس بحیثیت صدر مدرس منتقل ہوگئے اور یہاں تقریباً چار سال تک تدریسی فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، اس قلیل ترین مدت میں فن حدیث وفقہ میں طلبہ کی ایک ایسی کھیپ تیار کردی کہ ان میں سے بیشتر افراد مختلف علمی مراکز اور تحقیقی اداروں میں موقر مناصب پر فائز ہوئے، لیکن ان تمام ترقیوں کے باوجود ان کے دل میں ایک ایسے مدرسہ کی تاسیس وتعمیر کا خیال چٹکیاں لیتا رہا جو ان کی علمی توانائیوں کا مرکز، ان کے عظیم علمی منصوبوں کا امین اور علم حدیث کے فیضان کے لئے بحر مواج ثابت ہو، لہٰذا شاہزادی جہاں آرا بنت شاہ جہاں کی تعمیر کردہ شاہی مسجد مئو میں اپنے تخیل کو عملی جامہ پہناتے ہوئے مفتاح العلوم نام سے ایک مدرسہ قائم کرلیا اور اس طرح ان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہوگئی، مدرسہ کی داغ بیل پڑتے ہی اسلامی علوم وفنون کے ماہرین کا یہاں اجتماع ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ مدرسہ آباد ہوگیا اور قلیل سی مدت میں مدرسہ نے حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ملک کے اطراف وجوانب سے تشنگان علوم نبوی اس چشمۂ حیواں پر سمٹ آئے اور اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوبؒ مفتاح العلوم سے وابستہ تھے ۱۹۴۸ء سے تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری بھی انھیں کے سپرد تھی۔ انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں اور تمام توانائیوں کے بروئے کار لاتے ہوئے مدرسہ کو ہر پہلو سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ اور اس کے لئے انھوں نے پر مشقت طویل ترین اسفار بھی کئے حتی کہ مدرسہ کے طائر شہرت کی پرواز بیرون ہند تک جا پہونچی اور اس کے تعلقات عظیم الشان علمی مراکز اور چوٹی کے علماء سے قائم ہوگئے۔

دوسری طرف والد ماجدؒ اپنے تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ مدرسہ کی نظامت سے لے

بھرپور تعاون ان کو حاصل تھا، اس ادارہ کی تیسری شخصیت مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کی تھی جو انتہائی جرأت وعزم اور ارادہ کے لحاظ سے مردآہن سمجھے جاتے تھے، اپنی تدریسی مشغولیات حدیث وفقہ وتفسیر کی اونچی کتابوں کی تدریسی ذمہ داری انجام دینے کے ساتھ علامہ اعظمی کا پورا پورا تعاون کرتے تھے۔ان کی شخصیت سے مدرسہ کومختلف شعبوں میں مخصوص طور پر فائدہ پہونچا اور مدرسہ کی ترقی پران کے دوررس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

مدرسہ کو ان تینوں شخصیتوں کی فکری یکسانیت، مزاجی ہم آہنگی اور سعی پیہم نے بہت کم عرصہ میں معراج کمال پر پہونچادیا خصوصاً علامہ اعظمی کی فن حدیث میں بصیرت آمیز مہارت، جرح وتعدیل میں عمق وگہرائی اور اسماء الرجال کا استحضار (جوکم ازکم ہندوپاک میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا) کے تشخص وتفوق سے مدرسہ کے اشہب عروج واقبال کومہمیز لگی اور تھوڑی مدت میں حیرتناک ترقی کی اوراسی وجہ سے مدرسہ میں مولانا شمس الدین، مولانا عبدالباری، مولانا عبدالجبار مئوی (جنھوں نے اپنے آپ کو علامہ اعظمی کے سپرد کردیا تھا اور ان کی وفات حسرت آیات تک ان کی اس خودسپردگی میں کوئی فرق نہیں آیا) مولانا محمد یحیٰ (جو علامہ اعظمیؒ کے ہونہار فاضل شاگردوں میں تھے) جیسے لائق وفائق جلیل القدر اساتذہ کی ایک پاک طینت جماعت اکٹھا ہوگئی تھی۔

علامہ اعظمی کے دور محدثیت اور تنظیم کی اس قلیل سی مدت میں مدرسہ نے تعمیر وترقی کا طویل فاصلہ طے کرلیا، ہر عام وخاص کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور اپنی قلیل وسائل اور سہولتوں کے فقدان کے باوجود ہندوستان اور پڑوسی ممالک سے آنے والے طلبہ جو علامہ اعظمیؒ سے شرف تلمذ حاصل کرنے کو اپنے لئے سرمایہ افتخار سمجھتے تھے جب آئے تو ان کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور ان کے لئے ساری سہولتوں کا بندوبست کیا۔

یہ زمانہ میرے لڑکپن کا تھا اور میری معلومات بس اس قدر تھی کہ علامہ اعظمیؒ اس مدرسہ

بلاضرورت ان کے سامنے لب کشائی کی جسارت نہیں کرپاتا، مدرسہ کی چہار دیواری میں آپ کے قدم رکھتے ہی طلبہ اور اساتذہ پر ہیبت سی چھاجاتی، ایک مرعوب کن خاموشی کی فضا طاری ہوجاتی، یہ منظر بارہا میری نظروں سے ایسا گذرا کہ میرے دل ودماغ میں رچ بس گیا اور میرے تحت الشعور میں ان کی ہیبت بیٹھ گئی۔ میرا حال یہ تھا کہ جب تھوڑے دنوں کے بعد مجھے ان سے ادب عربی پڑھنے کا موقع ملا تو مارے ہیبت کے میری ہمت جواب دے گئی، لیکن والد ماجدؒ نے ہمت افزائی کی اور بذات خود لے کر استاذ معظم کے پاس گئے اور مجھے ان کے حوالہ کر دیا اس کے بعد میں ان سے پڑھنے لگا۔ اور دھیرے دھیرے مجھے ان سے انسیت سی ہوگئی۔ اور ان کے سامنے پڑھنے سے ایک قسم کا سرور وانبساط محسوس ہونے لگا۔ اور دوران طالب علمی ان کے قیمتی مشورے اور ہدایات میری زندگی کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے اور ان سے میں نے ادب عربی میں جو کچھ پڑھا، وہی آگے چل کر ندوۃ العلماء میں داخلہ کا سبب اور والد معظم رحمہ اللہ کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا باعث بنا۔

میرا علمی سفر جاری رہا، اس دوران میں نے حدیث وادب کی بعض دیگر کتابیں بھی ان سے پڑھیں یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ فن حدیث میں درجہ کمال کے ساتھ عربی ادب میں بھی علامہ اعظمیؒ ید طولیٰ رکھتے تھے اسی وجہ سے میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ میں عربی زبان کے تمام اصناف میں کمال پیدا کروں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو زبان میں مہارت پیدا کرنا ہی منتہائے کمال سمجھا جاتا تھا اور عربی زبان درخور اعتناء نہ سمجھی جاتی تھی۔ والد صاحب کا عربی زبان کے تئیں اس حد سے بڑھی ہوئی فکرمندی اور ذوق وشوق کو دیکھ کر کسی نے والد محترم کو خط کے ذریعہ عربی ادب سے دلچسپی لینے کو بے وقت کی شہنشائی کہا اور لکھا کہ یہ دور اردو کا ہے نہ کہ عربی کا۔ لیکن والد ماجدؒ اپنے موقف پر قائم رہے کیونکہ ان کی دوررس نگاہیں مستقبل کے افق پر عربی زبان وادب کا تابناک ستارہ روشن ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا

بقید حیات ہوتے تو عربی زبان کی بالا دستی اور اس کی ہمہ گیری کو بچشم خود دیکھ لیتے...... غالباً والدؒ نے اس سلسلہ میں علامہ اعظمیؒ سے تبادلۂ خیال بھی کیا اور ان سے یہ بھی درخواست کی کہ عربی زبان وادب کی تعلیم کے لئے مجھے اپنی تربیت میں لے لیں اور تھوڑا وقت عنایت کریں علامہ اعظمیؒ نے بخوشی اس کو قبول کر لیا پھر انھوں نے عربی مشق وتمرین کے لئے ایک مصری فاضل کی کتاب عنایت کی اور حکم ہوا کہ اس کے تمام مضامین اردو میں منتقل کروں یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ پھر ظہر وعصر کا درمیانی وقفہ تعلیمی وقت اور ان کے گھر میں ان کا خاص دارالمطالعہ میری درسگاہ قرار پایا میں پوری تندہی کے ساتھ چھ ماہ تک عربی زبان وادب کی تحصیل میں لگا رہا ان کے قیمتی افادات کے جواہر پارے اپنے دامن میں سمیٹتا رہا۔

اس کے بعد والد ماجدؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں خصوصاً استاذ گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے خط وکتابت کی اور علامہ اعظمیؒ سے بھی اس سلسلہ میں مشورہ کیا خدا کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دفتر سے منظوری آگئی اور میرا داخلہ ''تخصص فی الادب العربی'' میں ہوگیا اور اس طرح میں ہمیشہ کے لئے دارالعلوم سے وابستہ ہوگیا، یہاں سے میری زندگی کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔

اب میں گھریلو ماحول سے کٹ کر تعلیم وتعلم کی وسیع فضا میں آگیا تھا اور اس وقت میرا نصب العین والد ماجدؒ کی آرزوؤں کی تکمیل عربی زبان وادب کی تحصیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ مرور زمانہ کے ساتھ میری اور والد صاحبؒ کی یکساں آرزو بھی پوری ہوتی گئی۔ اور ہمارے مقصد میں اللہ تعالیٰ نے کسی حد تک کامیابی عطا فرمائی۔ اور آج بھی جذبۂ تشکر سے دل لبریز ہے۔

انھیں ایام میں علامہ اعظمیؒ کو اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا جس کی وجہ سے لکھنؤ میں ان کا قیام لازمی سا ہوگیا۔ آپ امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسہ دارالمبلغین

طلبہ سے لے کر اساتذہ تک علامہ اعظمی کے وجود کو غنیمت سمجھتے رہے اور مشکل وپیچیدہ مسائل میں مولانا کی طرف مراجعت کیا کرتے۔اس استفادہ میں خانوادۂ فاروقی کے افراد مولانا عبدالرحیم فاروقیؒ ان کے برادر اصغر اور مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ پیش پیش تھے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے تھے۔معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد علامہ اعظمیؒ کی مجلس لگتی تھی جس میں مستفیدین اور بڑے علماء کرام موجود ہوتے تھے۔میں بھی مجلس میں پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا اور اس زریں موقع سے استفادہ کی بھرپور کوشش کرتا رہا، زندگی اسی طور سے گزرتی رہی اس دوران دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تاریخ ادب عربی اور نصوص ادبیہ کی تحصیل اور ادبی افکار ونظریات کے غائرانہ مطالعہ میں مشغول رہا، میں سمجھتا ہوں کہ میرے فکر ومطالعہ اور عربی ادب کی ذوق آفرینی وسیع النظری جہاں میرے مرشد استاذ گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قیمتی مشوروں اور ان کی رہنمائی مربیانہ ومشفقانہ برتاؤ کی مرہون منت ہے وہیں علامہ اعظمیؒ کی قیمتی آراء اور ان کے دوررس ہدایات وافادات کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، بلکہ وہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں زندگی اسی انداز سے گزار رہا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں علامہ اعظمی کے قیام کو بسا غنیمت سمجھ کر ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی۔تا کہ مولانا شاہ محمد حلیم عطاؒ کی وفات سے مسند حدیث ایک مدت سے جو سونی پڑی تھی اس کو زینت بخشیں۔ یہ درخواست استاذ گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے کچھ اس طرح پیش کی کہ وہ اسے مسترد نہ کر سکے۔اور لکھنؤ میں قیام کی حد تک اس کے لئے تیار ہو گئے، یہ خبر مژدۂ جانفزا بن کر طلبہ و اساتذہ کے درمیان پھیل گئی اور تمام لوگوں نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی دارالعلوم کے مہتمم تھے انھوں نے علامہ اعظمیؒ کے گھنٹوں کی ترتیب قائم کی اور ان کے قیام کا معقول نظم کیا۔اور

ڈیڑھ سال تک ابر کرم بن کر طلبہ اور اساتذہ پر یکساں برستے رہے۔

حتی کہ ۱۹۵۷ء میں جب نئے الیکشن کا زمانہ قریب آگیا اور اسمبلی تحلیل کر دی گئی تو اب پھر لکھنؤ میں قیام کا جواز باقی نہ رہا اور واپسی کے ارادہ کا اظہار فرمایا۔ ہر چند کہ طلبہ اساتذہ اور ذمہ داران مدرسہ نے قیام پر اصرار کیا لیکن آپ نے مزید اقامت سے معذرت کر دی۔ اور وطن مالوف مئو اعظم گڑھ واپس ہو گئے۔ اور اپنے مدرسہ کے انتظام وانصرام میں مصروف ہو گئے۔

علامہ اعظمیؒ کی مفتاح العلوم واپسی کے بعد ادارے کی رونق اور طلبہ واساتذہ کی تعلیمی وثقافتی سرگرمیاں پھر عود کر آئیں۔ اور ملک کے اطراف واکناف سے طالبان علوم نبوت کی آمد کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔ اور مدرسہ میں چہل پہل کی فضا پیدا ہو گئی۔ اور مدرسہ کی جامد علمی ترقیاں پھر رواں دواں نظر آنے لگیں۔ اور کونے کونے سے اس کی نصرت وحمایت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ تدریسی اشتغال انتظامی امور کی دیکھ ریکھ دعوت وارشاد کے فریضہ کی انجام دہی جیسے مشاغل کی گونا گونی کے باوجود آپ کی تحقیقی کاوشیں ایک منٹ کے لئے موقوف نہیں ہوتی تھیں، مصروفیت ہی آپ کی روحانی غذا تھی، یہی مشغلہ تسکین قلب کا باعث اور زندگی کے لئے سرمایہ سکون تھا، جب بھی کوئی نو وارد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اس حال میں پاتا کہ اردگرد کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے اور ان کے درمیان بیٹھ کر داد تصنیف وتحقیق دے رہے ہیں کبھی املا ہو رہا ہے کبھی کچھ نوٹ کیا جا رہا ہے کہیں تعلیق کا کام ہو رہا ہے۔ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہ نو وارد علامہؒ کے پاس طویل نشست نامناسب سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ ان تصنیفی امور میں ان کے صاحبزادہ مرقاۃ العلوم کے مہتمم جناب مولانا رشید احمد اعظمی ہمیشہ معاون ہوتے۔ خصوصاً ان کی موجودگی اس وقت ناگزیر ہوتی جب کسی مخطوطہ کا مقابلہ یا کسی مسودہ کی تبییض و ترتیب کا مسئلہ ہوتا۔ تصنیف وتالیف کے باب میں وہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ م ۱۴۰۲ھ کے مثنی تھے اشتغال بالحدیث اور علمی افادات کی اشاعت حدیث کی کتابوں کی تحقیقات وتالیفات

شیخ الحدیث کا انتہائی احترام کرتے تھے اور خاص اوقات میں ان سے دعاء بھی لیا کرتے تھے۔

تحصیل علم اور خصوصاً ادب عربی کے سلسلہ میں میری کدوکاوش اور شوق فراوان کو دیکھتے ہوئے استاذ گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے طے کیا کہ مجھے استاذ گرامی علامہ محمد تقی الدین ہلالی مراکشی (جو ندوۃ العلماء میں چار سال تک ادیب اول کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دے چکے تھے اور فی الحال بغداد یونیورسٹی کے کلیۃ دار المعلمین العلیا میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے) سے مزید استفادہ کرنا چاہئے، یہ شروع جنوری ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ لیکن علامہ اعظمیؒ کی شاگرد نوازی کو فراموش نہیں کرسکتا کہ جس وقت ناچیز بغداد کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ باوقار شخصیت لکھنؤ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہے اس ناچیز پر ان کی الطاف وعنایات کی ہمیشہ بارش ہوتی رہی، اور اس ہمت افزائی کو بھی ناچیز ان کے ابر کرم کا ایک چھینٹا سمجھتا ہے انھوں نے میری ہمت افزائی کرتے ہوئے اور درازئ عمر، سہولت وبرکت کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا اور تاعمر میری تدریسی تعلیمی سرگرمیوں کی خبرگیری کرتے رہے، اللہ انھیں غریق رحمت کرے اور ان کے درجات بہت بلند فرمائے۔

علامہ اعظمیؒ کی حدیث ورجال میں عمیق بصیرت اور تنقیدی واقفیت اور ان کے علوشان کی وجہ سے ہندوستان کے بڑے بڑے مدارس وجامعات ان کی خدمات حاصل کرنے کے متمنی اور کوشاں رہتے۔ اور بہت سی جامعات ومدارس کی طرف سے پیشکش بھی ہوئی اور بڑے الحاح واصرار کے ساتھ اس کو قبول کرنے کی درخواست بھی کی گئی اور مزید باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اس سے افادہ کا دائرہ وسیع ہوگا اور آپ کی شخصیت محدود حلقوں سے نکل کر ملک گیر ہو جائے گی۔ لیکن انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے اس نوخیز پودہ مدرسہ مفتاح العلوم کی آبیاری اور ان کی تعمیر وترقی کی خاطر ساری پیشکش کو مسترد کردیا اور اپنے مستقر کو خیرباد کہنا پسند نہ کیا۔

دیوبند اور حضرت قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند پانچویں دہائی کے شروع میں علامہ اعظمیؒ کے پاس تشریف لائے اور شعبۂ افتاء کی صدارت پیش کی اور افادۂ عام کے لئے دارالعلوم دیوبند میں فروکش ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن انھوں نے مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر و ترقی کی اہمیت اور اپنے علمی و تحقیقی و تصنیفی مشاغل کی وجہ سے معذرت کر دی۔ لیکن پھر تھوڑی مدت کے بعد دونوں بزرگوں نے منصب شیخ الحدیث کی قبولیت پر شدید اصرار کیا لہٰذا مجبور ہو کر انھوں نے اس کو قبول کر لیا مگر جب مفتاح العلوم کے مجلس شوریٰ کے ارکان اور مدرسہ کے ذمہ داروں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو سب نے اس منظوری کے خلاف بیک زبان عقیدتمندانہ احتجاج کیا اور کہا کہ ہم اپنے مربی اور علمی و روحانی قائد سے دستبردار نہیں ہو سکتے یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائیں۔ اس شدید ردعمل کے بعد علامہ اعظمیؒ نے اپنی رائے بدل دی اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور یہ دن ایک یادگار تاریخی دن بن کر رہا۔

ان کی علمی و تحقیقی خدمات اہل نظر سے مخفی نہیں اور تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔ ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے المعہد العالی للدراسات العلیا فی الحدیث اور مدرسہ مرقاۃ العلوم اور اسی کے جوار میں دریائے تونس کے کنارے ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کی۔ انھوں نے اپنے آخری دور میں مفتاح العلوم کو اپنے لائق و فائق شاگردوں کے حوالہ کر دیا تھا، ~~اور خود معہد اور مدرسہ مرقاۃ العلوم کے لئے فارغ ہو گئے تھے۔~~ آپ اپنے خاص دار المطالعہ میں بحث و تحقیق میں منہمک رہتے اور مختلف دیار اور امصار سے آتے ہوئے فارغ التحصیل طلبہ کے اندر حدیث و فقہ و تفسیر میں عمق پیدا کرنے کی فکر میں لگے رہتے اگر وہ ایک محدود تعداد اور باصلاحیت اہل لیاقت افراد کی شرط نہ لگاتے تو اس چشمۂ فیض پر تشنگان علم و فن کا جمگھٹا رہتا اور تشنگان علم و فن اپنے اپنے ظرف و ذوق کے مطابق سیراب ہوتے۔

ہندو بیرون ہند کے بے شمار علمی حلقوں اور مختلف تحقیقی اداروں سے ان کے گہرے اور

نقطۂ نظر کے شدید اختلافات کے باوجود ان کی تعریف وتوصیف سے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی، اور جلیل القدر عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی صاحب کے علاوہ دیگر اہل حدیث علماء ومحدثین کے علمی ودینی خدمات کو سراہنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

علامہ اعظمیؒ جمعیۃ العلماء کے رکن اس وقت منتخب ہوئے جب کہ اس کی سرگرمیاں شباب پر تھیں اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اس کے صدر تھے، انھوں نے اس تحریک کی وسعت وترقی اور اس کے حامیوں کی تعداد میں کثرت کے سلسلہ میں قائدانہ کردار ادا کیا، ان کی محبوب ذات سے اس تحریک کو حد درجہ فائدہ پہونچا، شہر مئو اور قریبی شہروں کے مسلمانوں نے محض ان کی شرکت کی وجہ سے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی اور اس کی رکنیت قبول کی علامہ اعظمیؒ اس تحریک کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہے اور ہر آڑے وقت میں اس کی وکالت وحمایت اور تائید وتصدیق کرتے رہے حتیٰ کہ جب اس کے عہدۂ صدارت پر مولانا اسعد مدنی فائز ہوئے تو علامہ نے ان کے ساتھ بھی مکمل تعاون کیا۔

ان کی زندگی کے اخیر ایام میں انھیں امیر الہند مقرر کیا گیا۔ اس انتخاب کے بعد انھوں نے ملک گیر دورہ کیا۔ ہر مذہب ومسلک کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اور ان تمام لوگوں نے اس انتخاب پر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ علمی میدان میں ان کا جو وقار تھا وہ محتاج تعارف نہیں لیکن تحریکی اعتبار سے بھی انھوں نے جو شہرت عام حاصل کی وہ کم نہ تھی۔ اس انتخاب کے بعد ان کی حیثیت محض ایک جلیل القدر عالم ومحدث ہی کی نہیں تھی بلکہ عوام الناس کے درمیان ان کی حیثیت ایک پیشوا کی بھی ہوگئی تھی۔

ہندوستان کے چوٹی کے علماء اور قائدین سے ان کے گہرے تعلقات تھے، جن میں سرفہرست حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ذات عالی صفات ہے۔ علامہ اعظمی کا ان

اسی طرح بے شمار اکیڈمیوں کی رکنیت اور علمی مراکز کی سرپرستی بھی انہیں حاصل تھی۔ وہ مسلمانوں میں دینی بیداری کے سلسلہ میں حد درجہ فکرمند اور اس کے لئے تعلیم وتربیت کے ساتھ دعوتی وتبلیغی دوروں کوضروری خیال کرتے تھےاور علماء کرام کو جب بھی کسی چیلنج کا سامنا ہوا علامہ اعظمیؒ ان کے دوش بدوش رہےاور مشقت وکلفت کو جھیلنے میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، انھوں نے اپنی زندگی کا مشن اعلاء کلمۃ اللہ اور اتباع سنت کو بنالیا تھا۔ ان کی علمی وتحقیقی کاوشوں اور عربی زبان وادب کے میدان میں ان کی بیش قیمت خدمات اوران کی قدآور شخصیت کے اعتراف میں حکومت نے صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا تھا۔

ان تمام مساعی جمیلہ کے ساتھ ساتھ وہ وعظ ونصیحت اور پر اثر تقریروں کے ذریعہ دعوت وارشاد کے کام میں لگے رہتے تھے، اس طرح ہر خاص وعام کو ان کی ذات سے فائدہ پہونچتا تھا وہ علم وتحقیق، صلاح وتقویٰ، بالغ نظری وسعت ظرف میں سلف صالحین کی زندہ یادگار تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال جلیلہ کو قبول فرمائے اور ان کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ اور جنت الفردوس کے اعلی مقام میں جگہ عطا فرمائے۔

☆☆☆

والد محترم حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ

کچھ حیات وخدمات کے بارے میں

کچھ بچپن کے بارے میں

میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو اپنے بچپن کی کچھ باتیں اور کچھ یادیں اور اس دور میں پیش آنے والے واقعات کے کچھ ہلکے پھلکے خاکے ضرور ذہن میں رہتے ہوں گے، مجھے اپنے بچپن میں سنِ شعور تک پہنچتے پہنچتے والدین کی شفقتوں اور انتہائی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اس بات کے سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ گھر میں لکھنے پڑھنے کا ایک اچھا ماحول ہے، میرے والد صاحب مدرسہ میں تعلیم دیتے ہیں، اور میرے دادا صاحب حیدرآباد میں اپنی تدریسی مصروفیتوں کو چھوڑ کر واپس آچکے تھے، اور مجھے اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا تھا، اور بہت سے لوگ ان سے برابر اپنی ضرورتوں کے سلسلہ میں ملنے آیا کرتے تھے، اور شیخ طریقت ہونے کے ساتھ اچھی تربیت میں اپنے آپ کو مشغول رکھتے تھے، محلّہ کے صحن میں جہاں اہلِ محلّہ آکر بیٹھا کرتے تھے، میں ان کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا، کبھی انگلی پکڑ کر اور کبھی گود میں، ہمارے والد صاحب کا ننیہال بھی محلّہ ہی میں سکونت پذیر تھا، وہاں بھی میں اپنے دادا صاحب کے ساتھ جایا کرتا تھا، پھر شعور میں کسی قدر پختگی آتے ہی میں اکثر اپنے والد صاحب کے ساتھ مدرسہ جانے لگا، اور قاعدۂ بغدادی ہاتھ میں لے کر مدرسہ کے قاری صاحب کے سامنے جا بیٹھتا تھا، جہاں والد صاحب نے ایک دفعہ مجھے لے جا کر قاری صاحب سے درخواست کی تھی کہ بچے کو یہاں بیٹھا لیا کریں، ابھی عمر کم وبیش ڈھائی سال

صاحب میں بہت سخت تھا، اور وہ ہمیشہ کی عمر میں پکے لگا تھا، مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ مدرسہ کے بعض طلباء مجھے گھر پہنچادیا کرتے تھے، اور گھر میں اپنے بڑے بھائی صاحب کی نگرانی میں اوران کی تربیتی سختیوں کے درمیان رہتا تھا، مغرب کے بعد گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی، والد صاحب کہتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے کہ مغرب کے بعد اپنے بچوں کو گھر سے نہ نکلنے دو، اس لئے کہ شیاطین راستوں میں پھیل جاتے ہیں اور بچوں کو بہکاتے ہیں، ابھی عمر پورے تین سال ہی ہوئی تھی کہ ہمارے دادا صاحب اپنے شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ ولی محمد صاحبؒ کے ایصال ثواب کے موقع پر جاتے ہوئے مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے، ان کا وطن قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڑھ میں تھا، ان کے خاندان سے ہمارے بزرگوں کا تربیتی رشتہ تھا۔

والد صاحب کے اعظم گڈھ کا ایک سفر

اب میری عمر کا چوتھا سال شروع ہوگیا تھا، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اعظم گڑھ مدرسہ کے کسی کام سے جانے والے تھے، میں نے والدہ صاحبہ سے ضد کیا کہ میں بھی ساتھ جاؤں گا، اعظم گڑھ جانے کے لئے جب لاری کے کھڑے ہونے کی جگہ پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڑے بزرگ اور والد صاحب سے بہت بے تکلف معروف شخصیت کے مالک پہلے سے وہاں لاری کا انتظار کررہے تھے، اور دونوں حضرات کو ایک ہی کام سے اعظم گڑھ جانا تھا، مجھ کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ کہاں جائے گا؟ تو میرے والد ماجد نے کہا کہ اعظم گڑھ جانے کے لئے ضد کررہا تھا، جب زیادہ ضد کیا تو بیٹھالیا، یہ بھی اعظم گڑھ دیکھ لے گا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی وکیل سے ملنے کے لئے تشریف لے جارہے تھے، اگر میرا وجدان ساتھ دے رہا ہے تو وہ اقبال سہیل تھے، یہ دونوں حضرات مدرسہ کے کسی معاملہ میں ان سے مشورہ کرنے کے لئے گئے تھے۔

میرے مشفق ومربی والد صاحب کی وفات ۶ رشوال ۱۴۰۴ھ ہجری مطابق ۶ رجولائی ۱۹۸۴ء یوم جمعہ نماز فجر کے وقت ہوئی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

س تھے، معمولات کے بہت پابند تھے، عشاء کے بعد جلد سو جانے کا معمول تھا، صبح صادق سے پہلے اٹھ کر تہجد پڑھنا آپ کا دائمی معمول تھا، بیماری میں بھی تخلف اور ناغہ مشکل تھا، نماز باجماعت کا بہت اہتمام تھا، گھٹنوں کے درد اور اٹھنے بیٹھنے کی تکلیف کے باوجود مسجد میں آکر جماعت سے نماز پڑھتے اور فرض نماز کھڑے ہو کر پڑھتے، حتی کہ رمضان میں جب طبیعت مسجد جانے کے لائق ہوتی تو دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں آتے، تہجد کے بعد صبح کی نماز تک جہراً ذکر کرتے، اسی وقت ذکر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت بھی ہوئے۔

دلائل الخیرات اور اوراد وظائف کا معمول تھا، جس کی سختی سے پابندی کرتے، ملنسار، خندہ جبیں، متواضع واقع ہوئے تھے، ہر چھوٹا بڑا ان سے بے تکلف ملتا اور مجلس میں بیٹھتا تھا، طبیعت میں ظرافت بھی تھی، خشک مزاج اور کج خلق نہیں تھے، اپنے چھوٹوں سے بھی احترام کے لہجے میں گفتگو فرماتے، درس میں بڑی دلچسپی کا سامان ہوتا، طلبہ اندازِ بیان میں شگفتگی کی وجہ سے کشش محسوس کرتے، اپنے استاد علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تحقیقات والہانہ انداز میں بیان کرتے، انداز بیان ایسا سہل تھا کہ ذکی اور غبی دونوں قسم کے طلبہ یکساں فائدہ اٹھاتے، اختلافی مسائل میں مسلک حنفی کی برتری واضح طور پر ظاہر فرمادیتے، چہرہ پر نورانیت کے ساتھ وقار بھی نمایاں تھا، طلبہ کے ساتھ بڑی شفقت فرماتے، شاگردوں کے ساتھ خط وکتابت کے ذریعہ تعلق رکھتے اور نیک مشوروں سے نوازتے، الحمدللہ دوبار حج کی سعادت نصیب ہوئی، وفات سے ایک سال قبل بھی اس سعادت سے بہرہ مند ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتیں آپ پر ہوں۔

جامعہ مفتاح العلوم کے بعد والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز تھے، اور تقریباً ۲۲ سال تک وہاں نہایت یکسوئی کے ساتھ تدریس حدیث میں مشغول رہے، وفات کے بعد اسکی اطلاع فوری طور پر بذریعہ تار وہاں کے مہتمم حضرت مولانا سعید احمد بزرگ صاحب کو دے دی گئی تھی، پھر بعد میں بذریعہ خط مہتمم

صاحب کی خدمت میں جو خط تحریر کیا گیا، وہ زندگی کے آخری حالات پر مشتمل ہے۔

اس خط کا یہاں پر درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مخدوم معظم حضرت مولانا سعید احمد بزرگ صاحب دامت برکاتہم
مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، ضلع ولساڑ (گجرات)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک!

آنجناب کو یہ اطلاع دیتے ہوئے قلم کا جگر شق ہو رہا ہے کہ ہمارے والد معظم ومخدوم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی رحمۃ اللہ ۶ر شوال جمعہ کے دن نماز فجر کے وقت تقریبا ساڑھے چار بجے صبح کو اپنے رب حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اسی دن اکسپریس تار کے ذریعہ جناب کی خدمت میں اس عظیم حادثہ کی اطلاع کردی گئی تھی، امید ہے کہ بروقت علم ہو گیا ہوگا۔

حضرت والد صاحب مرحوم کی طبیعت یکم شوال کو نماز فجر کے بعد تقریبا ۶ر بجے جبکہ وہ عید کی نماز کے لئے عیدگاہ جانے کی تیاری فرما رہے تھے، کچھ علیل ہوئی، سینہ پر درد کی شکایت ہوئی، تھوڑی دیر تک مالش وغیرہ ہوئی اور بحمد اللہ تعالی درد ہلکا ہو کر ختم ہو گیا، مگر اس کی وجہ سے عیدگاہ تشریف نہ لے جاسکے، اس دن کے بعد علاج میں اہتمام اور تیزی کے باوجود کئی بار درد کی شکایت ہوئی، تاہم کسی کو یہ گمان نہ تھا کہ یہ کوئی ایسی تکلیف ہے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوگی، کئی بڑے ڈاکٹروں کا علاج ہوا، بعد میں وجع الفؤاد تجویز ہوا، اور ۶ر شوال کو ثلث رات میں تکلیف شروع ہوئی، دوائیں استعمال کرائی گئیں، انجکشن بھی لگا، مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور آخر کار وقت موعود آ گیا، اور حالت ذکر بالجہر میں روح جاں آفریں کے سپرد کردی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ، رفع اللہ درجاتہ ، وغفر زلاتہ، وجعلہ من

[redacted]

وحسن أولئک رفیقا (آمین اللهم آمین)۔

اس حادثہ فاجعہ کا اثر طبعی طور پر ہمارے تمام افراد خاندان پر بہت شدید ہوا، خاص طور سے ہماری والدہ صاحبہ پر بہت شدید اور گہرا ہے، والد صاحب مرحوم ہمارے لئے ایک ایسے مشفق مربی اور ایک ایسے عظیم دینی اور علمی سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے، جس کی مثال اس زمانہ کے مسلمانوں میں بہت کم ملتی ہے۔

ان کی عالمانہ عظمت، ان کی مدبرانہ تربیت، ان کا گہرا تعلق باللہ، ان کی تواضع اور بے نفسی، ان کا خلوص وللّٰہیت یہ سب چیزیں ایسی تھیں، جن سے ان کی دل آویز اور جامع شخصیت عبارت تھی، وہ اپنی مثال آپ تھے، ان کی وفات سے ہمارے زندگیوں کے اندر جو خلا پیدا ہو گیا ہے اور جس شفقت وتربیت سے ہم محروم ہو گئے ہیں، وہ عرصہ دراز تک ہمارے دلوں کو غمگین رکھے گا۔

آنجناب سے ان کا بہت قریبی تعلق عرصہ تقریباً ۲۲؍سال تک رہا ہے، اس لئے جی چاہتا ہے کہ آنجناب ان کے لئے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کے سلسلے میں اپنے جامعہ میں مختلف مؤثر طریقوں سے ذرا اہتمام فرمائیں، تاکہ جامعہ اسلامیہ کے طلباء واساتذہ سے ان کے گہرے اور قدیم تعلق کا تقاضہ بھی پورا ہو، اور مرحوم جلیل کی روح کو ثواب پہنچے اور اطمینان حاصل ہو، امید ہے کہ یہ درخواست قبول فرمائی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

عزیزی وصی الرحمٰن سلمہ (چھوٹے بھائی ڈاکٹر مسیح الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے) حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ رہتے تھے، اس لئے سب کی رائے یہی ہوئی کہ ان کی تعلیم کا سلسلہ جامعہ اسلامیہ میں جاری رہے، اور وہ آنجناب کی شفقت وسرپرستی میں وہاں رہ کر زیادہ سے زیادہ علمی اور دینی استفادہ کر سکیں گے، امید ہے کہ وہ ۲۰؍شوال تک وہاں حاضر خدمت ہوں گے، اور آنجناب ان کے لئے وہاں کے قیام وطعام کی کوئی موزون اور بہتر

صاحب کی روح کے لئے اطمینان اور انشراح کا باعث ہوتا، اگر خدانخواستہ کوئی ایسی صورت نہ پیدا ہوسکے تو ان کو مستطیع طلبہ کی فہرست میں رکھا جائے، انشاء اللہ تعالیٰ مصارف طعام کی ادائیگی کردی جایا کرے گی۔

خدا کرے آنجناب کے مزاج ہر طرح بخیر ہوں، تمام اساتذۂ کرام اور طلبہ حضرات کی خدمت میں ہمارا سلام اور دعائے مغفرت وایصال ثواب کی درخواست پہونچادی جائے، ہم لوگ آنجناب کے ممنون ہوں گے۔

امید ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذمہ اگر کسی کا کوئی حق باقی رہ گیا ہو تو ہمیں مطلع فرمایا جائے گا، تاکہ اسے ادا کر کے ہم درگاہ حق میں ان کے لئے زیادہ سے زیادہ مقبول ہونے کی راہ میں معاون بن سکیں، آمین ثم آمین، دعاؤں کی درخواست کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں، اللہ تعالیٰ آنجناب کو والد مرحوم کی خدمت کا بہترین صلہ دین و دنیا دونوں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین

والسلام
خادم: سعید الرحمٰن الاعظمی

مولانا احمد دیولوی والد محترم کے ارشد تلامذہ میں ہیں انہوں نے والد محترم پر ایک جامع مضمون لکھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس کو نقل کر دیا جائے، اس مضمون میں والد صاحب کی خصوصیات، درس کا انداز، حلال غذا کا اہتمام اور سلسلہ سند پر بڑی جامع بحث ہے:

”ربک یخلق مایشاء ویختار، ارشاد خداوندی ہے اور کلام الملوک ملوک الکلام کے مطابق اس کے جو مظاہر عالم میں نظر آتے ہیں بس اس کا

کی قدم رنجائی کے شاہد ہیں، مگر ڈابھیل وسملک اور دیگر مقامات کو علم وعمل کے منبع کے طور پر منتخب فرمایا، پھر دیکھئے کہ کیا کچھ ہوا، اور کس طرح ہوا کہ جامعہ ڈابھیل کو دیوبند سے روانہ ہوئے قافلہ محدثین ومفسرین کی منزل بنایا، اور مجھے معلوم بھی نہیں کہ میرے آباء واجداد کی کون سی نیکی کے صدقے مجھے ایک دورافتادہ بستی سے اٹھا کر جامعہ ڈابھیل پہنچادیا، جس کے آسمان تعلیم وتربیت تلے علم وعمل کے سیاروں کا گویا ایک نظام شمسی متحرک تھا، اور اس نظام شمسی کے شمس وقمر اور مریخ وزہرہ سے یہاں کے دریائے علم میں اور میدان عمل میں سردوگرم موجیں اور لہریں رواں دواں ہوتی تھیں۔

میری نااہلی اور ناکردگی کے باوجود-جس کا احساس مجھ کو اور میرے احباب کو بھی ہے-اللہ رب العزت نے مجھے نعمتوں اور سعادتوں سے نوازا، ان میں بڑی نعمت علم دین سے وابستگی کی ہے، اور اس نعمت کا اتمام واکمال اس طور پر فرمایا کہ جامعہ ڈابھیل کے بڑے باکمال، اصحاب فن اور تعلیم وتربیت کے شہ سواروں کا سایہ تربیت وشفقت مجھے عطا فرمایا۔

علم وعمل کے باب میں میرے جن اساتذہ اور مربیان کا مجھ پر بڑا کرم اور احسان ہے ان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمی رحمہ اللہ واسعۃ، وہ شخصیت ہے جن کی تعلیم وتربیت اور شفقت وعنایت سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے، علاوہ اس کے ان کے زہد وقناعت، تقویٰ وطہارت اور فرائض ونوافل کی طرح ہی درس ومطالعہ کی ان کی پابندی اور مداومت نے بھی مجھ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

زہد وقناعت آپ کا مزاج تھا، یکسوئی بہت پسند فرماتے تھے، کوئی ان سے ملنے آتا تو اس سے بہ ہزار خوشی ملتے اور حتی الوسع اس کی خاطر مدارات فرماتے،

البتہ یکسوئی تبلیغ دین نصیحت للمسلمین میں مانع نہ تھی، ڈابھیل اور اطراف کی بستیوں میں کسی کے بلانے پر بلا تکلف وعظ و تقریر کے لئے تشریف لے جاتے، ایسے متعدد اسفار میں خدمت کا مجھے شرف بھی حاصل ہے، عید کے دن ڈابھیل کی عیدگاہ میں اہتمام کے ساتھ آپ وعظ فرماتے تھے، اسی طرح محض دعوت طعام اور ضیافت کو بھی، احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے قبول فرماتے تھے۔

بحیثیت ایک عالم دین، شیخ الحدیث اور معلم و مربی ہونے کے زہد و تقویٰ، عشق نبوی و اتباع سنت وغیرہ جن عمومی و خصوصی صفات سے متصف ہونا قرین قیاس ہو وہ سب حضرتؒ میں موجود تھے، اور اس کا مشاہدہ ہر کوئی اس طرح کرتا تھا کہ اب تحریر میں اس کو ذکر کرنا اس بدیہی بات کو نظری کرنے کے مترادف ہے اور آئندہ صفحات میں حضرتؒ کی مفصل سوانح میں کسی نہ کسی طرح اس کا ذکر آ ہی جائے گا، سردست میں چند ایک خصوصیات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

درس:

درس کی پابندی حضرتؒ کی ضرب المثل خصوصیت تھی، اور حاضری کی مداومت کی طرح طریقہ تدریس میں یگانگت بھی آپ کی خصوصیت تھی، گفتگو کا نبوی طریقہ جو حدیث میں مذکور ہے کہ ما کان النبی ﷺ یسرد سردکم ھذا، و لکن کان یتکلم بکلام بین فصل یتحفظہ من جلس الیہ—

بالکل اسی طرح حدیث اور متعلقہ بحث کو تشفی بخش طریقہ سے سمجھانا مکرر بیان کرنا ہر پہلو الگ الگ نکھرے ہوئے انداز میں پیش کرنا آپ کے امتیازات تھے۔

درسِ حدیث کی اہمیت، اہتمام اور ادب و اکرام کے پیش نظر درس کا

درس کے وقت درس ہی کو پسند فرماتے، مہمان یا کسی ملاقاتی سے ملنا درس کے وقت بھی گوارا نہ تھا اور دوران درس بھی گوارا نہ تھا، چنانچہ ہر حال میں آپ درس کے لئے تشریف لاتے اور دوران درس کوئی آتا تو درس بند نہ کرتے۔

حدیث شریف میں نفس وشیطان سے بچنے کی جو کچھ تاکید وارد ہے، وہ محتاج بیان نہیں، ایک حدیث شریف آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ اس حد تک احتیاط کیا جائے، گویا انسان اپنے آپ پر بدگمانی کر رہا ہو، یعنی کسی قول وفعل کے بارے میں اولاً یہی سوچے کہ کہیں یہ غلط نہ ہو، گناہ نہ ہو، نفس پرستی نہ ہو وغیرہ، اس معیار پر رہنے والا انسان یقیناً نفس وشیطان کے مکروفریب اور گناہوں سے بچا ہوا رہے گا، ہمارے اکابر کا یہی طرہ امتیاز تھا، اور وہ گناہوں سے اسی طرح بچنے کی کوشش فرماتے تھے، تقویٰ واحتیاط کے اسی معیار نبوی کو اختیار فرماتے ہوئے آپؒ کا معمول تھا کہ۔

امرد بچوں سے بہت دور رہتے تھے، کسی ادنیٰ کام میں خدمت تو کجا صف میں بھی کوئی امرد بچہ پہلو میں آ کھڑا ہوتا تو اسے دور کر دیتے، کبھی کوئی امرد بچہ اپنی ضرورت یا درخواست لے کر کمرہ میں آجاتا تو جلدی باہر آجاتے اور پھر اس سے بات چیت کرتے۔

حلال غذا کا اہتمام:

مدرسہ کی یکسوئی کی زندگی میں حضرت کا گذارہ یقیناً مدرسے کے کھانے اور حق الخدمت ہی سے ہوتا تھا، البتہ کچھ مخلصین ومتعلقین دعوت پیش کرتے تو اسے قبول کرتے، مگر اس بات کا خیال رکھتے کہ صاحب دعوت کا پیشہ وپیسہ حلال ہو، اگر کسی کی آمدنی کے متعلق حرام ہونے کا علم ہوتا تو پھر اس سے تعلق ختم کرنے کو ہی ترجیح دیتے، مجھے یاد ہے کہ ایک حاجی صاحب کی دعوت قبول

بھی اس کی دعوت قبول نہ کی، انہوں نے ایک بار کہلایا کہ سواری بھیج دوں، آپ تشریف لے آئیں تو نے ان کو کہلوایا کہ آپ ہوائی جہاز بھیجیں تب بھی میں آپ کے یہاں نہ آؤں گا۔

سلسلہ سند:

ویسے آپؒ نے بخاری شریف اور ترمذی شریف حضرت العلامہ سید انور شاہ کشمیریؒ سے پڑھی ہے، اور یہ آپ کا سلسلہ سند سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ ۱۳۳۵ھ حضرت شیخ الہندؒ جب سفر حجاز پر تشریف لے جا رہے تھے، اس وقت تبرکاً ترمذی شریف کا درس دیا تھا اور آپؒ اس میں شریک ہوئے تھے، بایں معنیٰ آپ کے سلسلہ تعلیم و تعلم اور آپ کی علمی سند ایک درجہ مزید عالی سمجھی جانی چاہئے۔

حضرت الاستاذؒ کی شخصیت جن تعلیمی و تربیتی صفات سے مجسم تھی اس کا اعتراف ان کے شاگردوں اور ہم عصروں کی زبان زد ہے اور برائے نام ذکر آجانے پر بھی ان کا تفصیلی ذکر و شکر ہر ایک کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے، بنابریں یہ ازبس ضروری تھا کہ ان کی تعلیمی و تربیتی خدمات اور ان کی حیات مبارکہ کے دیگر پہلوؤں کا تفصیلی تذکرہ اور تجزیہ تحریری شکل میں مرتب کیا جائے، جو ان کے خوشہ چینیوں کے لئے تذکیر کا سامان اور نئی نسل کے لئے حوصلہ و ہمت کی راہ ہموار کرے۔

مجھ ناچیز کے ساتھ حضرت الاستاذ انتہائی محبت و شفقت کا اظہار فرماتے تھے، ان شفقتوں اور نوازشوں کے طفیل میں خود کو ان کا خادم خاص اور منظور نظر سمجھتا تھا، اور مجھے افسوس ہے کہ میں خود اپنے ایسے عظیم مربی، مشفق

---

(۱) تقریظ مختصر سوانح حیات حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی ص ۲۸ تا ۳۴

[redacted]

ہمارے رفیق درس جناب حضرت مولانا یونس صاحب سورتی دامت برکاتہم کو اللہ تعالیٰ نے اسلاف واکابر سے محبت اور ان کی سوانح کو جمع کرنے کا بہترین ذوق اور وافر جذبہ عطا فرمایا ہے، نیز اسے بحسن وخوبی جمع کرنے اور ترتیب وتحریر سے آراستہ کرنے کا شوق وجنون بھی ان پر سوار ہے اور اس کے متعدد شاہکار سامنے بھی آچکے ہیں، یقیناً یہ وہ بات ہے جو ہم میں مفقود ہوتی جارہی ہے۔

اللہ رب العزت ان کے حوصلہ وہمت اور قوت واستطاعت کو دوبالا کردے کہ اب انہوں نے مشفق ومربی استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمی رحمہ اللہ کی سوانح مرتب کرنے کا عزم کیا ہے، اس سلسلے میں وہ بہت کچھ جمع کرچکے ہیں اور ترتیب دے چکے ہیں مجھے بھی انہوں نے یاد کیا اور کچھ لکھنے کا مطالبہ کیا اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے دوچار باتیں مختصراً تحریر کردی ہے، تفصیلی سوانح ان کی تحریر وکاوش سے مرتب ہوکر آہی جائے گی، انشاء اللہ۔

اس لئے دیگر احوال اور علمی وعملی خدمات کے ذکر کو ترک کرتا ہوں، آپؒ کے متعدد خطوط میرے پاس محفوظ تھے، مگر مصروفیتوں کی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہ کرسکا اور اب وہ گم ہے، ایک خط مل پایا، اس کا عکس روانہ کررہا ہوں۔

آپؒ کی روحانی اور نسبی اولاد کے ذمہ پر عائد اس فرض کو ادا کرنے کے لئے۔ جواب قرض میں تبدیل ہوگیا ہے۔ مولانا یونس صاحب دامت برکاتہم نے جو بیڑا اٹھایا ہے اس پر وہ ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور حضرت الاستاذ کی سوانح سے اس دور کے اساتذہ وطلبہ کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔‘‘(۱)

☆☆☆

مولانا عبداللطیف نعمانی

چند نقوش وتأثرات

أعدذكرنعمان لنا، ان ذكره　　　هوالمسك ماكررته يتضوع

مجھے اپنی کم عمری کا بچپن یاد ہے، کوئی تین سال یا اس سے بھی کم عمر میں مجھے اپنے مدرسہ (جامعہ مفتاح العلوم) کی چہاردیواری میں داخل ہونا پڑا تھا، میرے ہاتھ میں قاعدہ بغدادی تھا اور میں اپنے والد مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی (سابق ناظم وصدر المدرسین جامعہ مفتاح العلوم) کی نشست گاہ کے ایک کونہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بارعب اور باتمکنت شخص، جو میرے والد صاحب سے بہت بے تکلف تھے، آکر ان کے قریب بیٹھ گئے، اورانھوں نے تعجب سے مجھے دیکھتے ہوئے کچھ سوالات میرے ہی بارے میں والد صاحب سے کئے۔ کچھ دنوں بعد میں سمجھ سکا کہ وہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی تھے۔

اس وقت میں اپنے مدرسہ کا سب سے کم عمر طالبعلم تھا، والد صاحب نے مجھے مدرسہ کے ایک فاضل استاذ قاری عبدالمنان صاحب کے پاس بٹھایا تھا، قاری صاحب نے مجھے شفقت وحکمت کے ساتھ تھوڑا تھوڑا پڑھانا شروع کیا، اور جلد ہی میں نے قاعدہ بغدادی ختم کرلیا، قاری صاحب کے پاس میں حسب معمول پڑھتا رہا۔ ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے ننھے سے دل میں رعب وخوف کا ایک طوفان برپا کردیا۔ قاری صاحب کی زبان سے اچانک نکلا ''بڑے مولانا'' اور دیکھا تو ایک وجیہہ اور بہت رعب دار وپروقار بزرگ جامع مسجد کے مشرقی دروازہ پر بے تکلف دیوار کا سہارا لئے ہوئے کھڑے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ بڑے مولانا ہیں

مولانا کی عزت وعظمت کو جو لوگوں کے دلوں میں پنہاں تھی سمجھا، یہ اپنی کم عمری میں حشمت ورعب کا سب سے پہلا نقش تھا جو میرے دل پر مرتسم ہوا اور آج تک وہ نقش قائم ہے۔

مدرسہ کے جملہ اساتذہ وطلبہ ''بڑے مولانا'' بول کر حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کو مراد لیا کرتے تھے، اور یہ جملہ گویا ایک رمز تھا کہ لوگ جب بھی حضرت مولانا کا نام لینا چاہتے تھے بڑے مولانا کہہ کر کام نکال لیتے۔

میں ابتدائی تعلیم میں وقت زیادہ نہیں لگا سکا۔ مجھے قرآن مجید اور کچھ اردو وغیرہ پڑھا کر فارسی کی تعلیم میں لگا دیا گیا، میں درجات فارسی میں داخل ہوا تو مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ ہمارے مدرسہ کی سب سے بڑی شخصیت حضرت الاستاذ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی ہے، اور دوسری شخصیت جو علم وفضل میں مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ معاملاتی امور میں بھی لوگوں کی مرکز توجہ تھی اور جن کی شہرت مدرسہ کی حدود سے نکل کر سیاسی حلقوں تک پہنچ چکی تھی، اور ''انقلاب زندہ باد'' کے نعروں میں (جو اس وقت یہاں بھی ہندوستان کی آزادی کے لئے لگائے جا رہے تھے)، جن کا بڑا ہاتھ تھا اور جو مئو کے مسلمانوں کی سیاسی قیادت کی ہر طرح سے اہل اور ان میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی، وہ حضرت مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ کی شخصیت تھی۔

حضرت مولانا عبد اللطیف نعمانی اہل مئو کے سیاسی لیڈر تھے، لیکن ان کی علمی اور دینی لیڈر شپ(LEADER-SHIP) زیادہ طاقتور اور مؤثر تھی، وہ ایک کامیاب استاذ فن اور مذہبی عالم کی حیثیت سے زیادہ محبوب ومشہور تھے۔ ان کی دوررس نظر، اور نکتہ آفریں ذہن، علمی نوادر ونکات کو ظاہر کرنے اور ان کی گہرائیوں تک پہنچنے میں جہاں اکثر اہل علم کی رسائی بآسانی نہیں ہو سکتی تھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ وہ کسی بھی مشکل تر مسئلہ سے نہ تو مرعوب ہوتے تھے اور نہ یہ سوچتے کہ اس کے سمجھنے میں ان کو عام علمی مسائل سے زیادہ دقت پیش

اور نہ ان کو بہت زیادہ اہم بنا کر پیش کیا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ ابتداء ہی سے مجھے مولانا سے باقاعدہ پڑھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ جب ہدایۃ النحو پڑھنے کا وقت آیا تو یہ گھنٹہ مولانا نے اپنے ذمہ لے لیا، اور ہم لوگ ہدایۃ النحو جیسی کتاب جو اس وقت ابتدائی درجہ کے کوئی استاد پڑھایا کرتے تھے مولانا کے پاس مقرر ہونے سے بے انتہا خوش تھے۔ فخر و مسرت کے امتزاج کے ساتھ ہم نے یہ کتاب مولانا سے سبقا سبقا پڑھنا شروع کردی اور تھوڑی مدت میں وہ ختم بھی ہوگئی۔ ششماہی امتحان کا اعلان ہوا تو کتاب کا مذاکرہ شروع ہوا۔ بعض ساتھیوں نے پوری کتاب زبانی یاد کرلی تھی۔ لیکن حقیقت ہے کہ مجھے یہ کتاب بہت مشکل معلوم ہوئی، مولانا نے میرا امتحان لیا تو خوف اس قدر غالب تھا کہ میں کسی سوال کا جواب ہی نہ دے سکا۔

ایک دفعہ اوپر کے درجات کے بعض بڑی عمر کے طلبہ کسی جرم میں ماخوذ ہوئے، مدرسہ کی عدالت نے ان کے لئے زبانی ملامت کے ساتھ سخت تنبیہ تجویز کی، میں نے دیکھا کہ مولانا کو سزا کی تنفیذ کے لئے مقرر کیا گیا، اور انھوں نے ان تمام طالب علموں کو سخت سزا دی، اس کے بعد سے مولانا کا رعب اور زیادہ دل میں بیٹھ گیا اور ان کو دیکھتے ہی سنجیدگی کا مظاہرہ از خود ہونے لگتا۔ اس واقعہ کا اثر پورے مدرسہ پر پڑا اور طلبہ کی جماعت پر مولانا کا خوف پوری طرح چھا گیا۔

مولانا نعمانی طلبہ سے اپنا ذاتی کام لینے میں انشراح نہیں محسوس کرتے تھے، جب کہ وہ مدرسہ ہی کے اندر قیام فرمایا کرتے تھے اور بہت سی ضروریات میں ان کو طلبہ کی مدد کی ضرورت پیش آتی تھی، جب بھی وہ اس سے احتراز کرتے اور عموماً اپنا کام اپنے ہاتھ ہی سے کرتے، بعض دفعہ کھانا پکانے اور بازار سے سودا لانے کی ضرورت پیش آتی، طلبہ اپنی خدمات پیش کرتے، لیکن مولانا ان سے معذرت کردیتے اور اپنا کام اپنے ہاتھ سے انجام دینے میں وہ

مدرسہ میں جب بھی کوئی بڑی انتظامی ضرورت درپیش ہوئی تو مولانا اپنے حسنِ انتظام اور تدبر سے اسے انجام دیتے۔ جب مدرسہ کا پہلا جلسۂ دستار بندی ہوا تو جلسہ کے تمام انتظامی امور مولانا ہی کے ذمہ تھے اور مولانا نے ان تمام ذمہ داریوں کو بکمال خوبی انجام دیا۔ دستار بندی کے دوسرے جلسہ میں بھی مولانا کے انتظامات کا بڑا حصہ تھا، اور انھیں کی مساعی سے ہر طرح کی سہولتیں حاصل تھیں۔ وہ اجتماعی معاملات کی انجام دہی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے، اور ان کی کوششوں سے بہت سے مشکل مسائل دیکھتے دیکھتے حل ہو جاتے تھے، انھوں نے مدرسہ کی انتظامی ذمہ داریاں بھی کئی بار سنبھالیں اور ہمیشہ کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔

مولانا کا تعلق جب عام اجتماعی اور سیاسی معاملات سے بہت بڑھ گیا اور مدرسہ کی ذمہ داریوں میں جب وہ بعض اوقات حائل ہونے لگا تو کچھ طالب علموں نے ناظم صاحب کے نام یہ درخواست دی کہ ہمارے اسباق کا نقصان بہت ہونے لگا ہے۔ اگر مولانا عبداللطیف صاحب کی عدم موجودگی میں ہمارے اسباق کا کوئی اور نظم ہو جائے تو ہمارے لئے زیادہ مفید ہوگا، مولانا کو یہ بات معلوم ہوئی اور انھوں نے ان طالب علموں سے کہا کہ بھائی! اگر تمہارا یہ احساس تھا تو پہلے تم مجھ سے مشورہ کر لیتے میں خود کوئی حل نکالتا، مولانا نے جس شفقت ومحبت سے یہ بات فرمائی تھی اس کا اثر سب کے دل پر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ سب نے بیک زبان اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اپنا معاملہ انھوں نے مولانا کے اوپر چھوڑ دیا کہ وہ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسباق کا نقصان کم سے کم ہو گیا۔

جب ہمارے مشکوۃ جلالین کا سال آیا تو مولانا ہی کی تجویز ہوئی کہ اس سال اوپر کے پورے ایک ایک درجے کو ایک ایک استاذ کے ذمہ کر دیا جائے۔ وہی ان تمام اسباق کا ذمہ دار ہوگا، مولانا کی یہ تجویز منظور ہو گئی اور ہمارا درجہ مولانا کے پاس پڑا، اس سال ہم لوگوں نے اپنی تمام کتابیں مولانا ہی سے پڑھیں، اور اندازہ ہوا کہ مولانا کی نظر کتنی وسیع ہے۔ وہ کبھی

ساتھ حضرت الاستاذ حدیث کی کتابیں اور صحیح بخاری کے اسباق بھی پڑھاتے رہے۔

اس سال ہم نے مولانا کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں قریب سے سننے کی کوشش کی۔ مولانا نے جس شان سے پڑھایا وہ ہمیں یاد ہے۔ وہ دوران سبق کبھی کوئی غیر متعلق بات نہیں کرتے، وہ طلبہ سے بے تکلف بھی نہیں ہوتے تھے، اور نہ کبھی دوران سبق تکان دور کرنے یا ذہن کو نشیط کرنے کے لئے کوئی واقعہ یا علمی نکتہ بیان کرتے تھے۔ یہ مولانا کا اپنا خاص طرز تھا جو عام اساتذہ کے طرز سے جداگانہ تھا۔ اس کے باوجود طلبہ ان کے درس میں اخیر تک ہمہ تن گوش رہا کرتے تھے، اور ان کے افادات سے مستفید ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

آزادی ہند کے بعد سے برابر مولانا کی قومی اور اجتماعی مصروفیات میں اضافہ ہوتا گیا، وہ عوام کی خدمت اور وطن کی راہ میں قربانی کے جذبہ سے ہمیشہ سرشار رہے، ملکی حالات اور مسلم عوام کے مصالح کے پیش نظر ان پر سیاسی رنگ غالب تھا۔ آزادی کا ثمرہ جب مسلمانوں کو فسادات اور اقتصادی بدحالی کی شکل میں ملنا شروع ہوا تو مولانا کا اس سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ انھوں نے اسی تاثر کی بناء پر ۱۹۵۷ء میں یوپی اسمبلی کے الیکشن میں امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور اپنے حلقہ سے وہ ممبر اسمبلی منتخب ہوگئے۔ اس دوران ان کو اکثر لکھنؤ میں قیام کرنا پڑتا، اور مدرسہ کی خدمت کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ بالآخر انھوں نے اس صورت حال کو محسوس کیا اور مدرسہ کی خدمات سے معذرت کردی، یہ ایک بہت نازک موڑ تھا۔ جہاں مدرسہ کو نقصان پہونچنے کا بھی اندیشہ کیا جانے لگا تھا، مگر اہل مدرسہ اور ذمہ داران کو اللہ تعالیٰ نے اس نازک مرحلہ سے بھی گزار دیا۔ مدرسہ حسب معمول اپنی خدمت میں مصروف رہا۔ مولانا جب لکھنؤ سے آتے تو سب سے پہلے مدرسہ تشریف لاکر وہاں کے حالات معلوم کرتے اور حسب گنجائش اپنا تمام تر وقت وہ مدرسہ کی خیرخواہی میں گزارتے۔

مولانا نعمانی ایک بڑے عالم دین، ایک جرأت مند مناظر، ایک زندہ و متحرک مسلمان

کا ماہرین [illegible] ہے۔ وہ دین و دنیا کی [illegible]

چلنے کے زبردست داعی تھے۔ انھوں نے سنگ وحریر کو جمع کرنے کا فن سکھایا، انھوں نے میدان سیاست میں کبھی اپنے علمی ودینی خصائص وصفات کے لباس کو تھوڑی دیر کے لئے بھی اتارنا گوارا نہیں کیا، وہ اسمبلی کے ایوان میں ہوں یا جامع مسجد کے سائبان میں، ہر جگہ انھوں نے اپنی مجاہدانہ اور عالمانہ شان کو برقرار رکھا، اور اہل دنیا پر یہ ثابت کر دکھایا کہ ایک عالم دین ہی دراصل ریاست وسیاست کا اہل اور صحیح حقدار ہے اور وہی اس کے مفہوم سے آشنا ہے۔

مولانا کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑے قوی الاعصاب تھے، کتنا ہی بڑا حادثہ یا مشکل ہو وہ اس کا سامنا نہایت ٹھنڈے دل ودماغ سے کرتے، اور اپنا ذہنی توازن بہرحال قائم رکھتے تھے، ان کی زندگی کی ڈکشنری میں یاس وناامیدی نام کا کوئی لفظ نہیں تھا، وہ ہر حال میں حوصلہ مند نظر آتے تھے۔ وہ بڑے ہوشمند اور حاضر دماغ تھے۔ بہت سے حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات سے وہ دوچار ہوئے، مگر صبر وحوصلہ کے دامن کو انھوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا، وہ انگریزوں کے دور میں قید وبند کی صعوبتیں جھیل چکے تھے۔

مجھے اپنی موجودہ مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مولانا عبدالستار اعظمی (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے یہ خبر دی کہ مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کے انتقال کا تار آیا ہے، عجیب سی خبر تھی، کسی طرح اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہا، مگر خبر صحیح تھی، میں نے مولانا کے بڑے صاحبزادے برادر محترم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نعمانی ایم۔ ایل۔ اے کے پاس تعزیت کا خط لکھا۔ چند دن کے بعد تفصیلی حالات کا علم ہوا، اور مرگ ناگہانی کا حال معلوم کر کے زندگی کی بے ثباتی اور دنیائے فانی کی بے حقیقتی کا احساس اور بڑھ گیا۔

مولانا سے میری آخری ملاقات انتقال سے ڈھائی ماہ قبل رمضان میں انھیں کے محلہ

… ہوئے تھے، اس دفعہ ملاقات … مولانا بہت
توجہ سے ملے تھے، اور کچھ باتیں بھی کی تھیں، دیر تک ہم لوگ ان کے ساتھ بیٹھے۔ مولانا نہایت منشرح اور تندرست نظر آ رہے تھے، اس وقت بے اختیار جی چاہا کہ مولانا سے ہمیشہ ایسی ملاقاتیں ہوا کریں، جن میں ان کی شفقت و توجہ ظاہر ہو جایا کرے۔ مگر کون جانتا تھا کہ یہ آخری ملاقات تھی، اور اس کے بعد پھر ان سے کبھی اس دنیا میں ملنا مقدر نہ تھا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ ان کی تاریخ وفات ذی الحجہ ۱۳۹۲ء مطابق جنوری ۱۹۷۳ء ہے۔

مولانا اس دنیا سے چلے گئے، لیکن ان کی ناقابل فراموش خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی، اور ان کی قابل تقلید زندگی مشعل راہ بنتی رہے گی۔

☆☆☆

مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ

کامیاب مربی، مشہور فقیہ اور عظیم مصنف

گزشتہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے کی بالکل ابتدا میں، میں مدرسہ مفتاح العلوم جامع مسجد شاہی مئو میں ابتدائی مکتب میں داخل ہوا تھا، اس وقت میرے اساتذہ میں پرائمری درجات کے ذمہ دار جناب منشی گدا حسین صاحب فاروقی اور ناظرہ قرآن کریم کے استاذ قاری عبدالمنان صاحب تھے، بہت جلد چند سالوں میں یہ مرحلہ پورا ہوگیا، پھر عربی درجات میں تعلیم حاصل کرنے کی سعادت اس خاکسار کو حاصل ہوئی اور درجہ اول سے لے کر غالباً سال ششم جلالین ومشکوٰۃ اور ہدایہ کے درجہ تک کی ساری کتابیں ۱۹۴۸ء مطابق ۱۳۶۸ھ تک اپنے سبھی جلیل القدر اساتذہ سے پڑھ لیا تھا، ان میں عربی ادب کی کتابیں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نور اللہ مرقدہ اور درسیات کی جملہ کتابیں اپنے والد مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ، حضرت مولانا عبداللطیف نعمانیؒ، حضرت مولانا عبدالجبار صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا شمس الدین صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عبدالباری صاحبؒ، حضرت مولانا یحیٰ صاحبؒ، اور بعض دیگر اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، فجزاھم اللہ خیرا کثیرا۔

مفتی صاحب میرے استاد، میرے مربی

سال دوم میں علامہ جرجانی کی کتاب ''شرح مأۃ عامل'' کے اسباق حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہ غالباً ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا، بالکل اسی زمانہ میں مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاح العلوم سے سند فراغ لے چکے تھے اور محدث

... ان کے طریقہ تدریس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور ترکیب نحوی کی مشق کرنے اور اعراب کی صحت کا ادراک حاصل ہوا، مولانا مفتاحی نے بہت خوبی اور وضاحت کے ساتھ یہ کتاب ہم کو پڑھائی، فجزاهم الله خیرا کثیرا۔

متعدد مدارس میں تعلیمی وتدریسی سرگرمیاں

مولانا مفتاحیؒ نے اپنا بیشتر تعلیمی سفر مفتاح العلوم میں پورا کیا، محدث جلیل حضرت مولانا اعظمیؒ نے ان کے جوہر کو اچھی طرح پہنچان لیا تھا، اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص طور سے متوجہ رہے اور حضرت مولانا سے مفتی صاحب کا علمی اور تربیتی تعلق بہت مضبوط رہا اور اس شجر سایہ دار بلکہ شجر طوبیٰ کے سایہ میں اپنی علمی شخصیت کو پروان چڑھانے میں ہمہ تن مشغول ہوگئے اور اہل علم کی صفوں میں ان کا شمار ہونے لگا، اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے استاد ومربی علامہ اعظمی سے اجازت لے کر دو تین سال تک مدرسہ معدن العلوم نگرام ضلع لکھنؤ میں تدریسی خدمت انجام دیں، ۱۹۴۸ء میں دار العلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر میں مدرس ہوئے اور عرصۂ دراز تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، ایک سال ڈابھیل ضلع سورت کی جامعہ اسلامیہ میں تعلیمی خدمت انجام دی، لیکن وہاں کی آب وہوا راس نہ آنے کی وجہ سے پھر دار العلوم سانحہ واپس تشریف لے گئے۔

مفتاح العلوم سے فراغت کے بعد علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مشورہ سے انھوں نے ۱۹۴۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور تقریباً چھ ماہ بحیثیت طالب علم یہاں قیام کرسکے، اس دوران انھوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ، مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ، مولانا محمد اسحاق ندویؒ اور مولانا حمید الدینؒ جیسے اساتذہ سے استفادہ کیا اور حضرت مولانا اویس ندوی نگرامیؒ کے مشورہ سے ان کے قصبہ نگرام کے مدرسہ معدن العلوم میں مدرس ہوگئے اور ایک اچھا تعلیمی اور تربیتی وقت گزارنے کا وہاں موقع ملا۔

[redacted]

۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے منسلک ہوکر کئی کتابیں تصنیف کیں، ۷ سال تک اس شعبہ سے متعلق رہنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے منتظم مقرر ہوئے اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب نو کا بیڑہ اٹھایا، ۱۲ر جلدوں میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی کے فتاویٰ کی ترتیب وتدوین میں پورا حصہ لیا اور وہ زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں، مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے مختلف علمی اور تدریبی شعبوں کی سرپرستی کی اور اس کے ذریعہ سے بہت سے ذہین اور ہونہار طلباء کے اندر علمی اور تفسیری مطالعہ کا شوق پیدا کیا اور انھوں نے ان کی بہترین رہنمائی میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا، دارالعلوم کے بہت سے شعبوں کو اپنی صلاحیتوں سے مالا مال کیا، دارالافتاء میں صدر مفتی کا منصب آپ کو عطا کیا گیا، رسالہ ''دارالعلوم'' میں اداریہ لکھنے اور اس کی سرپرستی کے فرائض بھی آپ نے انجام دیے اور ۱۴۲۹ھ تک دارالعلوم کو اپنے علمی فیوض سے فائدہ پہونچاتے رہے، لیکن برکت عمر کی وجہ سے کمزوری حد درجہ کو پہونچ گئی، تو ذمہ داران دارالعلوم سے معذرت کے ساتھ سبکدوشی کی درخواست کی اور اپنے وطن عزیز میں قیام فرمایا۔

مفتی صاحب مرحوم نے ہر اعتبار سے ایک کامیاب استاد، انشاء پرداز اور افتاء میں مہارت کے ساتھ ساتھ جملہ دینی اور اخلاقی صفات کے ساتھ زندگی گزاری، دارالعلوم دیوبند میں اتنے طویل المدۃ قیام کے باوجود بحیثیت استاد کے نمایاں نہ ہوسکے، جب کہ وہ تعلیم وتربیت کے فن سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ وہ اس فن سے پوری طرح مسلح تھے اور حدیث وفقہ کی کتابوں کو درجات علیا میں پڑھانے کی استعداد کامل رکھتے تھے، ہوسکتا ہے اس میں کوئی انتظامی مصلحت رہی ہو، لیکن یہ سوال ان سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوکر رہتا ہے۔

مفتی صاحب کے اساتذۂ کرام میں سرفہرست محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ جن کے زیر تربیت رہ کر مفتی صاحب نے عالمانہ زندگی کا درس حاصل کیا، مطالعہ کی گہرائی، مسائل میں باریک بینی، ائمہ اسلام کی حیات وخدمات کا مطالعہ، علم دین کی اہمیت کے ساتھ حسنات دنیا سے پوری واقفیت، یہ ساری چیزیں حضرت محدث جلیل کی تربیت میں رہ کر ان کو سیکھنے کا خوب موقع ملا، ان کے دیگر غیر رسمی اساتذہ کرام میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ جیسی نادرۂ روزگار ہستیاں شمار کی جاتی ہیں۔

دوران قیام دارالعلوم دیوبند مفتی صاحب مرحوم کا محبابہ تعلق ہمارے برادر اکبر حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمیؒ سے بہت بے تکلفانہ تھا، اکثر یہ حضرات مجلسوں کی زینت بنتے تھے، اور اپنے علم وآگہی سے دوسروں کو فائدہ پہونچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے اور صدق دلی کے ساتھ یہ دونوں حضرات اخیر تک ایک دوسرے سے برادرانہ اور محبانہ تعلق میں مشہور تھے، حکیم صاحب مرحوم اپنی چائے کی مجلسوں میں اکثر مفتی صاحبؒ کو دعوت دیتے اور شرکت کرنے کی درخواست کرتے تھے، مفتی صاحب انتہائی خوشی اور انبساط کے ساتھ تشریف لاتے اور جب تک وقت ساتھ دیتا علمی، دینی اور ادبی معلومات میں تبادلۂ خیال کرتے اور زندہ دلی اور فوائد علمیہ کی ایک بہتر فضا قائم کر کے ایک دوسرے سے جدا ہوا کرتے تھے، مختلف مواقع پر حکیم صاحب مرحوم مفتی صاحب کی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے اور وہیں ایک لطیف اور مفید مجلس منعقد ہو جایا کرتی تھی، بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے کا احترام واعتماد مجلس کی زینت میں اضافہ کا باعث بنتا تھا اور جملہ اہل تعلق اس سے

[redacted]

مفتی صاحب نے تاحیات اپنے بنیادی ادارے مفتاح العلوم مئو سے مخلصانہ تعلق قائم رکھا، وہ حضرت محدث جلیل کے مشورہ سے وہاں کی علمی اورادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے، جب بھی کوئی اہم موقع ہوتا، مفتی صاحب وہاں بلائے جاتے تھے، مفتاح العلوم کے ایک عظیم جلسۂ تقسیم اسناد میں جو غالباً ۱۹۵۳ء میں جامع مسجد کے وسیع میدان میں ہوا، مفتی صاحب نے جلسہ کے تنظیمی امور میں خاطر خواہ حصہ لیا اور اپنے استاد ومربی حضرت محدث اعظمی کی ہدایات کے مطابق وہاں کی سرگرمیوں میں مشغول رہے، مفتاح العلوم سے فراغت کے بعد جہاں کہیں بھی تعلیمی اور تربیتی اعتبار سے قیام کیا، برابر محدث اعظمیؒ سے رابطہ رکھا اوران کی ہدایات کے مطابق کام کیا، ان کی وفاداری کا حال یہ تھا کہ جب بھی وہ اپنے وطن جاتے یا وہاں سے واپس ہوتے مربی جلیل اوراساتذہ کرام کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے مئو میں بریک جرنی (Break Journey) کرتے، یا مزید کچھ وقت گزارنے کے بعد اپنے وطن واپس جاتے، محدث اعظمیؒ سے اپنے خاص الخاص تعلق کی بناپر ان سے تعلق رکھنے والے ہر فرد سے اوران کے خاندان کے جملہ افراد سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کی صدارت

دارالعلوم دیو بند میں قیام کے دوران وہاں کے دارالافتاء میں مفتی دارالعلوم کے صدر مفتی کے منصب پر فائز ہوئے تو اسلامی فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ذمہ داروں نے ان سے درخواست کی کہ اس اکیڈمی کے رئیس کا منصب قبول فرما کر اپنی ہدایات اور مشوروں سے اس کے لئے ترقی کی راہ عمل تجویز فرمائیں اوراپنی تجاویز سے ارکان اکیڈمی کو مستفید فرمائیں، الحمد للہ انھوں نے اس پیش کش کو قبول فرما لیا اور تاحیات اکیڈمی کے منصب صدارت پر فائز رہے، اکیڈمی کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہیں اور سیمینار کے انعقاد کے سکریٹری حضرت مولانا عبیداللہ الاسعدی ہیں، جب تک صحت نے

سے فقہ اسلامی کی روشنی میں مسائل جدیدہ کا حل تلاش کرنے کی لوگوں کو دعوت دی، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اہم ترین ارکان میں تھے اور فقیہانہ بلندی سے مسائل اور بورڈ کے سیمیناروں اور اجلاس کے ایجنڈے پر غور کر کے اپنی رائے دیا کرتے تھے اور بورڈ کے سبھی جلسوں میں شرکت فرماتے تھے۔

ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی کی تیاری میں مفتی صاحب کی سرگرمی

مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ جب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی ندویؒ نے ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن منعقد کرنے کا فیصلہ فرمایا اور مجلس انتظامی نے اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تو ندوۃ العلماء کے دارالافتاء کے فتاویٰ کی جمع وتدوین کے لئے حضرت مولانا کی نظر انتخاب مفتی صاحب مرحوم پر پڑی اور دارالعلوم کے ذمہ داروں سے خط وکتابت کرنے کے بعد ان کو کم از کم دو مہینے تک ندوہ میں قیام کرنے کے لے بلالیا، اس موقع پر مفتی صاحب سے جب میں ملا تو انھوں نے بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ سعید الرحمٰن! میں اب تمہارا مہمان ہوں، میں نے عرض کیا: میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے، چنانچہ ندوہ کے دوران قیام اور پچاسی سالہ اجلاس کی تیاریوں کی مشغولیت کی بنا پر بہت زیادہ خدمت کا موقع مل سکا، مختلف مواقع سے دارالعلوم سے باہر اپنی قیام گاہ پر تشریف لے چلنے کی درخواست کیا کرتا تھا، تا کہ وہاں دوپہر کا کھانا نوش فرمائیں اور کھانے کے بعد عصر تک آرام فرمائیں، الحمد للہ اس طرح کے مواقع ان اوقات میں بھی پیش آتے، جب وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ یا اجلاس کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لاتے اور دیگر ارکان اور علماء کے ساتھ میرا تعارف کراتے اور انتہائی شفقت کے ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ سعید الرحمٰن میرے شاگرد ہیں، مجھے بہت خوشی ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ میں مفتی صاحب کے قدموں میں رہ کر زندگی گزار دوں۔

اجلاس ندوۃ العلماء کے دوران قیام مفتی صاحب کو یہاں کی آب وہوا اور کھانا موافق نہیں آتا تھا، ہم نے گزارش کی کہ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے گھر کا پکا ہوا ٹوٹا پھوٹا کھانا آپ کی خدمت میں لایا کروں، لیکن انھوں نے مجھے اس کی مستقل اجازت نہیں دی، اس لیے مواقع کے انتظار میں رہا کرتا تھا، تا کہ مفتی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا موقع ملے، انھوں نے مجھے ہر موقع پر بہت دعائیں دیں اور ان کی دعاؤں سے مجھے فائدہ پہونچا، مجھے یاد ہے کہ کئی بار مفتی صاحب نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں کچھ طلباء کے داخلہ کے سلسلہ میں مجھے خط لکھا اور میں نے اس کی تعمیل کرنے کی پوری کوشش کی، ندوہ کے تمام ذمہ دار حضرات اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ مفتی صاحب کا بہت احترام اور خاص خیال فرماتے تھے۔ کسی موقع سے جب یہاں تشریف لاتے تو ان کے قیام وطعام کا خاص اہتمام فرمانے کا حکم فرماتے اور اکثر مجھے فرماتے کہ دیکھو! مفتی صاحب کا خیال رکھنا۔

مفتی صاحب کے صاحبزادگان

مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے جناب احمد سجاد قاسمی صاحب اپنے وطن دربھنگہ کے ہائی اسکول میں استاد ہیں، دوسرے صاحب زادے جناب حماد میاں صاحب جامعہ رحمانی مونگیر اور دیوبند سے فارغ ہوئے اور تیسرے صاحبزادے جناب عباد میاں صاحب مفتی صاحب کے ساتھ رہتے تھے، انہوں نے دار العلوم دیوبند میں حفظ کیا، اب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

مفتی صاحب کے خط کا ایک حصہ جو انھوں نے ۱۳۹۲ھ یعنی آج سے چوالیس سال پہلے برادر مکرم حضرت مولانا نور عالم صاحب امینی کی خدمت میں بھیجا تھا، اس کا ایک حصہ نقل کرنا یہاں مفید ہوگا، اس لیے ان کی کتاب ''پس مرگ زندہ'' سے مفتی صاحب کے خط کا یہ ٹکڑا نقل کیا جا رہا ہے۔

سانحہ ... ن کرایا ہوں، وہاں میٹرک کی تیاری میں ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب فرمائے اور میاں حماد سلمہ کو جامعہ رحمانی مونگیر بھجوادیا ہے، اس لیے کہ سانحہ سے قریب ہے، میاں احمد سجاد اس کی نگرانی بھی کریں گے، البتہ عباد سلمہ کو اپنے ساتھ لایا، وہ یہاں حفظ کر رہے ہیں۔

مولانا علی میاں مدظلہ، مولانا سعید الرحمٰن سلمہ اور مولانا شمس تبریز سے سلام مسنون عرض ہے، اپنی خیریت سے برابر مطلع کرتے رہیں، میرا علمی تعلق ندوہ سے بھی ہے، اس لیے کہ میں وہاں کچھ دنوں طالب علم رہ چکا ہوں، مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ اور مولانا ناظم صاحب اور مولانا اسحاق صاحب (رحمہم اللہ تعالیٰ)، یہ سب ہمارے اساتذہ رہے ہیں، گو ندوہ والے یہ نہیں جانتے۔"

طالب دعا

محمد ظفیر الدین، دار العلوم دیوبند

سانحہ وفات

۲۵ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۳۱ مارچ ۲۰۱۱ء کو ۸۵ سال اور ۲۵ دن اس دار فانی میں اپنے علم وتقویٰ اور تواضع، وسعت نظر اور بلندئ فکر کی ایک مثال قائم کر کے راہی دار آخرت ہوئے اور علمی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا کر گئے جو مشکل سے پر ہوتا ہے اور علم وعمل کی دنیا میں اس کو ایک بڑے نقصان سے تعبیر کیا جاتا ہے:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے درجات بلند فرمائیں، انھوں نے علم وعمل کی جامعیت کے ساتھ اللہ کے دین اور اس کی شریعت اور کتاب وسنت کے علم کو پھیلانے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانے کی جو سعی بلیغ کی ہے

اللہ اس کو قبول فرمائے اور دار آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور جنت الفردوس کی بہاروں سے پوری طرح سرفراز فرمائے۔(آمین)

اس موقع پر یہ عرض کرنا شاید مناسب ہو کہ مفتی صاحب کے مفتاح العلوم مئو کے زمانۂ تعلیم میں حضرت محدث جلیل، شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے اور حضرت مولانا عبد اللطیف نعمانی علوم اسلامیہ کے درجات علیا میں استاذ و مربی تھے اور میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی مفتاح العلوم کے ناظم اور علوم دینیہ عقلیہ کے استاد تھے اور دیگر بڑے اساتذۂ کرام کا ذکر اس مقالہ میں واضح طریقہ سے آچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو غریق رحمت فرمائیں اور ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرما کر جنت الفردوس کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائیں؛ آمین۔

☆☆☆

پیکر مہر وفا

حضرت مولانا عبدالجبار اعظمیؒ

سن شعور کو پہنچنے کے بعد میں نے اپنے مشفق، بلکہ سراپا شفقت استاذ کو اس وقت پہچانا، جب مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، استاذ معظم جامع مسجد کے صحن میں نیم کے ایک درخت کے نیچے تشریف فرما ہوا کرتے تھے، طلبہ اپنے درس کے وقت میں بڑے ادب واحترام کے ساتھ استاذ کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے تھے، اور درس کا سلسلہ شروع ہوتا تھا، شفقت پدری کے انداز میں حضرۃ الاستاذ ایک ایک لفظ کو سمجھاتے اور مثالوں سے واضح فرماتے تھے، اکثر کسی طالب علم سے سوال کر کے یہ اندازہ لگاتے کہ طلبہ نے کس حد تک سبق کو اخذ کیا ہے، میں بھی عبارت پڑھا کرتا تھا، اور جو بات سمجھ میں نہ آتی، بعد میں اپنے ساتھیوں سے سمجھ لیا کرتا تھا، درجہ میں پوچھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

ادب وانشاء کے ابتدائی اسباق ہم نے حضرۃ الاستاذ سے پڑھا، مبادی القراءۃ الرشیدۃ، ''القراءۃ الراشدۃ'' حصہ اول پڑھنے کے ساتھ انشاء بھی لکھتے تھے، جس کو ہم اپنی اس وقت کی زبان میں ''تحریر'' کہا کرتے تھے، اور ہمارے درجہ کی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ القراءۃ الرشیدۃ حصہ دوم ہم کو محدث العصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ سے پڑھنے کا موقع ملا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے والد معظم حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ نے جو اس وقت مفتاح العلوم کے ناظم تھے، حضرت محدث عصر سے درخواست کی تھی کہ آپ (سعید الرحمٰن) کو ادب کی کوئی کتاب پڑھا دیں، اس درخواست کا اثر تھا کہ بعد میں

''مقامات حریری'' کا کچھ حصہ بھی حضرت مولاناؒ نے پڑھایا۔

استاذ معظم حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مئویؒ نے ادب کی کتابوں کی تعلیم کے دوران نحو وصرف کی استعداد مضبوط کرنے کے لئے ایک بہت ہی مفید وانوکھا طریقہ ایجاد فرمایا تھا، اور وہ یہ کہ ہم طلباء کو قرآن کریم کے الفاظ اور ان کے صیغے اور ان کی پوری تشریح لکھ کر لانے کے لئے کہتے تھے، ایک مرتبہ انھوں نے اس کا طریقہ بتادیا، اور ہفتے میں کئی بار طلبہ قرآن کریم کے الفاظ کے صیغے اور ان کی تشریح لکھ کر دکھایا کرتے تھے، اس عمل سے کئی فائدے پہنچے، اور الفاظ کی تشریح کا عملی طریقہ معلوم ہوگیا۔

استاذ مکرم حضرت مولانا عبدالجبار صاحب نہ صرف ایک زبردست عالم دین تھے، بلکہ وہ اپنے استاذ اور مربی حضرت علامہ اعظمیؒ کے علمی معاون ہونے اور مستقل خدمت عالیہ میں قیام کرنے کی وجہ سے ایک بے مثال تدریسی ملکہ رکھتے تھے، ان سے استفادہ کا شوق ہر طالب علم پر غالب رہتا تھا، اور ان کی عظمت ہر شخص کے دل میں جاگزیں تھی۔

میں جب بھی کبھی حضرت محدث کبیرؒ کی علمی مجلس یا گھر کے کتب خانے میں- جہاں حضرت والا مقیم رہا کرتے تھے- گیا، تو مجھے حضرۃ الاستاذ وہاں تشریف فرما نظر آئے، اور وہ بے مثال تعلق مجھے نظر آیا، جو اسلاف کے یہاں پایا جاتا تھا، اور جہاں استاذ اپنے مخلص اور قریب سے تعلق رکھنے والے شاگرد کے ساتھ افادہ اور تربیت کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، اس مخلصانہ تعلق کی وجہ سے حضرۃ الاستاذ ایک بڑی اور سربرآوردہ شخصیت کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، اور مدارس اسلامیہ کے ماحول میں انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

استاذ مکرم کا علمی پایہ بلند ہونے کے ساتھ وہ اخلاق عالیہ کا پیکر تھے، کبھی ان کو کسی کے ساتھ غصہ کا معاملہ کرتے نہیں دیکھا، طلبہ کے ساتھ بے حساب شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، اہل علم کا احترام اور ان کے ساتھ حسن ظن رکھنا ان کا شیوہ تھا، ورع وتقویٰ میں وہ ایک امتیازی مقام کے مالک تھے۔

بخاری شریف کے مطالعہ اور تدریس کے دوران اس کے حواشی میں کچھ فروگذاشتیں نظر آئیں، تو ان کو اپنے خاص اسلوب میں تصحیح کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور ایک پوری کتاب اس ضمن میں تالیف فرمادی، جس کا نام بہت خوبصورت رکھا گیا۔(التصویبات لمافي حواشي البخاري من التصحيفات)۔محدث کبیر علامہ اعظمیؒ نے اس پر نہایت پر مغز مقدمہ تحریر فرمایا، اور وہ جامعہ مظہر العلوم بنارس کی طرف سے شائع ہوئی، اس کتاب پر علمائے حدیث اور اہل علم حضرات نے بہت اچھا تاثر ظاہر کیا اور ملک کے مختلف مجلات ورسائل میں اس پر علمی تبصرہ شائع ہوا۔

اسی کے ساتھ حضرۃ الاستاذ نے عبداللہ بن المبارک کی کتاب (کتاب الزھد والرقائق، جو حضرت محدث کبیر علامہ اعظمیؒ کی تحقیق وتصحیح اور تعلیق کے ساتھ شائع ہوکر عالم عربی اور دنیا کے علمی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہے) کا ترجمہ شگفتہ اردو زبان میں کر کے مجلس علمی مدرسہ مرقاۃ العلوم سے شائع کیا۔

حضرۃ الاستاذ نے جامعہ مفتاح العلوم میں ایک عرصہ تک مدرس ومربی کی حیثیت سے وقت گزارا، پھر اپنے مرشد ومربی حضرت محدث کبیرؒ کے حکم سے جامعہ مظہر العلوم بنارس تشریف لے گئے، اور وہاں بحیثیت شیخ الحدیث قیام فرمایا، وہاں صحیح بخاری کے تدریس کے زمانے میں دوران مطالعہ بخاری شریف مطبوعہ ہند کے حواشی کا جائزہ لیا تو اس میں بہت سی فروگذاشتوں کا پتہ چلا اور ان سب کی تصحیح فرما کر آپ نے مذکورہ بالا کتاب لکھی اور اسے وہیں سے شائع کیا۔اس کا تذکرہ ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے عربی مجلہ البعث الاسلامی میں نئی کتابوں کی وصولیابی کے باب میں شائع ہوا اور اس کا مختصر تعارف بھی زیر تحریر آیا جو البعث الاسلامی کے قدیم شمارے میں موجود ہے۔

جب حضرت محدث کبیرؒ نے المعہد العالی ومرقاۃ العلوم کی بنیاد ڈالی، اس وقت وہاں رئیس ھیئۃ التدریس کے لئے آپ کی ضرورت محسوس کی گئی، اور آپ نے فوراً وہاں

سے واپس آکر یہاں کام شروع فرمادیا اور حضرت محدث کبیرؒ کی خدمت میں اخیر تک قیام پذیر رہے، آخری زمانے میں تعلق میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا تھا اور پوراوقت حضرت کے ساتھ ہی گذارتے تھے۔

حضرت محدث کبیرؒ کی وفات ۱۱؍رمضان ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۷؍مارچ ۱۹۹۲ء دوشنبہ اور منگل کی درمیانی رات میں ہوئی، اور اس کے تقریباً ایک سال دس مہینے بعد ۱۴؍رجب ۱۴۱۴ھ مطابق ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۳ء کو حضرۃ الاستاذ نے اس دار فانی کو الوداع کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون، انھوں نے یہ مدت کس احساس فراغ اور بے چینی کی حالت میں گذاری ہوگی، اس کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے خاص عفو وکرم اور درگذر کا معاملہ فرمائیں اور ان کو جنت الفردوس کے مقام اعلیٰ میں جگہ عطا فرمائیں، اور ان کے احسانات اور حسنات کو قبول فرما کر ہم طالب علموں کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

☆☆☆

شیخ التفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامیؒ

مہینہ تو یاد نہیں لیکن ۱۹۵۳ء کی بات ہے جب میں نے پہلے پہل مولانا کو دیکھا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا نے از سرِ نو ندوہ میں درس وافادہ کے لئے تشریف لانا منظور فرمالیا تھا، ناظم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کی کوشش وخواہش کو مولانا کی تشریف آوری میں بڑا دخل تھا، اس وقت طلباء میں مولانا کے آنے سے ایک نیا جوش پیدا ہو گیا تھا، دارالعلوم کے درجات کے علاوہ مولانا عشاء کے بعد اپنی قیام گاہ پر جو عمارت دارالعلوم کے بالائی حصہ میں تھی ایک عام درس قرآن دیا کرتے تھے، اس درس میں اوپر کے درجات کے طلبہ کے ساتھ دوسرے ہونہار طالبعلم بھی شریک ہوا کرتے تھے، پھر مولانا کے درس وافادہ کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا، طلباء کافی مانوس ہوتے گئے، مولانا کی یہ خواہش رہا کرتی تھی کہ کس طرح طالب علم کو وہ سب کچھ سکھادیں جو خود ان کے اندر ہے، جس طالب میں علم کا شوق دیکھتے اس کو ہر وقت قیمتی علمی مشورے دیا کرتے تھے اور اس کی ایسی علمی مدد کرتے جو گویا خود اپنے لئے کر رہے ہیں۔

اساتذہ بھی مولانا کا بڑا احترام ملحوظ رکھتے تھے اور ان کی قیام گاہ پر اکثر حاضر ہوتے، جو بھی ان سے ملتا ان کی علمی وجاہت کے ساتھ ان کے حسن اخلاق، تواضع اور سراپا محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا، ان کی خندہ پیشانی کا یہ عالم تھا کہ اکثر ان سے مل کر بڑا سے بڑا غم دور ہو جاتا، مولانا کو کبھی کسی نے غمگین، رنجیدہ اور فکرمند نہیں دیکھا، لیکن دو موقع میری دانست میں ایسے آئے جب مولانا پر تاثر تھا اور نہایت رنجیدہ تھے، ایک سید صدیق صاحب آئی، سی، ایس کی اچانک وفات کا واقعہ مولانا کے لئے زبردست صدمہ کا باعث ہوا۔ سید صدیق حسن صاحب سے ان کے ایسے گہرے اور عقیدتمندانہ تعلقات تھے کہ اس کا صحیح اندازہ

کوئی دوسرا نہیں کرسکتا، محبت، عقیدت، اعتماد دونوں کے درمیان مشترک صفات تھیں۔

دوسرا واقعہ دارالعلوم کی آخری اسٹرائک کا تھا مئی ۱۹۶۹ء میں کچھ ناسمجھ اور جوشیلے لڑکوں نے گرمیوں کی تعطیل کے مسئلہ کو اتنا الجھایا کہ وہ اسٹرائک پر جا کر منتہی ہوا۔ مولانا کو میں نے دیکھا کہ وہ اس واقعہ سے اتنے ملول، دلگیر اور غمگین تھے کہ کئی دن تک کسی نے ان کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، بار بار فرماتے تھے کہ مولوی صاحب اب آخر اعتماد کس پر کیا جائے، یہ طلبہ جن کے لئے ہم رات ودن ایک کئے ہوئے ہیں اور جن کی تعلیم وتربیت کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو لگائے ہوئے ہیں، وہ اس طرح ہم سے آنکھیں پھیر سکتے ہیں اور ہمارا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہوسکتے ہیں، دراصل مولانا کو اس واقعہ سے جتنا صدمہ پہونچا تھا شاید ہی کسی اور واقعہ سے پہونچا ہو۔

مولانا نگرام ضلع رائے بریلی کے ایک شریف علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے، آپ کے بزرگوں میں بڑے صاحب تاریخ علماء گزرے ہیں ۱۹۱۴ء میں آپ پیدا ہوئے شروع ہی سے علمی فضا میں آپ کی تربیت ہوئی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آپ نے مشفق اور علم نواز اساتذہ کے زیر بیت وقت گزارا، مولانا کی ذہانت اور علمی ذوق کا اندازہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کو پہلے ہی سے ہوگیا تھا، فارغ ہونے کے بعد سید صاحبؒ نے مولانا کو دارالمصنفین میں اپنی زیر تربیت رکھا، اور مولانا عرصہ تک سید صاحب کے علم سے بہرہ اندوز ہوتے رہے، خاص طور سے علوم قرآن کے مطالعہ کی سید صاحبؒ نے ترغیب دلائی، اور اس موضوع پر ان کو تیار کیا، اثنائے مطالعہ امام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم کی کتابوں سے مولانا بہت متاثر اور مستفید ہوئے، ان کی عبقریت اور علمی عظمت کا سکہ آپ کے ذہن ودماغ پر کچھ اس طرح جما کہ مولانا نے خوب جی بھر کے ان کی کتابوں کو پڑھا، اور پڑھکر دوسروں کو پڑھایا، یہی وجہ تھی کہ مولانا کی علمی مجلسیں ابن تیمیہ اور ابن قیم کے ذکر اور ان کے علمی نکات وحقائق کے تذکرہ سے کبھی خالی نہیں جاتی تھیں، ہر طالب علم کو ان کی کتابوں کے پڑھنے اور

مطالعہ کرنے کی ترغیب دلاتے، دارالعلوم کے عزیز اساتذہ جوان کے شاگردوں کی صف میں ہوتے ان سے برابران دونوں اماموں کی کتابوں کو زیر مطالعہ رکھنے کی فہمائش کرتے، اوران کے حسب حال کتابوں کا خود ہی انتخاب بھی فرمایا کرتے تھے۔

اسی طرح ہندوستان میں شاہ ولی اللہ اوران کے علمی خانوادہ سے بہت متاثر تھے، ان کی تصنیفات سے شغف رکھتے تھے، دارالعلوم میں ہمیشہ الفوز الکبیر پڑھانے کا انتخاب اپنے لئے کرتے، عرصہ تک حجۃ اللہ البالغہ کا درس بھی دیا اور طلبہ کو فائدہ پہونچایا، شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کی بہت تعریف کرتے تھے اوراس سے استفادہ کی طرف طلبہ کی توجہ مبذول کراتے تھے، قرآن مجید کی آیتوں میں ایک ہی لفظ جو مختلف ابواب سے استعمال ہوا ہے اس کی نہایت ہی دلنشیں توجیہ بیان فرمایا کرتے تھے جس سے قرآن کی بلاغت اور اس کے اعجاز کا پتہ چلتا، ان کی بہت خواہش تھی کہ قرآن مجید میں صیغوں کے اختلاف کے ساتھ معانی میں جو فرق پیدا ہوتا ہے اس موضوع پر کوئی شخص کام کرتا، دارالعلوم کے بزرگ استاذ مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاویؒ سے مولانا نے کچھ کام اس موضوع پر کرا بھی لیا تھا۔ خاصیات ابواب کے سلسلہ میں برابر تحقیق فرماتے رہتے تھے اور جہاں بھی اس موضوع پر کوئی چیز نظر آتی اس سے استفادہ کرتے، اپنے چھوٹوں سے بھی پوچھنے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے، مولانا کا تصنیفی ذوق بہت ستھرا تھا تحقیق وتالیف میں وہ اپنے استاذ سید صاحبؒ کے پوری طرح تابع تھے، بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں اور علمی مضامین مولانا کے قلم سے نکلے، لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم مولانا کی عربی تصنیف ''التفسیر القیم'' ہے جس میں حافظ ابن قیم کی تفسیروں کو جو ان کی مختلف کتابوں میں منتشر تھیں جمع کیا ہے۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی، اسی طرح ''العقیدۃ الحسنۃ'' کی شرح العقیدۃ السنیۃ بھی ایک نادر علمی تحفہ ہے اور دارالعلوم کے نصاب درس میں داخل ہے۔

مولانا کا درس قرآن اس قدر مشہور ہوا کہ شہر کے کچھ سربرآوردہ اوراہل وجاہت،

حکام واعلیٰ افسران نے مولانا کے درس قرآن سے استفادہ کرنے کی خواہش کی، اس سلسلہ کے سربراہ سید صدیق حسن صاحب تھے، سب سے پہلے انھیں نے مولانا سے اس کی درخواست کی اور مولانا نے بخوشی منظور فرمالی، اور ہفتہ وار درس کا سلسلہ پہلے ان کی سرکاری قیام گاہ پر شروع ہوا، پھر جب ان کا اپنا ذاتی مکان بن گیا تو ان کے مکان پر درس دیا کرتے تھے، وہیں پورا حلقہ حاضر ہو جاتا، اور نہایت پابندی کے ساتھ شریک درس ہوتا، مولانا بھی اسی اہتمام سے اس کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔

مولانا کا حلقہ ارادت بھی کافی وسیع تھا، سلطانپور، فیض آباد، بارہ بنکی، رائے بریلی، کے مواضعات کے لوگ آپ سے عقیدت رکھتے تھے، مولانا سال میں دو ایک بار ان علاقوں کا دورہ بھی فرمایا کرتے، اور وہاں اصلاح وتربیت کا کام کرتے تھے، مولانا مدنیؒ کے خلیفہ تھے، لیکن دوسرے بزرگوں سے بھی تعلق رکھتے تھے، مولانا ایک ممتاز عالم دین اور صاحب فکر ونظر بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک روشن خیال اور حالات زمانہ سے گہری واقفیت رکھنے والے مرد مومن بھی تھے، دین ودنیا کی صحیح اور متوازن سمجھ اور علم وایمان کا صحیح امتزاج ان کے اندر موجود تھا، وہ نگاہ بلند، سخن دلنواز، اور جان پرسوز کی صفات کے حامل تھے۔

مولانا نے دارالعلوم میں ایک طویل مدت تک درس دیا، اس اثناء میں ان کے ندوی شاگردوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوئی، جو مختلف مقامات پر مختلف علمی، دینی خدمات میں مشغول ہے، باہر کے طلبہ میں ترکی، سعودی عرب، کویت، فلسطین اور شام کے طالبعلموں نے بھی ان سے پورا استفادہ کیا، مولانا کو ندوہ اور اس کے تمام مسائل سے نہایت گہری دلچسپی تھی، وہ کسی حال میں غیروں کی زبان سے ندوہ پر تنقید گوارا نہیں فرماتے تھے، اور جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا مولانا اس کے لئے سینہ سپر ہوتے تھے، اخیر میں جب ۱۹۷۲ء میں ابتداء مولانا قاضی معین اللہ صاحب ندویؒ (اس وقت کے ناظر شعبہ تعمیر وترقی) کے عہد میں جب دارالعلوم کی مسجد کی توسیع کا کام شروع ہوا تو مولانا نے اس میں زبردست دلچسپی لی اور سرمایہ

فراہم کرنے کے سلسلہ میں اپنی ساری خدمات پیش کیں، مختلف جہات سے خاصی وقیع رقمیں اس مد میں فراہم کیں، اور اس مسئلہ کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا کر اہل تعلق سے تعاون کی درخواست کی، مولانا عرصہ دراز تک ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے سرگرم رکن رہے۔

افسوس کہ ابھی مسجد کی توسیع کا کام شروع ہی ہوا تھا کہ اچانک ۲۸؍دسمبر ۷۴ء کو مولانا پر شدید قلبی دورہ پڑا اور س کے بعد سے برابر صحت گرتی گئی، مسلسل صاحب فراش رہے، بیماری کے دوران صاحبزدگان اور اہل تعلق نے علاج اور خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ انہیں دنیا کے آزار سے نجات عطا فرما کر اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، چنانچہ ۲۹؍شعبان ۱۳۹۶ھ جمعہ کی سہ پہر کو ہلال رمضان طلوع ہونے سے پہلے ہی مولانا نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اور یکم رمضان کی صبح کو لکھنو کے عیش باغ میں ہمیشہ کے لئے آسودۂ خاک ہوگئے، نماز جنازہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ نے ایک بڑے مجمع کے ساتھ پڑھی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ وأسکنہ فسیح جنانہ (آمین)

مولانا کی وفات سے ایک بڑا علمی خلا پیدا ہوگیا، ندوہ کے لئے مولانا کی ذات بہت قیمتی تھی، ندوہ کے لئے ان کا درس وافادہ ان کی فکرمندی، طلبہ کے لئے ان کی علمی وجاہت اوران کا عالی مقام یہ سب باتیں بہت اہم تھیں، اس لئے مولانا کی وفات ندوہ اور اہل ندوہ کے لئے ایک بڑا خسارہ ہے، جس کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نہیں، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے کوئی انتظام فرمادیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

☆☆☆

میرے دیگر چند اساتذہ
ایک اجمالی تعارف

(۱) حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ

حضرت مولانا شاہ حلیم عطاء صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء قصبہ سلون ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے، ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاذ حدیث کے تشریف لائے، اور مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد صحیحین کا درس بھی آپ ہی سے متعلق ہوا، بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ:

> ''ان کا اصل ذوق مطالعہ اور کتابوں سے تمتع ولطف اندوزی کا تھا، لیکن ان کا قوی حافظہ، علمی استحضار، مطالعہ کی وسعت اور معلومات کی فراوانی طلباء کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی''۔

شاہ صاحب حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت تھے، حدیث ورجال اور تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع تھا، قرآن مجید بڑا پختہ یاد اور مستحضر تھا، ان کے والد شاہ مہدی عطا تھے، شاہ صاحب کے چار صاحب زادے ہیں، ایک شاہ ہادی عطا، شاہ حسن عطا، شاہ شبر عطا ندوی، شاہ شبیر عطا ندوی، شاہ صاحب کا انتقال ۲۰/صفر ۱۳۷۵ھ میں ہوا۔ (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ)

(۲) حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی

استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء اور متعدد لغت کی کتابوں کے مصنف
خاص طور سے ''مصباح اللغات'' کے مؤلف

مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، بلیا کے رہنے والے تھے، عربی زبان وادب کے زبردست رمز شناس تھے، دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہیں درس دیا، اور ۲۰/سال سے زائد عرصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ ادب کی حیثیت سے گذارا، عربی لغت ان کا اختصاصی موضوع تھا، اسی وجہ سے انہوں نے کئی قابل ذکر کتابیں لکھیں جن میں ''المنجد'' کے طرز پر ''مصباح اللغات'' (عربی اردو لغت) وغیرہ ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب مختارات من أدب العرب اول، دوم کی شخصیات کا تعارف اور مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی ہے، ۷۱/سال کی عمر میں جمادی الثانی ۱۳۹۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

(۳) حضرت مولانا مفتی محمد سعید صاحبؒ

حضرت مولانا مفتی محمد سعید صاحب سابق مفتی دارالعلوم ندوۃ العلماء، اعظم گڑھ کے ایک گاؤں سینگائی پور کے رہنے والے تھے، ۱۹۰۷ء میں آپ کی ولادت ہوئی، دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں ابتدائی وعالی تعلیم حاصل کی، مولانا شبلی مدرس، مولانا عبداللطیف، مولانا حفیظ اللہ اور مولانا عبدالغفور صاحبان سے خصوصی استفادہ کیا اور فقہ میں خصوصی مہارت پیدا کی، حصول علم کے بعد ندوہ ہی میں استاد مقرر ہوئے، دارالعلوم کے مفتی اور قائم مقام مہتمم کے عہدہ پر فائز رہے، راقم خاکسار کو آپ سے تیسر الوصول فی حدیث الرسول پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب (رحمہ اللہ) کو غریق رحمت کریں اور جنت الفردوس کے اعلی مقام میں جگہ عطا فرمائیں (آمین)۔

(۴) مولانا ابوالعرفان خاں صاحب ندوی

مولانا ابوالعرفان خاں صاحب ندوی قائم مقام مہتمم اور صدر شعبۂ دینیات اور دارالعلوم کے بڑے اساتذہ میں تھے، ان کی پوری زندگی تعلیمی وتربیتی سرگرمیوں میں گذری، قرآن وحدیث کا مطالعہ بہت گہرا تھا، تاریخ آپ کا اختصاصی موضوع تھا، تواریخ وسنین نوک زبان ہوتی تھیں، تقریبا پچاس سال تک ندوہ سے وابستہ رہ کر دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، ۶/ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۷/نومبر ۱۹۸۸ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ رحمه الله رحمة واسعة، وغفر له زلاته وأسكنه فسيح جناته۔

(۵) حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ صاحب

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مایہ ناز فرزندوں میں تھے، ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں پھلواری شریف پٹنہ میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم جناب مفتی عباس صاحبؒ سے حاصل کی، فرنگی محل میں ۱۹۳۸ء میں داخلہ لیا، ایک سال وہاں پڑھنے کے بعد ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجہ پنجم میں داخلہ ہوا، ۱۹۴۸ء میں ندوہ سے فارغ ہوئے، اور ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ سے منسلک ہوئے، اور کچھ مدت رحیم آباد ضلع لکھنؤ میں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۵۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہوئے، اور کچھ مدت کے بعد ادیب اول کے منصب پر فائز ہوئے، اور ۱۹۵۴ء میں حجاز مقدس کا سفر کیا اور سعودی ریڈیو کے ادارہ نشریات شرقیہ سے وابستہ ہوئے، اور ۱۹۶۰ء میں رابطہ عالم اسلامی کے تین شعبے اقلیات، منظمات اور ترقیات کے سربراہ رہے، ۱۹۶۷ء میں انگلستان سے فلسفۂ لسانیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ندوہ کے جشن تعلیمی میں غیر معمولی حصہ لیا، اور ۱۹۸۰ء میں ندوۃ العلماء

کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے، ذکر وفکر کے نام سے ایک ماہانہ بھی نکالا، اور ۲۰۰۶ء میں سعودی عرب میں سفر آخرت اختیار کیا، اور تدفین جنت المعلاۃ میں ہوئی، دو درجن سے زائد کتابیں تالیف کیں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کئی کتابوں کے ترجمہ کئے اور ایک مدت تک جامعہ ام القریٰ میں استاذ بھی رہے، اور اپنے زمانہ کے بزرگوں اور مشائخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت مولانا احمد علی لاہوری، اور مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد یوسف کاندھلوی سے خصوصی تعلق رکھا۔ رحمه الله وأسكنه فسيح جناته۔

باب ہفتم

چند باکمال رفقاء

محمد الحسنیؒ

(ایک مخلص دوست تھا، نہ رہا)

میں نے اپنی بعض تحریروں میں اپنے ایک ایسے خیر خواہ اور مخلص دوست کا ذکر کیا ہے جن سے میرا مخلصانہ تعلق اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا، جب مجھے ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ کی سعادت حاصل ہوئی، میں اپنے درجہ سے گھنٹہ ختم ہونے کے بعد نکلتا تھا تو ایک فرشتہ نما نوجوان جو تقریباً ہم عمر تھے نظر آتے تھے، دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ یہ نوجوان اسرۂ حسنیہ کے سب سے بزرگ عالم دین، طبیب اور ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے محمد الحسنی صاحب ہیں، اور وہ دارالعلوم کے محدث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حدیث شریف کے گھنٹوں میں شرکت کرنے کے لئے آتے ہیں۔

اس زمانہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کچہری روڈ پر دعوت و تبلیغ کے مرکز میں قیام پذیر تھے، ان کا درس قرآن ہر اتوار کو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قدیم مرکز کے بالائی حصہ پر ہوتا تھا، اور پوری طرح سامعین سے بھر جاتا تھا، درس میں شرکت کرنے کے لئے میں بھی بالالتزام وہاں حاضر ہوتا تھا، اور مولانا سید محمد الحسنی صاحب بڑے اہتمام سے شریک ہوا کرتے تھے، اسی دوران ہماری ان کی ملاقات ہوئی، اس وقت اندازہ ہوا کہ ان کو میرے بارے میں کسی حد تک کچھ معلومات ہیں، اسی طرح جمعرات کے اجتماع میں بھی ملاقات ہوتی تھی، دارالعلوم میں جب وہ حدیث شریف کے اسباق میں شرکت کرنے کے لئے آتے تھے تو موقع نکال کر ملاقاتیں ہوتی رہتیں، ان کو میرا مزاج اور مقصد

سمجھنے میں دیر نہیں لگی، میرے لئے بھی یہ بات باعث سعادت تھی کہ ان کے ساتھ رہنے اور عربی زبان وادب کے بارے میں تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔

دوران تعلیم برابر یہ سلسلہ جاری رہا، اور اخلاص ومودت کا رقبہ وسیع تر ہوتا گیا، کبھی کبھی ہماری مجلسوں میں ہمارے مرحوم دوست مولانا سید محمد اجتباء صاحب ندوی بھی شریک ہوا کرتے تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد حضرت مولانا نے میرے لئے تکمیل ادب کا داخلہ منظور فرمالیا، اور ادب کی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھنے کے لئے اپنے دست مبارک سے ایک فہرست تیار فرمادی، اور اسکے لئے ندوۃ العلماء کی عام لائبریری میں مطالعہ کا ایک گوشہ بھی بن گیا، اور کچھ ادب وانشاء کے گھنٹے بھی ابتدائی درجوں میں پڑھانے کے لئے مقرر کئے گئے، اس اثناء میں ہم دونوں ساتھیوں کی مجلس اور گفتگو کا میدان پہلے سے زیادہ وسیع ہوگیا، اور عربی زبان وادب کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کا جذبہ پوری طاقت کے ساتھ دل میں موجزن ہوا، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں حاضری اور ان کی علمی ودینی مجلسوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی تمنا دل میں گھر کرگئی۔

اب یہ داستان اس طرح شروع ہوتی ہے کہ " المنتدی الأدبی " کا قیام عمل میں آتا ہے، اس کے دیگر ارکان کے ساتھ راقم کو بھی رکن کی حیثیت سے شریک ہونا پڑتا ہے، اس ادبی مجلس کے قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہفتہ میں ایک بار جمعہ کے دن کوئی ادبی مقالہ لکھ کر اس مجلس میں پیش کیا جائے، اس کے صدر باوقار جناب مولانا سید محمد طاہر حسینی صاحب (والد ماجد مولانا سید سلمان حسینی ندوی صدر جمعیت شباب الاسلام واستاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) باتفاق رائے منتخب ہوئے، غالباً المنتدی کے دوسرے جلسہ میں طے پایا کہ جو مضامین اس میں پیش کئے جائیں، ان کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کرنا اس مجلس کے تعارف اور اس میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک امر ضروری محسوس کیا جارہا ہے، یہ تجویز عام طور سے پسند کی گئی، اور اس اثناء میں المنتدی کے جلسے جاری رہے، مقالات بھی جمع ہوگئے، لیکن چھپنے سے پہلے ان کو تحقیقی مرحلہ سے گذرنا بھی ضروری معلوم ہوا، اسی اثناء

میں ایک دوسری تجویز ہمارے مخلص دوست مولانا محمد الحسنی صاحب کے ذہن میں آئی، اور انہوں نے اس سلسلہ میں اپنے بزرگوں سے مشورہ بھی کیا، اور المنتدی کے جلسہ میں پیش کر کے اس پر عمل درآمد کرنے کے بارے میں دوستوں سے مشورہ کیا، سبھی نے تائید کی اور اس پر مسرت کا اظہار کیا، لیکن بعض ساتھیوں نے اس کو امر محال تصور کیا، اس کے باوجود اللہ تعالی کو منظور تھا کہ ایک عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے نام سے جاری ہو جائے، جس کے لئے ضروری قانونی کارروائیاں شروع کر دی گئیں، اور عربی ماہنامہ نکالنے کے لئے کئی نام پیش کئے گئے، جس میں "البعث الاسلامی" کا نام منظور ہوا، اور دیگر صحافتی امور اور مضامین کے انتخاب کا مرحلہ کسی حد تک مکمل ہوا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی توجہ اور دعا کی درخواست کی گئی۔

پرچہ کی تیاری، اس کی ترتیب و کتابت، پریس اور کاغذ کا انتخاب، اسی طرح پرچہ جن شخصیتوں کے پاس بھیجا جائے ان کے نام اور پتے، ٹائٹل کی نوعیت، پرچہ نکالنے کے اہداف و مقاصد، یہ اور اس طرح کے اور دیگر انتظامات کے طے کرنے میں کافی وقت صرف ہوا، اسی اثناء میں دو ساتھی جن کا نام پرچہ کے اندر مدیر التحریر کی حیثیت سے آنے والا تھا وہ اچانک شام یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ دمشق میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے روانہ ہو گئے، اگرچہ پہلے شمارہ میں ان کے نام چھپ گئے تھے، لیکن بعد میں مولانا محمد الحسنی اس عربی ماہنامہ "البعث الاسلامی" کے رئیس التحریر (چیف ایڈیٹر) اور راقم الحروف سعید الاعظمی مدیر التحریر کی حیثیت سے شریک ادارت ہوئے، مگر پہلا شمارہ نکلنے کے بعد جو ٹائٹل کے علاوہ ۳۲ر صفحات پر مشتمل تھا، حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے، پہلی اکتوبر ۱۹۵۵ء کو پرچہ کی نشر و اشاعت اور تعارف کے لئے مغربی یوپی کے مدرسوں اور یونیورسٹیوں اور وہاں کے اصحاب علم و دانش سے ملنے کے لئے ہم دونوں کا ایک دورہ شروع ہوا، جس کی سب سے پہلی منزل کانپور، پھر اٹاوہ، اس کے بعد علی گڑھ، آگرہ، دہلی، وہاں جامعہ ملیہ، مدرسہ فتحپوری، مدرسہ امینیہ، اس کے بعد دہلی کے اطراف، پھر دار العلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ

شاہی مراد آباد، مدرس رحمانیہ روڑکی، رامپور وغیرہ ہوتے ہوئے دو ہفتے کے بعد لکھنؤ واپسی ہوئی، اس اثناء میں ۵/روپئے سالانہ کے حساب سے تقریباً ۵۰/خریدار بن سکے۔

''البعث الاسلامی'' پہلے گوئن روڈ سے نکلا تھا، اس کی ملکیت اور ادارت وغیرہ سب کچھ ذاتی حیثیت رکھتی تھی، اور مولانا سید محمد الحسنیؒ کے والد ماجد حضرت مولانا حکیم سید عبدالعلی صاحب حسنی رحمۃ اللہ علیہ، اس کے مصارف کا انتظام ذاتی طور پر کیا کرتے تھے، جب رسالہ کو ترقی اور مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کی افادیت نمایاں ہوئی تو ندوۃ العلماء نے ۱۹۶۰ء میں اسکو اپنے ترجمان کی حیثیت سے اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ''البعث الاسلامی'' کی تعریف اور اس کے مدیر مرحوم کے زورِ قلم اور ان کے جذبۂ ایمانی، جوش جنوں اور بصیرت وحمیت کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''البعث کے صاحب ایمان نوجوان مدیر کا جوش جنوں، اس کی غیرت ایمانی اور زور قلم کی وجہ سے جس نے سید جمال الدین افغانی کے ''العروۃ الوثقی'' کے مخصوص مقالات اور مولانا آزاد کے ''الھلال'' کے آتشیں اداریوں کی یاد تازہ کردی تھی، بہت جلد اس رسالہ نے اسلام پسند حلقوں میں جو مصر کی اس ''خانہ برانداز'' تحریک سے بے چینی محسوس کررہے تھے، مقبولیت حاصل کرلی، اور انہوں نے نہ صرف اس کو اپنے خیالات کا ترجمان سمجھا، بلکہ اپنے زخموں کا مرہم اور اپنے درد کی دوا سمجھے''۔

مولانا محمد الحسنی کا ذہن عالم اسلام کے مسائل وحالات سے کبھی فارغ نہیں رہتا تھا، ہر وقت وہاں کی دینی اور دعوتی تحریکوں اور سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کرتے رہتے، اور نت نئے حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے، وہاں سے جو لٹریچر اور جرائد ومجلّات اور نئی کتابیں آتیں، ان کو غائر نظر سے پڑھنے اور نتائج اخذ کرنے میں خاص ملکہ رکھتے تھے، فکری حیثیت سے وہ اتنے بلند تھے کہ بڑے بڑے اہل فکر بھی ان کی بلند پروازی کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، وہ فکری حیثیت میں اپنے عم مخدوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے، اس سلسلہ میں بار ہا اس کا تجربہ ہوا کہ کسی مسئلہ کے بارے میں جو خیال انہوں نے ظاہر کیا بعینہ وہی خیال حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سننے میں آیا، بعض دفعہ تو الفاظ اور اسلوب بیان میں سو فیصد یکسانیت دیکھنے میں آئی، نہ صرف عالم اسلام بلکہ دنیا کی تہذیبوں اور مختلف تحریکوں اور مادی وغیر مادی دعوتوں اور سرگرمیوں سے، خاص طور سے مغربی تہذیب وثقافت سے اس حد تک واقفیت رکھتے تھے جیسے وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کر چکے ہوں، اور ان کے تمام عیب وہنر ان کی نظروں کے سامنے ہوں، وہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے، اس لئے انگریزی اخبارات ورسائل اور کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے، نومسلم خاتون مریم جمیلہ نے جب ۱۹۶۳ء میں اسلامی موضوع پر لکھی ہوئی اپنی کتاب (Islam.Versus the Wes) حضرت مولانا کی خدمت میں بھیجی تو مولانا محمد میاں نے اسکو پڑھ کر اس کے مختلف حصوں کا عربی میں ترجمہ کیا، جو ''البعث الاسلامی'' کے مختلف شماروں میں چھپا تھا، اس سے پہلے وہ محمد اسد صاحب کی کتاب (Road to Makkah) کا ترجمہ اور اس کی تلخیص بھی کر چکے تھے، ''جو'' طوفان سے ساحل تک کے نام سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے اسی زمانہ میں چھپ گئی تھی۔ اسی طرح انہوں نے ندوۃ العلماء کے ۸۵ رسالہ جشن تعلیمی منعقدہ ۱۹۷۵ء کی تفصیلات کو ''روداد چمن'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔

''البعث الاسلامی'' کے پہلے شمارہ میں انہوں نے ''أهدافنا'' کے عنوان سے جو افتتاحیہ سپرد قلم کیا وہ زبان وبلاغت کے لحاظ سے ایک مثال ہے، اور اس دور میں ان کے عربی اسلوب وزبان کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کسی عجمی ملک میں رہنے والے نوجوان کا قلم ہے یا کسی خالص عرب کہنہ مشق ادیب کے قلم کی روانی ہے۔ انہوں نے عربی زبان کو بہت کم عمری سے اپنی ادبی اور دعوتی سرگرمیوں کا محور بنالیا تھا، حالانکہ انہوں نے کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی تھی، اس کے باوجود وہ بڑے بڑے ادباء، اہل قلم کے مضامین پڑھنے لگے تھے، اور عربی لکھنے کی مشق ۱۳/۱۴ رسال کی عمر میں شروع کر دی تھی، ان

کے عم محترم رحمۃ اللہ علیہ ان کے اس وصف انشائی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ابھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے عربی کتنی پڑھ لی، اور ان کی استعداد کیا ہوئی کہ ایک دن اچانک جب ان کی عمر ۱۳/۱۴ سال سے زیادہ کی نہ ہوگی، انہوں نے شرماتے ہوئے مجھ سے اپنے عربی کے ایک مضمون کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، میرے لئے یہ ایک انکشاف تھا کہ وہ عربی میں مضمون لکھنے لگے ہیں، میں نے بڑے شبہ واستعجاب کے ساتھ ان کا مضمون دیکھنا شروع کیا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ عربی میں ان کا قلم چل گیا، اور وہ مضمون نگاری کے قابل ہو گئے ہیں، ۱۹۴۹ء میں جب ان کی عمر ۱۴/۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، میں نے لکھنؤ کے ایک تبلیغی اجتماع میں ''صورت وحقیقت'' کے عنوان سے ایک تقریر کی، اس وقت کے حالات وتأثرات کی وجہ سے یہ تقریر بڑی مؤثر وطاقتور بن گئی تھی، بعض یادداشتوں اور حافظے کی مدد سے میں نے اس کو اردو میں مرتب کرلیا، اور وہ ''صورت وحقیقت'' ہی کے عنوان سے چھپ گئی، اس زمانہ میں مجھے حجاز کا دوسرا سفر درپیش تھا جس میں مجھے وہاں طویل قیام کرنا تھا اور وہاں کے علمی وادبی حلقوں میں دینی وذہنی تحریک پیدا کرنے کا عزم تھا، اس مقصد کے لئے مجھے ایسے دعوتی لٹریچر کی ضرورت تھی جو وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اہل قلم کے حلقوں میں ایک جنبش وتموج پیدا کرسکے، میں نے امتحاناً یہ تقریر محمد میاں کے حوالہ کی کہ وہ اس کا ترجمہ کردیں، خیال تھا کہ میں اس پر محنت کرکے اس کو چھپنے کے قابل بنادوں گا، لیکن جب وہ ترجمہ کرکے لائے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں اصل تقریر کا جوش اور طاقت موجود ہے، اور مجھے اس پر کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں، یہ ان کے ترجمہ اور انشاء کا پہلا کامیاب تجربہ تھا، ''بین الصورۃ والحقیقۃ'' کے نام سے رسالہ عربی ٹائپ میں قیمہ پریس بمبئی سے چھپوا کر جون ۱۹۵۰ء میں اپنے ساتھ لے گیا، میں جتنے دعوتی

> رسائل اپنے ساتھ لے گیا تھا، ان میں یہ رسالہ سب سے زیادہ مؤثر ومقبول ہوا، اور بعض بڑے علماء نے اپنی مجلس میں اسکو خود پڑھ کرسنایا، اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور وہ بہت سے عرب ممالک میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔(۱)

ابتدائے جنوری ۱۹۵۸ء میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مزید استفادہ اور عربی زبان وادب کی مشق کے لئے اپنے استاد مکرم علامہ ڈاکٹر محمد تقی الدین ھلالی مراکشیؒ کی خدمت میں بھیجا تھا، وہ اس وقت بغداد یونیورسٹی کے ٹیچرس ٹریننگ کالج (Teachers training college) میں استاد تھے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں سے میں ایک عرصہ تک ان کی خدمت میں قیام کرکے اخیر جنوری ۱۹۵۹ء میں جب لکھنؤ واپس آیا تو اپنے عزیز اور محترم دوست مولانا محمد میاں صاحب سے مل کر زبردست خوشی ہوئی اور الحمدللہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی توفیق حاصل ہوئی، اسی زمانہ میں ہم لوگوں نے ایک بین الأقوامی اسلامی مجلسِ رابطہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا، جس کا نام تھا: ''الرابطۃ الاسلامیۃ الدولیۃ'' اس مجلس رابطہ کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا، ایک عالم اسلامی سے دعوتی اور فکری رابطہ قائم کرنے کے لئے عربی زبان میں، اور دوسری مجلس رابطہ ہندوستان میں کام کرنے کے لئے، جو عام طور سے اردو زبان وادب میں شروع کیا گیا تھا، اور بہت سے نوجوان داعی اور دانشور اس رابطہ کے ممبر ہوئے تھے، اس کا مرکزی دفتر سابق دفتر نظامت کے بالائی حصہ میں گوئن روڈ پر قائم ہوا تھا، اور باقاعدہ اس کی نشستیں ہوا کرتی تھیں، عالم اسلام کے نوجوانوں کو مخاطب کرنے کے لئے اور انگریزی داں طبقے کے لئے ایک خبرنامہ (Bulletin) عربی اور انگریزی زبان میں شائع کرنے کا پروگرام مشورہ سے طے ہوا، اور اس پر عمل ہونے لگا، یہ (Bulletin) آٹھ فل اسکیپ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ چار صفحے عربی کے، اور بائیں طرف سے چار صفحے انگریزی میں چھپتے تھے، اور اسلامی دعوت وفکر کو نوجوانوں تک پہونچانے کے لئے بذریعہ ڈاک بھیجا جاتا تھا، اس کے ابتدائی شمارے چار اور پانچ نمبر جاذب نظر اور چکنے کاغذ پر عمدہ طباعت کے ساتھ شائع ہوئے، لیکن فنڈ نہ ہونے کی بنا پر

---

(۱) پرانے چراغ ج۲/۳۷۵/۳۷۶

اس کا حلقہ محدود ہوگیا، اور اس کی تلافی کے لئے "البعث الاسلامی" کے صفحات میں اضافہ کرنے کی کوشش ہوئی، اور رابطہ کے اس کام کو جو کئی سال تک مسلسل قائم رہا، حضرت مولانا نے سراہا تھا اور سب سے زیادہ حوصلہ افزائی حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ (حال ناظم ندوۃ العلماء) نے کی، اور ان کے مشورہ سے برابر اسکو تقویت حاصل ہوئی لیکن اس کا کام کمزور پڑنے کے بعد اس کے متبادل کے طور پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے مشورہ سے دار عرفات کے نام سے ایک تربیتی اور اشاعتی ادارہ قائم کرنے کا حوصلہ ملا، اس کے بانی اور سرپرست خود حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب تھے، اور ہم دونوں اس کے سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے، الحمد للہ یہ ادارہ حضرت مولانا کی رہنمائی میں ترقی کرتا رہا، اور اس کی مستقل بلڈنگ بھی تکیہ رائے بریلی میں تعمیر ہوئی، پھر دار العلوم ندوۃ العلماء کے آخری درجات کے طلبہ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کے لئے ایک ہفتہ وہاں گزارنے لگے، اور ان کے بیچ حضرت مولاناؒ کے محاضرات ہوتے، اس طرح ذہنی اور فکری تربیت کے ساتھ بڑی علمی و دینی سوغات لے کر طلبہ واپس ہوتے، اور یہ سلسلہ بحمد اللہ آج بھی جاری ہے، علمی و فکری و دعوتی محاضرات کا بھی سلسلہ قائم ہے، اور کسی اہم شخصیت کا محاضرہ ہر مہینہ رکھنے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے، اس کا اہتمام و انتظام حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ العالی کی سرپرستی اور جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (جو دار عرفات کے سکریٹری ہیں) کے مشورہ سے اس کے ڈائرکٹر مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی کرتے ہیں، اب ماشاء اللہ اس کے تحت ایک اشاعتی ادارہ سید احمد شہید اکیڈمی، اور تحقیقی ادارہ مرکز الامام أبی الحسن الندوی بھی قائم ہو چکا ہے، اور اب مزید ترقی کر کے وہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے ایک زبردست تربیتی، علمی اور اشاعتی ادارہ بن گیا، اور اس کی ایک خوبصورت اور شاندار بلڈنگ بھی بن گئی، اس کے روح رواں اور سرپرست حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب ہیں، اور مولانا محمد میاں کے چھوٹے صاحبزادے مولانا سید بلال حسنی ندوی اس کے سکریٹری ہیں اور وہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب اور جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب سے مشورہ کر کے اس کے دائرۂ عمل کو زیادہ سے زیادہ وسیع

کرنے میں اپنی توانائیں صرف کررہے ہیں، اور الحمدللہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہورہے ہیں۔

۱۰ رنومبر ۱۹۶۳ء مولانا محمد الحسنیؒ کی تاریخ زندگی کا ایک اہم ترین دن تھا، ۱۰ رنومبر کی تاریخ کو تعمیر حیات کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تھا، اس شمارہ کی تیاری میں یہ خاکسار بھی شانہ بہ شانہ اور قدم بقدم ساتھ رہا، اس وقت کے حالات سے جو تعمیر حیات کی زندگی سے متعلق تھے، راقم بھی ان حالات کو بدلنے کے لئے سینہ سپر رہا، حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں سے حالات بدلے، اور تعمیر حیات اپنی منزلیں طے کرتا رہا، ندوۃ العلماء کے آرگن کے طور پر اس کا استقبال بھی ہوا، اور ستائشی خطوط بھی آئے۔

اللہ کا شکر ہے کہ پہلے شمارہ کی تیاریوں سے لیکر تقریباً دس سال تک میں تعمیر حیات کی خدمت میں سرگرم رہا، اکثر اداریہ بھی لکھنے کا اتفاق ہوا، تعمیر حیات کے دفتر میں تنہا بیٹھ کر مضامین کی تیاری اور ترتیب، نیز لفافے پر خریداروں کے پتے اور اس کی پوسٹنگ وغیرہ کے تمام انتظامات میں پیش پیش رہنے کی توفیق ہوئی، اُس زمانہ کے تعمیر حیات کی جلدیں آج بھی کتب خانہ ندوہ العلماء میں محفوظ ہیں، لیکن البعث والرائد کے کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے وقت کی تنگ دامانی پیش آئی، تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے مولانا اسحاق جلیس صاحب مرحوم کو اس کا مدیر مقرر کردیا گیا، وہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی از سر نو ترتیب وتنسیق کے لئے بلائے گئے تھے، اسی کے ساتھ ان کو یہ ذمہ داری بھی دے دی گئی۔

میں اپنے اس مخلص دوست کے بارے میں جو اپنے خاندان میں محمد میاں کے نام سے معروف تھے اپنے تاثرات کو زیر تحریر لانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا:

وہ نہ صرف ایک ادیب موہوب، ایک عظیم الشان انشاء پرداز اور قلم کے بادشاہ تھے، بلکہ وہ ایک داعی، ایک مفکر اور ایک مصلح کی شان بھی رکھتے تھے، وہ جس عصر میں پیدا ہوئے وہ جنگ آزادی کا آخری دور تھا، اس وقت تک ملک میں ایک انقلابی ادب پروان چڑھ چکا تھا، ادباء وشعراء اپنی تمام ترفنی وقلمی طاقتیں اس لڑائی کو آخری درجہ تک پہنچانے اور استعماری طاقتوں کو زیر کرنے اور ملک کو آزاد کرنے کی راہ میں صرف کررہے تھے، اس وقت تک عربی

زبان وادب کا ذوق عام نہیں ہوا تھا، بلکہ ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم اوراس کے ذمہ داروں کی کوششوں کے عوض عربی ادب کا چرچا جدید عربی زبان کے نام سے شروع ہو چکا تھا، اور دوسرے حلقوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہوا، اور مدارس اسلامیہ نے عربی زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ کی، جس کی وجہ سے عربی زبان وادب کے نصاب کو اہمیت دینے کا سلسلہ شروع ہوا، اور ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے عربی مجلّہ ''الضیاء'' کے بند ہونے کے بعد، سب سے پہلا عربی مجلّہ ''البعث الاسلامی'' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں مولانا محمد الحسنی صاحب نے اپنے بعض مخلص ساتھیوں کے تعاون سے شائع کیا، اگر چہ اسوقت کے ہندوستان کے حالات میں کسی معیاری عربی مجلّہ کا نکالنا ایک جرائتمندانہ قدم تھا، انہوں نے بڑی عالی ہمتی سے کام لیا، اور ان کی ہمت وعزم کو دیکھ کر دوسروں کو بھی حوصلہ ملا، ان کی وفات اچانک ۱۳؍جون ۱۹۷۸ء کو چند گھنٹوں کی بیماری کے بعد ہوگئی، اور ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا، ان کی وفات کے بعد ان کے عم مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے زور قلم اور ان کی زبردست ادبی حس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> ''خاندان علم اللہی کے اس گوہر شب چراغ نے زندگی کی صرف چوالیس بہاریں دیکھیں، لیکن اپنے زور قلم سے دعوت وفکر اسلامی کے میدان میں وہ کام کیا جو بعض مرتبہ بڑے اسلامی داعیوں اور اسی میدان میں کام کرنے والوں کے لئے مشکل ہوتا ہے، سحر ناصری کے طلسم کو پاش پاش کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، انہوں نے اپنے پرزور مضامین اور طاقتور اداریوں سے دلوں کی سرد انگیٹھیوں کو گرم کیا، آنکھوں کو نم کیا، اور میدان عمل میں حرکت پیدا کی''۔

مولانا سید محمد الحسنیؒ ایک خالص علمی اور دعوتی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بنا پر تصنیف وتالیف کا بھی بہت اونچا اور معیاری ذوق رکھتے تھے، ان کی سب سے پہلی کتاب ''سیرت

محمد علی مونگیری'' ہے جو انہوں نے ۶۴ء میں لکھی تھی، اگرچہ اس سے پہلے ہی ان کا ترجمہ ''طوفان سے ساحل تک'' چھپ کر مقبول ہو چکا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے خاندانی بزرگ شیخ علم اللہ جو ایک زبردست عالم ربانی تھے کی سیرت پر اپنی کتاب ''تذکرۂ شاہ علم اللہ'' کے نام سے لکھی۔

مولانا کے قلم میں ایسی طاقت وتاثیر تھی جو مردہ دلوں میں زندگی پیدا کر دیتی تھی، ان کے عربی اور اردو کے مضامین، زبان وبیان اور اسلوب ونگارش کے لحاظ سے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترتے ہیں، ''البعث الاسلامی'' کے ہر شمارہ میں ان کا افتتاحیہ ہی دراصل پرچہ کی جان ہوتا تھا، مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ عرب نوجوانوں اور اہل قلم کی ایک بڑی تعداد ان کے اداریوں کے لئے بے چین رہتی تھی، جب ان کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحریر ایک ایسے نوجوان عالم وادیب اور صاحب قلم کی ہے، جس نے عرب ممالک میں کوئی تربیت نہیں حاصل کی ہے اور نہ کسی عرب ملک میں وقت گذارا ہے، تو ان کے تعجب کی انتہا نہیں رہتی تھی، مصر وشام اور اردن وحجاز کی دینی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے عرب علماء وادباء اور اصل اخوان نوجوانوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب دنیا کے کسی حصہ میں جمال عبدالناصر کے غلط تصرفات اور اس کی اسلام کشی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی تو تنہا محمد الحسنی مرحوم نے عبدالناصر کی حقیقت کو آشکارا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، اور باوجود خطرات وموانع کے وہ اس مقدس فریضہ سے باز نہیں آئے جس کا جی چاہے ''البعث'' کے وہ مضامین اور افتتاحیے پڑھ لے، جس میں انہوں نے قومیت کے بت تراش آزر کے ساتھ پنجہ آزمائی کی ہے، اور اسے آخری انجام تک پہنچا کر دم لیا ہے۔

شاید یہ شعر ان کی جان فروشانہ کوششوں کی کسی حد تک ترجمانی کر سکے۔

عشق کی قیمت دیارِ عشق میں ہے کوئے دوست
جب سے یہ مژدہ سنا ہے سر وبال دوش ہے

مولانا ڈاکٹر سید محمد اجتباء حسینی ندویؒ

چند یادیں

مولانا ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندویؒ نے دار العلوم ندوۃ العلماء سے عالمیت کی سند ۱۹۵۴ء میں حاصل کی، اس کے بعد فضیلت کے آخری سال میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کے حکم اور مشورہ سے دمشق یونیورسٹی کے شریعت کالج میں جن تین طلباء کا انتخاب ہوا تھا، ان میں مولانا سید محمد اجتباء مرحوم اور ڈاکٹر محمد راشد ندوی اور ڈاکٹر رضوان علی ندوی کا انتخاب فرمایا گیا، اور ۱۹۵۵ء کے آخر میں ان حضرات نے براہ ممبئی دمشق کا سفر کیا اور وہاں پہونچ کر دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ میں داخلہ کی کارروائی فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعیؒ کی سرپرستی میں مکمل کرالی، اور وہاں کی تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے، چونکہ یہ حضرات دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے بھیجے گئے تھے، اس لئے وہاں کے علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی، اور یونیورسٹی کے ماحول میں ان حضرات کو نمایاں ہونے کا موقع حاصل ہوا، خود ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی ان کے ساتھ اپنی خاص توجہ اور علمی رہنمائی کا معاملہ فرماتے تھے۔

ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی سے میری شناسائی سب سے پہلے اس وقت ہوئی جب وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے عالمیت کے درجہ پنجم میں داخل تھے، اتفاق سے میرے استاد مولانا ابو العرفان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قائم مقام مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء اس درجہ میں درس دے رہے تھے کہ میں اپنی کسی تعلیمی ضرورت کی بنا پر مولانا سے ملنے کے لئے درجہ میں حاضر ہوگیا تھا، اور وہاں میں نے مولانا سید اجتباء مرحوم کو پہلی مرتبہ دیکھا، ان کے ایک اور ساتھی جن کا نام

مجید اشرف تھا اور مولانا طفیل احمد پرتا بگڑھی غالباً اسی درجہ کے ساتھیوں میں تھے، ان تینوں حضرات کا سراپا آج بھی میری نظروں میں بالکل اُسی طرح نمایاں ہے، پھر درجہ کے باہر بھی ان حضرات سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، اس وقت دارالعلوم میں طلباء کی تعداد بہت کم تھی، شبلی ہاسٹل تمام طلباء کے قیام کے لئے کافی تھا، مجھے کمرہ ۱۳ میں اپنے بامقصد ساتھیوں کے ساتھ قیام کا موقع ملا، اور اکثر طلباء سے جان پہچان بھی ہوگئی تھی، مولانا اجتباء صاحب مرحوم اگر چہ امین آباد میں محمد علی لین کے ایک مکان میں اپنے برادر بزرگ حضرت مولانا سید محمد مرتضی صاحب سابق انچارج کتب خانہ ندوۃ العلماء کے ساتھ رہا کرتے تھے، جب بھی ادھر مرکز دعوت وتبلیغ میں حاضری اور حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس قرآن میں شرکت کے لئے جاتا تھا تو اکثر مولانا اجتباء صاحب بھی سے ملاقات ہوا کرتی تھی، حضرت مولاناؒ اس زمانہ میں مرکز ہی میں قیام پذیر تھے اور اکثر میں مولانا کی خدمت میں عصر کے بعد حاضر ہوا کرتا تھا، ایک دفعہ حضرت مولانا نے میرا امتحان لیا، ایک کتاب کی عبارت پڑھوائی اور کچھ سوالات کئے، پھر عربی میں ایک انشاء لکھنے کا حکم دیا، میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند سطریں لکھ کر پیش کیں، حضرت مولانا نے دیکھ کر اطمینان کا اظہار فرمایا، مجھے حضرت مولانا کا یہ جملہ آج بھی یاد ہے: ”تمہارے اندر ادب کے جراثیم پائے جاتے ہیں“، ظاہر ہے یہ میرے لئے بڑی بشارت تھی، اور اس کا اثر میری تعلیمی زندگی پر پڑنا ناگزیر تھا۔

۱۹۵۳ء میں میرا فضیلت ادب کا دوسرا سال تھا، دارالعلوم کی عمارت کے بالائی حصہ میں ہمارا درجہ اور فضیلت اول ودوم دینیات کا درجہ بھی قریب ہی کے کمروں میں قائم تھا، میں اکثر دیکھتا تھا کہ حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم اور حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلویؒ کے درس حدیث میں شرکت کرنے کے لئے ایک نوجوان آیا کرتے ہیں، ان کے چہرہ پر سنجیدگی، اور بلندی کے آثار نمایاں تھے، میں نے معلوم کرنا چاہا کہ یہ نوجوان کہاں سے آتے ہیں؟ تو معلوم ہوا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے اور حضرت مولانا کے

برادر بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی کے صاحبزادے محمد میاں صاحب ہیں، میں نے ان کی طرف ایک کشش محسوس کی، اور درجہ سے نکلنے کے بعد ان سے ملاقات ہوگئی، میں نے اپنے اچھے تاثر کا ان سے اظہار کیا، انہوں نے نہایت مختصر انداز سے میری باتوں کا جواب دیا، پھر جب میں پابندی کے ساتھ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دیتا، تو درسِ قرآن کے بعد اکثر میری ان سے ملاقات ہوجایا کرتی تھی، ایک دفعہ انہوں نے مجھ کو چائے کی مجلس میں مدعو کیا، میں ان کے ساتھ قریب ہی کے ایک کم آباد چائے خانہ میں پہونچا، جہاں چائے پی گئی، اور دیر تک باتیں کرتے رہے، اسی اثناء میں انہوں نے ''المنتدی الادبی'' کے بارے میں اس کے کچھ پروگرام سے آگاہ کیا، اور مجھے بھی اس کا ممبر بننے پر مسرت کا اظہار کیا، اس کا ہفتہ وار جلسہ ہر جمعہ کو عصر کے بعد امین آباد میں ان کے گھر کے قریب ہی منعقد ہوا کرتا تھا، اس میں پابندی سے شرکت کا موقع ملتا تھا، اور ٹوٹے پھوٹے مقالے پڑھنے کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی تھی، یہیں سے ہم لوگوں کے ذہن میں ایک عربی ماہنامہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا، جس کا اظہار ہمارے دوست مولانا سید محمد الحسنی صاحب کے ذریعہ حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ہوا، حضرت مولانا نے حوصلہ افزائی فرمائی، اور اس خیال کی پوری تائید کی، حضرت مولانا کی منظوری کے بعد ماہنامہ کے نام کا مسئلہ پیش آیا، اور ''البعث الاسلامی'' نام کو حضرت مولانا نے پسند فرمایا اور اسی پر سب نے اتفاق کیا۔

ان تمام معاملات میں مولانا سید محمد اجتباء صاحب بھی پوری طرح شریک رہے، پرچہ نکالنے کی سرکاری منظوری حاصل کرنے کے لئے جو ضروری کوششیں تھیں، ان میں بھی اور اس کو نکالنے کی تیاری میں بھی ہر طرح شریک رہے، اور شریک ادارت بھی بنائے گئے، چنانچہ پہلے شمارہ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں دو نام میرا اور مولانا سید محمد اجتباء حسینی صاحب کا چھپا، مگر افسوس کہ یہ شمارہ منظر عام پر آنے سے پہلے ہی مولانا سید اجتباء صاحب ندوی دمشق یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے سفر دمشق پر روانہ ہوگئے، اس کے باوجود

چار شماروں تک میں برابر ان کا نام چھپتا رہا، جب وہ باقاعدہ ''کلیۃ الشریعۃ'' میں تعلیم حاصل کرنے لگے اور وہاں کے طالب علم کی حیثیت سے ان کا نام داخلہ کے تمام کاغذات اور رجسٹر حاضری میں چھپ گیا تو پانچویں شمارہ سے مدیر التحریر کی حیثیت سے مجھ خاکسار کا نام باقی رہا، اور بفضلہٖ تعالیٰ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، فرق صرف یوں ہوا کہ ۱۹۷۸ء میں صدیق محترم مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک رحلت کے بعد باقاعدہ رئیس التحریر کی حیثیت سے میرا نام حسب الحکم حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء رحمۃ اللہ علیہ چھپنے لگا، اور پرچہ کے نکالنے کی تمام ذمہ داری اس خاکسار کے سر آگئی، شریک ادارت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (حال معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) کا اسم گرامی بھی ''رئاسۃ التحریر'' کے تحت آنے لگا، اور نقشہ یوں بنا:

رئاسة التحرير :سعيد الأعظمي- واضح رشيد الندوى

الحمد للہ کہ یہ عربی ماہنامہ برابر وقت کی پابندی کے ساتھ ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان کی حیثیت سے نکل رہا ہے، اگرچہ بعض محترم حضرات نے بانی رسالہ کی وفات کے بعد علی الاعلان یہ پیشین گوئی کی تھی کہ مولانا محمد الحسنی کے بعد ندوۃ العلماء کا سب سے بڑا خسارہ یہ ہوا کہ یہ پرچہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے پردۂ غیب سے اس کے جاری رہنے کا فیصلہ فرمایا، اس لئے یہ برابر جاری ہے، اور اسکے ۶۰/ سال پورے ہو چکے ہیں، اب اس کا ۶۱/ رواں سال ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک حمداً کثیراً۔

مولانا اجتباء صاحب لکھنؤ سے باہر دمشق میں رہتے ہوئے بھی البعث الاسلامی کے لئے فکرمند رہا کرتے تھے، ان کے اس زمانہ کے خطوط سے یہ معلوم کر کے انتہائی اطمینان ہوا کرتا تھا کہ البعث الاسلامی کو وہاں کے علماء وادباء حضرات نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اس کا خریدار بننے کے سلسلے میں مولانا ندوی سے برابر استفسار کرتے تھے، خود ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رحمۃ اللہ علیہ اس پرچے کو بنظر استحسان دیکھتے تھے، اور اس میں ان کے مضامین

بھی شائع ہوا کرتے تھے، وہاں کے ایک بڑے عالم وداعی شیخ عاصم العطار بھی پرچے کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، اور ہمیشہ نئے شمارہ کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اسی اثناء میں جب کلیۃ الشریعۃ میں تعلیم حاصل کرنے والے یہ حضرات وہاں موجود تھے کہ اچانک مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی عمید کلیۃ الشریعۃ کی دعوت پر دمشق یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر (Visiting Professor) کی حیثیت سے سفر ہوا، اسی مناسبت سے حضرت مولانا نے ''رجال الفکر والدعوۃ'' کے عنوان سے ۸ر آٹھ محاضرات تحریر فرمائے، تاکہ وہاں منتخب علماء، ادباء اور زعماء کے سامنے پڑھا جاسکے، ان محاضرات کو پیش کرنے کے لئے جامعہ دمشق کے مرکزی ہال میں اصحاب فکر ودانش اور طلبائے جامعہ کا اجتماع منعقد ہوا کرتا تھا۔

سفر سے قبل حضرت مولانا ان محاضرات کو املا کراتے تھے، میں ہیچمدان اس کام کے لئے روزآنہ حضرت کی قیام گاہ کچہری روڈ کے مرکز دعوت وتبلیغ جایا کرتا تھا، املا کرانے کے بعد حضرت مولانا اس پر نظر ثانی کیا کرتے تھے، اور پھر میں ان کو قلم سے صاف کیا کرتا تھے، یہی محاضرات بعد میں رجال الفکر والدعوۃ کے نام سے کلیۃ الشریعۃ دمشق کی طرف سے شائع ہوئے۔

اس موقع پر مولانا اجتباء صاحب اور دیگر ساتھیوں کو حضرت مولاناؒ کی خدمت میں رہنے کا اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا خوب موقع ملا، وہاں کے بہت سے اہل علم وادب اور تعلیم یافتہ طبقہ سے تعارف حاصل ہوا، اس زمانہ میں شیخ علی طنطاوی دمشق یونیورسٹی کے بڑے اساتذہ میں تھے، اور پروفیسر کے درجہ پر فائز تھے، وہ یونیورسٹی کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے، اس خطبہ کا چرچا اہل علم کے سبھی طبقات میں ہوتا تھا، ان کی ادبی فصاحت وبلاغت کے ساتھ علمی اور معنوی گہرائی کا ایک بڑا عنصر ان کے خطبوں میں شامل رہا کرتا تھا، ہمارے یہ ندوی حضرات ان کے خطبہ جمعہ میں حاضر رہنے کا اہتمام کرتے تھے، نماز کے بعد پھر ان سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوتا تھا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ

حضرت مولانا نے اپنے دوران قیام شیخ علی طنطاوی کے خطبہ جمعہ میں شرکت فرمائی تھی، یہ ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب جنوری ۱۹۵۸ء میں اپنے اس خادم کے لئے جناب ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی کی خدمت میں مزید علمی اور ادبی استفادہ کے لئے بغداد بھیجنے کا فیصلہ فرمایا تو اس وقت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بغداد میں مقیم تھے، اور بغداد یونیورسٹی کے كلية المعلمين العليا میں پروفیسر کی خدمت انجام دے رہے تھے، بغداد میں قیام کے دوران جب حج کا زمانہ قریب آیا، تو بیت اللہ کو دیکھنے اور حج کے ایام میں وہاں شریک ہونے کا جذبہ دل میں موجزن ہوا، میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں خط لکھ کر اس کا اظہار کیا، تو پورے انشراح سے اجازت عطا فرمائی، اس زمانہ میں ہمارے استاد محترم جناب ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ جدہ میں ریڈیو اسٹیشن کے شعبہ مشرقیات سے منسلک تھے، اور مذیع ومترجم کے عہدہ پر فائز تھے، بغداد میں میرے سفر حج کا انتظام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والی دو شخصیتوں نے کر دیا تھا، ان میں وہاں کی سب سے معتبر شخصیت علامہ امجد الزہاوی اور وہاں کی دینی قیادت کے علمبردار شیخ محمد محمود الصواف تھے۔ رحمهما الله تعالى وتقبل منهما صالح الأعمال۔

میں ذی الحجہ کے پہلے ہفتہ میں جدہ پہونچا، اور ایک معلم حج کی معرفت میں کسی طرح جدہ ریڈیو اسٹیشن کے اس زمانہ کی مرکزی عمارت میں حاضر ہوا، تو مجھے میرے ندوی کرم فرما جناب نصار رفیع صاحب ملے، ان کے ساتھ ریڈیو میں کام کرنے والے دوستوں کی ایک جماعت بھی تھی، مجھ کو دیکھ کر انہوں نے انتہائی خوشی کا اظہار کیا، میں نے ان سے عرض کیا کہ استاد محترم مولانا عبداللہ عباس صاحب کی قیام گاہ تک میری رہنمائی کریں، مگر انہوں نے کہا کہ سردست آپ ہمارے مہمان ہیں، ہمارے ساتھ چلیں اور ہماری قیام گاہ پر قیام کریں، کل انشاء اللہ ان سے ملاقات ہو سکے گی، چنانچہ میں اپنے دوست نصار رفیع

صاحب کی قیام گاہ جو شارع قابل جدہ کے نواح میں تھی، چلا گیا، اوران کی میزبانی سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، دوسرے دن استاد محترم حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کی قیام گاہ شارع قابل میں شیخ محمد نصیف کے تاریخی مکان کے سامنے تھی، مولانا نے مجھ سے کہا کہ اب تم کو یہیں رہنا ہے، حج سے ایک دن پہلے ہم مکہ چلیں گے، اور وہاں حج اور قیام کا انتظام کریں گے، میں پہلی مرتبہ مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحبؒ کے ساتھ احرام باندھ کر داخل ہوا، حرم شریف میں جا کر دو رکعت نماز پڑھی اور طواف وسعی کے بعد عمرہ کی سعادت سے بہرہ مند ہوا، **فالحمد الله على ذلك** ۔

مکہ مکرمہ میں حج کرنے والے افراد کا ایک جم غفیر پہلے سے موجود تھا، حرم شریف کے قریب کوئی ایسی قیام گاہ نہیں تھی، جہاں ایام حج میں رہنا ممکن ہوتا۔ اس زمانہ میں سفر حج کے سلسلہ میں بنارس کے عالم دین حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی اور الحاج محمد شفیع صاحب پہلے سے آکر حرم کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں مقیم تھے، مولانا نے مجھے ان کی خدمت میں پہونچا دیا، اور ان لوگوں نے بمسرت تمام مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامندی کا اظہار کیا، اب میں انہیں کے ساتھ منی، عرفات، پھر منی میں رہا، مناسک حج ایک نوجوان شخص کو نوجوان امنگوں کے ساتھ ادا کرنے کا موقع ملا، اس وقت عمر کے ۲۳ ویں سال سے نکل کر ۲۴ ویں سال میں داخل ہو چکا تھا، سفر حج کا کوئی تکان یا کسی مشقت کا کبھی کوئی احساس نہیں ہوا، رمی جمار، قربانی اور طواف افاضہ، بھی نہایت آسانی کے ساتھ پورا کرنے کا موقع ملا، میں ان تمام چیزوں میں جناب مولانا محمد اسحاق صاحب بنارسی کے قافلہ کے ساتھ رہا، حج سے فراغت کے بعد کچھ دن مکہ میں گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی، پھر طواف وداع کر کے میں جدہ آ گیا، حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اندوہ ناک خبر سنائی کہ بغداد میں انقلاب آ گیا ہے، اور وہاں کے شاہی

خاندان کو کمیونسٹوں نے عوام کی مدد سے تہہ تیغ کردیا ہے، اب وہاں کے وزیر اعظم عبدالکریم قاسم ہیں، وہاں کے حالات انتہائی تشویش ناک ہیں، انقلابیوں نے بہت سی شخصیتوں کو قتل کردیا ہے، سردست وہاں واپس جانا مناسب نہیں ہے۔

چنانچہ استاذ محترم کے مشورہ کے مطابق دمشق کا سفر طے ہوا، وہاں ندوہ کے ایک طالب علم محمد محمود الحافظ کے والد صاحب پہلے سے موجود تھے، انہوں نے دمشق میں ٹھہرنے کے لئے شیخ صلاحی کے مکان پر انتظام کردیا، میں نے اس انتظام سے مولانا سید محمد اجتباء صاحب کو مطلع کیا، تو وہ شیخ صلاحی کے مکان پر تشریف لائے اور ان سے اجازت لے کر مجھ کو اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے، اور نہایت ہی اہتمام واکرام کے ساتھ اپنے ہی کمرہ میں ٹھہرایا، نظافت وشفافیت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ہم دنیا کے ایک ایسے ملک میں آگئے ہیں، جو ہر اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اکثر مولانا اجتباء صاحب مجھ کو اپنے ساتھ مختلف تاریخی اور مشہور جگہوں پر لے جاتے تھے، میرا قیام وہاں تقریبا چار ہفتے رہا، اس دوران وہاں کی عظیم شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا، شیخ بہجۃ البیطار، شیخ علی طنطاوی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی سے ملاقات کا موقع عطا ہوا، اسی کے ساتھ اپنے دوست جناب مولانا محمد راشد ندوی اور مولانا رضوان علی صاحب ندوی کی قیام گاہوں پر بھی جانے کی سعادت حاصل ہوئی، کئی ایسے دار النشر جو اسلامی کتابوں کی طباعت کا اہتمام کرتے تھے، ان کی زیارت اور ان کے ذمہ داروں سے ملنے کا موقع حاصل ہوا، قیام وطعام کی ضیافت کے ساتھ ساتھ اس ضیافت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع بھی جناب مولانا سید محمد اجتباء صاحب کے ذریعہ حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کے نامۂ حسنات میں اس تکریم ومحبت کا اضافہ فرما کر اس کی بھرپور جزاء عطا فرمائیں۔

مولانا اجتباء صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۶۰ء میں اپنی تعلیم مکمل کرکے واپس آئے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاد مقرر ہوئے، ریلوے کے ایک بڑے آفیسر

جناب عبدالجبار صاحب بستوی کی صاحبزادی سے عقد ہوا، عقد کے بعد محلّہ ارادت نگر میں پہلے ایک کرایہ کے مکان میں قیام کیا، اور روزانہ تعلیم کے اوقات میں دارالعلوم آتے تھے، کچھ عرصہ کے بعد احاطۂ دارالعلوم کے اندر ایک مکان کا انتظام ہوگیا، میرا مکان بھی اس زمانہ میں احاطۂ دارالعلوم ہی میں تھا، میں ان کے پڑوسی کی حیثیت حاصل ہوجانے پر مسرور ہوا، ہماری ملاقاتیں روزانہ مختلف اوقات میں ہوا کرتی تھیں، اور اہل خانہ کے بھی اہل خانہ سے خوشگوار تعلقات قائم ہوگئے تھے، میرے بچے اس زمانہ میں بہت کم عمر تھے، مولانا اجتباء صاحب کی بھی چھوٹی صاحب زادی تھیں۔

نہایت خوشگوار حالات میں وقت گزرتا رہا، اور بعد میں مولانا اجتباء صاحب نے کلیۃ الشریعہ دمشق کی سند کی بنیاد پر علی گڑھ میں پی، ایچ، ڈی کے لئے داخلہ لیا، اور اسکے بعد وہاں کچھ دنوں تک لکچرر کے منصب پر فائز رہے، اور شعبۂ عربی سے ان کا باقاعدہ تعلق ہوگیا، اس بناپر حضرت مولانا کے مشورے سے ندوے سے علی گڑھ منتقل ہوگئے، علی گڑھ سے پھر جامعہ ملیہ کے شعبۂ عربی سے وابستہ ہوئے، اور عربی زبان وادب کے موضوع پر وہاں ان کو مزید مطالعہ اور قیام کا موقع ملا، انہوں نے اپنا ایک مکان بھی اس زمانہ میں بنوالیا تھا، کچھ عرصہ کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے بلایا گیا، وہاں اس زمانہ میں پروفیسر مشیر الحق بحری آبادی وائس چانسلر تھے، ان کی نگرانی اور سرپرستی میں مولانا ایک عرصہ تک وہاں رہے، لیکن وہاں کے حالات خراب ہونے کی بنا پر پھر انہوں نے اپنا تبادلہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی وفارسی کے صدر کی حیثیت سے کرالیا، کافی مدت تک الہ آباد میں رہنے کا اتفاق ہوا، لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد وہاں سے واپس آگئے، اور دہلی میں اپنا ایک بہت اچھا مکان جامعہ نگر میں تکونہ چوراہے کے پاس بنوا کر مقیم رہے، اور ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی مراکز میں منعقد ہونے والے سیمیناروں میں شرکت کرنے کا موقع ملتا رہا، اور وہ فارغ البالی کے ساتھ دہلی میں قیام پذیر رہے، عالمی رابطہ ادب اسلامی

کے سینئر رکن ہونے کی بنا پر دار العلوم ندوۃ العلماء بھی تشریف لاتے تھے، پھر انہوں نے دہلی میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی شاخ قائم کی، اور آخر تک صدر کے عہدہ پر فائز رہے، ہر مہینہ رابطہ کا جلسہ کرتے تھے، اور اس وجہ سے اس کا حلقہ برابر وسیع ہوتا رہا۔

قابل ذکر یہ ہے کہ مولانا نے علی گڑھ یونیورسٹی سے علامہ سید صدیق حسن قنوجی کی حیات وخدمات پر پی، ایچ، ڈی کا رسالہ تیار کیا تھا، وہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے، اسی طرح حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حیات پر ایک قیمتی کتاب لکھی ان کے ادبی، علمی اور تحقیقی مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے، انہوں نے المرکز العلمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، اسکے ذریعہ سے وہ بیشار علمی اور ادبی خدمات انجام دے رہے تھے، ان کے صاحبزادے زبیر مصطفیٰ انجینئر ہیں، وہ اس ادارہ کو باقی رکھنے، اور اسکو مزید پروان چڑھانے کے لئے اپنی کوششیں صرف کرر ہے ہیں، اور اپنے مکان کے ایک حصہ کو مرکز علمی اور اس کے کاموں کے لئے خاص کردیا ہے، اور بعض ندوی فضلاء کے تعاون سے اس مرکز علمی کو اپنے والد مرحوم کی ایک علمی یادگار کے طور پر نہ صرف یہ کہ باقی رکھنا چاہتے ہیں، بلکہ اس کے حلقہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے اور اسکے فیض کو عام کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

مولانا اجتباء آخر میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ممبر منتخب ہوگئے تھے، اور نہایت پابندی کے ساتھ اسکے جلسوں میں شرکت کرتے تھے، اسی طرح ندوہ کی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے رکن تھے، اور اس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے، مجلس کی مطبوعات کو ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی پہونچانے کے سلسلہ میں مفید مشورے دیتے تھے، اور بہت سے مدارس اور علمی مراکز کے سرپرست اور رکن بھی تھے، انہوں نے اخیر میں بھی دمشق، اردن، سعودیہ اور خلیجی ممالک کا سفر کیا، اور مرکز علمی کا تعارف بھی کرایا۔

اخیر میں یہ بات عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ مولانا نے مدینہ یونیورسٹی اور ریاض یونیورسٹی کے عربی شعبوں میں بھی تدریس کی خدمت ایک عرصہ تک انجام دی، اور وہاں کے

طلباء کو ان سے فائدہ اٹھانے کا ایک اچھا موقع ملا، وہ اپنی عربی تحریر وتقریر میں بہت فائق اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے، ان کے عربی مضامین دوسرے عربی رسالوں کے ساتھ البعث الاسلامی میں بھی چھپتے تھے، اور ندوۃ العلماء کی صحافت اور اسکے تعلیمی معاملات سے خاصا تعلق رکھتے تھے، اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے تھے، اسی طرح حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان عالی کے بزرگوں اور افراد سے والہانہ تعلق رکھتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شفقتوں اور توجہات سے ان کو بہت فائدہ پہونچا، اسی طرح حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نہ صرف ان کے استاد تھے، بلکہ ان کی خیر خواہی اور ان کی علمی ترقی میں ان کا بہت بڑا کردار ہے، اسی خاندان سے متعلق جناب مولانا سید محمد طاہر حسینی مظاہری سے ان کے مخلصانہ تعلقات دوستی کی حد تک پہونچے ہوئے تھے، اور ہمارے فاضل اور محترم دوست جناب مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ کے بے تکلف ساتھیوں اور دوستوں میں تھے، مولانا اجتباء صاحب کا قیام ایام طالب علمی میں محمد علی لین پر تھا۔ جہاں یہ تمام حضرات رہتے تھے، اس لئے دن رات کا ان کا ساتھ تھا۔

اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائیں، اور جن علمی منصوبوں کو نامکمل چھوڑ کر گئے ہیں، امید ہے کہ ان کے صاحبزادے عزیزی زبیر مصطفیٰ انکی تکمیل کریں گے اور ان کی روح کو مسرور اور سرشار کریں گے، اللہ تعالی محض اپنے فضل وکرم سے نوازیں اور جنت الفردوس کے اعلی مقام میں جگہ عطا فرمائیں۔

امیر شریعت سادس

حضرت مولانا سید نظام الدین قاسمیؒ

ہندوستان کے تین صوبوں بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدین قاسمی ایک بڑی جامع شخصیت کے مالک تھے، وہ علوم اسلامیہ کے ماہر، اور فقہ اسلامی اور دین وشریعت کے تقاضوں کا پورا علم رکھتے تھے اور جماعت علماء میں ایک امتیازی شان کی صفت کے ساتھ متعارف تھے، اور وہ نہ صرف سب کی نظروں میں مانوس تھے، بلکہ دل کی گہرائیوں سے لوگ ان سے محبت کرتے تھے، ان کا شمار ملک کے کبار علماء میں ہوتا تھا، وہ بیک وقت امیر شریعت اور امارت شرعیہ کے قاضی القضاۃ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری اور قوم وملت کے مرشد ومربی کے مرتبے پر فائز تھے، انھوں نے اپنی پوری زندگی علم ودین کی خدمت، دعوت وارشاد کی ذمہ داری اور اخلاق حسنہ کی نمائندگی اور اس کی آبیاری میں گذاردی، رسوخ فی العلم اور اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ کسر نفسی اور تواضع آپ کا خاص وصف تھا، اور اپنی جامع شخصیت کی بنا پر ملک کے مشہور مراکز علمیہ، مدارس وجامعات اور دینی جماعتوں سے آپ کا گہرا تعلق تھا، اور ہر نوع کے دینی، تعلیمی، دعوتی، اور فکری مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے اور اپنی جملہ توانائیوں کو صرف کر کے ان کی بے لوث خدمت کرنے کے جذبے سے معمور تھے۔

اللہ تعالی نے حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس ملک کی آزادی کے بعد سے بدلتے ہوئے حالات اور قومی اتحاد جو اس ملک کو آزاد کرانے کے دوران قائم تھا، اس کو ختم کرنے اور سیکولرازم کے تصور کو مٹانے اور مسلمانوں کے خلاف

مذہبی عصبیت کو رواج دینے میں مصروف طاقتوں کے پیش نظر عقیدہ وایمان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رکھنے کے سلسلے میں علمائے کبار کے ساتھ رہ کر اپنی جدوجہد کو بلاتوقف جاری رکھا۔ اور دعوت دین اور اصلاح معاشرہ کے کاموں میں پوری طرح مصروف رہے. اس کے نتیجے میں حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی (امیر شریعت رابع) کے اصرار و دعوت پر مولانا مرحوم امارت شرعیہ سے وابستہ ہوگئے اور اس ادارہ کی ذمہ داری قبول کر کے اس کے تمام شعبوں کی ترقی و توسیع کے عمل کو مضبوط کیا۔

یوں تو مولانا دارالعلوم دیوبند سے وہاں کے باکمال اساتذہ سے تحصیل علم کے بعد ۱۹۴۷ء میں جو ملک کی آزادی کا تاریخی سال تھا، صوبہ بہار کے ضلع چمپارن میں مدرسہ ریاض العلوم میں جو موضع ساٹھی. میں واقع تھا، صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور تقریباً گیارہ سال تک علوم اسلامیہ کا درس دیتے رہے، اور اہل علم وعمل کی ایک جماعت آپ کے ذریعہ تیار ہوئی، مدرسہ ریاض العلوم میں ایک عرصہ تک تعلیمی اور علمی خدمت انجام دینے کے بعد ہزاری باغ کے قصبہ چترا میں مولانا رحمت اللہ صاحب کی دعوت پر ان کے مدرسہ رشید العلوم میں صدر مدرس کی حیثیت سے جانا ہوا۔ اور غالباً دو سال تک وہاں صدر مدرس کے منصب پر رہتے ہوئے درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اور تشنگان علوم کو سیراب کرتے رہے، اور ۱۹۶۵ء سے حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحبؒ کے اصرار پر آپ کو امارت شرعیہ کے ناظم کی حیثیت سے امارت کی خدمت انجام دینے کا بہترین موقع ملا، اور امارت شرعیہ کے حلقے کو وسیع کرنے اور اس کے عملی دائرہ کو عوام الناس تک پہونچانے میں آپ نے بے مثال کردار ادا کیا، اس وقت امیر شریعت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب تھے اور امیر شریعت خامس شمار کئے گئے اور مولانا مرحوم ان کے نائب مقرر ہوئے اور نائب امیر شریعت کی حیثیت سے بیش بہا خدمات انجام دیں، لیکن ۲؍ستمبر ۱۹۹۸ء کو امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی وفات ہوگئی، اور اس واقعہ کے بعد ان کے نائب امیر شریعت

ہونے کی بنا پر طبعی طور سے امارت شرعیہ کی ذمہ داری حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کے کاندھوں پر آگئی اور آپ کا شمار امیر شریعت سادس کی حیثیت سے یکم نومبر ۱۹۹۸ء میں ہوا اور قاضی مجاہد الاسلام صاحب نائب امیر شریعت کے منصب پر فائز ہوئے۔

امیر شریعت سادس نے اپنے مخلص رفیق کار جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلامؒ کے ساتھ مل کر صوبۂ بہار اور دیگر مقامات کا دورہ کیا، جس سے امارت شرعیہ کے کاموں اور اس کے ہر سطح کے فیصلوں اور ذمہ داریوں کا تعارف کرایا، اور امیر شریعت کا منصب تفویض ہونے سے پہلے امارت کی نظامت کے عہد سے اپنی ذاتی کوششوں سے بہت سے اہم امور انجام دیئے، ان میں امارت کے لئے وسیع جگہ کا انتخاب اور اس کی تعمیر جدید میں انہماک، نیز سجاد میموریل ہسپتال کی تاسیس اور اس کی تعمیر، مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا قیام، اور اس کی مختلف شاخوں کا افتتاح، اسی طرح امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ کا قیام آپ کی کوششوں سے ہوا، امارت شرعیہ کے بہت سے مقدمات میں جو کسی حد تک پیچیدہ اور دقت طلب تھے، آپ نے فیصلے کئے، اور وہ نظیر بنے، اسی طرح المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء کا قیام بھی انتہائی اہمیت کا حامل آپ کا کارنامہ ہے۔

امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کو شرعی قوانین نافذ کرنے اور مسلم معاشرہ کو اس کا پابند بنانے کی کتنی فکر تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ملک کے ہر طبقے کے علماء سے رابطہ قائم کیا، اور ان سے شرعی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں گفتگو کی اور امت مسلمہ کے تمام نمائندوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور ان کے سامنے مسلم عائلی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں ایک متحدہ بورڈ کی تشکیل دینے کی تجویز پیش کی، جس کو متفقہ طور پر منظور کرلیا گیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے بمبئی کے اجلاس منعقدہ ۲۷/۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کی صدارت میں قائم ہوا اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی

اس کے سکریٹری جنرل متعین ہوئے، اوراس متفقہ بورڈ کے قیام کے بارے میں حکومت ہند کو اطلاع دی، اور بتادیا کہ مسلم معاشرہ میں شرعی قوانین نافذ کرنے کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا ہے، اور یہ دینی امانت ہے، جو بورڈ کی سرپرستی میں ادا کی جائیگی، اوراس میں کسی فرد یا حکومت کی مداخلت کا حق نہیں ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات کے بعد متفقہ طور پر بورڈ کے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی منتخب ہوئے، اوراس کے سکریٹری جنرل مولانا سید نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ ہوئے، اور تاحیات وہ اسی منصب پر قائم رہے، بورڈ کے موجودہ صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے ساتھ امیر شریعت نے سکریٹری جنرل کے عہدہ پر رہ کر اپنی فکر اور مشوروں سے بورڈ کو فائدہ پہونچانے کی بھرپور کوشش کی، اور صدر محترم کو ہر طرح ان سے پورا تعاون حاصل رہا۔

مولانا سید نظام الدین قاسمی امیر شریعت سادس اپنی علمی وجاہت کی بناء پر دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی اور مجلس نظامت کے رکن تاحیات رہے اور پوری پابندی کے ساتھ دونوں مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، آپ نے نصف صدی سے زائد تک علم دین، شریعت اور افتاء وقضاء کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دیں، اور انتہائی مشکل حالات میں بھی آپ کے پائے ثبات میں کبھی کوئی تزلزل نہیں پیدا ہوا، بلکہ عزم کامل اور بلند ہمتی اور دولت اخلاص سے معمور رہ کر اپنے جملہ دینی اور شرعی فرائض انجام دیتے رہے۔

امیر شریعت کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بے حد عقیدت ومحبت تھی، اوران کی شخصیت کی جامعیت کی بنا پر وہ ان کی عزت وقدردانی میں بہت آگے تھے، اور بورڈ کے جنرل سکریٹری کے ایام میں وہ مشورہ کرنے کے لئے اکثر لکھنؤ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لایا کرتے تھے اور بورڈ کے اجلاس کی تاریخوں اور

ایجنڈے کی تعیین میں نہایت دوراندیشی کے ساتھ فیصلہ فرماتے تھے، جس پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو پورا اطمنان اور اعتماد ہوا کرتا تھا اور اس کے مطابق عمل فرمایا کرتے تھے۔

امیر شریعت کو ندوۃ العلماء کی فکری اور اس کے مقاصد عالیہ سے اس قدر ہم آہنگی تھی کہ انھوں نے اپنے صاحب زادے مولانا عبدالواحد صاحب کی پوری تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دلوائی، اور اپنی نیک تمناؤں سے یہاں کے سبھی اہل تعلق کو نوازتے تھے، طلبہ بھی امیر شریعت سے ملاقات کر کے ان سے استفادہ کرتے اور اپنی انجمن الاصلاح میں پروگرام منعقد کر کے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے تھے، میں نے ندوہ کی تشریف آوری کے موقع پر امیر شریعت کو ہمیشہ نہایت خوش اور منشرح دیکھا، اور ہر اعتبار سے یہ محسوس ہوا کہ وہ ندوہ کے اپنے قیام کو باعث خیر تصور کرتے ہیں۔

امیر شریعت علم وفضل، تفقہ فی الدین اور تعمق فی العلم کے اعتبار سے علمی مرتبہ پر فائز تھے اور اپنے علم وورع کو چھپانے اور بے تکلف زندگی بسر کرنے کو ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ افسوس! یہ آفتاب علم وفقہ اور رجل مقبول اپنی عمر طبعی کو پہونچ کر دنیا سے رخصت ہو گئے اور ایک بڑا اخلاء پیدا کر کے راہی دار آخرت ہو گئے۔

ایک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

وفات سے چند سال پہلے حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء اور صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ان کی عیادت کے لئے اپنے وفد کے ساتھ تشریف لے گئے تھے، اس کے چند دن بعد اچانک مؤرخہ ۳؍محرم ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۷؍نومبر ۲۰۱۵ء کو پٹنہ میں آپ کا حادثہ وفات پیش آیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وفات کی خبر سن کر راقم پر گہرا اثر ہوا، چنانچہ اس موقع پر راقم کے قلم سے لکھے ہوئے چند تعزیتی کلمات اخبارات وسوشل میڈیا پر شائع ہوئے، وہ یہاں نقل کئے جارہے ہیں:

’’ابھی چند منٹ پہلے نماز مغرب کے بعد امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین

صاحبؒ کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب علیہ الرحمۃ نہ صرف امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری تھے، بلکہ وہ اس ملک کے ایک بڑے عالم، فقہ اسلامی کے ماہر اور داعی الی اللہ تھے، انہوں نے پوری زندگی علم ودین کی خدمت میں صرف کردی، اور نہایت احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنی تمام ذمہ داریاں انجام دیتے رہے، اور اہل علم وعمل کے لئے ایک مثالی زندگی کا تحفہ دے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

وہ دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور دیگر بہت سے علمی اور دینی اداروں کے رکن رکین تھے، اور اپنے علم واخلاص اور اپنے اخلاق عالیہ اور عمل پیہم سے سب کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچا کر اپنے رب کریم سے جا ملے، ان لله ما أخذ وله ما أعطى ، وكل شيئ عنده الى أجل مسمى۔ اللہ تعالیٰ مرحوم عالی قدر کی مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس کے اعلیٰ ترین مقام میں جگہ عطا فرمائیں، اور اعلیٰ علیین میں شمار فرمائیں۔ يأيتها النفس المطمئنة ارجعي الى ربك راضية مرضية ، فادخلى فى عبادى وادخلى جنتى" ۳؍محرم ۱۴۳۷ھ؁ ۱۷؍اکتوبر ۲۰۱۵ء؁۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی وسیع مسجد میں جو پوری طرح طلبہ اور اساتذہ سے بھری ہوئی تھی، بعد نماز مغرب ایک تعزیتی جلسہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) کی صدارت میں منعقد ہوا، مولانا نے اپنے خطاب میں کہا: مولانا سید نظام الدین بڑی صلاحیتوں کے حامل تھے، وہ ایک طرف دار العلوم دیوبند کے عالم وفاضل تھے، تو دوسری طرف مسلمانوں کے مسائل سے خوب واقف تھے، وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری ہونے کے ساتھ امارت شرعیہ کے بھی امیر تھے، دونوں اداروں کی ذمہ داریوں کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے، مولانا ایک دور اندیش، فہیم، بردبار اور علمی لحاظ سے پختہ صلاحیت کے مالک تھے، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے تربیت یافتہ تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات

کے بعد بورڈ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ میں نے خود ان کے مشوروں سے بہت فائدہ اٹھایا، ملت اسلامیہ کے متحدہ پلیٹ فارم کو حکمت وبصیرت کے ساتھ آگے بڑھایا۔

راقم نے اس موقع پر کہا: مولانا سید نظام الدین مؤمن کامل کا مکمل نمونہ تھے، انہوں نے قابل رشک زندگی گذاری، ان کی شخصیت ہر طبقہ میں مقبول تھی، ان کی مقبولیت کا نمایاں اثر ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی حیات اور کارناموں پر کتابیں منظر عام پر آئیں ، مولانا نظام الدین اپنے کارناموں کی وجہ سے زندۂ جاوید ہیں، مولانا ایک عظیم داعی، فقہ اسلامی کے ماہر اور زبردست عالم تھے، انہوں نے اپنی پوری زندگی علم ودین کی خدمت میں صرف کردی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنی تمام ذمہ داریوں کو ادا کرتے رہے، اور اہل علم کے لئے ایک مثالی زندگی کا تحفہ دے کر رخصت ہوئے۔

امیر شریعت سادس کی وفات کے بعد امیر شریعت سابع حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحب کا ارریہ کے دار العلوم زیرو مائل میں علمائے کرام اور عامۃ المسلمین کے عظیم مجمع میں باتفاق رائے انتخاب ہوا، اور وہ امیر شریعت کی حیثیت سے امارت کے مقاصد کے مطابق عمل پیرا ہیں، فالحمد للہ علی ذلک۔

فضیلۃ الحاج الحافظ محمد اقبالؒ

اللہ کے جوار میں

صوبہ اتر پردیش کے شہر گونڈہ میں مدرسہ فرقانیہ کے مہتمم اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ تحفیظ القرآن کے سرپرست الحاج حافظ محمد اقبال صاحبؒ نے پیر میں فالج کے اثر سے جو ایک لمبی مدت تک قائم رہا کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا، مرحوم کافی دنوں سے علیل تھے اور وہیل چیئر کے سہارے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے تھے ۳۰/جولائی ۲۰۰۸ مطابق ۲۶/رجب ۱۴۲۹ھ کو اپنی عمر کے ۹۷/سال مکمل کر کے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نہایت کشادہ قلب، نیک مزاج اور نرم خو تھے، قرآن کریم کے مانے جانے حافظ اور لائق افتخار مدرسین میں آپ کا شمار ہوتا تھا اور اس تعلق سے ملک و بیرون ملک میں آپ کو بڑی شہرت حاصل تھی، ہندوستان کے علاوہ ایشیاء، افریقہ، برطانیہ کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

آپ کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ ہی کی کوششوں کے نتیجہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ ''تحفیظ القرآن'' کا قیام عمل میں آیا اور آپ کی محنتوں طلبہ و مدرسین کے ساتھ اخلاص وتقویٰ اور پرہیزگاری، تلاوت کلام اللہ، نماز کے اوقات کی پابندی، نوافل اور تہجد میں قرآن کریم کی تلاوت کے نتیجہ میں اس شعبہ نے خوب سے خوب ترقی کی اور آپ خود بھی اخلاص وتقویٰ کے بلند مقام پر فائز تھے، اور نہایت سادگی وقناعت پسندی کی زندگی

گزارتے اور اس پر بڑے شکر گزار رہتے تھے، الحمد للہ، اللہ رب العزت نے آپ کو ایسی دینی خصوصیات سے نوازا تھا جس کی نظیر آج ہمارے معاشرہ میں کم ہی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا یہ شعبہ بڑے بڑے مدارس اسلامیہ کے لئے ایک نمونہ اور تعلیم وتربیت کے میدان میں ممتاز نظر آتا ہے۔

مرحوم نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۲۰ ؍سال پر مشتمل ایک خوشگوار عرصہ گزارنے اور حفاظ قراء کی ایک بڑی کھیپ تیار کرنے کے بعد حالات کی مجبوری کی وجہ سے اس شعبہ کی ذمہ داری اپنے ممتاز شاگردوں کے سپر کردی اور خود مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے ذمہ داروں کے اصرار پر وہاں جاکر منصب اہتمام کو رونق بخشی الحمد اللہ آپ کے دور اہتمام میں وہاں بھی خوب ترقی ہوئی اور مدرسہ نے بڑی شہرت حاصل کی۔

حافظ صاحبؒ صلاح وتقویٰ ذمہ داری کا احساس، اور اس کو سنجیدگی وامانت داری سے انجام دینے کے معاملے میں اپنی مثال آپ تھے، آپ ہر معاملہ میں ثواب کی امید رکھتے ہوئے اللہ کی جانب رجوع کرتے تھے آپ صحیح معنوں میں آیت کریمہ (ومن اوفیٰ بما عاهد عليه الله فسيؤتيه اجرا عظيما) کے مصداق تھے۔ اللہ رب العزت آپ کو غریق رحمت کرے اور اآپ کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں بہترین نعمتوں سے آپ کا اکرام اور اہل وعیال کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے (واللہ ولی المتقین)

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب درس میں حفظ قرآن کا الگ سے ایک شعبہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا تاکہ اس کے ذریعہ طلبہ کے لئے تجوید وقرأت کی خوبیوں سے آراستہ ہونے کا موقع فراہم ہو، اگرچہ طلبہ کے لئے تجوید وقرأت کی تعلیم کا انتظام موجود تھا، لیکن جب طلباء کی تعداد زیادہ ہوئی اور تحفیظ القرآن کا شعبہ قائم کرنے کا خیال پختہ ہوا تو سب سے پہلے اس سلسلے میں حضرت مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ نے ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے اس شعبہ کو کھولنے کی تجویز پیش کی، اور حضرت مولانا نے اس سے اتفاق فرمایا۔

لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس شعبے کی اہمیت کے لحاظ سے اس کی ذمہ داری

ایسے جید حافظ قرآن کو سونپی جائے، جو نہ صرف اس شعبہ کی ذمہ داری قبول کریں، بلکہ اپنے تقویٰ و پاکیزگی میں وہ ایک مثالی شان کے مالک ہوں، اور قرآن کریم کی عظمت کے لحاظ سے ان کی قرآنی زندگی سے عملی طور پر طلبہ مستفید ہوسکیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا علی میاں صاحب کے رفیق محترم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے حافظ محمد اقبال صاحب کی طرف رہنمائی فرمائی، جو گونڈہ کے مدرسہ فرقانیہ میں شعبۂ حفظ کو انتہائی کامیابی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ چلا رہے تھے، چنانچہ حافظ محمد اقبال صاحب سے گفتگو کے بعد ان کو شعبۂ حفظ کے بنیادی ذمہ دار کی حیثیت سے یہاں آنے کی راہ ہموار ہوئی، اور یہ شعبہ نہایت کامیاب ثابت ہوا، ان کے کئی اہم ترین شاگرد اسی شعبہ میں استاذ کی حیثیت سے مقرر ہوئے، اور پورے ملک میں اس شعبۂ حفظ کا شہرہ عام ہوا۔

حافظ صاحب نے بیس سال تک یہ عظیم خدمت انجام دی، اس دوران انہوں نے حفاظ وقراء کو صحیح نہج پر چلایا، جس کے نتائج بہتر سے بہتر ظاہر ہوئے، حافظ صاحب مرحوم کے مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں دوبارہ واپسی کے بعد اس شعبہ کو ان کے قابل قدر شاگردوں نے جاری رکھا، اور بڑی حد تک ان کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، الحمد للہ آج بھی یہ شعبہ قابل اساتذہ کی سرپرستی اور نگرانی میں جاری ہے، اور اس کی بہت سی شاخیں ملحقہ مدارس میں موجود ہیں، جہاں اسی نہج پر حفظ وقرأت کی تعلیم ہوتی ہے، اور طلبائے علوم اسلامیہ اس سے مستفید ہوکر دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کرتے ہیں۔

حافظ صاحبؒ کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے خوب برکت عطا فرمائی، اور وہ تاحیات قرآن کریم کی یہ خدمت انجام دیتے رہے، اور حفظ وقرأت کے مدارس اور اس کے اساتذہ کے لئے ایک حافظ باعمل، ایک متقی و پرہیزگار مربی اور خادم قرآن کا نمونہ چھوڑ کر رحلت کر گئے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں، اور ان کی مخلصانہ خدمات کے عوض میں جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں ان کو جگہ عطا فرمائیں۔ یـأیتها النفس المطمئنة، ارجعي الى ربك راضية مرضية، فادخلي في عبادي وادخلي جنتي۔

مولانا حبیب الرحمٰن ندویؒ

کچھ باتیں، کچھ یادیں

سنہ ہجری کے لحاظ سے ۶۴/سال سے بھی پہلے کی بات ہے، ہمارے مخلص دوست مولانا حبیب الرحمٰن ندوی (مئوی) دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالمیت کا آخری سال مکمل کر رہے تھے، وہ عالمیت کا آخری امتحان پاس کر کے وطن واپس ہوئے تھے اور میں شعبہ تخصص میں داخلہ لینے کے لئے پہلی بار ندوہ میں حاضر ہوا تھا، وہ سنہ عیسوی کے لحاظ سے ۱۹۵۱ء میں عالمیت سے فارغ ہوئے تھے، ان سے میری پہلی ملاقات جامعہ مفتاح العلوم مئو میں ندوہ میں داخلہ لینے سے بہت پہلے ہوئی تھی، اسی وقت ان سے باقاعدہ تعارف ہوا تھا، ندوہ جانے سے قبل انھوں نے مئو کے مشہور اور قدیم ادارہ ''دارالعلوم'' میں تعلیم حاصل کی تھی، اور وہاں کے ممتاز اور ذہین طلبہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، یوں تو میرے ان کے تعلقات پہلے سے تھے، مگر ندوہ کی طالب علمی کے دور میں جب میں پہلی بار عبدالاضحیٰ کی تعطیل میں وطن گیا اور ان سے ملاقات ہوئی تو اس ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہوئے، ندوہ کی نسبت سے اس تعلق میں برابر مضبوطی اور وسعت پیدا ہوتی گئی اور ہمارے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے، یہ زمانہ انتہائی نشاط اور علم وادب کے میدان میں ذوق وشوق کے ساتھ آگے بڑھنے اور ترقی کی فکر میں انہماک پیدا کرنے کا دور تھا، ہم لوگ بالمشافہ اور بالمراسلہ بہت سے علمی اور ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے، اور رسائل واخبارات میں مضامین لکھنے کی مشق شروع کردی تھی، ندوی صاحب کے مضامین ''الجمعیۃ''

اخبار اور ''تجلی'' وغیرہ رسالوں میں چھپنے لگے تھے ان کے قلم میں بلا کی روانی اور خیالات میں شادابی اور ان کو نہایت ہی مؤثر انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت بھرپور تھی، ندوہ کے زمانہ قیام میں انھوں نے انجمن الاصلاح سے خوب جی بھر کر فائدہ اٹھایا، یہاں کی علمی وادبی فضاؤں، روایات، اور عظیم الشان کتب خانہ سے فیض اٹھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اور ماحول کی پاکیزگی اس کی وجاہت اور علمی وقار کا بھی ان کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا کردار تھا۔

وہ اگرچہ حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر عالمیت کی سند لے کر مئو واپس ہو گئے، لیکن ان کے ذہن و دماغ پر برابر ندوے کی پر کیف علمی مجالس اور تعلیم و تربیت کے اچھوتے انداز کا اثر اور ایک نئے تربیتی نقطۂ نظر کا عملی تجربہ کچھ اس طرح طاری تھا کہ وہ ایک منٹ کے لئے بھی اس فضاء سے الگ نہیں ہو سکتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنا تاریخی و علمی مطالعہ بڑے انہماک کے ساتھ جاری رکھنے پر قابو پا چکے تھے، وہ تجارتی سرگرمیوں میں دن کے ایک حصہ میں مشغول رہ کر راتوں کو کتب بینی اور مضمون نگاری میں بڑا وقت لگاتے تھے، ندوہ سے برابر تعلق رکھتے اور وہاں کی علمی، تصنیفی، تعلیمی سرگرمیوں کو معلوم کرتے رہتے تھے، جب بھی کوئی نئی کتاب شائع ہوتی بلا تاخیر اس کو منگواتے تھے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی دامت برکاتہم کی تصنیفات کے تو وہ عاشق تھے، اور ان کو حاصل کرنے میں سبقت کرتے تھے۔

۱۹۶۳ء میں جب ''تعمیر حیات'' منظر عام پر آیا اور اس کی ادارت کی ذمہ داری ہمارے مخلص دوست مرحوم مولانا سید محمد الحسنی صاحب اور مجھ کو سونپی گئی تو سب سے پہلے وہ اس کے خریدار بنے اور دل کی گہرائیوں سے اس ادبی اور صحافتی رسالے کے اجراء پر مبارکباد دی، اور بالآخر وہ تعمیر حیات کے مستقل مضمون نگار بن گئے۔ خطبات نبوی کے موضوع پر انھوں نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں ایسے مضامین لکھے جو ہر حلقے میں بہت پسند کئے گئے، اس کے لئے انھوں نے سیرت اور تاریخ اسلامی کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں اور خطبات کے الفاظ کو صحیح سند اور روایت سے پیش کر کے ہر خطبہ پر ایک دلکش، مؤثر اور تربیتی مضمون لکھا، یہاں تک کہ وہ

ایک مستقل کتاب کا موضوع بن گیا، اور سیرت کے موضوع پر ایک وقیع مواد جمع ہو گیا، اسی زمانے میں وہ میری حقیر دعوت پر کئی بار لکھنؤ آئے، اور ندوہ میں اپنے عہد رفتہ کی تجدید کر کے گئے ان کی ملاقات اس عہد کے اساتذہ کرام اور اہل تعلق سے بھی ہوئی، حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں بارہا حاضر ہو کر مستفید ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں حضرت مولانا سے مضامین قرآن کا درس لیا تھا، اور ان کی دعوتی اور تربیتی فکر سے فیض حاصل کر چکے تھے اور اس کی روشنی میں وہ اپنا علمی سفر جاری رکھنے پر پوری طرح تیار تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۳ء میں جب صوبائی جمعیۃ علماء ہند کی ایک کانفرس ان کے آبائی گاؤں جو مئو سے ۷رکیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے منعقد ہونے کا فیصلہ ہوا تو وہ اس کے علمی اور انتظامی امور کے ذمہ دار قرار پائے ان کے ساتھ اس موضع کے اور بھی بہت سے علماء کانفرس کو کامیاب بنانے میں پوری طرح مشغول تھے۔

ندوی صاحب نے اس سلسلہ میں مجھ سے ایک مضمون کی فرمائش کی تھی اور وہ ''الجمعیۃ'' اخبار میں شائع ہوا تھا۔ ان کا انداز نگارش اور معروضی اسلوب قارئین کے سامنے ایک پختہ کار اور بلند کردار ادیب کی خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے، ان کے ابتدائی دور کی تحریر کے چند مختصر نمونے اس موقع پر پیش کرنا مناسب ہوتا ہے، وہ ''مدینہ منورہ میں حق کی پہلی آواز'' کے موضوع کو کچھ اس طرح شروع کرتے ہیں۔

''تہذیب وشائستگی کی ہزاروں منزلیں طے کرنے کے باوجود دنیا امن وسکون کی دولت سے محروم ہے۔ آدمی کو آدمی پر بھروسہ نہیں، ایک قوم دوسری قوم کی دشمن ہے، اور ایک ملک دوسرے ملک کا، ذرا اس وقت کا تصور کیجئے جب انسان تہذیب وتمدن سے دور خاندان اور قبیلے کی مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا، خصوصا دنیا کے اس خطے کے لوگوں کی حالت تو انتہائی ناگفتہ بہ رہی ہوگی جہاں قتل وغارت کو صرف ذریعہ معاش ہی نہیں بلکہ ایک قابل فخر کارنامے کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ ٹھیک ایسے ہی ماحول اور ایسے ہی وقت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا

آبائی وطن مکہ معظّمہ چھوڑنا پڑا، اپنا خاندان اور اپنی جان پہچان کے لوگوں سے دور مدینہ منورہ آپؐ تشریف لے گئے، جہاں چند آفت زدہ مہاجرین اور چند اور دوسرے لوگوں کے سوا اور کوئی آپؐ کا شناسا بھی نہ رہا اور نہ پاس میں زرودولت تھی کہ اسی کے سہارے کچھ دن آرام واطمینان کی زندگی بسر ہوسکتی، مکہ سے آپؐ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں کسی طرح یہاں پہونچتے ہیں، مگر آتے ہیں تو نہ اپنی مالی حالت کے استحکام کی فکر کرتے ہیں نہ سیاسی پوزیشن کے مضبوط کرنے کی، آتے ہیں اور بے جھجک لوگوں کے سامنے دعوت اسلامی کا وہی پیغام پیش کردیتے ہیں جس کی بدولت آپؐ کو اپنے گھر اور اپنے شہر سے نکلنا پڑا ہے''۔

اسی طرح مساجد کی عظمت اور ان کے آداب وحقوق پر اپنے ایمان افروز بیان کو قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''اسلامی معاشرے میں اگر کسی چیز کو دھڑکتے دل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو وہ صرف مسجد ہے، جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔ أحب البلاد الی اللہ مساجدھا'' (شہر اور آبادیوں میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ان کی مسجدیں ہیں) مسجدیں جو نماز جیسی اہم عبادت کا مرکزی مقام اور دینی زندگی کی تشکیل اور تنظیم کا ایک اہم مرکز۔ ان کے بنانے والوں کو یہ مژدہ بھی سنایا گیا۔'' من بنی للہ مسجدابنی اللہ له بیتافی الجنة (بخاری ومسلم) (جو شخص اللہ کے لئے کوئی گھر بنواتا ہے اللہ کی طرف سے بھی اس کے لئے جنت میں گھر بنوایا جاتا ہے) مگر جب کہ خود حدیث کے الفاظ بتارہے ہیں یہ بشارت صرف انھیں لوگوں کے لئے ہے جو صرف اللہ کے لئے مسجد بنوائیں، ایک مسجد تو وہ بھی تھی جس کے متعلق خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ:

لاتقم فیه ابدا (توبہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسجد میں کبھی کھڑے نہ ہوں، آپ نے اگر اسلامی تاریخ کا کوئی معمولی مطالعہ بھی کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ مسجد تھی'' مسجد ضرار''، جس کی خود قرآن نے یہ تشریح کی ہے'' والذین اتخذوا مسجداً ضرارا

وکفرا وتفریقا بین المؤمنین" (سورۂ توبہ)(جن لوگوں نے مسجد ضرار اس مقصد کے لئے بنائی ہے کہ اس کے ذریعہ اسلام کو نقصان پہنچائیں اور اس میں بیٹھ کر کفر کی باتیں کریں اور مؤمنین میں تفریق ڈالیں)"

اسلامی نظام حکومت کی خصوصیات اس کا بنیادی کردار اور اس کی عظمت واہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"اعلیٰ درجہ کے کامل انسان جن کی انسانیت انتہائی عروج کمال تک پہنچ چکی ہو وہ معاشرے کی خرابیوں کو اپنے کردار واخلاق سے بدل دیتے ہیں پھر اس بدلی ہوئی اجتماعی زندگی اور اعلیٰ نظام حیات میں ماحول کے اثر سے خود بخود اچھے انسان پیدا ہونے لگتے ہیں:

اس نقطۂ نگاہ سے تاریخ کا یہ کس قدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عرب کے بے آب وگیاہ سرزمین سے ایک انسان اٹھتا ہے، جس کے پاس نہ سرمایہ ہے نہ اقتدار ہے، نہ سلطنت ومملکت نہ کالج ویونیورسٹی کی کوئی ڈگری، ماں باپ کا سایۂ عاطفت بھی میسر نہیں، کوئی استاذ کوئی معلم نہیں، بیگانوں کا ذکر کیا! اپنے بھی بیگانے بن گئے، دوست دشمن ہوگئے، قبیلہ، شہر، قوم، ملک سارا عالم مخالفت پر آمادہ لیکن ان میں سے کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر دنیا کے سامنے اپنا حیات بخش پیغام پیش کرتا رہا، ظلم وستم کی ماری ہوئی دنیا کو عدل وانصاف، امن ورواداری کی دولت سے مالا مال کرتا رہا، یہاں تک کہ ظلم وجبر کی تمام صورتوں کو اپنی مختصر سی زندگی میں اپنی سرزمین سے نیست ونابود کر دیتا ہے، عرب کی ننگ انسانیت قوم کو انسانیت کا مبلغ بد خلقوں کو اخلاق کا معلم بنا دیتا ہے، جس قوم نے کبھی معمولی تنظیم سے آگے قدم نہیں بڑھایا تھا، اس کو ایک ایسی مضبوط آرگنائزیشن کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے کہ قیصر وکسریٰ کی عظیم الشان شہنشاہتیں ٹکرا کر پاش پاش ہوگئیں، یہیں تک نہیں سیاست ومعیشت اور تنظیم ملک کا وہ ایسا عملی خاکہ بھی دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جو آج بھی اپنی جامعیت کے اعتبار سے نہ صرف قابل عمل بلکہ امن وخوشی اور صلاح وفلاح کا واحد راستہ ہے"۔

۱۹۶۵ء میں علامہ شبلی کے قائم کردہ عظیم تحقیقی اور علمی ادارہ دارالمصنفین شبلی منزل اعظم گڑھ کی سلور جبلی منانے کا فیصلہ ہوا، پچاس سالہ جشن کے اس موقع پر ہندوستان کے کونے کونے سے علم وادب کے شیدائیوں نے اس عظیم الشان علمی مرکز کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور اس تقریب کے منعقد کرنے پر دلی مبارکباد دی۔ مولانا حبیب الرحمٰن ندوی مرحوم نے بھی اپنے خاص علمی اور تاریخی انداز میں جشن کے موقع پر مضمون لکھا، انھوں نے اپنے اس مضمون کی ابتداء ان الفاظ سے کی۔

''بڑے لوگ اپنے پیچھے جائداد اور مال ودولت کے انبار چھوڑ جاتے ہیں لیکن قابل صد مبارکباد ہیں علامہ شبلی نعمانی جنھوں نے اپنے ترکہ میں اپنی بیش بہا تصنیفات کے علاوہ چند نادرۂ روزگار علمی شخصیتیں اور دارالمصنفین جیسا تصنیفی اور تحقیقی ادارہ بھی چھوڑا، جو اپنے بلند پایہ علمی کارناموں کی بدولت ہمیشہ دنیا سے خراج تحسین حاصل کرتا رہے گا''۔

علامہ شبلیؒ پچھلی صدی کے متبحر عالم، مؤرخ، محدث اور ادیب تھے، انھوں نے تحقیق وتصنیف کی نئی راہیں کھولیں، جس کے لئے آج بھی آپ کی جلیل القدر تصنیفات زبان حال سے شہادت دے رہی ہیں، دارالمصنفین آپ ہی کی ژرف نگاہی کا نتیجہ ہے، دارالمصنفین کی تاسیس اور اس کی ضرورت کا خیال سب سے پہلی بار آپ کو کتب خانہ ندوۃ العلماء کے ضمن میں ۱۹۱۰ء میں ہوا۔

اس جشن کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کا وفد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی قیادت میں اعظم گڑھ حاضر ہوا، وہاں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم حکومت یوپی کے وزیر اعلیٰ اور بہت سے وزراء، ممالک اسلامیہ کے سفراء کرام اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرس، پروفیسرس اور ملک کے مشہور اہل علم وادب تشریف فرما تھے، لیکن ندوے کے وفد اور ندوی حضرات کی شرکت بالکل اپنے گھر میں کسی عظیم تقریب میں شرکت کی طرح تھی، حضرت مولانا علی میاں صاحب نہ صرف ندوہ کے سالار قافلہ تھے

بلکہ وہی دراصل اس جشن کے میزبان تھے، صدر جمہوریہ سے ان کے دوستانہ اور مخلصانہ روابط نے ان کی شخصیت کو اس جشن میں اور زیادہ نمایاں کردیا تھا۔

اس نادر موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن ندوی اپنے دوستوں کا ایک وفد لے کر حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے ملے، اس وفد میں ان کے قریبی اور قدیم دوست مولانا اسیر ادروی، مولانا محمد صاحب اور مدرسہ دارالسلام ادری کے بعض ذمہ دار حضرات بھی تھے، راقم الحروف نے ان حضرات کا تعارف کرایا، وفد کے ارکان نے حضرت مولاناؒ کو جشن کے اختتام پر مدرسہ دارالسلام (ادری) میں تشریف آوری کی دعوت دی، ناچیز نے سفارش کی اور حضرت مولانا نے منظور فرمالی۔

جشن ختم ہونے کے دوسرے دن حضرت مولانا کی سربراہی میں ندوی قافلہ موضع ادری کی طرف روانہ ہوا، اگرچہ روانگی کار کے ذریعہ ہوئی تھی مگر موضع کے اندر مدرسہ تک جانے کے لئے سڑک سے اتر کر پکڈنڈیوں پر کم از کم ایک کیلومیٹر پیدل چل کر گاؤں میں پہونچنا ہوتا تھا، حضرت مولانا اور قافلہ کے سبھی افراد گاڑی سے اتر کر کھیتوں کی مینڈھوں پر پیدل چل پڑے اور چند ہی منٹ میں مدرسہ کے حدود میں قدوم میمنت لزوم ہوا، طلبہ اور اساتذہ نے خوش آمدید کہا، داعیوں کے حوصلے نہایت بلند تھے، قیام کا بہتر سے بہتر انتظام، سب سے پہلے کچھ آرام کے بعد پرتکلف کھانے کا دسترخوان بچھا، ندوی صاحب اور دیگر میزبان خوش تھے کہ ان کو آج کس ہستی کی میزبانی کا شرف ان کے اس مدرسہ میں حاصل ہورہا ہے، حضرت مولانا دامت برکاتہم بھی اس دورہ سے بہت منشرح تھے، عصر کے بعد مدرسہ میں طلباء واساتذہ اور گاؤں کے اہل دانش حضرات کا ایک جلسہ منعقد ہوا، حضرت مولانا کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا، حضرت مولانا کا بیان ہوا اور مغرب تک جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔

مغرب کی نماز کے بعد واپسی طے تھی، واپسی میں ٹرین کا سفر اختیار کیا گیا، حضرت مولانا اور ارکان وفد نے گاؤں سے اسٹیشن تک پیدل جانا پسند کیا، یہ راستہ بھی اچھا خاصا

طویل ہے لیکن نہایت خوشی کے ساتھ سبھی حضرات چہل قدمی کرتے ہوئے اسٹیشن وارد ہوئے، تھوڑی ہی دیر میں ٹرین آگئی، اور مئو تک کا سفر دس منٹ میں پورا ہوگیا، اس اثنا میں حضرت مولانا میزبان حضرات سے بہت بے تکلفی میں باتیں کرتے رہے، ان کو ندوہ اور رائے بریلی آنے کی دعوت دی اور اس سفر سے اپنی خوشی کا اظہار فرمایا، اس سفر میں ندوی صاحب اور مولانا اسیر صاحب، مولانا محمد صاحب حضرت مولانا سے بہت قریب ہوئے اور اس کے بعد کئی بار مولانا ندوی اور مولانا اسیر صاحب نے لکھنو کا سفر صرف حضرت مولانا دامت برکاتہم سے ملنے اور ان سے استفادہ کے لئے کیا، حضرت مولانا ان سے مل کر ہمیشہ بہت خوش ہوئے۔

کاروباری مشاغل میں انہماک کے باوجود انھیں ہر وقت یہ خیال رہتا کہ جون ہی ان پر حج فرض ہوجائے وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے حرمین شریفین کا قصد کریں، اس سلسلہ میں برابر مشورے کرتے اور وہاں کے حالات حج وعمرہ کے مسائل منیٰ وعرفات کے حالات حج کے سلسلہ میں معلم کا انتخاب اور وہاں کے قیام سے زیادہ سے زیادہ روحانی فوائد حاصل کرنے کے وسائل کا پتہ چلاتے رہتے تھے، راقم الحروف سے انھوں نے اس سلسلہ میں بارہا مشورے کئے، وہاں قیام کے سلسلے میں جو مناسب صورتیں ہوسکتی تھیں وہ ان کو بتانے کا موقع ملا۔ خاص طور سے حج کے زمانے میں جو بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے اور اس میں قافلہ کے ساتھیوں کے ساتھ جو ناخوشگوار حالات کبھی کبھی پیش آتے رہتے ہیں ان سب باتوں کا ذکر آیا، اور طے یہ پایا کہ مکہ مکرمہ میں قیام کے لئے دونوں میاں بیوی ایک الگ کمرہ لے کر رہیں خواہ اس میں مصارف کچھ زیادہ ہوجائیں لیکن یہی صورت حال ہر طرح مناسب ہے، چنانچہ مولانا ندوی نے اس مشورہ پر عمل کیا اور بعد میں اس کی افادیت اور اس کی وجہ سے جو اطمینان قلب حاصل ہوا اس کا ہمیشہ ذکر کرتے رہتے تھے۔

وہ دسمبر ۱۹۷۸ء میں مع اہلیہ کے سفر حج پر روانہ ہوئے، اور بخیر وخوبی مناسک حج

ادا کرنے کی سعادت حاصل کی، وہاں کے قیام سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع ملا، مدینہ منورہ میں بھی دس دن سے زیادہ قیام رہا، اور وہاں کی برکتوں سے بھرپور بہرہ اندوز ہونے کی کوشش کی، واپسی فروری کے پہلے عشرہ میں ہونا طے تھی اس لئے راقم الحروف نے حج کی مبارکباد کا خط اسی حساب سے مئو کے پتے پر لکھا، اتفاق سے ندوی صاحب کی واپسی اور خط پہونچنے کی تاریخ ایک ہی تھی اس لئے مبارکباد دینے میں سبقت کرنے پر ان کو بہت خوشی ہوئی، اورانھوں نے فوراً ہی مندرجہ ذیل جواب لکھا۔

مئو ۱۳ر فروری ۱۹۷۵ء

مکرمی ومحترمی مولانا سعید الرحمٰن صاحب زاد حبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

اللہ کا شکر ہے سفر خیر وعافیت کے ساتھ تمام ہوا، اور گھر آنے پر جہاں اورلوگوں سے مل کر خوشی ہوئی، وہیں آپ کا خط پا کر دہری خوشی حاصل ہوئی، اورایسا محسوس ہوا کہ آپ سے بھی ملاقات ہوگئی، آپ نے بروقت مبارکباد دی اس کی وجہ سے جو خوشی ہوئی اس کو بیان کرنے سے قلم عاجز ہے، آپ نے ایک ہی حج پر اتنے سارے القاب وآداب سے نواز دیا، اگر کوئی کئی عدد حج کر چکا ہو تو اس کے لئے القاب وآداب کہاں سے پیش کئے جا سکتے ہیں اوراس کے لئے کس لغت میں الفاظ ڈھونڈنے کی ضرورت پڑے گی! لکھنؤ میں اگر اس طرح کے کتب خانے موجود ہوں تو استفادہ کے لئے مجھے آنا پڑے گا، سردست تو اتنے لمبے سفر کے بعد لکھنو کا سفر کرنا مشکل ہے اس لئے بہتر ہے کہ آپ خود لکھنؤ سے یہاں آنے کا پروگرام بنائیں۔ تاکہ قریب سے آپ کی دعا حاصل ہو۔ آب زمزم اورمدینہ طیبہ کی کھجوروں کا تبرک آپ کے لئے رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ مئو نہ آسکے تو میں ہی خود اسے لے کر لکھنو آؤں گا انشاء اللہ، اس طرح آپ سے اورمولانا اسیر صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی (مولانا اسیر صاحب ان دنوں

لکھنو میں جمیعۃ علماء ہند کے دفتر میں مقیم تھے۔)

انشاء اللہ تفصیل سے گفتگو پھر ہوگی۔ سردست صرف یہ دعا ہے کہ آپ ہر طرح اچھے ہوں، گھر میں سب خیریت ہو، مولانا حسنی صاحب (مولانا سید محمد الحسنی صاحب مرحوم مدیر البعث الاسلامی) اور تمام جاننے والے حضرات کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے خصوصاً مولانا اسیر صاحب اگر ملاقات ہو جائے تو میرا سلام ضرور پہونچادیں۔

والسلام

حبیب الرحمٰن ندوی

ہٹی مداری مئو

مولانا ندوی سے برابر مراسلت قائم رہی جس کی مدت تقریباً ۴۸ رسال ہے اگر یہ مراسلت جمع کردی جائے تو مکتوبات کی ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے، مگر افسوس کہ تمام خطوط کی حفاظت نہ ہو سکی ورنہ اس مختصر سے مضمون میں مزید خطوط پیش کرنے کا موقع ملتا جو خطوط ڈھونڈنے پر مل جائیں گے ان کو کسی اور مناسبت سے شائع کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کا یہ پہلا بیرون ملک کا سفر تھا، اس کے بعد وہ پھر کئی بار بلاد عربیہ کے سفر پر روانہ ہوئے، حج بھی دو بار کیا اور عمرہ کی سعادت بھی بارہا حاصل ہوئی، ان کو شرح صدر تھا کہ اس ملک میں خاص طور سے ایمان واسلام کی حفاظت کے لئے علوم اسلامیہ کی نشر واشاعت بہت ضروری ہے، اس یقین کو انھوں نے اپنے آبائی گاؤں ادری میں مدرسہ قاسمیہ قائم کر کے عملی جامہ پہنایا، اور برابر اس کی ترقی وتوسیع اور اس کی افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کی فکر میں مشغول رہے یہاں تک کہ یہ مدرسہ جامعہ کی شکل اختیار کر گیا، اور وہ آج ندوی صاحب کی یقین محکم اور عمل پیہم کی داستاں سنا رہا ہے، یہی یقین ان کو قصبہ بہادر گنج ضلع غازی پور کے قدیم مدرسہ ''مدرسۃ المساکین'' کی سرپرستی قبول کرنے اور اس کے لئے اپنی توانائی صرف کرنے پر آمادہ کر سکا، وہ ان دونوں مدرسوں کی بڑی فکر رکھتے تھے ان کے مالیاتی نظام کو

مضبوط بنانے کے لئے دورے بھی کیے، کئی بار ممالک عربیہ کا دورہ بھی کیا اور ان مدارس کی افادیت کی طرف اہل علم وثروت کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئے، ندوۃ العلماء کی تعلیمی اور دعوتی وتصنیفی سرگرمیوں سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے، برابر رابطہ رکھ کر معلومات حاصل کرتے رہتے تھے بلکہ نہایت فخر کے ساتھ ان کو بیان بھی کرتے تھے، حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم کی تصنیفات کے شیدائی تھے اور جو کتاب بھی شائع ہوتی فوراً اسے خریدتے تھے اور اپنے ذاتی کتب خانہ کو اس سے مزین کرتے تھے۔

انھوں نے کئی کتابیں اپنی تصنیفات میں چھوڑی ہیں، اس وقت وہ علماء مئو کی تاریخ پر کام کر رہے تھے اور اس کا بڑا حصہ لکھ چکے تھے، امید کہ یہ کتاب بھی زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئے گی۔

ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کے قیام پر انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا، اور مبارکباد دی، ان کو اس کا ممبر بھی بنایا گیا، اور وہ اس کے سیمیناروں میں شرکت کرتے تھے، اور نہایت اچھے تاثرات کا اظہار کرتے تھے، رابطہ کے ادبی مجلّہ ''کاروان ادب'' کی خریداری قبول کی، اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دلاتے تھے، ''تعمیر حیات'' کے نہ صرف مضمون نگار تھے بلکہ اس کے سچے داعی اور ثنا خواں تھے، اور ہمیشہ ڈاک میں پرچے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اکثر ڈاک خانے سے ان کا پرچہ غائب بھی ہوجاتا تھا اس پر وہ بہت رنجیدہ ہوئے اور خط لکھ کر دوبارہ طلب کرتے تھے، ندوہ سے شائع ہونے والے عربی پرچے ''البعث الاسلامی'' اور ''الرائد'' کو بھی بڑے شوق سے منگواتے اور مطالعہ کرتے تھے اور اس کی فائل بھی محفوظ رکھتے تھے۔ ندوہ کی مالی اعانت کے لئے خاص اہتمام کرتے تھے رمضان المبارک میں ندوۃ کی طرف سے جو بھی مئو جاتا وہ اس کے ساتھ ہولیتے اور اہل ثروت وتجارت سے بڑی سے بڑی مدد کرواتے تھے، خود بھی خاص رقم عطا کرتے تھے اور ہمیشہ معطیان کے حلقے کو وسیع کرنے کی فکر میں رہتے، اور اگر کسی شخص سے کم رقم ملتی تو اس کی وجہ سے فکرمند ہوتے تھے، اس دفعہ شوال

۱۴۱۹ھ میں جب ان سے ملا تو کہنے لگے کہ فلاں سیٹھ صاحب نے اس دفعہ کم رقم دی ہے، مجھے بہت فکر ہے، آپ جا کر مدرسہ کی طرف سے ان کو خط بھجوائیں تا کہ وہ بھرپور تعاون کریں۔

میری ان سے آخری ملاقات انتقال سے دو ہفتہ قبل مئو میں ان کے گھر پر ہوئی تھی، اس وقت وہ بہت اچھے تھے اور کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں معلوم ہو رہی تھی، لیکن علاج اور احتیاط کا سلسلہ جاری تھا، اس لئے کہ قلبی دورہ کی وجہ سے اس کی ضرورت تھی، ڈاکٹروں نے بائی پاس سرجری کا مشورہ دیا تھا، مگر وہ اس خطرناک آپریشن کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پا رہے تھے، میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ تو اب ایک عام بات ہوگئی ہے آپ اسے کرالیں، مگر وہ ہمت نہ کر سکے، اور بالآخر ۲۵؍شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۲؍فروری ۱۹۹۹ء جمعہ کے دن سوا دس بجے دن میں جب کہ وہ جمعہ کی نماز کی تیاریوں میں مصروف تھے، اچانک شدید قلبی دورہ پڑا جو آخری تھا، اور اسی میں انھوں نے جان جاں آفریں کے سپرد کردی اور ہمیشہ کے لئے دنیا کے علائق اور اس کی فکروں سے آزاد ہوگئے، اور اہل تعلق و پس ماندگان کو سوگوار و غمزدہ چھوڑ کر دار آخرت کی طرف روانہ ہوگئے۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کے درجات بلند فرمائیں ان کے ساتھ اپنی رحمت و مغفرت کا خاص معاملہ فرمائیں اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں (آمین) جنازہ میں زبردست ہجوم تھا اور لوگ ان کا آخری دیدار کرنے کے لئے بے تاب تھے۔

ہمارا ان سے یہ طویل تعلق محض اللہ کے واسطے تھا اس میں کبھی بھی کسی دنیاوی غرض کا شائبہ نہیں ہوا، خلوص و محبت اور بے لوث تعلقات کی اس دنیا میں اب بہت کمی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو الحب فی اللہ کے دائرہ میں شامل فرما کر ہمیں اپنے خصوصی انعام سے نوازیں اور ہماری آخرت کو ہماری دنیا سے بہت زیادہ اچھی بنائیں، اور ان کے جانشیں جناب انیس احمد کو جو ان کے بڑے بیٹے ہیں، ان کے جلائے ہوئے چراغ کو روشن رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، اور ان کے کارناموں کو زندہ رکھنے کی کوششوں کو ہر طرح کامیاب فرمائیں۔ (آمین)

مولانا ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری رحمہ اللہ

۱۰/ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء جمعہ کا دن تھا کہ اچانک جناب ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری کی وفات کی اندوہناک خبر ملی، یہ خبر اہل علم وادب کے دلوں پر بجلی بن کر گری اور پورے ملک میں رنج وغم کی ایک فضا پیدا ہوگئی، اور تعلیمی مراکز میں اس المناک حادثہ پر غم وافسوس کا اظہار ایک طبعی بات تھی، ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم خاندان کے بچوں کی طرح اپنی تعلیم کا آغاز مدرسہ سے کیا تھا، اور قرآن کریم کے حفظ کے ساتھ انہوں نے علوم اسلامیہ میں ایک ممتاز مقام پیدا کیا، مدرسوں کے ماحول سے گذرتے ہوئے اور تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے گذشتہ صدی ۱۹۶۰ء کے دہے میں مزید تعلیم ومطالعہ کے لئے جامعہ ازہر پہونچنے میں کامیاب ہوگئے، وہاں انہوں نے اپنے قیمتی اوقات کو تعلیم ومطالعہ اور مصری اساتذہ سے بھرپور استفادہ میں گذارا، اور عربی زبان وادب کے میدان میں امتیازی شان حاصل کرنے کیلئے جملہ ذرائع ووسائل کو مقصدیت کی روح کے ساتھ پیش نظر رکھا، اور اپنی بلند ہمتی سے کامیابی کی منزل تک پہونچے، اور وہاں سے واپس آکر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کیا، اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، وہ مسلم یونیورسٹی میں بھی اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں سے شعبۂ عربی کو فائدہ پہونچا سکتے تھے، لیکن ان کے نزدیک زندگی کی کامیابیوں کا معیار یہ نہیں تھا، اس لئے انہوں نے اس جانب کوئی توجہ نہیں کی، اور جامعہ سلفیہ بنارس کی خدمت کو اور وہاں رہ کر طلبہ کی تعلیم وتربیت پر توجہ دینا اپنے لئے باعث سعادت سمجھا، بلکہ واقعہ یہ کہ وہ جامعہ سلفیہ کی وساطت سے دوسرے عرب ملکوں میں بھی معروف ومشہور ہوئے، خاص طور سے سعودی عرب کی جامعات اور وہاں کے علمی مراکز میں اپنے بلند علمی مرتبے کے

لئے جانے پہچانے گئے اور وہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے پروگراموں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں مدعو کئے گئے، وہ اپنے علمی اور تحقیقی مقالات سے اور اپنے دینی بلند مرتبے سے علمائے عرب کی صفوں میں مقبول ہوئے، اور قدر واحترام کی نظر سے دیکھے گئے، وہ خاص طور سے سماحۃ العلامۃ شیخ عبدالعزیز بن باز وہاں کے دارالافتاء والشئون الاسلامیۃ کے سربراہ اور مفتی اعظم کی نظروں میں ہندوستان کے ایک بڑے سلفی عالم کی حیثیت سے متعارف ہوئے، اور وہ ان کی شفقتوں اور قدردانیوں سے پوری طرح محظوظ ہوئے، یہی وجہ تھی کہ دار الافتاء کے زیر انتظام ایام حج میں توعیہ اسلامیہ کے پروگراموں میں ان کو مدعو کیا جاتا تھا، اور اس میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے حجاج کو مناسک حج پر آگاہی کے لئے حرم شریف اور دیگر مقامات پر درس کے انتظامات کئے جاتے تھے، اس میں دیگر علماء کے ساتھ ڈاکٹر ازہری صاحب کو خاص طور سے بھیجنے کا نظم ہوتا تھا، توعیہ اسلامیہ کے مدعوئین سے عربی زبان میں حج کے آداب ومسائل پر مضامین لکھوائے جاتے تھے، اور وہاں کے عربی جرائد میں شائع ہوا کرتے تھے۔

۸۲-۸۳-۱۹۸۴ء میں مجھ خاکسار کو توعیہ اسلامیہ کی طرف سے مدعو کیا گیا، اور توعیہ کے پروگراموں میں حصہ لینے کا موقع ملا، اتفاق سے تینوں بار مجھے ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کے ساتھ قیام کرنے اور پروگراموں میں حصہ لینے کی سعادت حاصل رہی، حج کے پانچوں دنوں میں منی، مزدلفہ اور عرفات میں بھی ساتھ رہا، وہاں بھی حاجیوں کے خیموں میں جاکر تبادلۂ خیال اور حج کے مسائل وآداب کے بارے میں گفتگو کرنے کے مواقع حاصل رہے، ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ میرا بہت خیال کرتے تھے، میں عمر میں ان سے کچھ بڑا تھا، اور ندوۃ العلماء کی نمائندگی کا شرف حاصل تھا، اس لئے وہ میرے بارے میں حسن ظن رکھتے تھے، اور جب بھی ندوۃ العلماء اور اس کے روح رواں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت نظری اور فکر عالی کا ذکر آتا تو بے ساختہ اپنی محبت وتعلق کا

اظہار کرتے، البعث الاسلامی کے سلسلہ میں ان کے خیالات بہت اچھے اور قابل قدر تھے، وہ تواضعاً کہتے تھے کہ میں نے البعث الاسلامی سے بہت کچھ سیکھا ہے، اور اس کے نتیجہ میں میں آج جامعہ سلفیہ کی عربی صحافت سے پوری طرح وابستہ ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۵ء میں جب البعث الاسلامی کا سورج طلوع ہوا، اور اس کی شہرت ان کے کانوں تک پہونچی تو وہ اس سے براہ راست واقف ہوئے، اس وقت وہ مئو کے مدرسہ فیض عام میں زیر تعلیم تھے، اور نہایت سادگی اور تواضع کی زندگی گذارنے والے طلباء میں ان کا شمار تھا، البعث الاسلامی کے دفتر میں ان کا ایک خط آیا کہ آپ نے جو عربی پرچہ نکالا ہے اگر چہ اسکا سالانہ چندہ پانچ روپیے ہے، مجھے بہت شوق ہے کہ میں اس پرچے کا خریدار بنوں، لیکن میرے پاس اتنی وسعت نہیں ہے کہ میں اسکا پورا سالانہ چندہ ادا کرسکوں، اس لئے مجھے ایک طالب علم کی حیثیت سے رعایتی چندہ پیش کرنے اور خریدار بننے کا موقع عنایت کریں، بلا تاخیر ان کے نام پرچہ جاری کردیا گیا، اور کافی دنوں تک جاری رہا، اپنی وسعت کے مطابق وہ اپنا رعایتی سالانہ چندہ ادا کرتے رہے، پھر جب وہ جامعہ ازہر سے فارغ ہوکر جامعہ سلفیہ بنارس سے عربی زبان وادب کے استاد کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے تو ان کے دل میں عربی زبان میں ایک رسالہ نکالنے کا داعیہ پیدا ہوا، جامعہ سلفیہ نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دی، اور ڈاکٹر ازہری کی ادارت میں ایک عربی ماہنامہ جاری ہوگیا، انہوں نے مجھے اپنی خاص گفتگو میں بتایا کہ یہ دراصل آپ کے مجلّہ البعث الاسلامی کا فیض ہے، الحمدللہ یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا، اور وہ جامعہ سلفیہ سے نکلنے والے عربی رسالہ کے رئیس التحریر باقی رہے، اور نہ صرف اس کے معیار کو بلند کرنے میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا، بلکہ جامعہ میں عربی زبان وادب میں مہارت پیدا کرنے کا ذوق عام ہوا، اور اس کی ایک فضا پیدا ہوگئی، اور ادیب مرحوم نے اپنی زندگی عربی زبان وادب کے موضوع کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے اور ترقی دینے میں گذار دی، عربی زبان میں تعلیم وتربیت، تحقیق

ومطالعہ اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کا اہتمام جاری رکھا، انہوں نے اپنی پی، ایچ، ڈی کا رسالہ عربی زبان میں لکھا، اور ممتاز حیثیت سے کامیاب ہوئے، یہی وجہ ہے کہ انکی اکثر تصنیفات عربی زبان میں ہیں، وہ جامعہ میں اپنے مضامین عربی زبان ہی میں پڑھایا کرتے تھے، اور کبھی اردو میں بھی درس دیا کرتے تھے، وہ تفسیر وحدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے تھے، ان کی تصانیف کی تعداد تقریبا تین درجن کتابوں پر مشتمل ہے، وہ ترجمہ کی مہارت بھی رکھتے تھے، اور اردو کتابوں کو عربی میں اور عربی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا فن ان سے سیکھنے میں ان کے شاگرد پوری دلچسپی لیتے تھے، مختلف دینی اور علمی موضوعات پر ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں خاص طور سے اصلاح المساجد، المرأۃ فی الاسلام، الصیام وعید الفطر من منظور تربوي، رحمۃ اللعالمین کا عربی ترجمہ۔ اہل حدیث کی تحریک اس کا مفہوم اور مقصد عربی زبان میں تحریر کیا ہے، مختصر زاد المعاد کا ترجمہ اردو میں کیا، فتاوی ابن تیمیہ کا ترجمہ اردو میں جاری تھا، عربی صحافت پر خاص طور سے زور دیتے تھے، اور طلبہ کو عربی لکھنے، بولنے اور تقریر کرنے کی ترغیب دلاتے تھے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے، وہ اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ علمی اور ادبی کاموں میں استعمال کرتے تھے، ان کے شاگردان سے وقت کی قدردانی اور وقت کی اہمیت کو سیکھ کر اس پر عمل پیرا ہوئے، اس کے نتیجہ میں انہیں کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی توفیق حاصل ہوئی، ان کی وفات کی خبر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ پورے ملک میں اور خاص طور سے طبقۂ اہل حدیث میں پہونچ گئی، لوگوں نے ایک دوسرے کی تعزیت کرنا شروع کردی، اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے رنج وغم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، ملک سے باہر دوسرے ممالک میں بھی یہ خبر صاعقہ اثر اسی سرعت کے ساتھ پہونچ گئی، اور ان سے تعلق رکھنے والے حضرات پر حزن وغم کی ایک فضا چھا گئی، واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی رجل رشید اور عالم وادیب کی اہمیت کا اندازہ اس کے دنیا سے رخصت کے ہونے بعد ہوتا ہے، اور ایک بڑا خلا محسوس کیا جانے لگتا ہے، اکثر دیکھا گیا کہ کسی جانے والے کا خلا پر کرنا بہت مشکل ہوتا

ہے، چند دنوں تک رنج وغم کا تذکرہ ہونے کے بعد دامن صبر میں پناہ مل جاتی ہے، اور داغ فراق بتدریج مٹ جاتا ہے:

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس کے باوجود انسان اپنی امتیازی صفات کے ساتھ زندہ رہتا ہے، اس کی مقصدیت، اس کی روح کی بے چینی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس کے خوبصورت کارنامے اس کو دوام بخشتے ہیں، " اذکروا محاسن موتاکم " کے ماتحت جانے والے کی خوبیوں کا چرچا ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم کا اصل وطن ضلع مئو تھا، ۱۹۳۹ء وہیں ان کی پیدائش ہوئی اور والدین کی علمی اور اخلاقی تربیت نے ان کو بلندی عطا کی، اور علم حاصل کرنے کا شوق آخری درجہ تک حاصل ہوا، وہ تحصیل علم میں اس قدر مشغول ہوئے کہ ان کی توجہ کسی اور طرف نہ ہوسکی، اور علم وادب اور دعوت وارشاد کی بنیاد پر کام کرنے کا شوق پوری طرح غالب ہوگیا، اور علم کی راہ میں انہوں نے اپنے آپ کو فنا کردیا، اور شدید محنت کے باعث وہ ۷۰ رسال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے دنیائے فانی سے دارالبقاء کی طرف روانہ ہوگئے۔

اللہ تعالی ان کے ساتھ اپنے عفو وکرم اور رحمت ومغفرت کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمائیں، اور ان کے درجات بلند ہوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیں اور جنت الفردوس کے اعلی مقام میں جگہ فرمائیں۔ آمین

☆☆☆☆

مولانا شفیق الرحمٰن ندویؒ

کامیاب استاذ، دیانتدار منتظم، اور باوقار مثالی عالم دین

دار العلوم میں بحیثیت طالب علم

غالباً ۱۹۵۶ء کا زمانہ تھا، میں دار العلوم میں کتب خانہ ندوۃ العلماء سے باہر نکل رہا تھا کہ اچانک دروازہ کے باہر میری ملاقات ایک تازہ وارد طالب علم سے ہوئی، انہوں نے بتایا کہ میں بتیا، بہار کے مدرسے سے پڑھ کر آیا ہوں، اور یہاں داخلہ لینا چاہتا ہوں، میں نے ان کو خوش آمدید کہا، انہوں نے مجھے اپنے ندوی استاذ کا سلام پہونچایا، اور غالباً ان کا کوئی خط بھی دیا، وہ خط میرے کلاس فیلو جناب مولانا مسیح الدین صدیقی ندوی صاحب کا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ مدرسہ اسلامیہ بتیا میں وہ استاد ہیں، اور ان کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دار العلوم میں طلباء کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی، اور تعلیم وتربیت کے شعبے میں اتنا پھیلاؤ بھی نہیں تھا، جو آج نظر آرہا ہے، اساتذہ میں مولانا محمد اویس صاحب شیخ التفسیر، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب شیخ الحدیث، مولانا مفتی سعید احمد صاحب سربراہ شعبہ فقہ وافتاء، مولانا عبد الحفیظ صاحب بلیاوی استاد ادب، مولانا عبد اللہ عباس صاحب ندوی اس زمانہ میں حجاز مقدس کے سفر پر تھے، مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی، مولانا عبد الماجد صاحب ندوی، مولانا قاری منیر صاحب استاد تفسیر۔ دار العلوم میں تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، اس زمانہ میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کچہری روڈ کے مرکز تبلیغ میں قیام فرما کر تصنیف وتالیف میں مشغول تھے، اور دعوت الی اللہ کا کام نہایت

سرگرمی سے انجام دے رہے تھے۔اسی کے ساتھ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم تھے، جن کی خوشگوار سرپرستی اور پاکیزہ ماحول میں دارالعلوم کے مخلص اساتذہ ندوہ کے اعلیٰ مقاصد کو تعلیم وتربیت اور تدریس وتصنیف کے ذریعہ ان مقاصد کو بروئے کار لانے میں مصروف تھے اور انتہائی خلوص کے ساتھ اسلام کی دعوت اور کتاب وسنت کی تعلیمات کو عام کرنے اور امت وسط کے اعتدال کو بروئے کار لانے میں منہمک تھے اور ندوۃ العلماء کا پیغام نہ صرف ہندوپاک بلکہ پورے عالم اسلام اور مغربی ممالک کے اسلامی مراکز اور علمی اور دینی اعتماد کی فضا میں عام ہو رہا تھا، اور ہر سال طلباء کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، اسی دوران ہمارے رفیق عزیز ومکرم مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ندوی ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے بعض ندوی اساتذہ کی فیض سے مستفید ہو کر دارالعلوم میں داخلہ کے لئے آئے اور بغیر کسی تاخیر اور دشواری کے ان کا داخلہ درجہ چہارم میں ہو گیا وہ اپنے کلاس میں ایک ممتاز طالب علم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے، اساتذہ کرام بھی ان کا خاص خیال رکھتے تھے، اور اپنی توجہات سے نوازتے تھے۔حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے تو وہ نور نظر تھے۔

طلباء واساتذہ کے لئے ہر دلعزیز

مولانا شفیق الرحمٰن ندوی مرحوم کا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے سنہ فراغت از فضیلت ۱۹۶۲ء ہے، وہ فراغت کے بعد اپنے آبائی وطن بہار واپس چلے گئے اور اپریل ۱۹۶۲ء میں اہل حدیث کے ایک مشہور درس گاہ ''مدرسہ اصلاح المسلمین'' محلہ پتھر کی مسجد پٹنہ سے وابستہ ہو گئے جہاں دو سال تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ کی تحریک ومشورہ پر فروری ۱۹۶۴ء میں بحیثیت معلم دارالعلوم شعبہ تدریس سے منسلک ہو گئے اور ایک سال قیام کے بعد ملک کے باہر چلے گئے اور ایک طویل مدت کے بعد وطن واپس آئے اور مدرسہ اسلامیہ انجمن رفاہ المسلمین رام پور کیسریا، ضلع مشرقی چمپارن بہار میں درس وتدریس کے ساتھ صدر مدرس کی حیثیت سے مدرسہ کا انتظام وانصرام بھی دیکھ رہے تھے۔

ان ہی دنوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک اچھے ور باصلاحیت استاد کی ضرورت پیش آئی اور ۲۹؍نومبر ۱۹۷۳ء میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ایماء پر دارالعلوم آنے کی دعوت دی گئی۔

شروع میں عارضی تقرر استاد ادب کی حیثیت سے دوسو روپے ماہوار تنخواہ پر ہوا۔اس زمانہ میں مولانا محب اللہ صاحب لاری ندوی مہتمم اور مولانا معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم کے عہدہ پر تھے،مولانا مرحوم نے ان دونوں حضرات کے معاون اور دست راست بن کر دارالعلوم میں اپنی صلاحیت کا بہترین نمونہ پیش کیا،اور جلد ہی ان کو باقاعدہ گریڈ دوم میں منتقل کردیا گیا اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا،اس کی اطلاع ان کو دفتر اہتمام سے ۹؍شوال ۱۳۹۴ھ کو دی گئی،اس طرح وہ نہایت انہاک اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہے اور طلباء اور اساتذہ ہر طبقے میں مقبول ومحبوب ہوئے،اور ان کی قدر میں برابر اضافہ ہوتا رہا،یہاں تک کہ ذیقعدہ ۱۴۰۱ء میں وکیل کلیۃ اللغۃ العربیہ وآدابہا کے مشورہ سے ان کو امور علمی کی انجام دہی کے لئے پچاس روپۓ الاؤنس پر مزید وقت دینے کے لئے حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء سے منظوری حاصل کی گئی،اور اس خدمت کی انجام دہی مرحوم کے لئے باعث خیر ثابت ہوئی اور انکا علمی وزن بڑھا،جس سے دارالعلوم کے طلباء کے لئے علمی استفادہ کی راہ ہموار ہوئی،اسی کے ساتھ وہ ہر سال تعلیم کے شروع ہونے سے قبل تعلیمی گھنٹوں کا نظام،نظام الاوقات کے نام سے اساتذہ ومدرسین کے مشورے سے تیار کرتے تھے جسے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے نظر ثانی کے بعد آویزاں کیا جاتا تھا،یہ کام بھی بڑی دقت نظر کا تھا،اور خاص محنت کا طالب تھا۔لیکن مولانا مرحوم کچھ اس انداز سے ترتیب دیتے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔

مولانا شفیق الرحمٰن : دیانتدار منتظم

مولانا مرحوم کے زمانہ کارکردگی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مدارس عربیہ کے الحاق

کا سلسلہ شروع ہوااوراس میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے کی صورت میں ایک ذمہ دار استاذ کی ضرورت محسوس کی گئی، جوان مدارس کا معاینہ کر کے ان کی رپورٹ کرے اوراس کی تعلیمی وتعمیراتی ترقی کے لئے خاکے کا منصوبہ بنائے اوران کی مکمل نگرانی کرلے اس کا ایک الگ سے باقاعدہ دفتر ہو، جس کا نام دفتر مدارس ملحقہ دارالعلوم رکھا جائے، اس سلسلہ میں جناب مولانا ابوالعرفان صاحب ندویؒ نے حضرت ناظم کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی اورلکھا کہ:

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے جن مدارس کا الحاق ہوا ہے ان کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے، ضرورت ہے کہ ان مدارس کا منظم اورمربوط تعلق قائم رہے، اس کے لئے دارالعلوم میں ایک دفتر کے قیام کی ضرورت ہے، جہاں سے ضروری مراسلات کی جائے، اورکاغذات رکھے جاسکیں، مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ندوی تقریباً ایک سال سے یہ کام کررہے ہیں، لیکن اس کی توسیع کی ضرورت ہے، تاکہ زائد سے زائد مدارس کو شرائط کے ساتھ اس حلقہ میں داخل کیا جائے، اس لئے میری سفارش ہے کہ مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ندویؒ کو باقاعدہ دفتری کام سپرد کردیا جائے، اور ان کی تشجیع کے لئے پچاس روپیہ ماہانہ الاؤنس منظور فرمایا جائے، اوریکم ربیع الاول ۱۴۰۲ھ سے اس کا نفاذ فرمایا جائے۔

والسلام

ابوالعرفان ندوی

۱۵/ربیع الاول ۱۴۰۲ھ

اس خط کے بعد مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ندوی دفتر مدارس ملحقہ کے ذمہ دار قرار پائے اورانہوں نے پوری دلچسپی کے ساتھ اس کام کی انجام دہی میں اپنا وقت لگایا، ان کو دفتر دارالعلوم سے اس کی مندرجہ ذیل اطلاع دی گئی:

جناب مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ندوی

یکم ربیع الاول ۱۴۰۲ھ سے مدارس عربیہ کے الحاق کے سلسلہ میں آپ کو ذمہ داری

دی گئی ہے اور اس کام کے لئے ماہانہ پچاس روپیہ الاؤنس منظور ہوا ہے، کارکردگی کی رپورٹ اس ماہ سے علاحدہ ارسال کریں۔

محب اللہ
مہتمم دارالعلوم

عدل ودیانت پر مبنی دو اہم رپورٹ

مولانا شفیق الرحمٰن ندویؒ دارالعلوم کے الحاق کی درخواست کرنے والے مدارس کا معاینہ کرکے اس کی رپورٹ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور مثبت رپورٹ آنے کے بعد الحاق کا فیصلہ ہوتا تھا۔ وہ اس معاملہ میں انتہائی دیانت دار اور احساس ذمہ داری سے سرشار تھے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی ملحقہ مدارس کا معاینہ کرنے جائیں اور وہاں ان کی خاطر تواضع ہو، اور اس مدرسہ کے بعض ممبران کی خوشامدانہ روش سے متاثر ہوکر وہ واقعہ کے خلاف کوئی رپورٹ تیار کریں، اور ان کی خوشی کے لئے وہ ناظم صاحب ودیگر ذمہ دار حضرات سے ان کے لئے الحاق کی سفارش کریں، نمونہ کے طور پر ایک رپورٹ کا اقتباس ہے۔

(۱) بخدمت گرامی جناب ناظم صاحب ندوۃ العلماء مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب عالی!

۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ بروز جمعرات ساڑھے دس بجے دن میں مدرسہ پہونچا، وہاں بالکل سناٹا پایا، دو کمرے ہیں، جن کی دیواریں اینٹ کی ہیں، اور چھت کچی ہے، کمروں میں دروازے نہیں ہیں، کمروں کے سامنے خالی زمین ہے، جس کی بنیادیں تین طرف سے بھری ہوئی ہیں، کمروں کے شمال میں ملبے کی صورت میں ایک زمین ہے۔ واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بتایا کہ وہ اس مکتب میں پڑھاتے

ہیں، چالیس بچے اور بچیاں زیر تعلیم ہیں، درجہ حفظ بھی ہے، طلباء مقامی بھی ہیں، حفظ کے استاذ گھر گئے ہوئے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ طلباء کو میں نے دیکھا نہیں، اس لئے آپ طلباء کا رجسٹر، اساتذہ کا رجسٹر اور تنخواہ کا رجسٹر دکھادیں، انہوں نے رجسٹر دکھانے سے معذوری ظاہر کی، اور کہا کہ رجسٹر صدر صاحب کے یہاں ہے، اس لئے کہ مدرسہ میں رجسٹر رکھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے، میں نے ان کو مہلت دی کہ دو گھنٹے کے اندر رجسٹر لا کر دکھلا دیں، لیکن وہ ایسا نہ کر سکے، کچھ دیر بعد مدرسہ کے ایک ذمہ دار آ گئے، ان سے بھی چند سوالات کئے، مگر صحیح جوابات نہیں دے سکے، البتہ چلتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ اطلاع دے کر دوبارہ آئیں تو میں مدرسہ کے اندر طلباء کو دکھا سکتا ہوں، اور سارے رجسٹر بھی۔

فقط والسلام

شفیق الرحمٰن

۳؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ

یہ ایک ہلکا سا نمونہ تھا ان کے اس دیانتدارانہ پرخلوص رویہ کا جو وہ مدارس ملحقہ کا معاینہ کرنے کے بعد حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے، ان کی اس مخلصانہ کارکردگی کے بنا پر ان کے الاؤنس میں جس کا تعلق ملحقہ مدارس کے معاینہ اور رپورٹ سے تھا، ایک سو پچاس روپے کر دیا گیا، اور تعلیمی تعاون کا الاؤنس پچاس روپے اس کے علاوہ رکھا گیا، اور یکم محرم ۱۴۱۲ھ سے تنخواہ اور گریڈ میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا، اور اس وقت ان کی تنخواہ دو ہزار چار سو ہو گئی۔

جب مدرسہ احسانیہ سیوان کے ذمہ داروں اور مولانا ظہیر احمد صاحب ندوی، اس مدرسہ کے صدر کے مابین شدید اختلاف ہوا، اور مدرسہ کے ذمہ داروں اور اس گاؤں کے لوگوں نے ان کے خلاف ایک بہت طویل اور شکایات سے بھری رپورٹ ماہ صفر ۱۴۲۱ھ میں اس وقت کے مہتمم (راقم) سعید الرحمٰن اعظمی کے پاس رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجی، اور انہوں نے

وہ رپورٹ ندوۃ العلماء کے ناظر عام مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی کی خدمت میں ارسال کی،اوران کے ذریعہ مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ندوی مرحوم کواس رپورٹ سے مطلع کیا گیااورانہوں نے پوری رپورٹ پڑھ کراس کے جواب میں جو کچھ لکھاوہ مناسب ہے کہ وہ عبارت یہاں نقل کردی جائے۔

(۲) جناب عالی!

ضلع گوپال گنج بہار سے آئی ہوئی تحریر دیکھی جومولوی ظہیراحمد صاحب کے خلاف ہے، یہ تحریر یک طرفہ ہے، وہاں کے لوگوں نے مدرسہ کے بے قصور طلباء کواپنی بربریت کا نشانہ بنایاہے،اوراپنی تحریر میں اس کا کوئی ذکرنہیں کیا،اس لئے یک طرفہ تحریر کی بناپرکوئی رائے قائم کرنامناسب نہ ہوگا،بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ یہ بنواعمام کی لڑائی ہے،اس کی جڑیں گہری اور پرانی ہیں،اوردور کے آدمی کے لئے اس کا سمجھنا آسان نہیں ہے،سمرامدرسہ کوبعض لوگوں نے جس طرح اپنی سیاست کا اکھاڑابنا کررکھاہے،اس پس منظر میں مولوی ظہیراحمد جیسے شخص کا وہاں ہوناضروری ہے۔

شفیق الرحمٰن ندوی

باوقار مثالی شخصیت

اس سے یہ بھی اندازہ لگایاجاسکتاہے کہ وہ اپنی حق گوئی اور بے باکی میں اپنی مثال آپ تھے،اورحالات چاہے جیسے بھی ہوں وہ حق بات کہنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے،اور ہرطرح کی مداہنت سے دور تھے،جب کہ فی زمانامداہنت کا رواج بہت زیادہ ہے،اوردین کا کام بھی محض دنیاوی غرض پرانجام دینے کے لئے فخرمحسوس کیاجاتاہے،اس موقع پرحضور پاک ﷺ کی وہ حدیث تحریر کرنے کی اجازت دیجئے،جس میں حضور پاک ﷺ سے صحابہ کرام نے سوال کیا کہ حضوراس آدمی کے بارے میں کیا خیال ہے،جو جہاد کرتا ہےاس لئے تاکہ لوگ اسے بہادرکہیں،یاکسی قومی حمیت کی بناپروہ جہاد کرتاہے،یامحض لوگوں

کو دکھانے کے لیے میدان جہاد میں مشغول ہوتا ہے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کیا وہی اللہ کے واسطہ ہے،'' (اس کے علاوہ کوئی عمل بھی اللہ کے راستہ میں یا اللہ کی مرضی کے لئے نہیں شمار کیا جاسکتا)۔

☆☆☆☆☆

میں نے مولانا شفیق الرحمٰن صاحب کو ان ہی مجاہدین کی صف میں پایا، جو ہر طرح کے عُجب وریاء سے پاک تھے، اور ان کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرہ میں رہ کر انھیں تمام سرگرمیوں کو جاری رکھنا تھا، وہ صرف یہی نہیں کہ اپنی ساری ذمہ داریوں کو نہایت اخلاص اور دیانتداری کے ساتھ انجام دیتے تھے، بلکہ وہ اپنے بڑوں کا پوری طرح لحاظ بھی رکھتے تھے، دار العلوم میں قیام کے دوران جن لوگوں سے ان کو حوصلہ ملا، اور مدد ملی، وہ ہمیشہ ان کے احسان مندر ہے، اور جذبہ تشکر کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے، انہوں نے ایسے تمام حضرات کا خیال رکھا، ان کے لئے دعا کرنا، اور ان کے احسانات کا تذکرہ کرنا ان کا معمول تھا۔

محسنین کی احسان شناسی کا عملی اظہار

طالب علمی کے دور میں مجھ خاکسار کو ان کے درجہ میں کچھ مضامین اور خاص طور سے ادب عربی سے متعلق کتابوں میں تعلیمی شرکت کا موقع ملا، تو ان کی قدر افزائی کا تماشا خود میری آنکھوں نے دیکھا، اتفاق سے احاطہ دار العلوم میں جس مکان میں قیام پذیر تھے، اس طرف سے میرا اکثر گذر ہوا کرتا تھا، جب بھی ان کی کم عمر بچی ثروت شفیق (جس کا نکاح بعد میں راقم نے پڑھایا) کی نظر مجھ پر پڑتی تو وہ زور زور سے یہ الفاظ دہراتی، دیکھئے: ''میرے ابو کے استاذ جا رہے ہیں، میرے ابو کے استاذ! السلام علیکم'' یہ وطیرہ ایک دو دن نہیں رہا، بلکہ جب تک وہ اس مکان میں رہے، اور جب تک وہ باحیات رہے، اس وقت تک اور اس کے بعد بھی ان کے بچوں نے ہمیشہ بڑوں کا احترام ملحوظ رکھا۔

اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھریلو بے تکلف ماحول میں بھی بچوں کے سامنے بڑوں کا تذکرہ بہت احترام اور عقیدت سے کیا کرتے تھے۔

اس زمانہ میں یہ بات نادر تھی، اور کوئی اپنے کسی استاد یا کسی محسن کا تذکرہ بہت اچھے انداز سے نہیں کرتا، اگر کوئی کسی کے اچھے کام کی تعریف کرتا ہے، تو اکثر سننے والے یا تو ناگواری سے سنتے ہیں یا خاموش رہتے ہیں، تائید کرنے کا مزاج جیسے ختم ہوتا جا رہا ہے، چہ جائے کہ خوشی کا اظہار کیا جائے، ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک صاحب جو کسی بڑے مدرسہ میں استاد تھے، وہ اپنے ایک شاگرد کے شہر میں کسی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے گئے، اور یہ سوچ کر کہ میرے فلاں شاگرد سے بھی ملاقات ہوگی، چنانچہ تقریب کے دوران ملاقات ہوئی، بعض لوگوں نے استاد سے دریافت کیا کہ کیا یہ آپ کے شاگرد ہیں؟ تو قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیں، فوراً شاگرد صاحب بول پڑے: شاگرد نہیں، شاگرد نہیں! بس کبھی فلاں مدرسہ میں میں نے ان سے کچھ پڑھا تھا، حالانکہ انھوں نے کافی دنوں تک ان کو پڑھایا تھا، اور ان پر اپنی خاص توجہ بھی رکھتے تھے، خیر یہ واقعہ بر سبیل تذکرہ آ گیا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ زمانہ خود غرضی اور غلط فہمیوں کا ہے، اس میں سچائی کا اعتراف کر لینا بہت مشکل کام ہے، مولانا شفیق الرحمٰن صاحبؒ ایک باوقار اور مثالی شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے ہمیشہ سچائی، اعتراف اور خیر خواہی کا نمونہ پیش کیا، اور انہوں نے دین داری اور تقویٰ کی نمائندگی زندگی کے ہر گوشہ میں کی، اور اپنی علالت کے زمانہ میں بھی اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو انجام دیتے رہے، اور اپنی کسی تکلیف یا پریشانی کا ذکر کرنے سے گریز کرتے رہے، اچانک ایک شب وہ ہم سے جدا ہو گئے اور سب سے منہ موڑ کر اپنے رب کے دربار میں حاضر ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

تاریخ وفات: شب دوشنبہ ۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۴؍جون ۲۰۰۲ء ہے، دارالعلوم میں گرمیوں کی چھٹی کا زمانہ تھا، تاہم نماز جنازہ میں زبردست شرکت دیکھنے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، اور رحمت و مغفرت کی نعمت سے سرفراز

فرمائے اور جنت الفردوس میں بہترین مقام عطا فرمائے۔(ان لله ما أخذ، وله ماأعطى، وكل شئي عنده الى أجل مسمى)۔

ایک گرانقدر تصنیف

ان کی تصنیفات میں الفقہ المیسر ہے، انہوں نے یہ کتاب مرشدی حضرت مولانا علی میاںؒ کے ایماء اور مشورہ سے تصنیف کی، جو داخل نصاب ہے، اور اس کے بہت سارے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تمام مدارس ملحقہ میں یہ کتاب داخل نصاب ہے، فالحمد لله على ذلك۔

☆☆☆

الحاج عبدالرزاق رصاصی صاحبؒ

۱۹۶۸ء کی بات ہے، اپنے ایک تعلق والے صاحب نے مجھ سے خلیج کے ملکوں میں ایک ریاست شارقہ کا تذکرہ کیا اور وہاں کے جید عالم دین شیخ عبداللہ العلی المحمود کا بھی ضمناً ذکر کیا، میں نے خلیج میں مجلہ البعث الاسلامی کے ان قدردانوں کا جائزہ البعث کے دفتر میں جا کر لیا اور جن حضرات کے نام یہ عربی رسالہ خلیج کے ملکوں میں بھیجا جاتا تھا ان کی فہرست دیکھی، تو مجھے اچانک شیخ عبداللہ العلی المحمود، شیخ محمد علی المحمود، شیخ سالم علی المحمود اور شیخ احمد بن عبدالعزیز وغیرہ کئی اہل علم کے نام لکھے ہوئے ملے اور ان کے نام البعث الاسلامی پابندی سے جایا کرتا تھا۔

اسی زمانے میں اچانک ایک دن مدراس سے کسی صاحب نے مجھ کو ندوۃ العلماء کے فون پر یہ خبر دی کہ شیخ عبداللہ العلی المحمود کل لکھنؤ ندوۃ العلماء کی زیارت اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ملاقات کرنے کے لئے پہنچ رہے ہیں، یہ خبر اگرچہ انتہائی خوشی کا باعث تھی، لیکن اتفاق سے حضرت مولاناؒ اس زمانے میں لکھنؤ سے باہر دعوتی سفر پر تھے، ان کے ساتھ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی (موجودہ ناظم ندوۃ العلماء) بھی رفیق سفر کی حیثیت سے حضرت مولانا کے ساتھ تھے۔

شیخ عبداللہ العلی المحمود تشریف لائے، میں نے ان کو مہمان خانہ میں ٹھہرایا اور ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، اس زمانے میں وہ کچھ کمزوری صحت کی وجہ سے زیادہ چلنے پھرنے سے کسی حد تک معذور تھے، اور جہاں تک ممکن تھا انھوں نے ندوہ کے مقاصد، اس کے تعلیمی پروگرام اور نظم وانتظام، طلبائے عزیز کی خوش سلیقگی اور ایک پرسکون ماحول میں کچھ وقت گذار کر بہت خوش اور متاثر ہوئے۔

یہ واقعہ ۱۹۶۹ء میں بعض ناعاقبت اندیش طلبہ کے گرمیوں کی چھٹی کا مسئلہ لے کر اور بے جا اصرار پھر سرکشی کرنے کے بعد ایک اسٹرائک جیسا ماحول بنانے اور پھر حضرت ناظم صاحب اور انتظامیہ کے غیر متعینہ مدت تک کے لئے دارالعلوم بند کرنے کا فیصلہ کرنے سے تقریباً ایک سال پہلے کا ہے، اس وقت نئے مہتمم دارالعلوم جناب مولانا محبّ اللہ صاحب ندوی کا دور شروع ہی ہوا تھا اور کچھ ہی مدت کے بعد یہ واقعہ پیش آیا اور تقریباً ایک ماہ یا اس سے کم وبیش مدت کے بعد مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے بعد ایک نئی روح وزندگی کے ساتھ دارالعلوم کھلا، اور ضرورت پیش آئی کہ ندوۃ العلماء کے پیغام سے زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے اور ممالک عربیہ میں اس کے کام وپیغام اور اس کے اعلیٰ مقاصد کا تعارف کرایا جائے، اور موجودہ ہنگامے سے اس کی شہرت کو جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کی جائے۔

اس اہم کام کے لئے حضرت ناظم صاحبؒ نے بیرونی ممالک میں وفود بھیجنے کا پروگرام مرتب فرمایا اور اسی سال ۱۹۶۹ء کے اخیر میں کویت جانے اور وہاں کے اہل علم ووجاہت سے ملنے اور ندوۃ العلماء کا صحیح اور نہایت متوازن تعارف کرانے کے لئے اس ناچیز کا انتخاب فرمایا، وفد کے ارکان پر اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے مجھے تنہا کویت جانے کی ہدایت فرمائی گئی اور حضرت مولاناؒ نے اپنے تعلق والوں کے نام خطوط بھی لکھ دیئے، الحمد للہ کویت کا سفر مفید رہا، ندوۃ العلماء کے مقاصد اور کارناموں کا تعارف کرانے کا موقع ملا، وہاں کے عالم وداعی جناب شیخ عبدالعزیز العلی المطوع، اور ان کے برادر عزیز جناب شیخ عبداللہ العلی المطوع اور اس زمانے کے مدیر اوقاف اسلامی، وزارۃ الاوقاف الشئون الاسلامیۃ کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر عبداللہ العقیل حفظہ اللہ اور ان سب حضرات کے بزرگ اور مربی فضیلۃ الشیخ عبدالرزاق الصالح رحمھم اللہ تعالیٰ، ان سب حضرات کے ذریعہ وہاں کے مختلف طبقات کے لوگوں سے بھی ملنے کا مزید موقع حاصل ہوا، ملا، چونکہ شیخ عبداللہ العلی المحمودؒ نے مجھ کو شارقہ آنے کی دعوت دی تھی، اور بہت اصرار کے ساتھ یہ دعوت دی تھی، اور وہاں کے اس وقت

کے موجودہ حاکم شارقہ سموالشیخ خالد بن محمد القاسمیؒ سے ملاقات کرانے اور ان کی ضیافت میں کچھ وقت گذارنے کا مجھ سے وعدہ لے لیا تھا، اس لئے میں نے کویت واپسی میں قطر ہوتے ہوئے اور قطر سے شارقہ جانے کا پروگرام بنا کر شیخ المحمود کو بذریعہ فون اطلاع کردی تھی ، میں اسی سال ۱۹۶۹ء دسمبر کے آخری ایام میں وہاں پہونچا تھا اور میرا قیام پہلے شیخ المحمود کے مکان پر ہوا، پھر شیخ خالد بن محمد کی ضیافت میں ہوٹل مں ٹھہرنا ہوا۔

شارقہ کے اس سفر میں شیخ عبداللہ العلی المحمود کی معیت میں ریاست دبئی کے حاکم جناب سموالشیخ راشد بن المکتوم سے ملنے دبئی ان کے دفتر میں جانا ہوا، اور شیخ راشد المکتوم سے ملاقات ہوئی، اس وقت وہ جمرکیۃ دبئی کے آفس میں بیٹھا کرتے تھے، اور وہیں ان کا اپنا حکومتی دفتر بھی تھا۔ پھر کمال حمزہ جو بلدیہ دبی کے رئیس تھے، ان سے ملاقات ہوئی، اور ندوہ کے مقاصد اور اس کے علمی، ادبی اور دعوتی وفکری کارناموں کا ذکر آیا، اور مختصر تعارف ہوسکا۔

اسی زمانے میں دبئی کے بعض بڑے دیندار تاجروں سے بھی ملنے کا موقع ملا، ان میں شیخ مسرت حفظہ اللہ انتہائی قابل قدر اور لائق شکر وذکر ہیں، اس موقع پر یہ پہلا سفر ۱۹۶۹ء میں تین عرب ملکوں کا حضرت مولانا مرشدی علامہ سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی کی توجہ خاص اور دعاؤں سے کامیاب سفر کی حیثیت سے پورا ہوا، اور مستقبل کے سفروں کا پیش خیمہ ثابت ہوا کہ اس کے بعد تقریباً ہر سال کویت کے احباب کی دعوت پر اور قطر میں علامہ عبداللہ بن ابراہیم انصاری کے ایماء پر اور شارقہ اور دبئی اور ابوظبی میں علماء ومحبین کی مخلصانہ توجہات کی بنا پر حلقۂ ندوۃ العلماء کے محبین کا حلقہ برابر وسیع ہوتا گیا۔

بعد کے سفروں کے دوران شارقہ میں قیام کے بجائے دبئی میں قیام کرنا زیادہ آسان ہوگیا، اس لئے کہ یہاں اہل تعلق سے ملنے اور عرب وہند کے دوستوں سے ملاقات کرکے ایک اچھے تعارف وتعلق کا سلسلہ قائم ہوا، اور محبّ مکرم جناب قاری عبدالحمید صاحب ندوی اور ان کے اہل تعلق عرب علماء وادباء اور تعلیم یافتہ طبقے اور یہاں مقیم ہندوستان کے بعض اعلیٰ

دینی اور تجارتی حلقے سے ملنے اوران کی دعوت پر دینی پروگراموں میں شرکت کرنے کے مواقع بھی حاصل ہوئے، قاری عبدالحمید صاحب کے ساتھ الغریر صاحبان کی ذاتی اوران کی روایتی مجلسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا، خاص طور سے شیخ سیف العزیز اوران کے بھائی شیخ عبداللہ الغریر سے حضرت مولاناؒ کی توجہات اور ندوۃ العلماء کی اہمیت کے پیش نظران حضرات سے قریبی تعلق قائم ہوا، اور وہ آج تک الحمداللہ قائم ہے۔

انھیں ایام میں جو گذشتہ صدی کے آٹھویں دہے کی ابتداء سے تعلق رکھتے ہیں ،قاری صاحب کے ساتھ جناب الحاج عبدالرزاق رصاصیؒ سے ان کے آفس میں ملاقات ہوتی، حاجی صاحب نے زبردست استقبال کیا اور ندوۃ العلماء کے بارے میں تفصیلات معلوم کرتے رہے، حضرت مولانا علی میاں صاحب کی کچھ کتابیں وہ مطالعہ کر چکے تھے، اور ان کی عظیم شخصیت کے زبردست قائل تھے، اور ملاقات کرنے نیز ندوہ کی زیارت کرنے کی غرض سے لکھنؤ آنے کا ارادہ ظاہر کر رہے تھے، اگر چہ ممبئی میں حضرت مولانا سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی، لیکن وہ مزید ملاقاتوں کی تمنا رکھتے تھے، ان تعلقات کے بعد اب میرا سفر امارات بھی تقریباً ہر سال شعبان کی چھٹیوں میں تعلیم کا کام بند ہو جانے کے بعد ہوا کرتا تھا اور حاجی رصاصی صاحب سے ہر بار ملاقات ہوتی تھی اور وہ اسی محبت اور تعلق کے ساتھ ملتے تھے، اور دارالعلوم کے بعض مشاریع میں حصہ لیتے تھے، ان کی شخصیت بہت پرکشش تھی اوران کی دینداری ضرب المثل تھی، وہ انتہائی محتاط اور رزق حلال کی سعی میں ہر طرح کی تکلیف اور خسارہ برداشت کرنے کے عادی تھے، اسی دینی شعور اور ایمانی زندگی کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی عطریات کی تجارت میں بہت آگے بڑھ گئے، اور برابران کا تجارتی حلقہ وسیع ہوتا گیا، اور عالم اسلام کے علاوہ دنیا کے بہت سے شہروں میں ان کی تجارتی شاخیں قائم ہوگئیں، ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار سے زائد ان کی تجارتی شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، اوران کے صاحبزادگان میں خاص طور سے جناب الحاج محمد سلیم صاحب

رصاصی اس تجارتی کمپنی کے ذمہ داروں میں خصوصی اہمیت کے مالک ہیں۔

حاجی رصاصی نے بذات خود ممبئی میں تین ادارے قائم کئے تھے اور ان اداروں کو بہت ہی منظم انداز سے چلانے اور ان کی سرپرستی کرنے میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، ان اداروں سے سب سے زیادہ اہم اور ان کی تعلیم کی راہ میں اعتدال پسندی کی علامت الحمد میڈیکل اینڈ ریسرچ فاؤنڈیشن، ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور فیروز ایجوکیشنل فاؤنڈیشن ہے، ان اداروں کی نہ صرف وہ تعلیمی سرپرستی کرتے تھے، بلکہ ان کے جملہ مصارف کے بھی ذمہ دار تھے، ان مخلصانہ توجہات کی بنا پر مہاراشٹر کے بہت سے اہم حصوں میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم ہوئے، اس میں حاجی رصاصی کی سرپرستی کا بڑا دخل تھا، اور وہاں کے لوگ رصاصی صاحب مرحوم کے تعلیمی میدان میں ان کی سرگرمی کے قائل اور ان کے بے حد ممنون تھے۔

ماہنامہ معارف کے مدیر اعلیٰ جناب مولانا اشتیاق ظلی صاحب نے فیروز فاؤنڈیشن کے ایک پروگرام میں کچھ عرصہ قبل شریک ہونے کے بعد ماہنامہ معارف میں حاجی رصاصی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”چند سال پہلے مجھ کو اس کے ایک پروگرام میں شرکت کرنے کا موقع ملا تھا اور اس سے بہت متأثر ہوا تھا، یہ ادارہ کوکن اور گوا کے اسکولوں اور کالجوں میں گذشتہ پندرہ سال سے دینی تعلیمی اسکیم چلا رہا ہے اور اس کے بہت سے اچھے اور مثبت نتائج سامنے آرہے ہیں، اس وقت اس اسکیم کے تحت ۸۷/اداروں میں کام ہو رہا ہے“ (شذرات معارف ستمبر ۲۰۱۵ء)۔

تعلیم و تربیت کے میدان میں زبردست سرگرمی اور شعور ملی کے ساتھ کام انجام دینے کے ساتھ حاجی رصاصی صاحب ملت کے حاجتمند طبقے کے ساتھ نہایت ہمدردانہ اور ان کے ساتھ تعاون علی الخیر کے جذبے سے عجیب و غریب خدمات کا تسلسل جاری رکھتے تھے، مدارس اسلامیہ اور دیگر عصری دینی درسگاہوں کے لئے ہمہ وقت نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ تیار

رہتے تھے، اور جملہ ضروریات کوحتی الوسع پوری کرتے تھے، یہ سلسلہ برابر جاری رہتا تھا اور مرور زمانہ کے ساتھ اس میں کسی نوع کی بے توجہی یا معذرت خواہی کا تصور کرنا ناممکن تھا۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک کے حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ امت مسلمہ کے نمائندے نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھنے اور ملک میں باعزت شہری کی حیثیت سے اپنی اہمیت کو تسلیم کرائیں، بلکہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے اعلیٰ تعلیم کے میدان میں انقلابی فکر کے ساتھ اتریں اور خود اپنے وسائل وامکانات کے ذریعہ بڑی تعلیم گاہیں قائم کریں اور تعلیم میں جامعیت کے خواب کو پورا کریں، اسی مقصد کے پیش نظر اس ناچیز نے اپنے بعض دوستوں سے مشورہ کیا اور خاص طور سے پروفیسر سید وسیم اختر صاحب سابق ڈائریکٹر الھدی ماڈل اسکول اور موجودہ وائس چانسلر انٹیگرل یونیورسٹی لکھنؤ سے اس موضوع پر بار بار مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آئی، انھوں نے اس کی پرزور تائید کی اور بتایا کہ میں خود اسی موضوع پر آپ سے بات کرنے والا تھا، اب متفق علیہ مقصد کے بارے میں مزید غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا، اور سب سے پہلے اس عالی مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے زمین کا مسئلہ سامنے آیا، اس کے لئے مختلف علاقوں میں زمینی معلومات حاصل کرنے کی کوشش شروع کی گئی اور بالآخر موضع دسولی بہٹہ کے علاقے میں ایک مسلم شخص کی ایک زمین کے بارے میں معلوم ہوا اور ہم نے ان سے ملاقات کر کے کسی حد تک معاملہ طے کرلیا، یہ زمین اس وقت کی ضرورت کے مطابق مناسب معلوم ہوئی تھی، اس کی رجسٹری کرانے کے لئے ہم نے صاحب زمین سے وقت مانگا تو اس پر راضی ہو گئے، اب اس عظیم منصوبے کا ذکر ہم نے حاجی رصاصی صاحب سے کیا، انھوں نے اتفاق کیا اور تعاون کا وعدہ بھی، اس طرح تقریباً چھ ماہ کے اندر ہم نے قرض کے طور پر کچھ پیسوں کا انتظام کر کے اور بقیہ کی جلد ادائیگی کا وعدہ کر کے زمین کی رجسٹری کرالی، اس زمین میں پروفیسر سید وسیم اختر صاحب نے چھپر

ڈلوا کر ایک عارضی اسکول کھول دیا تھا، حاجی صاحب تشریف لائے، اور ان کی تکریم میں ایک جلسہ بھی ہوا، انہوں نے زمین دیکھ کر اور اس کے آگے خالی زمین دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور اپنی تقریر میں، ہم سب کو مبارکباد دی اور یہ کہا کہ اس زمین پر بہت بڑا تعلیمی ادارہ جلد شروع ہوگا اور علم حاصل کرنے والوں کی لائن لگ جائے گی، یہ بات کچھ ایسی تھی کہ اس وقت یقین کے ساتھ اس کا ذکر کرنا بے محل معلوم ہو رہا تھا، مگر یہ بات اللہ تعالیٰ نے حاجی صاحب کے دل میں ڈالی اور ان کی زبان سے اسے کہلوایا۔ اور کچھ مدت میں ان کی پیشین گوئی کا اثر ظاہر ہونا شروع ہوا، اور پہلے انجینئرنگ کالج کی منظوری حاصل ہوئی اور تعلیم کا آغاز ہو کر اس کی اچھی شہرت ہوئی اور دور دور سے لوگ اس نوخیز یا نومولود ادارے کو دیکھنے کیلئے آنا شروع ہوئے اور جناب سید وسیم اختر کی شب و روز کی محنتوں سے اس کالج نے ترقی کر کے جلد یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا، یہ غالباً اس ''رجل مخلص'' کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کا اثر تھا، اور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی اس افتتاحی تقریر اور دعا جو سنگ بنیاد کے موقع پر حضرت مولانا نے کی تھی اور پتھر پر جو عبارت کندہ کرائی تھی اس کی قبولیت کا کھلا ہوا ثبوت تھا، آج بھی وہ پتھر اسی عبارت کے ساتھ یونیورسٹی کی عمارت کی دیوار کے ایک کارنر پر اس ''رجل عظیم'' کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔

حاجی رصاصی صاحب نے ہر اعتبار سے پورا تعاون کیا اور اس طرح کا معاملہ کیا جیسے وہ انھیں کا اپنا ادارہ ہے، اس کا ذکر ہر محفل میں کرتے ہوئے سنا گیا اور ہر جگہ اس کی مقبولیت کا چرچا ہوتا رہا، یہ حاجی صاحب کے اس جذبۂ ایمانی کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

حاجی رصاصی صاحب نہ صرف ممبائی کی تین عظیم الشان مذکورہ دانش گاہوں کے سرپرست اعلیٰ اور ہر لمحہ اس کے ساتھ ہر طرح سے وابستہ تھے، بلکہ وہ ان تمام مدارس و جامعات کے معاون خصوصی تھے، جہاں سے علم و عمل اور خدمت و وحدت کی خوشبو پھیلتی تھی اور جن کی وجہ سے اس ملک کی شان عظمت اور انسانیت کے نام پر قوم و وطن کا اتحاد قائم تھا۔

انٹیگرل یونیورسٹی کے لئے زمین کا جائزہ لینے کے موقع پر وہ دارالعلوم ندوۃ اعلماء تشریف لائے تھے اور مفکر اسلامؒ کے مہمان خانہ کی مجلس میں بیٹھ کر اسی منصوبے کے بارے میں دیر تک تبادلۂ خیال کیا تھا اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کے فیض علمی اور اس کے جامع تخیل کے بارے میں اپنے بہترین تاثرات کو پیش کیا تھا۔

ان کا تعلق ملک کے تمام مشہور علمی، دینی اور تعلیمی اداروں سے بہت گہرا تھا، وہ دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، دارالمصنفین، مدرسۃ الاصلاح، جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، اور چھوٹی بڑی بہت سی درس گاہوں سے مستقل طور سے قائم تھا، وہ سب کے لئے اپنے تعاون کو پیش کر کے خوش ہوتے تھے اور خفیہ طور پر نہ جانے کتنے اہل حاجت اور بے سہارا خاندانوں کی مدد کرتے تھے اور تسلسل کے ساتھ کار خیر میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ان کی طویل علالت کے زمانہ میں بھی اہل خاندان اور صاحبزادگان نے ان کی قائم کردہ روایات میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے دیا، اور پوری طرح برقرار رکھا، اور طویل علالت کی پوری مدت میں وہ لوگ خدمت اور علاج کے جتنے طریقے بھی ممکن تھے ان کو نہایت تعلق اور خدمت گذاری کے جذبہ کے ساتھ جاری رکھا، اور ۱۰/اگست ۲۰۱۵ء مطابق ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ کو وفات کے بعد بھی ان کے بتائے راستے ہوئے راستے پر چلنے اور ان کے مقرر کردہ طریقوں پر قائم رہنے کا عہد کر رکھا تھا، خاص طور سے صاحبزادہ گرامی جناب محمد سلیم رصاصی صاحب ان کی جانشینی کے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔اور اپنے والد مرحوم کی خدمت کا حق ادا کر رہے ہیں، اللہ تعالی ان کی ہر طرح مدد فرمائیں اور ان کی تجارت میں مزید خیر و برکت عطا فرمائیں، اور حاجی صاحب مرحوم کو رب العزت محض اپنے فضل و کرم سے جنت الفردوس کے اعلی ترین مقام میں جگہ عطا فرمائیں (آمین)۔

(یـأیتهـا الـنـفـس الـمطمئنة ارجعی الی ربك راضية مرضية ، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی)

پروفیسر محمد یونس نگرامی ندویؒ

چند نقوش وتأثرات

۱۹۵۳ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تخصص ادب عربی کے آخری سال کا طالب علم تھا اور شیخ التفسیر حضرت مولانا اویس نگرامیؒ بھی حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ایماء پر دارالعلوم میں شیخ التفسیر کے منصب پر جلوہ افروز ہوئے تو ان کے دو صاحبزادے محمد شعیب اور محمد یونس بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ بغرض تعلیم یہاں رہنے لگے، یہ دونوں بچے نہایت صاف شفاف سفید کپڑوں میں ملبوس رہا کرتے تھے اور ابتدائی درجہ کے طالب علموں میں ایک اچھی پہچان رکھتے تھے۔ میں نے ان کو جب بھی دیکھا تو دونوں کو ساتھ ساتھ مل کر رہتے ہوئے دیکھا اور ان کی امتیازی روش میں کبھی کوئی فرق نہیں نظر آیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب ان لوگوں نے اوپر کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے ندوہ سے عالمیت اور پھر فضیلت کی سند حاصل کی۔ اور برادمکرم محمد یونس نگرامی دارالعلوم کی طرف سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ بھیجے گئے۔ وہاں انھوں نے تعلیمی سرگرمیوں میں اچھا وقت گزارا۔

پھر انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے، اور ایم۔اے کیا اور امتیازی پوزیشن حاصل کی اور ایم۔اے کے بعد پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اس بناء پر ان کا کچھ ہی دنوں بعد شعبہ عربی میں لکچرار کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ اور وہ اپنی ذہانت اور علمی تفوق کی وجہ سے برابر ترقی کرتے رہے یہاں تک کہ پروفیسر کے درجے پر فائز ہوئے۔ اور پروفیسر نگرامی کے نام سے شہرت حاصل کی۔

پروفیسر نگرامی کا تعلق قصبہ نگرام کے ایک مشہور علمی اور دینی خانوادے سے تھا ان کے اسلاف میں علماء دین کی بڑی اہم شخصیتیں گذری ہیں مولانا عبدالعلی نگرامیؒ مولانا مطلوب الرحمٰن نگرامیؒ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا محمد ادریس نگرامیؒ اور مولانا محمد انیس نگرامیؒ اپنے عصر کے جید علماء میں شمار ہوتے تھے۔ پھر ان کے والد معظم شیخ التفسیر مولانا محمد اویس نگرامیؒ اس خاندان کے ممتاز عالم دین کی حیثیت سے ابھرے انھوں نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سید صاحبؒ کی نظر انتخاب علوم قرآن میں اختصاص حاصل کرنے کے سلسلہ میں ان پر پڑی اور سید صاحبؒ کے مشورہ سے اور ان کی سرپرستی میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ایک عرصہ تک قیام فرمایا اور سید صاحب سے بھرپور استفادہ کیا۔

پروفیسر نگرامی نے علم وفضل اور فکر ونظر کی متاع اپنے انھیں اسلاف سے وراثتاً پائی تھی وہ اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں اور فکری ودعوتی کاموں میں شروع ہی سے ہمہ تن مشغول رہے عربی زبان وادب پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ہی انگریزی زبان سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ ہندوستان سے نکلنے والے بڑے مشہور انگریزی اخبارات کو پڑھ کر اہم ترین خبروں کا خلاصہ عربی زبان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے نکلنے والے عربی پندرہ روزہ جریدہ ''الرائد'' میں ایک عرصۂ دراز تک تسلسل کے ساتھ ''نافذۃ علی الہند'' کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ان کی تحریر جدید عربی اسلوب کے معیار پر پوری اترتی تھی اور عالم عربی کے مشہور جرائد ومجلّات اس کو اپنے صفحات پر نمایاں طریقے پر شائع کیا کرتے تھے ان کے صاف ستھرے ذوق کا عکس ان کی تحریروں میں بھی پوری طرح جھلکتا تھا۔

ان کی عربی زبان وادب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند نے ۱۹۹۲ء میں اعزاز عطا کیا تھا۔ اور اردو زبان وادب کے اعتراف میں میر اکیڈمی لکھنو نے ان کو ''میر اوارڈ'' بھی دیا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ اردو اکیڈمی اتر پردیش کے چیئرمین کے منصب پر

دومرتبہ فائز ہوئے۔ اوراپنی امتیازی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے، اردوزبان کی تعلیم کے لئے شبینہ اسکول کے قیام کا بیڑہ اٹھایااور سینکڑوں شبینہ اسکول قائم کرکے اردواکیڈمی کے وقارکو بلند کیا۔ مارچ ۱۹۹۷ء میں انھوں نے اکیڈمی کی طرف سے حضرت مولاناسیدعبدالحی (والد ماجد حضرت مولاناسیدابوالحسن علی ندویؒ) کی زندگی اورکارناموں پرایک عالمی سیمینارکاانعقادحضرت مولاناسیدابوالحسن ندویؒ کی صدارت میں کیا۔ سیمینارکاافتتاح کرتے ہوئے پروفیسرنگرامی نے ہندوستان میں دینی علمی اجتماعی وسیاسی تاریخ کے بارے میں اپنے قیمتی خیالات کااظہارکیاتھا۔ اوران شخصیات کوخاص طور پرموضوع بنایا جنھوں نے ہندوستان کے مختلف النوع تاریخ پراپنا گہرااثرچھوڑاہے۔ان میں ہندوستان کے مصلحین علماءاہل علم وسیاست اہل دعوت اوران کے کارناموں کاخاص طور پرذکرکیاہے۔

اسی ضمن میں انھوں نے اس بات پراپنی مسرت کااظہارکیاکہ ہندوستان کی تاریخ پر گہری نظررکھنے والے محقق علامہ سیدعبدالحی حسنیؒ کی زندگی اورکارناموں پر یہ سیمینارمنعقد کرکے نہ صرف یہ کہ اردواکیڈمی کے کارناموں میں اضافہ کررہے ہیں بلکہ ہندوستان کے عظیم پہلوؤں کو دنیاکے سامنے پیش کرنے کی سعادت بھی حاصل کررہے ہیں۔ اس سیمینارمیں پروفیسرخلیق احمدنظامی نےعلی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی کی اورحضرت مولاناؒ نے اپنے صدارتی کلمات میں اس عظیم پہلودارشخصیت کی خاموش خدمات کانہایت ہی اچھے اندازسے ذکرفرمایا۔ پروفیسرخلیق احمدنظامی نے اپنامقالہ پیش کیاسیمینارکااختتام ریاست کے گورنرجناب رومیش بھنڈاری کی تقریرپرہوا۔

پروفیسرنگرامی کےکارناموں میں مسلم انٹلکچول فورم کاقیام بڑی اہمیت رکھتاہےانھوں نے اس فورم کے ذریعہ مختلف اسلامی موضوعات پرکئی مؤقرکانفرنسیں منعقدکیں۔حج کانفرنس میں عرب نمائندوں نے بھی شرکت کی اورحضرت مولاناسیدابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ’’المرتضیٰ‘‘ کی اشاعت کے موقع پراس کتاب کی رسم اجراءاداکرنے کے لئے انھوں نے گنگاپرشادمیموریل

ہال میں مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی صدارت میں ایک عظیم نشست کا انتظام کیا اس میں ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں نے شرکت کی اور کتاب کو خراج تحسین اور اس کے مصنف کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اسی فورم کے زیر انتظام وہ مختلف مقامات پر دعوتی اجتماع منعقد کیا کرتے تھے۔ اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات، وقت کے تقاضوں اور تعلیم اور عقیدے کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ جنوری ۱۹۹۷ء میں حیدر گڑھ میں دینی اسلامی تعلیم اور توحید خالص کی دعوت کے موضوع پر کانفرس منعقد کی۔ اس میں ہزاروں مسلمانوں اور علمائے کرام نے شرکت کی اور پورے علاقے میں اس کا گہرا اثر مرتب ہوا۔ اسی طرح وہ یہاں دیہاتی علاقوں میں لوگوں کو اسلامی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے اور شریعت اسلامیہ کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی دعوت دینے کے لئے فورم کی طرف سے اجتماعات منعقد کیا کرتے تھے۔ اور تقریباً ہر جمعہ کو وہ نگرام اور دیگر علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ اور جمعہ کی نماز میں مسلمانوں کے اجتماع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔

وہ مختلف عالمی اور تعلیمی اداروں کے رکن تھے چنانچہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے ان کو ہندوستان میں اسلامی امور میں اپنا مشیر بنایا تھا وہ اپنے والد ماجدؒ کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے رکن منتخب ہوئے۔ اور اس کے سالانہ جلسوں میں بڑی پابندی کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ ممتاز ڈگری کالج، اسلامیہ کالج وغیرہ کے رکن اور منیجر مقرر ہوئے۔ اور وہ لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے ممتاز استاذ آخر عمر تک رہے۔ اور وہاں پروفیسر کی حیثیت سے ان کو ایک بلند مقام حاصل تھا اور آخر میں ادھر چند سالوں سے وہ دارالعلوم کے دعوتی شعبہ ''المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی'' میں محاضرہ دیا کرتے تھے۔ اور بڑی پابندی کے ساتھ اس ذمہ داری کو انجام دیتے تھے۔ نگرام کے قدیم مدرسہ معدن العلوم کے ذمہ دار تھے۔ اور اس کو بڑی صلاحیت اور فکرمندی کے ساتھ چلاتے تھے اس مدرسہ

کی وسعت اور ترقی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

پروفیسر نگرامی کا نیاز مندانہ تعلق سادات حسینہ سے بہت گہرا تھا۔ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ اور برابر ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔ ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معاملات سے انتہائی دلچسپی تھی۔ اور وہ ہر کام اور ضرورت کے وقت حاضر رہا کرتے تھے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کے جانشیں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی سے بہت مخلصانہ اور نیاز مندانہ تعلق رکھتے تھے۔ وہ اساتذہ کا احترام بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنے میں بے مثال تھے۔ ۱۹۹۴ء میں جب راقم الحروف کو صدر جمہوریہ کی طرف سے عربی زبان وادب کی خدمات پر اوارڈ کا اعلان ہوا تو وہ سب سے پہلے مبارکباد دینے والوں میں تھے۔ اور مختلف ملاقاتوں میں انھوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ اور اوارڈ لینے لئے جب دہلی جانا ہوا تو میری درخواست پر وہ بھی میرے ساتھ دہلی گئے اور سہولت بہم پہونچائی۔

وہ اپنے خیالات کا اظہار نہایت تعمیری اور صاف ستھرے انداز میں کیا کرتے تھے۔ زندگی کے تمام معاملات میں ایک مثبت نظریئے کے حامل تھے۔ اور جہاں بھی کوئی خوبی ہوتی اس کا اعتراف اور قدر کرتے تھے۔ وہ ندوۃ العلماء سے نکلنے والے عربی ماہنامہ ''البعث الاسلامی'' میں اپنے گرانقدر مضامین اشاعت کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ اور اکثر خود آتے اور تبادلہ خیال کرتے۔ آخر دنوں میں انھوں نے مسلم انٹلکچول فورم کے نائب صدر کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے مجھ سے کہا تھا۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے اپنا لٹریچر بھی تیار کیا تھا۔ خدا کرے یہ فورم قائم ودوائم رہے۔ اور ان کے لگائے ہوئے شجر سایہ دار سے امت کے افراد کو سایہ ملتا رہے اور ان کے صاحبزادگان اور اہل خاندان اس قافلے کو آگے بڑھاتے رہیں۔

انھوں نے اپنے پیچھے گرانقدر تصنیفات بھی چھوڑی ہیں جس میں ۵۸ءکے بعد ہند میں عربی زبان وادب، تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ، نئی عرب دنیا، خیالات، تذکرہ مولانا اویس نگرامی۔ مثالی خواتین، تقدس حج وغیرہ شامل ہیں، وہ عربی جریدہ 'الرائد' میں چھپے ہوئے اپنے مضامین کو نئی ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کررہے تھے۔ امید ہے کہ ان کے فرزند عزیز حماد نگرامی صاحب ان کے ادھورے کاموں کو مکمل کریں گے۔

انھوں نے دنیا کے بہت سے ملکوں میں علمی اور دعوتی دورے کئے۔ تقریبا ہر سال سعودی عرب کا بھی دورہ کیا کرتے تھے۔ اور رابطہ عالم اسلامی کے ذمہ داروں سے ملاقات کرتے تھے ان کا آخری بیرونی سفر جاپان کا ہوا تھا۔ جو ماہ مئی ۲۰۰۰ء میں ٹوکیو میں منعقدہ عالمی کانفرس میں شرکت کے لئے تھا۔ کانفرس کا عنوان ''مشرق ایشیاء اور عالم اسلامی'' تھا اس کو وہاں کے اسلامک سنٹر نے ۲۹/۲۸ مئی ۲۰۰۰ء میں منعقد کیا تھا۔ اس سفر میں وہ حضرت مولانا علی میاںؒ کے جانشیں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کے رفیق سفر تھے، انھوں نے کانفرنس میں شریک ہونے والے وفود کی ترجمانی کرتے ہوئے تقریر کی جو بہت پسند کی گئی۔ انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنے وقت کا جس احساس ذمہ داری سے استعمال کیا وہ قابل تعریف وتقلید ہے۔ ان کو ایک روشن خیال، صاحب ضمیر، داعی اور علوم اسلامیہ اور علوم عصریہ کی جامع شخصیت کی حیثیت سے ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

☆☆☆

مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ

جوار رحمت میں

۱۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ مطابق ۹؍جون ۲۰۰۶ء کو جمعہ کے دن فجر کی نماز کے بعد جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں اچانک مولانا محمد عارف صاحب ندوی سنبھلی کی وفات کا اعلان ہوا تو دل کو ایک چوٹ لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا سوگوار ہوگئی۔ حادثہ اس لحاظ سے کچھ زیادہ ہی تکلیف دہ تھا کہ مرحوم کی طبیعت ٹھیک تھی اوران کی بابت فرقت کا کوئی اندیشہ نہ تھا، مولانا نے انتقال سے قبل گھر پر پہلے فجر کی نماز ادا کی پھر استنجے وغیرہ سے فارغ ہوئے اسی دوران ان پر کپکپی طاری ہوئی مرحوم نے اوڑھنے کے لئے چادر مانگی لیکن وقت چونکہ پورا ہو چکا تھا اس لئے چند منٹ کے اندر ان کی روح نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ بارگاہ ایزدی کی طرف پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد عارف صاحب سنبھلی کا شمار ملک کے ان ممتاز علماء میں ہوتا تھا جو عقیدے کی صفائی، بدعت سے نفرت اور انحراف وگمراہی سے دوری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، سنت وبدعت کے موضوع پر ان کے مبتدعین سے مناظرے بھی ہوئے جن میں موصوف نے شرک کی حقیقت کو آشکارا کر کے توحید کا جھنڈا گاڑ دیا، وہ اپنے شاگردوں کو بھی اس بنیادی عقیدے سے آشنا کر کے ان کے دلوں سے غلط فکر وخیال اور ایسے مزعومات کو کھرچ ڈالتے تھے جو بندے اور معبود کے درمیان کسی بھی واسطے کی وکالت کرتے ہیں انہیں رسول اللہ ﷺ سے واقعتاً عشق تھا لیکن وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ تنہا حب رسول ہی نجات کے لئے کافی ہے بلکہ ان کا آئین تو دربار نبوت کے شاعر حضرت حسان بن ثابتؓ کی زبان میں یہ تھا۔

ان الرسول لنور یستضاء به مهند من سیوف الله مسلول

”یقیناً رسول ایسے نور ہیں، جن سے روشنی حاصل کی جاتی ہے، اللہ کی تلواروں میں ایک چمکتی تلوار ہیں“

مولانا عشق الٰہی اور حب رسول کا ایسا امتزاج رکھتے تھے جس میں کسی طرح کے افراط وتفریط اور غلو کی کوئی گنجائش نہ تھی وہ علمی حلقوں میں پکے موحد اور سچے عاشق رسول کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، اسی توازن اور استقامت کی بدولت مولانا کی زندگی اتنی سادہ تھی جس میں ظاہری رکھ رکھاؤ اور پرتکلف معیاری غذاؤں کا کوئی گذر نہ تھا وہ تو بس اللہ کے عطا کردہ ایمان وعلم اور معرفت وعقیدے پر قناعت کرتے تھے۔ مولانا دینی جلسوں اور اجتماعات میں شرکت کرنے کے لئے اکثر ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کرتے تو وہاں بھی وہ توحید الٰہی اور حب رسول کو موضوع بنا کر ایسی مدلل تقریر کرتے جو واقعتاً سامعین کی دلوں میں اتر جاتی تھی۔ مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر وعقائد اور سیرت نبوی کا تیس سال سے زیادہ درس دیا جس کے دوران طلبہ اور اساتذہ دونوں کے درمیان یکساں مقبول رہے اور عوام میں بھی وہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مرحوم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے برادرزادے تھے جو عظیم داعی، جلیل القدر مصنف اور ممتاز خطیب ہونے کے ساتھ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے اور ان کی دعوتی وفکری خدمات کا دائرہ ہندو بیرون ہند چھ دہائیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ مولانا عارف صاحب اپنی تمام تر صفات میں مولانا نعمانی کے جانشین تھے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بھی انہیں بڑی عقیدت تھی، وہ محبت واحترام کے ساتھ مولانا کی بڑی تعظیم کرتے تھے اسی طرح مرحوم کا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ان کے خانوادے سے بھی گہرا تعلق تھا۔ متعدد مضامین کے علاوہ بریلوی فتنہ کا نیا روپ مولانا کی یادگار تصنیف ہے انہوں نے پسماندگان میں دو بیٹے مولوی محمد حمزہ ندوی، مولوی محمد طلحہ ندوی اور ایک صاحبزادی مریم عفیفہ کو چھوڑا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور سیئات کو حسنات سے بدل کر وہ موصوف کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے نیز ان کے اہل وعیال میں سے کسی نہ کسی کو ان کے خلا کو پر کرنے کی توفیق دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

پیکرِ اخلاص ومحبت

مولانا ابو مسعود محمد اظہر غوری ندوی

اظہر غوری ایک ہونہار طالب علم

گذشتہ صدی ۱۹۶۰ء کے بعد ہی کا واقعہ ہے جب مشرقی سلطان پور (یوپی) کے ایک گاؤں حمزہ پور پٹھان کے ایک ہونہار طالب علم دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، وہ محمد اظہر غوری کے نام سے معروف تھے، اور اپنے گاؤں ہی کے مکتب میں اپنے والد گرامی جناب مولانا ریحان الدین قاسمی کی زیر نگرانی پرائمری مکتب سے آگے کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے، اس لئے ان کا داخلہ عربی درجات کے اولین مرحلے میں ہوا، اور وہ اپنی تعلیمی لگن اور دلچسپی سے جلد ہی دوسرے طلبہ میں بھی درجہ مقبولیت حاصل کر کے ایک ذہین وممتاز طالب علم کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں میرا باقاعدہ تقرر مدرس ادب کی حیثیت سے ۱۹۵۵ء میں ہو چکا تھا اور ابتدائی درجات کے ساتھ کچھ متوسط درجے کی کتابیں بھی پڑھانے لگا تھا، اس لئے میرا گھنٹہ بھی ان کے درجہ میں تھا، اور عالمیت تک کے آخری درجے تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس بنا پر میں بھی ان سے مانوس تھا، اور وہ بھی بڑی حد تک میری قدر افزائی کیا کرتے تھے، ان کے کمرہ میں میرے دو عزیز دوست جو طالب علمی کے دور سے گذر رہے تھے رہا کرتے تھے اور اکثر ان کی خوبیاں، مطالعۂ درس اور خارجی مطالعہ وذہانت کی باتیں مجھ سے بیان کرتے تھے، وہ شفیق احمد خان رستہ مئوی، اور محمد نعیم صاحب اعظمی تھے، یہ دونوں بھی اپنی ذہانت وسعادت

مندی کالوہا منوا چکے تھے اور طلبہ میں ہر دلعزیز تھے، اسی کے نتیجہ میں آج وہ علم وعمل کی بلندیوں پر فائز ہیں، اور اپنے قدردانوں اور شاگردوں کا ایک وقیع حلقہ رکھتے ہیں۔

دہلی کا قیام اور علمی ومعاشی سرگرمیاں

مجھے یاد پڑتا ہے کہ محمد اظہر غوری ندوی کا تعلق دارالعلوم سے عالمیت کرنے کے بعد، اپنے علم وثقافت میں مزید ترقی کے جذبہ سے بعض اہم دانشگاہوں سے ہوگیا، چنانچہ ۱۹۶۸ء میں مرحلہ عالمیت کو پورا کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے منسلک ہوگئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے عربی ادبیات میں فضیلت کی ڈگری حاصل کرلی، اب وہ ایک طرف مدرسہ کی فضاؤں سے استفادہ کرنے اور اس کے نصاب کا احاطہ کرنے کے ساتھ یونیورسٹی کے ماحول سے بھی آشنا ہوئے اور وہاں سے بھی اعلیٰ ڈگری حاصل کی، لیکن معاش کا مسئلہ پیش نظر ہونے کی بنا پر ان کو دہلی کا سفر کرنا پڑا، اور جماعت اسلامی ہند کے شعبۂ صحافت سے وابستہ ہوگئے، اور چند مہینے میں انہوں نے صحافت کے میدان میں خاطر خواہ ترقی کی، اور اس وقت کے روزنامہ ''دعوت'' میں معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا، دہلی لکھنؤ کے مقابل میں بہت زیادہ وسیع اور ہر نوع کی ثقافت ونظریات کے علمبرداروں کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ اس ملک کی راجدھانی بھی ہے، سیاسی سرگرمیاں، دھرنے اور برت، احتجاج اور سیاسی پارٹیوں کے شور وشغب سے بھرپور ہے، یہاں قیام کرنا اور یکسو ہوکر کسی بڑے مقصد کو بروئے کار لانا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے، اسی طرح یہاں قیام کرکے اپنے ایمان واخلاق کو اور زندگی کے معمولات کو صحیح نہج پر چلانے اور اس کو اپنے اور دوسروں کے لئے نفع بخش بنانے کی راہ میں بڑی رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ایک گرانقدر مکتوب

مولانا محمد اظہر غوری ندوی دہلی میں کسی حد تک معاش کا سہارا لے کر قیام پذیر ہوئے، ان کے والد مکرم جناب مولانا ریحان الدین قاسمیؒ نے ان کو جو خط لکھا وہ نہ صرف ایک عالم باعمل

اور اپنی اولاد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا مظہر ہے، بلکہ ہر فکر مند والد کے لئے اپنی اولاد کی تربیت کی راہ میں ایک رہنما کی حیثیت رکھتا ہے، اس موقع پر ان کے والد نے اپنے فرزند کے نام جو خط لکھا، اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"آج تم جس شہر میں پہنچے ہو، کسی زمانے میں اس میں قیام کرنے کی تمنا خود میرے دل میں تھی۔ صرف اس لئے نہیں کہ دلی سے ہماری تاریخ کی شاندار روایات وابستہ ہیں، اس لئے بھی نہیں کہ اسے شاہ ولی اللہ وخواجہ بختیار کاکیؒ و دیگر اساطین امت واکابر کا مرکز و مدفن ہونے کی حیثیت حاصل ہے، محض اس لئے بھی نہیں کہ دلی کے کھنڈرات اور یادگاروں میں عبرت وموعظت کے بہت سے سبق موجود ہیں، جن سے ایمان وایقان کو تازگی اور جوش عمل کی فراوانی نصیب ہوتی ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ایک ایسا شہر ہے جہاں مستقبل کی ترقیات کی مختلف راہیں موجود ہیں، جن میں تلاش وجستجو ومحنت کے بعد اپنی پسند کی راہ مل سکتی ہے۔

یقین جانو! میں نے دارالعلوم (دیوبند) سے تعلیم کی تکمیل کے بعد دہلی کی راہ لی تھی اور دلی نے میرے لئے اپنے دامن شفقت کو وا بھی کر دیا تھا، مگر طبیعت کی وحشت، انتشار ذہنی اور فقدان استقلال نے مجھے اپنی منزل سے بہت دور کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے مفادات پر ضربیں لگائیں اور نفع کی جگہ نقصان کو پسند کیا، حیرت ہوتی ہے کہ میں نے ہمیشہ بلبلوں کی نغمہ سنجیوں اور پھولوں کی رنگینیوں کی جگہ خارزاروں اور سنگلاخ میدانوں کو پسند کیا۔ مجھے ہمیشہ ایسا میدان چاہئے تھا جہاں میں اپنے آپ کو دعوت آبلہ پائی دیتا اور ایسے سنگ وخشت کی تلاش رہتی جن سے سر پھوڑنے کا کام لیا جا سکے۔ مجھے ہمیشہ نئے وحشت

کدوں کی تلاش رہتی۔ اسی وحشت سامانی وآوارہ مزاجی میں ساری عمر ختم ہو گئی، مجھے خدا کی رحمت بیکراں نے اپنی نعمتوں کی بخشائش سے محروم نہیں کیا تھا، مجھے صلاحیت واستعداد کی وافر دولت ملی تھی، میں اپنی استعدادی قوتوں کو سمیٹ کر کسی مستقل کام میں لگا تا تو آج میرا بھی ایک مقام ہوتا، میں ایک اچھا صحافی بن سکتا تھا، معلم وداعی بن سکتا تھا، میدان تصنیف و تالیف میں میرا اشہب قلم دوڑ سکتا تھا، مگر کیا ہوا؟ عمر کا ایک بڑا حصہ، جو دراصل سعی وعمل کا تھا، وحشت سامانیوں کی نذر ہو گیا اور اب:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں ہوتی

منزل لاپتہ، نشان راہ گم، میں اپنی عمر رفتہ پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ عمر کا اتنا طویل زمانہ کس طرح بیکاری وخود فراموشی میں ختم ہو گیا اور مجھے ہوش بھی نہیں آیا۔ سوچو اگر آج دنیا سے سلسلۂ زندگی منقطع ہو جائے تو میں اپنی زندگی کے کون سے علائم ونشانات چھوڑ جاؤں۔ اور میرے بعد دنیا میں کون سا خلا محسوس کیا جائے گا۔ پھر آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حضور اعمال وافعال کی کون سی متاع پیش کر سکوں گا، عالم خود فراموشی کی ضائع کردہ عمر کا کیا جواب بنے گا؟

اب جبکہ تمہاری زندگی نے ایک نیا موڑ لیا ہے، گوشۂ علم کی تنہائیوں سے نکل کر میدان عمل کی ہنگامہ خیز زندگی میں داخل ہو رہے ہو، اپنے لئے سوچ سمجھ کر ایسا میدان عمل اختیار کرو، جس میں اپنی جوان امنگوں، حوصلوں اور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ چلتے رہو۔ تمہیں حق ہے کہ اپنے لئے جو راہ بھی چاہو پسند کر لو اور جہاں چاہو رہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ خدا

کی بخشی ہوئی صلاحیتیں کام میں آئیں، تم سے خدا کی مرضی پوری ہو، اللہ کی دنیا تمہارے وجود کو باعث رحمت و برکت سمجھے۔ تم دنیا میں میری طرح گمنام و مجہول انسان بن کے نہ رہ جاؤ، دہلی ایسی جگہ ہے کہ اگر تم راہ تجارت اختیار کرو تو بھی اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتے ہو، سب سے پہلے ضروری ہے کہ کوئی کام، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، شروع کردو، تاکہ اپنی ضروریات زندگی کی طرف سے مطمئن و بے فکر ہو جاؤ۔ کیونکہ بغیر اس کے سکون قلب و دماغ حاصل نہیں ہو پاتا۔ اور جب تک اطمینان نہ ہو ٹھیک سے اپنی منزل کا تعین کر کے صحیح راہ پر چلنا کم میسر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے"۔

ایک دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں:

"دہلی میری پسند کی جگہ ہے، وہاں ترقی کے بہت سے مواقع ہیں، اگر خدا کی مشیت و مرضی تم پر کرم گستر رہی تو تم اپنی جد و جہد سے بہت اونچے اٹھ سکتے ہو، ابھی تمہیں محض علمی زندگی گذارنا چاہئے، ٹھوس مطالعہ کے ذریعہ علم و آگہی کے ہر چشمہ تک پہونچو، اور تلخ و شیریں اور گرم و سرد کا پتہ لگاؤ، کیونکہ ژرف نگاہی، دقت نظری اور وسعت علمی کے بغیر سطحیت نمایاں رہتی ہے، نہ اچھے مضامین لکھے جاسکتے ہیں، اور نہ اچھی شاعری ہی ہوسکتی ہے، جس کا اچھا اور مفید ذوق تمہیں خدا نے دیا ہے، انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کا کام تمہیں مشکل پڑے گا، اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ عربی کی طرح انگریزی میں بھی اچھی لیاقت پیدا کرلو، مگر مفلسی سد راہ بن گئی، خدا تمہیں توفیق دے کہ اپنی کمی پوری کرلو، میری خواہش ہے کہ تم انگریزی کے امتحانات بھی تیاری کر کے دیتے رہو۔

ایک بات یہ کہنی ہے کہ اگر کام کی معروفیت مانع نہ ہو اور کسی قریبی جگہ کوئی ذی علم درس حدیث دیتا ہو تو بخاری شریف سبقا سبقا پڑھ ڈالو، میرے نزدیک علم دین کے سلسلے میں یہ بڑی کمی رہ گئی ہے، اپنی صحت کا بھی پورا خیال کرو"۔

سعودی سفارت خانہ میں ملازمت

اللہ کا شکر ہے کہ محب عزیز مولانا اظہر ندوی دہلی میں مقیم رہ کر اپنے والد محترم رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایات پر عمل کرتے رہے، اور اپنی جملہ ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لئے ہمیشہ ان کی بتائی ہوئی بنیادی باتوں پر سختی سے عمل پیرا رہے، والد مکرم کی ہمیشہ یہ نصیحت رہی کہ زندگی اس طرح گذارو، جو دنیا و آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اس میں پوشیدہ رہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیشہ وہ ان کی نصیحتوں پر عمل پیرا رہے، اور محنت و مشققت کرنے سے کبھی دل برداشتہ ہو کر اپنے کاموں کی انجام دہی سے پیچھے نہیں ہٹے، اور برابر معاشی خوش حالی کی بھی فکر کرتے رہے، اسی اثناء میں ۱۹۷۷ء میں سعودی سفارت خانہ نئی دہلی میں ملازمت مل گئی، اور اس کی اطلاع بذریعۂ خط انہوں نے اپنے والد محترم رحمۃ اللہ علیہ کو دی، اس کے جواب میں انہوں نے لکھا:

"خدا کا شکر ہے، امید ہے کہ تمہیں اچھا ماحول ملا ہوگا اور مادی ترقی بھی، اللہ تعالیٰ تمہاری خوشحالی وصحت میں روز افزوں ترقی دے، مگر اس کی شکر گذاری میں تمہارا فریضہ ہے کہ "تا نے بکف آری وبغفلت نخوری" اللہ کی اطاعت و بندگی میں حسب قوت غفلت نہ برتو، اتباع سنت و پابندیٔ صوم وصلاۃ سے تمہارے دین و دنیا کو روشن و تابناک بنانے میں مدد ملے گی۔

تمہاری ترقی اللہ کا احسان و کرم ہے، فالحمد لله على ذلك۔

اب یہ میرا اور تمہارا فرض ہوتا ہے کہ خدا کا شکر ادا کریں، اور زیادہ

سے زیادہ شکر گذار بندے بننے کی کوشش کریں، اللہ جب کسی کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے اور وہ اس کی ناقدری کرتا ہے تو اسے یہ بات پسند نہیں آتی، اور قدردانی پر خوش ہوتا ہے، اور اضافہ کرتا رہتا ہے، جب آمدنی اللہ کے کرم سے ہے تو خرچ بھی اس کی خوشنودی کے مطابق ہو، اللہ تعالی بخل کو بہت ہی ناپسند کرتا ہے، مگر اس نے سختی سے یہ بھی منع کیا ہے کہ اللے تللے خرچ ہو، ولا تبسطھا کل البسط والی آخر الآیۃ موجود ہے"۔

دینی اور عصری تعلیم کے فروغ کے سلسلہ میں وہ اپنے والد مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"والد مرحوم کو تعلیم کے فروغ سے جنون کی حد تک عشق تھا، اور جوانوں و بزرگوں کے لئے تعلیمی ادارے کھولنے اور بچوں ولڑکوں کو تعلیم حاصل کرنے کی تلقین وترغیب اور ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، یہ موضوع دینی وسماجی اصلاحات کے ساتھ انہیں اتنا پیارا تھا کہ دیگر موضوعات پر گفتگو کا موقع ہی نہیں مل پاتا تھا"۔

جامعۃ الہدیٰ الاسلامیۃ کا قیام اور تعلیم کا آغاز

اسی عالی ہمتی کا نتیجہ تھا کہ ان کو ۱۹۹۲ء میں جامعۃ الہدی (ہدی اسلامک انسٹی ٹیوٹ) قائم کرنے کی اللہ تعالی نے توفیق عطا فرمائی، اس کے لئے ایک مناسب زمین انہونہ کے قریب "اوتیہ" گاؤں میں محبین کے تعاون سے فراہم ہوگئی، اور تقریباً ۱۵/۱ ایکڑ وسیع رقبہ پر اس ادارہ کے قائم کرنے کی تیاریاں شروع ہوئیں، اور وہ علاقہ سید احمد شہید نگر کے نام سے موسوم ہوا، اور مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے سنگ بنیاد رکھنے کی درخواست کی گئی، اور ۹/نومبر ۱۹۹۲ء کو حضرت مولانا کے ہاتھوں سنگ بنیاد کا کام پایۂ تکمیل کو پہونچا، جامعۃ الہدی کی وسیع سرزمین میں مسجد کا سنگ بنیاد حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب

رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا۔ الحمد للہ وہ مسجد مغل طرز تعمیر کے نمونے پر تعمیر ہوئی، جو ایک وسیع اور شاندار جامع مسجد کی تصویر پیش کر رہی تھی۔

جامعۃ الہدیٰ میں راقم کی حاضری

جامعۃ الہدیٰ کے جائے وقوع اور اس کے کاموں کی شروعات کے موقع پر راقم کو بھی وہاں حاضری کا موقع ملا، اور کسی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، مسجد کے تیار ہونے کے بعد اس کے افتتاح کے لئے ندوہ کے مؤقر وفد کے ساتھ وہاں جانے کا راقم الحروف کو دوسرا موقع ملا، اس دن جمعہ تھا، اور جمعہ کی نماز سے مسجد کا افتتاح ہونا تھا، قرعۂ فال راقم کے نام نکلا، مسجد کے بلند منبر پر نہایت تواضع کے ساتھ کھڑے ہونے اور عربی زبان میں خطبہ دینے کی سعادت حاصل ہوئی، اس موقع پر علمائے دین کی بھی بڑی تعداد موجود تھی، اور جامع مسجد کا افتتاح کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کر لکھنؤ واپسی ہوئی، مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ اس موقع پر مفکر اسلام حضرت سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی قیادت میں وہاں یہ وفد پہونچا تھا۔

اظہر غوری شعر وسخن کے میدان میں

اب ابو مسعود اظہر غوری کے ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، وہ ہے ان کے ادب وشاعری اور نعتوں کا اہم پہلو، ماشاء اللہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر سے کسی طرح کم نہیں تھے، کم سے کم ان کے چھ شاعرانہ کلام کے مجموعے منظر عام پر آکر مقبول ہو چکے ہیں۔

پہلا مجموعہ کلام ''خار وگل'' ہے، یہ غزلوں کا مجموعہ ہے، اس کے مقدمہ نگار مظہر امام صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''اظہر ندوی ہماری شعری روایات واقدار کا پورا عرفان رکھتے ہیں، ساتھ ہی رسم عام سے الگ ڈگر پر چل کر اپنی شاعری کو تازہ مطالبات اور نئے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔۔۔ان کی شاعری ایک سنبھلی ہوئی طبیعت اور صحت مند افتاد ذہنی کی پیداوار ہے، ان کے اسلوب

میں روانی، شگفتگی اور دل گداختگی ہے، وہ ہر طرح کی زمین اور بحر میں اظہار کی یکساں قدرت رکھتے ہیں"۔

دوسرا مجموعۂ کلام نظموں کا مجموعہ ہے، جو "مضراب" کے نام سے مشہور ہے، اس کے مقدمہ میں جناب ڈاکٹر خالد محمود صاحب لکھتے ہیں:

"مضراب کی نظموں کا بالاستیعاب مطالعہ، اظہر ندوی کے فنی وفکری سرمایہ کی وسعت وگیرائی، اور قدرت کلام اور وسعت خیال سے اعلی ادبی ذوق کا احساس دلاتی ہے، جہاں تک مذہبی اور اسلامی تاریخ سے متعلق موضوعات کا سوال ہے بہت کم شاعران کے معیار کی بلندی کو چھونے کی جرأت کریں گے، انہیں فن شعر گوئی پر خاطر خواہ دستگاہ حاصل ہے، نامانوس بحروں اور مشکل زمینوں میں رواں دواں شعر کہہ کر انہوں نے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کیا ہے"۔

تیسرا مجموعہ کلام منتخب عربی اشعار اردو نظم کے لباس میں "عکس جمال" کے نام سے معروف ہے، اس کے مقدمہ نگار پروفیسر سید ضیاء الحسن لکھتے ہیں:

"ایک زبان سے دوسری زبان میں نثری ترجمہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے، اور شعری ترجمہ تو جوئے شیر لانے جیسا جوکھم ہے، اس کو وہی اٹھا سکتے ہیں، جن کے حوصلے بلند ہیں اور ترجمہ کی دونوں زبانوں کی باریکیوں پر گہری نظر ہے، اظہر ندوی تشنگان شعر وادب کے مخلصانہ شکر وسپاس کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس گنجینۂ معرفت کی دروں آشنائی میں ادنی خود غرضی کے بغیر دوسروں کو شریک کرنے کی کامیاب کوشش کی، اور مشہور زمانہ عرب دریا دلی ومہمان نوازی کی پاسداری کرتے ہوئے اس خوان نعمت کے دریچے تمام اردو دانوں کے لئے کھول دئے ہیں۔"

چوتھا مجموعۂ کلام غزلوں پر مشتمل ہے اور ''دشت الم ہے بیکراں'' کے نام سے مشہور و معروف ہے، اس کے مقدمہ نگار پروفیسر عبدالقوی دسنوی تحریر کرتے ہیں:

''جہاں تک اظہر ندوی کی غزلوں کا تعلق ہے، ان کے مطالعہ سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اشعار نہایت صاف، رواں دواں اور سادہ ہیں، جو دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں، انہوں نے کہیں بھی لفظوں کے کرتب دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ احساسات و جذبات اور تجربات کو سادگی اور سچائی کے ساتھ پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، ان کی غزلوں میں صحتمندانہ طرز فکر کی ترجمانی ملتی ہے۔''

اور نعتوں کا مجموعہ ''حرف حرف گلاب'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے، اس کے مقدمہ نگار مشہور شاعر خوش بیاں ابوالمجاہد زاہد اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اظہر ندوی کی نعتیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عام شعراء کی طرح رسماً نعتیں نہیں کہی ہیں، بلکہ محبوب خدا سے ان کی عقیدت و محبت کا اظہار ان کے اپنے دل کی آواز ہے، وہ محبت رسول ﷺ کو زندگی کا حاصل اور گوہر مقصود سمجھتے ہیں، اس لئے ان کے کلام میں عشق و سرمستی کی کیفیات، سپردگی و شیفتگی اور دوری و مہجوری کی کسک اور تڑپ پائی جاتی ہے، رسول کریم ﷺ سے مخلصانہ اور والہانہ شیفتگی کے جذبات ان کی نعتوں میں جگہ جگہ جھلکتے ہیں، ساتھ ہی وہ دربار نبوت کے ادب شناس ہیں اور عقیدۂ توحید و رسالت اور عبدیت اور الوہیت کے فرق کو سمجھتے ہیں۔

اظہر ندوی فن کی جمالیات کو فکر کی اخلاقیات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں، ان کے خیال و اظہار میں ربط و توازن برقرار رہتا ہے، اور انہیں ابلاغ و ترسیل کی ناتمامی کا شکار نہیں ہونا

پڑتا، ان کی نعتیں، ان کی عالمانہ بصیرت، وسیع مطالعے اور تجربے کی عکاس ہیں اور شاعر کی قادر الکلامی کی کہانی سناتی ہیں"۔

اسی طرح حمدوں اور نعتوں کا مجموعہ "ربنا یا ربنا" کے نام سے مقبول عوام وخواص ہے اور اللہ سے تعلق رکھنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے لئے اس کا مطالعہ بہت ہی مفید ہے۔

شاعرانہ کلام کے چند نمونے:

مولانا اظہر ندوی صاحب نے والد محترم کے انتقال کے موقع پر منظوم خراج عقیدت پیش کیا، اس قصیدے کے چند بند نذر قارئین ہیں:

دل نے کھینچی آہ، اک شعلہ اٹھا — کون اک دم چھوڑ کر دنیا اٹھا
حسن کردار و عمل ماتم کناں — اُف جنازہ علم وتقوی کا اٹھا
عزم و پامردی کو جس پر ناز تھا — مرد میدان وغی ، یکتا اٹھا
کرب ورنج وغم سے جو لبریز ہو — آج ساقی! لا وہ پیمانہ اٹھا

ایک دوسرے قصیدے کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اک کھیل موت وزیست کا دنیا کہیں جسے — بس اس کو ہے دوام کہ عقبی کہیں جسے
منظر کہیں پہ جشن کا، ماتم کدہ کہیں — دنیائے بے ثبات کا نقشا کہیں جسے
شہرت سے دور رہ کے گذاری تمام عمر — اس دور میں سلف کا نمونہ کہیں جسے
ملت کے واسطے ہی تڑپتا تھا دل سدا — اک درد مند ملت بیضا کہیں جسے
توحید کا نقیب تھا، بدعات کا عدو — بس سنت نبی کا دیوانا کہیں جسے

والدہ مرحومہ کے حادثہ وفات پر کچھ اس طرح گویا ہوئے:

آہ دل سے نہیں اٹھی، کوئی شعلہ اٹھا — آج جب گھر سے مری ماں کا جنازہ اٹھا
باپ کے سایہ سے محروم ہی تھے مدت سے — سر سے لو ماں کا بھی، اب آخری سایہ اٹھا
ایک اک گوشہ مہکتا تھا مہک سے جس کی — وہی گلشن کا ہمارے گل رعنا اٹھا

ہدیٰ انسٹی ٹیوٹ (جامعۃ الھدیٰ) کا مختصر ترانہ لکھا، اس کے بھی چند شعر سماعت کیجئے:

طالب علم وہدیٰ نیر تاباں ہوں گے
رحمت حق سے کبھی فخر گلستاں ہوں گے
دونوں ہاتھوں میں لئے علم وترقی کے چراغ
اپنے کردار سے ہر سمت نمایاں ہوں گے
بن کے رحمت کی گھٹا قوم پر چھا جائیں گے
وحدت ملت بیضا کے نگہباں ہوں گے

یہ تھے چند اشعار، جو اُن کے شاعرانہ مذاق ومزاج اور فطرت شعر گوئی کی شہادت پیش کرنے کے لئے کافی ہیں، افسوس کہ اس شاعر علم وہدیٰ نے والدین کی اتباع کرتے ہوئے ۲۸ مئی ۲۰۱۰ء کو ایک تعلیمی سفر کے دوران دنیا سے رخصت ہوکر آخرت کی راہ لی، إنا لله وإنا إليه راجعون -

اس مختصر تحریر کو مرحوم کے برادر مکرم جناب مولانا اطہر ریحان ندوی صاحب کے خط پر ختم کرنا شاید مناسب ہو، مولانا اطہر ریحان صاحب ''ہدیٰ اسلامک انسٹی ٹیوٹ'' کے ڈائریکٹر ہیں، ان کی فرمائش پر یہ مختصر مضمون لکھنے کی توفیق اللہ تعالی نے عطا فرمائی، امید ہے کہ راقم کی مختصر تحریر کسی حد تک یادگاری مجلہ میں شائع کرنے کے قابل ہوگی۔

خط کی نقل پیش خدمت ہے:

''مخدوم مکرم استاذی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتھم
مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جیسا کہ حضرت کو علم ہوگا کہ برادر مکرم جناب اظہر غوری کا گذشتہ ۲۸ رمئی ۲۰۱۰ء کو اچانک جگدیش پور کے تعلیمی وانتظامی سفر کے دوران انتقال ہوگیا، ادارہ کی انتظامیہ نے

اپنے بانی چیئرمین وسرپرست مرحوم کی یاد میں اسکول کی سالانہ میگزین کا خصوصی شمارہ ''اظہر غوری یادگار مجلہ'' شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، مضامین کی کمپوزنگ ہورہی ہے، آئندہ سالانہ جلسہ کے موقع پر رسم اجراء انجام پائے گی، (انشاءاللہ) مرحوم غوری کو مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء اور خاص کر آپ کی ذات سے جو والہانہ و نیاز مندانہ تعلق تھا یہ دستاویز نامکمل رہ جائے گی، اگر اس میں حضرت کے تعزیتی پیغام اور دعائیہ کلمات شامل اشاعت نہ ہوئے۔

لہٰذا مؤدبانہ التماس ہے کہ اپنے گرانقدر پیغام سے نواز کر ممنون کرم فرمائیں اور دعاؤں میں ناچیز کو بھی شامل رکھیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے، تاکہ ملت اسلامیہ کو آپ کے فیوض سے بیش از بیش فائدہ پہونچے۔

والسلام

نیازمند

اظہر ریحان

ڈائریکٹر ہدی ''اسلامک انسٹی ٹیوٹ''

۵؍جولائی ۲۰۱۱ء

انہیں چند الفاظ کے ساتھ محبّ عزیز ابومسعود اظہر غوری ندوی رحمہ اللہ کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ
اللہ کے حضور میں

یوں تو مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی صحت ادھر کئی سال سے کمزور تھی، اس کے باوجود وہ دارالعلوم میں حدیث شریف اور فلسفہ شریعت کے اسرار رموز پر مبنی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ کی تدریس بڑے شوق وذوق اور انہماک سے کرتے تھے، اس دوران ان کو پیام انسانیت کے سلسلہ میں سفر بھی کرنے پڑتے تھے، اوراس کواپنی دعوتی ذمہ داری سمجھ کر ہمیشہ دعوت کے مواقع سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے، پیام انسانیت کے نام اور عنوان سے جہاں وہ بڑے بڑے جلسوں کو خطاب کرتے تھے، وہیں ایسے مقامات کا دورہ بھی کرتے تھے جہاں اسلام کے پیغام کو مسلم غیر مسلم طبقات میں پہونچانے کی ضرورت محسوس کرتے، اوراس معاملہ میں وہ اپنے جد معظم حضرت علامہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے جانشین تھے، حضرت علامہ نے ہی اسلامی دعوت کو غیر مسلموں اور کمزور عقیدے کے مسلمانوں میں حکمت موعظت کے پہلو سے پہونچانے کے لئے پیام انسانیت کے نام کی تحریک قائم کی تھی، اور اس میدان میں زبردست کام کا نمونہ پیش کر دیا تھا، اپنی تمام مصروفیتوں کے ساتھ پیام انسانیت کے نام سے جہاں بھی لوگ دعوت دیتے اسے قبول فرمالیتے تھے اورنہایت انشراح کے ساتھ موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اپنی ٹیم کے ساتھ تشریف لے جاتے، اس ٹیم کا سب سے اہم نام ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی مرحوم کا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام لئے جاسکتے ہیں، مولانا اسحاق جلیس صاحب ندویؒ، مولانا عبدالنور صاحب ندویؒ،

مولانا نذر الحفیظ صاحب ازہری، پروفیسر انیس چشتی صاحب وغیرہ حضرات اس تحریک سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، اس ناچیز کو بھی پیام انسانیت کے جلسوں میں حضرت مرشدی علامہ کے ساتھ شرکت کا موقع ملا ہے، یہ ایک کامیاب تجربہ تھا اسلام کے پیغام کو لوگوں تک اور خاص طور سے اعلیٰ تعلیم یافتہ غیر مسلم طبقے میں پہونچانے کا، الحمد للہ اس کام کا تسلسل قائم رہا جو وقت کی ایک بڑی دعوتی، دینی اور انسانی ضرورت تھی۔

حضرت علامہؒ کے وصال ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء کے بعد اس تحریک کے جانشین جناب مولانا سید عبداللہ حسنی صاحب ندویؒ ہوئے، انھوں نے حضرت علامہ کو اس کام میں فنائیت کا جذبہ رکھتے ہوئے اور اس کو ہر مصروفیت پر مقدم رکھتے ہوئے دیکھا تھا، اور وہ پیام انسانیت کے جلسوں میں شریک رہا کرتے تھے اور حضرت علامہ کے آخری ایام حیات باسعادت میں برابر اس میں شریک رہ کر اس کی سربراہی اور وقت کے حالات کو پیش نظر رکھ کر کام کرنے کا سلیقہ من جانب اللہ ان کو حاصل ہو گیا تھا، اس لئے وہ بھی اس کام کو اپنے جد عظیم کی دینی وراثت سمجھ کر کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، اور سفر خواہ کتنا ہی طویل اور بامشقت ہو وہ اس پیغام کو پہونچانے کے لئے اپنے رفقاء کے ساتھ نکلتے، اور جہاں بھی ضرورت محسوس کرتے تقریر کے ذریعے اور باہمی مجلس وگفتگو کے ذریعے اپنے اس پیغام کو مؤثر طریقے سے پہونچاتے۔

اس دینی اور دعوتی وراثت کو اپنانے بلکہ اس کو سینے سے لگا لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ذریعہ معتد بہ تعداد مشرف باسلام ہوئی، اور بہت سے غیر مسلم خاندان بحیثیت کل زندگی کی صحیح راہ پاتے گئے، کئی ایسے غیر مسلم نوجوان مشرف باسلام ہوئے جن کو مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ سے ایسا لگاؤ اور تعلق ہو گیا کہ وہ ہر سفر میں ان کے ساتھ رہتے تھے، اور ان کی پوری معاونت کرتے تھے، اس طرح مولانا عبداللہ حسنی نے علم کی وراثت اپنے آباء واجداد سے پائی، اور انھوں نے اسی وراثت کو نہایت صحیح انداز میں دوسروں تک پہونچائی، وہ حدیث کے استاذ تھے، اس مضمون میں انھوں نے پوری امانت داری کے ساتھ اپنے طلبہ کو فائدہ پہونچایا، اور ان کی علمی اور دینی

نگرانی کا فریضہ انجام دیا، یہی وجہ ہے کہ طلبائے علوم دینیہ کے ایک گروپ نے آپ کی محنت وشفقت اور علمی افادہ کی سعادت حاصل کی، اور آپ کی عمومی اور خصوصی مجلسوں میں دل وجان سے حاضر رہا کرتے تھے، اور نہ صرف دار العلوم کے دائرہ میں بلکہ آپ کی دینی مجلسوں جو عصر کے بعد اپنے گھر پر منعقد کرتے تھے، اس میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد روزانہ حاضری دیتی تھی، اور بہت کچھ سیکھنے اور علم وعمل کی جامعیت کا فائدہ اٹھانے کا ان کو موقع حاصل ہوا کرتا تھا۔

مرحوم کے والد مکرم جناب مولانا سید محمد الحسنی صاحبؒ سے میرا تعلق بہت قدیم تھا، میں ۱۹۵۲ء میں ندوۃ العلماء کے دار العلوم کا طالب علم تھا، تخصص ادب کے درجہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا، تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے میرے لئے ایک رفیق مخلص مولانا سید محمد الحسنیؒ سے مخلصانہ تعلق کا انتظام کر دیا، اور طبیعتوں اور امنگوں میں ہم آہنگی کے سبب ہم دونوں ایک دوسرے پر اعتماد اور محبت وتعلق رکھتے تھے، عربی زبان وادب کو فروغ دینے اور اس سلسلے میں مشورے کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ المنتدی الادبی قائم ہوئی، اور اس وقت چند باذوق ساتھیوں نے اس کے پروگراموں میں حصہ لیا، اور کچھ مدت گذرنے کے بعد البعث الاسلامی نام کا ایک عربی مجلّہ نکالنے کا ارادہ ہوا، اس میں ہم چار رفیق تھے، لیکن دو ساتھیوں کا دمشق یونیورسٹی میں داخلہ کا پروانہ آ گیا، اور وہ اپنے اس علمی سفر پر روانہ ہو گئے، اب صرف اس ناچیز نے اپنے رفیق قدیم مولانا سید محمد الحسنی صاحب کے ساتھ رہ کر اس عربی مجلّہ کی ذمہ داری کسی حد تک سنبھالی، اس سلسلے میں نہایت قیمتی مشورے حضرۃ الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی سے لیا کرتے تھے، اور انھیں کے مشوروں کی بدولت یہ مجلّہ منظر عام پر آیا، پہلا شمارہ ماہ صفر ۱۳۷۵ھ کا شائع ہوا، اس شمارے کو متعارف کرانے اور اس کے حلقۂ اشتراک کو وسیع کرنے کے لئے ہم دونوں نے تقریباً ڈھائی ہفتے کے ایک سفر کا پروگرام بنایا، اور ہم دونوں ساتھی سفر پر روانہ ہوئے، اس میں کانپور، آگرہ، علی گڑھ، سہارنپور، دیوبند، دہلی، مراد آباد، رام پور اور کچھ دیگر مقامات پر پرچہ کو لے کر جانے اور اس کے لئے خریدار حاصل کرنے کا موقع ملا۔

اس کے بعد مزید تعلقات اور رفاقت کا دائرہ وسیع ہوا، اور روزانہ مجلّہ کے سلسلے میں مشورہ کرنے اور اس کو مزید مفید و مستحکم بنانے کے لئے ملاقات کرنے کی ضرورت پر اتفاق ہوا، سفر سے واپسی کے بعد معاً ربیع الأول ۱۳۷۵ھ میں مولانا سید محمد الحسنی صاحب کا عقد خاندان کے اندر ہوا، اور سب کو اس سے بے حد خوشی اور مسرت ہوئی، ہر ایک نے مبارک باد دی، اور بڑوں نے دعائیں دیں، مولانا کے والد مکرم مولانا ڈاکٹر سید العلی حسنیؒ اور ان کے عم مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو اس تقریب سے جو خوشی اور مسرت ہوئی، وہ مولانا سید محمد الحسنی صاحب کے روشن مستقبل کا اعلان تھا، اور الحمد اللہ اس کا ظہور بھی ہوا۔

ہمارے برادر عزیز و مکرم جناب مولانا سید عبداللہ حسنیؒ کی ولادت ۲۹ / جنوری ۱۹۵۷ کو ہوئی، تو خانوادے کے جملہ حضرات کو اس واقعہ سے جو خوشی ہوئی اس کا احاطہ کرنا ناممکن ہے، عقیقہ کی دعوت میں سبھی اہل تعلق، اہل خاندان شریک ہوئے، یہ ناچیز بھی انتہائی مسرتوں کے ساتھ اس عقیقہ میں شریک ہو کر اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوا، اور اسی وقت سے مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کی خیر و عافیت اور علوم و معرفت کے اس عظیم ماحول میں ان کی تربیت اور بعد میں ان کی ذہانت و فطانت کے حالات معلوم ہوتے رہے، وقت گذرتا گیا، اور وہ تعلیم و تربیت کے میدان میں داخل ہوئے، گھریلو تعلیم کے ساتھ مکتب میں تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو کر عالمیت اور فضیلت کی سند حاصل کی، اسی کے ساتھ خاندان کے بزرگوں سے استفادہ اور علمی و دینی ترقی کا سلسلہ قائم رہا، اور اس کی وجہ سے دعوتی مزاج پروان چڑھا، اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر اور ان کی اقتداء کر کے داعیانہ صفات کے حامل ہوئے، اور حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد پیام انسانیت کی تحریک کو اپنا کر اس خلا کو پر کیا، اور اس راہ میں اپنی توانائیاں صرف کیں، اور ہر طرح کے حالات کا سامنا کیا، مسلسل اسفار کی مشقت برداشت کرنے کی وجہ سے صحت پر اثر پڑا، لیکن علاج کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، دراصل اہل دعوت کا مزاج یہی ہوتا ہے، کہ وہ دعوت کو ہر

چیز پر مقدم رکھتے ہیں، اور اس کی فکر میں وہ اپنی پوری زندگی اور زندگی کے لمحات گذارتے ہیں، خاص طور سے جب داعی، آل رسولؐ سے نسبت رکھتا ہو، اور خیر امت کا سچا نمائندہ ہو۔

مولانا عبداللہ حسنیؒ اسی نوعیت کے عالم تھے، انھوں نے علم و دعوت کی جامعیت حاصل کی، اور اسی راہ میں اپنے آپ کو فنائیت کے درجے تک پہونچا دیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کو جس کی بنیاد اخلاص کامل پر تھی قبول کرلیا، اور بے شمار انسانوں کو ان سے راہ حق کی تعلیم حاصل ہوئی اور اسلام کا صحیح پیغام ان تک پہونچا، اور وہ اپنے اس عمل سے سرخ رو ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق ایک قابل تقلید زندگی کی بنیاد مضبوط کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوگئے اور نہایت مطمئن و پرسکون حالات کے ساتھ راضی برضا اپنے رب کے دربار میں پہونچ گئے، جہاں ان کے لئے باسعادت اور کامیاب لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل ہونے کا فرمان جاری ہوا ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مولانا سید عبداللہ حسنی مرحوم کو عربی زبان وادب پر کافی عبور تھا، وہ چاہتے تو اپنے والد محترم کے قائم کئے ہوئے عربی مجلّہ البعث الاسلامی کے مدیر ہوتے، اور یہ ان کا آئینی حق ہوتا، لیکن انھوں نے اس جانب توجہ نہیں کی، اور بزرگوں کے مشورہ اور حکم کے مطابق پندرہ روزہ عربی اخبار الرائد کے نائب مدیر رہنے پر اکتفاء کیا، اور یکم جولائی ۱۹۷۹ء سے برابر اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے، اور اس میں اپنے عربی مضامین شائع کراتے رہے، وہ اکثر افتتاحیہ بھی خود ہی لکھتے تھے، اور اپنے اسلاف کے نہج پر چل کر دعوتی اسلوب میں جدید ذہن کو مخاطب کرتے تھے، انھوں نے تاحیات اس خدمت کو بأحسن وجوہ انجام دیا، البعث الاسلامی میں بھی ان کے بہت سے عربی معیاری مضامین شائع ہوئے، ان کو اردو زبان وادب سے بھی کافی لگاؤ تھا، اردو میں کافی مضامین لکھے، اور وہ تعمیر حیات و دیگر اردو رسالوں کی زینت بنے، اور سب کا ماحصل یہی ہوتا تھا کہ دین کی دعوت لوگوں تک پہونچے، اور عصری ذہن کو اپیل کرسکے، اور امت اسلامیہ کے افراد اپنی کھوئی ہوئی ایمانی طاقت کو ازسرنو اپنے اندر دریافت کرسکیں، اور

منصب قیادت کو اختیار کر کے سارے عالم کو امن وامان اور عقیدہ وایمان کا گھوارہ بنا سکیں، انھوں نے اپنے جد معظم حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے کئی عربی رسالوں اور مہتم بالشان عربی مضامین کے اردو ترجمے کئے، اور وہ بڑے پیانے پر اشاعت پذیر ہوئے۔

مولانائے مرحوم اپنی ایک خاص پہنچان رکھتے تھے، تواضع، کسر نفسی، اخلاق حسنہ، اور خاموش طبیعت کے ساتھ خاموشی سے اپنے کام میں مشغول رہنا ان کا امتیازی وصف تھا، وہ دعوتی اور پیام انسانیت کے کاموں کے لئے کثرت سے سفر کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ بذات خود تصنیف وتالیف کے لئے وقت نہیں نکال سکے، ورنہ وہ اپنی علمی اور عملی زندگی میں ہر اعتبار سے مستقل تصنیفات پیش کرنے کے لئے نہایت موزوں تھے، لیکن ہدایت وارشاد کے میدان میں انھوں نے جو کام کیا ہے وہ دیگر تمام مشغولیتوں سے بہتر ہے، حضرت علیؓ نے حضور پاکﷺ نے فرمایا تھا کہ ''اے علی! اگر تمہارے ذریعہ ایک آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمادیں، تو عرب کے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے''، انھوں نے اپنے معاون علمی عزیز مکرم مولوی محمد زبیر احمد ندوی سے بہت سی دعوتی کتابوں کا ہندی ترجمہ اپنی قائم کردہ ہندی اکیڈمی ''العافیۃ'' جس کا قیام اکتوبر ۲۰۰۹ء میں ہوا، اور جو ہندی تحقیق ادارہ ''ستیہ مارگ پرکاشن'' جو عافیہ کی تمدید ہے، کے ذریعہ ہندی میں کرایا، جو غیر مسلموں کے لئے انتہائی مفید مواد کا درجہ رکھتی ہیں، العافیہ اسلام کی تعلیمات سکھانے کے لئے اور اسلامی زندگی کو عملی شکل میں پیش کرنے کا ذریعہ ہے، اس کا دفتر مکارم نگر میں قائم ہے، اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طریقے سے انجام دے رہا ہے، **فالحمدلله على ذالك**۔

مرحوم کے صرف ایک ہی بیٹے محمد حسنی ہیں، اور ابھی کم عمر ہیں، ان کا نام ان کے داداجان مرحوم محمد الحسنی کے نام پر رکھا گیا، موجودہ حادثہ کے بعد بوقت تعزیت میں عزیزی محمد حسنی بن عبداللہ بن محمد الحسنی سے ملا اور ان سے معانقہ کیا تو مجھ کو ان کے والد مرحوم کے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔

مولانا عبداللہ حسنیؒ کی پہلی نماز جنازہ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی دامت برکاتہم کے حکم سے دارالعلوم کے وسیع میدان میں ناچیز نے پڑھائی، تو عظیم مجمع دیکھ کر مجھے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے جنازہ کا منظر یاد آ گیا، اور حضرت والا کی حیات طیبہ کا ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا، اور بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں، ان کی دوسری نماز جنازہ تکیہ رائے بریلی میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے پڑھائی، اور رات گئے تدفین عمل میں آئی۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اس محبوب ہستی کی روح پر جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی، ان کو صالحین کا درجہ عطا ہو، اور جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ پائیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ وہ زبان حال کہہ رہے ہوں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اور غالب کی زبان میں:

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی چلے

☆☆☆

آہ ! مولانا محمد ابراہیم ندویؒ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ ادب مولانا محمد ابراہیم ندوی صاحب کے انتقال سے مجھے ذاتی طور پر صدمہ پہنچا ہے۔ ان سے میرا ذاتی تعلق تھا، مرحوم کا داخلہ درجہ حفظ میں ہوا، حافظ حشمت اللہ صاحب مرحوم کے شاگرد تھے، اس وقت سے میرا ان سے ربط تھا اور اکثر و بیشتر مسجد دارالعلوم میں ملاقات ہوا کرتی تھی۔ عربی درجات میں آنے کے بعد مرحوم سے ملاقات کا سلسلہ زیادہ وسیع ہوا، مرحوم جب دارالعلوم ندوۃ لعلماء سے فارغ ہونے کے قریب تھے تو ایک مرتبہ میں نے ان سے اپنے بے تکلف انداز میں کہا کہ تم پاسپورٹ کیوں نہیں بنوا لیتے ؟! انہوں نے کہا کہ اس سے کیا فائدہ؟ تو میں نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے باہر جانے کا موقع مل جائے۔ میرے مشورہ سے ہی انہوں نے پاسپورٹ بنوایا، اس وقت پاسپورٹ بڑی آسانی سے بن جایا کرتا تھا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ ہوگیا۔ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد دارالافتاء ریاض سے مبعوثیت مل گئی، اس میں وہ کام کرتے رہے، ان کا ٹرانسفر دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور ہوگیا، کئی سال تک انہوں نے وہاں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کا تبادلہ کرایا گیا، اس کے لئے میں نے سعودی سفارت خانہ اور دارالافتاء ریاض کو بھی کئی خطوط لکھے، اس وقت سے وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے، میری ان سے اکثر و بیشتر ملاقات ہوتی تھی، مولانا اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ترقی کرتے کرتے علیا ادب کے درجات میں بھی تعلیم دینے لگے۔ مرحوم کو ادب، انشاء تفسیر کے ساتھ ساتھ نحو پڑھانے میں بھی بہت دلچسپی تھی۔

ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی، اور حال معتمد تعلیمات

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی منظوری سے کلیۃ اللغۃ کے نائب عمید مقرر ہوئے، اور وہ عمید کلیۃ اللغۃ مولانا نذر الحفیظ ندوی کے ساتھ مل کر کلیہ کے کاموں میں بھی مصروف رہے اور مولانا کا خاص تعاون کرتے تھے، انہوں نے شعبہ عربی میں پوری دل جمعی کے ساتھ انہماک رکھا، طلباء بھی ان کے حسن اخلاق اور انکی علمی وادبی لیاقت سے مسرور رہتے۔ مبعوثیت کے دوران انہوں نے اپنے علاقہ ردولی میں کوئی تعلیمی ادارہ قائم کرنے کے لئے ایک اچھی خاصی لب روڈ زمین خرید لی تھی، اس کو دکھانے کے لئے مجھے ایک دفعہ لے گئے۔ وہ اپنے حلقہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہت زیادہ خندہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ دارالعلوم میں مرحوم کی ایک خاص پہچان تھی، تواضع، ملنساری۔ ان کے دوستوں میں خاص طور سے مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی استاذ حدیث دارالعلوم اور مولانا اقبال احمد مدنی ندوی سابق مہتمم معہد الفردوس دوبگا قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ تقریباً روزانہ ایک دوسرے سے ملتے تھے اور علمی مسائل کے بارے میں گفتگو بھی کرتے تھے۔ چند سال پہلے ان کے والد مولانا محمد یعقوب ندوی کا انتقال ہوا تو اس سے وہ بہت متاثر ہوئے، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ان کی اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا، جو ان کے لئے مزید صدمہ کا باعث رہا، وہ اپنی خوش گفتاری و بلند اخلاقی سے صدموں کو جھیل رہے تھے، اسی اثناء انہوں نے اپنی تین صاحبزادیوں کی شادی بھی کرائی اور بڑے بچے محمد اسماعیل کا نکاح بھی ہوا، دو بچیوں کی شادی ہونی باقی ہے، ان کی والدہ بھی ساتھ رہتی تھیں، مولانا کے انتقال کے ہوتے ہی حضرت ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے حکم سے دارالعلوم میں چھٹی کر دی گئی اور بعد نماز عصر ندوہ کے فیلڈ میں (جو تقریباً نصف سے زائد بھر گئی) ناظم صاحب کے حکم سے میں نے نماز جنازہ پڑھائی، نماز جنازہ پڑھنے والوں اور تدفین (ڈالی گنج قبرستان) میں شرکت کرنے والوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا تھا۔ شہر کے علاوہ قرب وجوار واضلاع کے مدارس کے اساتذہ وطلباء ان میں بعض حضرات اپنے اہل خانہ کے ساتھ تعزیت اور تدفین میں شرکت کے لئے آئے، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی،

مولانا سید بلال حسنی ندوی، مولانا محمد ظہیر فلاحی ندوی، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی، مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی، مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی سمیت کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

مرحوم سے میں نے اپنے مضامین کے ترجمے کرائے ، انہوں نے نہایت شگفتہ ترجمہ کر کے مجھے ممنون کیا، البعث الاسلامی کے پروف پڑھنے میں بھی انہوں نے میری مدد کی، اسی طرح وہ علمی کاموں میں سب کے ساتھ تعاون کرتے تھے،، بعض احباب اپنی عربی تحریروں میں ان کی رائے حاصل کرتے تھے، وہ اعرابی اغلاط کی نشاندہی کرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے تھے، ادھر کچھ دنوں سے وہ زیادہ تر خاموش رہا کرتے تھے، صحت بھی متاثر معلوم ہوتی تھی، میں ازراہِ مذاق کہا کرتا تھا کہ ماشاءاللہ تمہاری آمدنی اچھی خاصی ہے، مگر خرچ میں بخل سے کام لیتے ہو، شاید اس لئے کہ تم کتاب البخلاء پڑھاتے ہو،، مگر وہ نہیں نہیں کر کے اس کو ٹال دیتے تھے ایک عرصہ تک انہوں نے جاحظ کے ادب سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اور تاحیات، جاحظ کے ادبی اسلوب سے متاثر رہے۔ ادھر دعاوعبادت کا کافی اہتمام کرتے تھے، نوافل کا بھی خاصا اعتناء کرتے تھے، اور اپنی ظاہری وباطنی زندگی میں سادگی کے ساتھ تعلق مع اللہ اور توکل علی اللہ میں بہت آگے تھے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائیں اور جنۃ الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین

جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

الحاج عبدالرزاق نصیرآبادیؒ

میرے مربی ومرشد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جنوری ۱۹۵۸ء میں مجھ کو اپنے نادرۂ روزگار استاذ ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی صاحب رحمہ اللہ، کی خدمت میں علمی اور ادبی استفادہ کے لئے بغداد بھیجا تھا، وہاں تقریباً گیارہ مہینے کی مدت پوری کر کے جنوری ۱۹۵۹ء میں واپس آیا تو مجھے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں برابر ایک نہایت مخلص وسرگرم ساتھی کو حاضر خدمت دیکھ کر ان سے متعارف ہونے کا موقع ملا، اور یہ معلوم کر کے کہ انھوں نے حضرت مولانا رحمہ اللہ کی خدمت میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے، اور اس سے ان کا مقصد صرف خدمت اور رضائے الٰہی ہے۔

وہ نصیرآباد رائے بریلی کے معتقدین سادات حسنیہ اور وہاں کے دین دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کا نام عبدالرزاق تھا، اور وہ شب وروز حضرت مولانا کے خادم کی حیثیت سے ساتھ رہتے تھے، اور ان کے مزاج شناس ہونے کے ساتھ ان کی جملہ علمی اور دینی مشغولیتوں میں پورے اخلاص اور فنائیت کے جذبے کے ساتھ ہر لمحہ اپنے آپ کو تیار رکھتے تھے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ روزانہ صبح کو ناشتے سے فارغ ہوکر اپنے علمی اور تصنیفی کاموں میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول ہوجاتے، اس دوران حاجی عبدالرزاق صاحبؒ ہمہ وقت تیار رہتے، اور اسی دوران مشغولیت ایک نرم آواز سنائی دیتی: عبدالرزاق! اور عبدالرزاق سامنے کھڑے ہوئے نظر آتے، دیکھو: کتب خانہ چلے جاؤ، اور یہ کتاب جس کا نام ہے، جو ایک پرچی پر تحریر ہوتا، لے کر آؤ، اور عبدالرزاق صاحب برق رفتاری کے ساتھ کتب خانے سے وہ کتاب نکلوا کر لاتے اور پیش کردیتے، ماشاء اللہ بہت جلد

لے کر آگئے، حضرت مولانا فرماتے، اس طرح وہ حضرت کے علمی کاموں کے دوران ہمیشہ معاون ثابت ہوئے۔

دوران مشغولیت کوئی اہم شخصیت ملنے آجاتی، اور حضرت مولانا اپنی شدید علمی مشغولیت کے باوجود نہایت خندہ پیشانی اور اعلی اخلاق کے ساتھ ان کے ساتھ کچھ وقت گذار تے، اور حاجی عبدالرزاق صاحب فوراً ادراک کر لیتے کہ ان صاحب کی عزت افزائی کے لئے کیا کرنا چاہئے، اور وہ بغیر کسی ہدایت کے ان کے لئے کم ازکم چائے اور ناشتہ کا انتظام کرتے، اوران کے قیام کے لئے مہمان خانہ میں جگہ کا انتخاب کر لیتے، اوران کے دوران قیام کھانے کے بعد قیلولہ کا انتظام اور دیگر ضروریات میں دوسروں کو متوجہ کردیا کرتے، حضرت مولاناؒ کے ہر سفر میں ساتھ رہ کر ان کے ہر طرح کے آرام کا خیال رکھتے، سفروں میں جو عام طور سے ٹرین کے ذریعہ ہوتے تھے، جن کتابوں اور زیر تالیف سامانوں کو ساتھ رکھنا ضروری ہوتا، وہ پورے اہتمام کے ساتھ اپنے ساتھ رکھ لیتے، دوران سفر نمازوں کے لئے قبلہ رخ، وضو اور اگر ضرورت ہو تو استنجے کے لئے ضروری انتظامات کا خیال ہر وقت رکھتے تھے۔

نہ صرف اندرون ملک سفروں میں ساتھ ہوتے بلکہ باہر کے سفروں میں بھی ساتھ ہونے کے مواقع ملتے، اور حسب ضرورت اس کے انتظامات میں بھر پور حصہ لیتے، سعودیہ کے سفر کے دوران حضرت مولانا کے پرگراموں سے واقفیت حاصل کر کے فوری طور سے اس پر عمل کراتے، عمرہ کی ادائیگی میں پوری طرح ساتھ رہتے، اور یک لحظہ بھی غافل نہ ہوتے، حضرت الاستاذ مولانا عبداللہ عباس صاحبؒ کے گھر میں قیام کی صورت میں ہر طرح کے اطمینان کے باوجود پوری طرح فکر مند رہتے، اور کسی لمحہ بھی خدمت سے غافل نہ ہوتے، جو لوگ ملنے کے لئے آتے، ان کی خاطر تواضع کے لئے اہل خانہ کے ذریعہ پوری تیاری کر لیتے، اگر کوئی ایسی بات جو حضرت والا اس سلسلے میں کہنے کا ارادہ رکھتے وہ پہلے ہی سے پوری فکر مندی کے ساتھ اس کا انتظام کرا لیتے تھے، کھانے کی مجلس ہو یا صرف ناشتہ

وچائے کی، کسی بات کی فکر حضرت مولانا کو کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔

اسی طرح دوران سفر علمی اور تعلیمی مشغلہ پوری طرح قائم رہتا، اس کے جملہ انتظامات، کتابیں اور حوالہ جات کے لئے مناسب جگہ اور پرسکون گوشے کا ہمیشہ ایک نظام قائم رہتا تھا، ضیافت کے سلسلہ میں اگر کوئی تبدیلی کرنی ہوتی تو اس کو بطریق احسن انجام دیتے تھے، دوران عمل اگر کوئی ضروری کام سے ملنے آتا تو ضرور ملاقات کراتے، اور ان کی خاطر تواضع کرنے کے بعد پھر اپنے کاموں میں مصروف ہوجاتے۔

بھائی عبدالرزاق صاحب نے اپنی ذہانت، موقع شناسی، اور مزاج سے مناسبت کی بناء پر اس طرح حضرت مولانا سے ایسا تعلق پیدا کرلیا تھا کہ ان کے بغیر حضرت مولانا کو اپنے کاموں میں کمی کا احساس ہوتا، اکثر ایسا ہوتا کہ ان کو مختلف ضروری مواقع پر اہل وعیال سے ملنے کا حکم دیتے تھے، اور کچھ ایسا نظم بن جاتا کہ گھر کے بچے اور نوجوان، یا باہر کے لوگ جو خاندانی مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، ان سے ضروری خدمت لے لیا کرتے تھے۔

مجھ کو بارہا حضرت کے ایک حقیر خادم کی حیثیت سے سفر کے بیشتر مواقع حاصل ہوئے، الحمدللہ کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں پیش آسکا، دو سے زائد مرتبہ سعودی عرب اور کم ازکم دوبار ترکی، اور ایک بار لندن کے سفر میں ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے یاد ہے کہ ان سفروں میں سے کسی سفر میں حضرت والا کے ساتھ ان کے خادم خاص حاجی عبدالرزاق کا ساتھ رہا، اور میں نے ان کو حضرت مولانا کے لئے ہر طرح کا آرام پہونچانے کی فکر میں مشغول پایا، کبھی بھی اجازت کے بغیر کہیں باہر کسی سے ملنے یا کسی دیگر کام سے نہیں گئے۔

ایک زمانہ میں جب ان کے گاؤں نصیر آباد میں ایک مدرسہ اور مسجد کی تعمیر حضرت مولانا کی توجہ اور دعائے خاص سے مکمل ہوگئی، اور وہاں کے لوگوں کیلئے دینی اور تعلیمی فائدہ اٹھانے اور بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہوگیا، تو مجھے اپنے مدرسہ اور مسجد کو دیکھنے کی دعوت دی، اور ایک پروگرام جو تعلیمی اور دعوتی تھا اس میں شریک ہونے اور کچھ عرض کرنے کے بارے

میں کہا، میں ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے وہاں حاضر ہوا، اور پروگرام میں حصہ لینے کے ساتھ نصیر آباد کے گاؤں اور اطراف میں حاضر ہونے اور لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا، انھوں نے اس میں مدرسہ کی مالی حالت کو مستحکم کرنے کی غرض سے ایک تجارتی دکان شروع کی تھی، اور اس میں مجھ سے حصہ لینے کے بارے میں عرض کیا، میں نے ایک قلیل رقم سے اس میں حصہ لے لیا، مگر کچھ عرصے کے بعد انھوں نے ایک رقم مجھ کو لا کر دی، کہ اس تجارتی کام میں فائدہ ہوا، اور یہ رقم آپ کے حصے کی ہے، مجھے بڑا تعجب ہوا، اور اس چھوٹے سے معاملہ میں ان کی پاکیزگی کی شہادت حاصل ہوئی۔

ان کے گاؤں سے قریب قصبہ جائس میں ۱۹۵۹ء میں تبلیغی جماعت کے ساتھ نکلے ،اس جماعت کے امیر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، اس موقع پر حضرت سے ان کا تعارف ہوا، اور پھر حضرت مولانا کے ساتھ محلّہ غوریانہ میں جماعت کے چند روزہ قیام کے بعد حضرت کے ساتھ پیدل جماعت میں مختلف علاقوں میں مثلاً شیوہ کا پوروا، چھولامئو، وغیرہ اور جماعت سے واپسی کے بعد بابوگنج جو وہاں سے قریب کے علاقہ میں ہے ایک دکان کرلی، جس سے کسی قدر معاشی مدد کا انتظام ہوا۔

جماعت تبلیغ کے دورے میں برابر شریک رہے، اور حضرت مولانا سے ملتے رہے، یہاں تک کہ حضرت کی جائے قیام تکیہ کلاں جانا ہوا، اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے، اور حضرت مولانا نے اپنی کمزورئ صحت کی بنا پر ان کی محبت اور دینداری کو دیکھتے ہوئے ان کا قیام ایک عام معاون وخادم کی حیثیت سے اپنے ساتھ کرلیا، اور اس کے بعد برابر حضرت والا کی خدمت میں رہنا ہوا، اور اس کو انھوں نے ایک غیبی انتظام سمجھ کر اپنے لئے باعث صد سعادت سمجھا، اور حضرت مولانا کے ایک بے لوث اور مزاج شناس خادم کی طرح ہمہ وقت حاضر خدمت رہے، اس اثناء میں جب بھی کوئی مہمان یا کوئی بڑی شخصیت حضرت مولانا کی خدمت میں ملاقات یا طلب دعا کی غرض سے حاضر ہوتی، حاجی عبدالرزاق صاحب ان کے شایان شان

ضیافت وملاقات کا انتظام کرتے، اور حضرت والا کو کسی طرح سے کوئی فکر نہ کرنی پڑتی۔

۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی نہایت اعلی اور وسیع پیانے پر منعقد ہوا، تو اس میں حضرت مولانا کی دعوت پر دنیا بھر کے اہل علم وثقافت جمع ہوئے تھے، یہ موقع حضرت مولانا کے لئے انتہائی مشغولیت اور فکر مندی کا تھا، اس اجلاس کی تیاریاں بہت پہلے سے جاری تھیں، اور اس کے لئے ایک پوری ٹیم کام کر رہی تھی، لیکن حضرت مولانا کی مختلف النوع مصروفیات سب سے زیادہ تھیں، ان حالات میں حاجی عبدالرزاق کا انتہائی مخلصانہ کردار حضرت مولانا کے شب وروز کی مشغولیات میں بہت اہم تھا، اور جشن تعلیمی کے بعد بھی عرصہ تک لوگ دور دراز مقامات سے حضرت سے ملنے اور ندوۃ العلماء کے دعوتی اور فکر ی مقاصد کو معلوم کرنے کے لئے آتے رہے، اس مین ہندوستان کی اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی اور دیگر بڑے لیڈران تکیہ کلاں آئے، اور حاجی صاحب نے ان کے استقبال اور معمول کے مطابق ضیافت کا انتظام برابر جاری رکھا۔

۱۹۸۷ء میں کشمیر کے وزیراعلی شیخ عبداللہ کی دعوت پر وہاں کا سفر ہوا، جس میں بہ حیثیت خادم اور مرافق خاص رہے، اسی کے بعد ہی بنگلہ دیش میں ڈھاکہ، چاٹگام اور سنارگاؤں کا سفر ہوا، اور حاجی صاحب ایک خادم خاص کی حیثیت سے ہمہ وقت حضرت کے ساتھ رہے۔

اور ۱۹۸۵ء حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وفات کے موقع سے بھوپال کا سفر ہوا، اور حاجی عبدالرزاق صاحب خادم خاص کی حیثیت سے حضرت کے ساتھ رہے، ۱۹۸۷ء میں دہلی اور ممبئی کا سفر ہوا، اس زمانے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی صحت کی کمزوری میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا، لیکن دہلی میں سابق وزیراعظم نرسمہا راؤ سے ملاقات طے تھی، اسلئے وہاں جانا ضروری معلوم ہوا، اسکے بعد کے اسفار اندرون اور بیرون ملک کے تمام مواقع پر حاجی صاحب رفیق سفر رہے، اور ۱۹۹۵ء میں کوچین اور بھٹکل کا سفر ۱۹۹۸ء میں حکومت دبئی کی دعوت پر دنیا کی عظیم اسلامی شخصیت کا

ایوارڈ لینے کے سلسلے میں حکومت دبئی کے انتہائی اصرار کی بناپراور دبئی سے خصوصی طیارہ بھیجنے کی بناپر یہ سفر ہوا، اس میں حضرت والا کے اصل مرافق سفر حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی، دامت برکاتہم تھے، اور حاجی صاحب اس میں خصوصی طور پر ہمہ دم حضرت کے ساتھ رہے، اس زمانے میں حضرت مولانا کی صحت کی کمزوری کی بناپر کئی حضرات اس سفر میں ساتھ رہے، اور ۱۹۹۷ء میں حاجی عبدالرزاق صاحب نے حضرت کے ہمراہ حرمین شریفین کا سفر کیا، اور وہاں رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اجلاس میں شرکت کی، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس میں شرکت کے لئے ۱۹۹۸ء میں جودھ پور کا سفر اور دہلی ہوتے ہوئے علی گڑھ میں دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے جانا ہوا، اور حاجی صاحب ان تمام اسفار میں ہمہ تن حاضر خدمت رہے، اور اس علاقے کے نامور طبیب حاذق حکیم افہام اللہ صاحب کی وفات کے موقع پر ان کے جنازے میں شرکت کے لئے انہونہ کا سفر ۱۹۹۹ء میں حضرت کی وفات سے کچھ عرصہ قبل اور سفر آخرت سے پہلے کا یہ آخری سفر تھا۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو بوقت نماز جمعہ حضرت والا نے سفر آخرت اختیار کیا، اور پورا عالم آپ کی وفات حسرت آیات سے غمگین اور سوگوار ہوکر رہا، تکیہ کلاں میں نماز جنازہ میں بے شمار افراد نے شرکت کی، اور حرمین شریفین میں نماز جنازہ غائبانہ خادم الحرمین ملک فہد بن عبدالعزیز کے حکم سے ادا کی گئی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا کی وفات کے بعد بھی حاجی عبدالرزاق صاحب حسب معمول حضرت کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے رفیق خدمت اسی انداز اور جذبے کے ساتھ قائم رہے، اور خاندان کے تمام افراد کے ساتھ ان کا تعلق اسی طرح قائم رہا، جیسا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں تھا، اور تکیہ کلاں کو اسی طرح اپنا گھر اور خاندان سمجھتے رہے، یہاں تک کہ ۴ر رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ مطابق ۴ر جولائی ۲۰۱۴ء کو اچانک تکیہ میں موجودگی کے دوران دار آخرت کا سفر کیا، اور اپنے بعد ایسی یادیں چھوڑ گئے جو

تاریخ کا جزء بن کر رہیں،اوران کے لائق وفائق فرزند مولانا شبیر احمد ندوی صاحب (نائب ناظر معہد دارالعلوم سکروری) نے ان کی شخصیت پر یہ کتاب تصنیف کی ہے، جوان کو ہمیشہ کے لئے ایک زندہ یادگار بنانے کی نہایت کامیاب اور مبارک کوشش ہے، میں اس عمل پر ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، جس کو حدیث شریف میں ولد صالح کی دعا سے تعبیر کیا گیا ہے، (إذامات ابن آدم انقطع عنه عمله الامن ثلاث، صدقة جارية،وولد صالح يدعو له و علم ينتفع به) ترجمہ: جب ابن آدم کا انتقال ہوتا ہے،تواس کے سارے اعمال اس سے منقطع ہوجاتے ہیں،سوائے تین عمل کے،ایک صدقۂ جاریہ، دوسرے نیک اولاد جواس کے دعا کرے،تیسرے ایسا علم جس سے فائدہ اٹھائے۔

اللہ تعالیٰ حاجی عبدالرزاق صاحب کے ساتھ اپنے عفو وکرم کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمائیں،اوران کی مخلصانہ خدمات کا جو حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ایام حیات اوراس کے بعد بھی جاری رہیں، ان کو قبول فرمائیں،اور جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائیں،(آمین)